جنوری شمارہ ۱

نہرو بال پستکالیہ

ہندوستان کی اہم زبانوں اور انگریزی میں بچوں کے لیے بہترین اور سستی کتابیں شایع کرنے کے لیے کتابوں کے اس سلسلے کا آغاز کیا گیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں بسنے والوں، مختلف زبانوں کے جاننے والوں کے لیے ایک ہی سا ادب پیش کیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہو سکیں اور اس سے قومی ایکتا مضبوط ہو۔

اب تک مندرجۂ ذیل کتابیں شایع ہوئی ہیں جو اُردو کے علاوہ انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ملتی ہیں۔ ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے (۱/۵۰) ہے۔ یہ سب کتابیں رنگین تصویروں کے ساتھ فوٹو آفسٹ پر شایع ہوئی ہیں۔

۱۔ باپو (حصّہ اول و دوم) مصنف: سی فری ناس، مترجم: صالحہ عابد حسین
۲۔ سب کا ساتھی سب کا دوست ، اُماشنکر جوشی ، انور کمال حسینی
۳۔ کشمیر مصنف: بالا سنگھ، مترجم: حدیجہ بیگم، تصویر: بریانند
۴۔ پرندوں کی دنیا مصنف: جہاں آرا، مترجم: محمد شفیع الدین نیّر
۵۔ ہمالیہ کی چوٹیوں پر ″ : بریگیڈیر گیان سنگھ، مترجم: محمد ذاکر
۶۔ ہماری ندیوں کی کہانی حصّہ اول، لیلا مجمدار، مترجم: رضیہ سجاد ظہیر
۷۔ جنّت کی سیر اور دوسری کہانیاں ″ : لیلا سعاگوت، ″ رضیہ سجاد ظہیر
۸۔ رسیلی کہانیاں ، ، منوج داس ، ، ؛ صغرا مہدی
۹۔ آزادی کی کہانی حصّہ اوّل و دوم ″ : دستو پرجاکر، ″ : انور کمال حسینی
۱۰۔ ہماری ریلیں ، جگ جیت سنگھ، ″ ؛ عرش ملسیانی
۱۱۔ ہندوستان میں غیر ملکی سیاح ″ ؛ کے بی۔ کھنہ، تصاویر: کرشن کھنہ
۱۲۔ آؤ ناٹک کھیلیں ، ، اوما نند، مترجم، رفیعہ منظور الامین
۱۳۔ غالب کا خاندان ، ؛ منوہر داس چترویدی، محمد شفیع الدین نیّر
۱۴۔ بہت دن ہوئے حصّہ اوّل ، چوکسی بی۔ ام جوشی، ″ ، رضیہ سجاد ظہیر
۱۵۔ بہادروں کی کہانیاں، مصنف: راجندر اوستھی، مترجم: انور کمال حسینی
۱۶۔ روشنت و تندیہ ″ ؛ کرتن چتنیہ ، ، ، ″
۱۷۔ سدابہار کہانیاں ″ ؛ شانتا رنگاچاری مترجم: انور کمال حسینی
۱۸۔ ایجادیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی (حصّہ اول و دوم) ″ ؛ میر نجابت علی، ″ ؛ سیّد احسان
۱۹۔ سونا کی سیر ″ ؛ تارا تیواڑی، ″ : انور کمال حسینی
۲۰۔ بڑا پانی مصنف: لیلا مجمدار، مترجم: صالحہ عابد حسین
۲۱۔ سورا ″ : ملک راج آنند، ″ ، انور کمال حسینی
۲۲۔ ہاکی کا کھیل ، ؛ سروپندر سانیال ″ : پریتم لال
۲۳۔ پھول اور شہد کی مکھی ، اشوک داور ، ؛ انور کمال حسینی

ذاکر حسین سیریز

۲۳۔ ابّو خاں کی بکری، مصنف: ڈاکٹر ذاکر حسین قیمت: ۲/۰۰
۲۴۔ انوکھی دُکان ، ؛ قدسیہ زیدی ″ ۲/۵۰
۲۵۔ گلابو جو ہیا اور پری زاد ، ؛ ″ ، ، ۲/۰۰
۲۶۔ دنیا کے جانور ، ″ ؛ ″ ، ، ۲/۵۰
۲۷۔ راجہ رام موہن رائے ″ ؛ عرش ملسیانی ۴/۵۰
۲۸۔ خواجہ الطاف حسین حالی، ؛ صالحہ عابد حسین ۶/۵۰
۲۹۔ سلطان زین العابدین "بڈشاہ" رضیہ سجاد ظہیر ۶/۵۰
۳۰۔ ذاکر صاحب کی کہانی ؛ سعیدہ خورشید عالم ۴/۵۰

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵، اُردو بازار جامع مسجد دہلی ۶، پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

ماہنامہ

پیام تعلیم

نئی دہلی ۲۵

جلد ۱۴ شمارہ ۱

ایڈیٹر
ولی شاہجہانپوری

معاون
صفیہ حسان

جنوری ۱۹۷۷ء

قیمت فی پرچہ ۶۰/ پیسے
سالانہ چندہ سات روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے [illegible] پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر دہلی [illegible] ۲۵ سے شائع کیا

فہرست

شوکت پردیسی

سالِ نو مبارک

گیا سن چہتّر، ہوا ختم سال
ازل سے ہے رسمِ عروج و زوال
نہیں اب جو باقی تو پھر کیا ملال

کہ ہے سامنے اک نئی آن بان
نئے سال کا ہے نیا سب پلان

یہ سوچو کہ پہلے ہوئی کیا کمی ؟
نئے سال میں ہو نہ غلطی وہی
کرو دل میں پیدا نئی روشنی

کرو علم حاصل، بنو شادکام
بدل دو زمانے کا سارا نظام

ارادوں پہ اپنے رہو تم اٹل!
نہ ہو پست ہمت، نہ ہو بے عمل
ملے گا تمھیں اپنی محنت کا پھل

جہاں جاؤگے، روشنی پاؤگے
ترقی کروگے خوشی پاؤگے

نئے سال کا ہے یہ تم کو پیام
ادھورا نہ چھوڑو کبھی کوئی کام
اسی میں ہے عزت اسی میں ہے نام
بنو جرأتِ شوق سے تیز رو
مبارک ہو بچو! تمھیں سالِ نو

نوشی بھابی

سالِ نو

خوشی کے دیپ جلاؤ کہ سالِ نو آیا
اندھیرا دل سے مٹاؤ کہ سالِ نو آیا
افق سے جھانک رہی ہے نئی سحر کب کو
خوشی کے ساز بجاؤ کہ سالِ نو آیا
نئی امنگ، نئے ولولے سے پڑھنے میں
دل اپنا تم بھی لگاؤ کہ سالِ نو آیا
اندھیرا دور ہو کچھ تو اجالا بڑھنے سے
چراغ دل کے جلاؤ کہ سالِ نو آیا
جو نوجواں ہیں عدو کے مقابلے میں انھیں
نویدِ فتح سناؤ کہ سالِ نو آیا
ہو بھائی بہنو، مبارک تمھیں یہ سالِ نو
دعا کو ہاتھ اٹھاؤ کہ سالِ نو آیا
وطن کی آن پہ قربان ہونے والوں کی
لحد پہ پھول چڑھاؤ کہ سالِ نو آیا
تقاضہ وقت کا ہے جو بچھڑ گئے ہیں انھیں
گلے سے اپنے لگاؤ کہ سالِ نو آیا
اٹھا کے ساز اک انداز نو سے اے نوشی
نئے ترانے سناؤ کہ سالِ نو آیا

بچوں سے باتیں

پیارے بچو! نیا سال مبارک ہو۔

ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی ہم سال ۱۹۷۶ کو بڑی اچھی امیدوں کے ساتھ خوش آمدید کہتے ہیں۔ مایوسی کفر ہے، اس لیے اس کو پاس نہیں آنے دینا چاہیے۔ امید ہو تو آدمی میں کام کرنے کی لگن بیدار رہتی ہے۔ وہ آگے قدم بڑھاتا ہے تو منزل خود بخود اس کے قریب آجاتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ قدم سوچ سمجھ کر بڑھایا جائے اور صحیح سمت بڑھایا جائے۔

طلبہ کی منزل تعلیم کی تکمیل ہے۔ اس منزل پر ان کا ہر قدم آگے کی طرف بڑھنا چاہیے۔ ہماری دعا ہے کہ پڑھنے لکھنے والے بچے اور بچیاں پورے سال کامیابیوں سے دوچار ہوتے رہیں۔

اس مہینے کی ۲۶ تاریخ بھی ہمارے لیے بہت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ آج سے ۲۶ سال قبل ۱۹۵۰ء میں آزاد ہندوستان کا پہلا آئین دستور ساز اسمبلی نے نافذ کر دیا تھا۔ اسی لیے اس دن کو "یوم جمہوریت" کہتے ہیں۔ پورے ملک میں یہ دن قومی تہوار کی طرح منایا جاتا ہے۔ دلی میں اور ریاستوں کے صدر مقامات [illegible] جگہ جگہ قومی جھنڈے لہرائے جاتے ہیں۔ انھیں سلامی دی جاتی ہے۔ ملک کی راجدھانی ہونے کے باعث دلی میں دور دور سے لوگ اس جشن کو دیکھنے آتے ہیں۔ فوجی پریڈ، ٹکڑیوں، اور جھانکیوں کو جلوس کی شکل میں دیکھنے کے لیے لوگ صبح ہونے سے پہلے ہی ان راستوں پر جم جاتے ہیں جدھر سے جلوس گزرتا ہے۔

اس شمارے میں شوکت پردیسی کی نظم "سالِ نو مبارک" اور رؤف انجم کی "جشن جمہوریت" اور لوگی بھارتی کی "سالِ نو" وقت کی چیزیں ہیں اور آپ کو یقیناً پسند آئیں گی۔

محترم شفیع الدین نیّر نے دسمبر میں بہت عمدہ نظم مرحمت فرمائی تھی۔ ہمیں مسرت ہے کہ نئے سال کا تحفہ بھی "یہ دور علم کا ہے" کی شکل میں آپ نے عنایت فرما کر قارئین کو وقت کی اہم ضرورت کی طرف متوجہ کیا ہے۔ نظم بچوں اور بچیوں کے لیے کہی گئی ہے۔ بڑوں کو بھی تو علم اور ہنر کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیّر صاحب نے ان دونوں کی اہمیت اور ضرورت کو بڑے سیدھے سادے انداز اور عام فہم زبان میں آپ کے سامنے رکھا ہے۔ [illegible]

بے کران کی نظمیں آسان سے آسان زبان میں ہونے کے باعث ہمیشہ کامیاب رہتی ہیں۔

محبوب راہی صاحب نے بھی نئے سال کی آمد پر "دعوتِ عمل" دی ہے۔ امید ہے کہ آپ اس دعوت کو شوق سے قبول کریں گے اور نیک اعمال سے اپنی زندگیوں کو سنوارنے کی کوشش کریں گے۔

جیسا کہ ہم نے کہا تھا' نادک حمزہ پوری صاحب نے کئی عمدہ اور دلچسپ نظمیں مرحمت کی ہیں۔ ان میں سے ایک آپ اس شمارے میں پڑھیے اور اس سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کیجیے۔ اور غلام الحسنین صاحب کا "کمہار" بھی پڑھیے اور لطف لیجیے۔

حصۂ نثر میں غلام حیدر صاحب کا "میرے اُستاد" حسبِ معمول ایک ایسی شخصیت سے متعارف کراتا ہے جو اپنی بے نفسی، خلوت پسندی اور نام و نمود سے بے نیازی کا مجسم پیکر ہے۔ آپ بھی اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اور سیکھنا چاہیے۔ حسینی صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بھی وابستہ رہے ہیں۔

محمد امین صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مدرسۂ ثانوی میں کافی مدت تک استاد رہنے کے بعد ازلیفہ چلے گئے تھے۔ کئی ملکوں کی سیر کی۔ ان کی اتھوپیا کی کئی کہانیاں آپ "پیامِ تعلیم" میں پڑھ چکے ہیں۔ اس مرتبہ آپ نے مصر کی ایک دلچسپ کہانی "نادرہ کی حاضر جوابی" آپ کے لیے لکھی ہے۔ کہانی طویل ہے اس کی ایک قسط اس شمارے میں پڑھیے اور لطف اُٹھائیے۔

ایوب صاحب واقف نے "ابراہیم لنکن" کے ایک اہم ہدایت نامے کا کامیاب ترجمہ پیش کیا ہے۔ اس سے بھی آپ مستفید ہو سکتے ہیں اور آپ کے سرپرست اور اساتذہ بھی۔ کوشش کیجیے کہ آپ بھی خود میں وہ صفات پیدا کریں جن کو امریکہ کا یہ بیدار مغز صدر اپنے بچے میں دیکھنا چاہتا تھا۔

نشاط حیدری صاحب کا مضمون "ارسطو" اور خلیل الرحمن صاحب کا "محمود غزنوی" خاص معلوماتی مضامین ہیں۔ اور آپ کو پسند آئیں گے۔

جناب شفیع الدین نیر

یہ دور علم کا ہے، یہ دور ہے ہنر کا

ہر سمت بج رہا ہے علم و ہنر کا ڈنکا … دنیا میں اُٹھ رہا ہے علم و ہنر کا ڈنکا
وہ مرد ہو کہ عورت، لڑکا ہو یا وہ لڑکی … ہر ایک کے لیے ہے علم و ہنر ضروری

یہ دورِ علم کا ہے یہ دور ہے ہنر کا … بے علم بے ہنر کا مشکل ہے اس میں جینا
علم زبان ہو یا سائنس یا ادب ہو … یا رب ہمارے دل میں ہر علم کی طلب ہو

سائنس کے عمل میں کیا کچھ نہیں ہے ملتا … ہر روز پھول تازہ ہے اس چمن میں کھلتا
انگلش ہو یا کہ اردو یا ہو زبان ہندی … ہر ایک ہی زبان کی تحصیل ہے ضروری

تاریخ ہو، ریاضی، مذہب ہو یا سیاست … ہر ایک علم ہی میں درکار ہے ریاضت
جاپان سے عرب سے چین اور جرمنی سے … علم و ہنر کو حاصل کرتے رہیں خوشی سے

دنیا میں علم ہی کی مشعل ہے کام آتی … تاریک راستوں میں ہے روشنی دکھاتی
تعلیم کی بدولت اخلاق ہیں سنورتے … اوقات زندگی کے ہیں چین سے گزرتے

علم و ہنر کا جوہر ہے آدمی بناتا … علم و ہنر کا زیور ہے آبرو بڑھاتا
باعلم باہنر ہیں سُکھ زندگی کا پاتے … بے علم بے ہنر ہیں بس ٹھوکریں ہی کھاتے

گھر ہو کہ کارخانہ بازار ہو کہ دفتر … علم و ہنر رفاقت کرتے ہیں بن کے یاور
خدمت ہو یا زراعت، صنعت ہو یا تجارت … سب ہی میں کامیابی ہے علم کی بدولت

علم و ہنر کی پونجی جس کے بھی پاس ہوگی
خوش وقتیوں کی اُس کو ہر وقت آس ہوگی

محمد ایوب واقف

ابراہم لنکن کا ایک اہم ہدایت نامہ

آج کل ہمارے سماج کے جو بچے درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں۔ اُن کے سامنے نہ تو تعلیم کا کوئی واضح مقصد ہوتا ہے اور نہ ہی اپنی زندگی کا اور ستم کی بات یہ ہے کہ والدین، درسگاہوں کے اساتذہ و سماج کے دوسرے ذمہ دار حضرات بھی بچوں کی ذہنی تربیت اور ان کے کردار و گفتار کی اصلاح سے حسب ضرورت دلچسپی نہیں لیتے۔ والدین اپنے بچوں کو درسگاہوں میں بھیج کر خوش ہو لیتے ہیں کہ ان کی طرف سے ان کا حق ادا ہو گیا اور اساتذہ بھی نصاب کے مقررہ اسباق کو پڑھا کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ انھوں نے بھی ذمہ داری پوری کر لی ہے۔ بچے چند بندھے ٹکے سوالوں کے جواب لکھ کر امتحان میں کامیاب ہو کر اسناد حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ اسناد کسی حد تک بچوں کے مستقبل کی زندگی کے معاشی بحران کو دور کرنے میں معاون تو ہو سکتی ہیں لیکن ان کی زندگی آدابِ زندگی سے ہم آہنگ نہیں بناتی۔ ابراہم لنکن امریکہ کا ایک دوراندیش اور [illegible] صدر تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کے لیے دنیا کے سامنے تعلیم و تربیت کا جو طریقۂ کار رکھا ہے، وہ خاصے کی چیز ہے۔ ابراہم لنکن کے ان مقرر کردہ اصولوں کی روشنی میں اگر ہمارے بچوں کی تربیت کی جائے تو نہ صرف یہ کہ وہ اپنی ذاتی زندگی کی اصلاح کر سکتے ہیں، بلکہ اپنے سماج اور معاشرے کی تعمیر میں بھی نمایاں کارنامے انجام دے سکتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اساتذہ، والدین اور سماج کے دوسرے ذمہ داران ابراہم لنکن کے افکار و خیالات سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے اور آج کی بے مقصد تعلیم کو بامقصد بنانے کی کوشش کریں گے۔ (واقف)

دنیا! میرے لختِ جگر کو اپنے شفیق و مہربان ہاتھوں میں لے۔ کیوں کہ آج وہ گھر کی چہار دیواری سے نکل کر درسگاہ کی سمت روانہ ہو رہا ہے۔ اس کے لیے یقیناً یہ ایک نیا اور چونکا دینے والا ماحول ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس ماحول سے خود کو ہم آہنگ نہ کر سکے یا یہ ماحول اس کے لیے دل خوش کن ثابت نہ ہو۔ اس لیے اس کے تئیں نرمی و عطوفت کی کیفیت رکھنے کی

[illegible] اور عدل کا سلوک کرے

دنیا! تجھے پتا ہے کہ اب تک وہ میرے چھوٹے سے گھر کا بادشاہ رہا ہے۔ اس کے خیالات و محسوسات کو میں اپنی پلکوں پر جگہ دیتا تھا۔ لیکن اب اس کے سامنے ایک نئی دنیا ہے۔ نئے لوگ ہیں اور نئی آوازیں آج کی اس تاریخی صبح کو میرے لاڈلے نے زندگی کے میدان میں اپنا ننھا منا قدم رکھا ہے تو اسے خوش آمدید کہہ اور اس کی زندگی کی اس عظیم ترین مہم کو جو مستقبل قریب اپنے اندر جنگ و جدل، غم و اندوہ اور تکالیف و مصائب کو بھی سمیٹ لے گی، قوت بخش۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کو توانائی عطا کر دے اس مہم کو سر کر سکے۔

اس رنگ و بو کی دنیا میں زندگی کے اوقات بسر کرنے کے لیے گہرے عقائد، محکم یقین، لازوال محبت اور مردانہ ہمت و شجاعت کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ اور اے دنیا! مجھے یقین کامل ہے کہ تو میرے بیٹے کو ان اوصاف حمیدہ سے روشناس کرائے گی۔ تو اس کے کمزور و ناتواں ہاتھوں کو تھام اور اس وقت تک تھامے رہ جب تک وہ ان چیزوں کی اہمیت کو سمجھ کر انہیں اپنا نہ لے اس لیے کہ ابھی اس کے بھٹکنے کا شدید اندیشہ ہے۔ اے جہانِ رنگ و بو! تو میرے جگر پارے کو یہ تمام چیزیں سکھا لیکن ڈانٹ پھٹکار کے ساتھ نہیں، بلکہ پیار و محبت کے ساتھ اس لیے کہ تیرا پیار اور تیرا خلوص اس کے ذہن کو منظم کرے گا اور تیری ڈانٹ اور پھٹکار اس کے ذہن کو منتشر اور پراگندہ کر دے گی۔

دنیا! میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ میرا نورِ نظر

سب باتوں کو سیکھے گا اور ضرور سیکھے مگر تو اس سے ناامید نہ ہو۔ میں جانتا ہوں کہ دنیا کا ہر شخص ذہنی جسمانی طور پر یکساں نہیں ہوتا۔ یہاں پر مجھے دشمن ہیں اتنی ہی اس کی قسمیں۔ اور میں اس حقیقت سے بھی آگاہ ہوں کہ ہر فرد سچائی اور ایمانداری کی دولت سے سرفراز نہیں ہوتا۔ ایک طرف اگر سچائی ہے تو دوسری طرف جھوٹ اور بے ایمانی۔ لیکن دنیا! تو میرے لختِ جگر کو یہ سکھا کہ ہر بے اصول اور بے قاعدہ شخص کے پاس بھی ایک مثالی کردار ہوتا ہے ہر غیر ——— سیاست داں کے پاس بھی ایک انوکھی سچائی ——— اور مہربانی کر کے میری زندگی کے سرچشمے کو یہ بھی بتا کہ یہاں ہر دشمن کے ساتھ کوئی نہ کوئی دوست ہوتا ہے جو اس پر اپنا تن من نچھاور کرنے کو ہر وقت تیار رہتا ہے۔

دنیا! تو اس کے غیر پختہ ذہن میں یہ بات بٹھا دے کہ ستم پیشہ اور مردم آزار افراد کا مستقل زدو کوب اور فتنہ و فساد بہت آسان کام ہے اور ایسے لوگ قدر و قیمت کے اعتبار سے بہت ارزاں ہیں اور بعض اوقات ایسے لوگ حق اور راست بازی کے مقابلے میں بازی لے جاتے ہیں۔

دنیا! تو اس کے ذہن کو کتابوں کی طرف مبذول کر۔ اسے ہر معاملے کے نشیب و فراز کو سمجھنا اور اس پر غور و خوض کرنے کا موقع دے۔ دور آسمان میں پرواز کرتے ہوئے پرندوں، تیز دھوپ میں اڑنے والی شہد کی مکھیوں اور ہرے بھرے کہساروں کے خوشنما پھولوں کے رازوں کو سمجھنے کے لیے اس کے ذہن کو بیدار کر۔

اسے یہ سمجھا کہ زندگی کے میدان میں ناکام و نامراد رہنا۔ دوسروں کو دھوکہ اور فریب دینے سے بدرجہا بہتر اور باعث توقیر ہے۔ اسے سمجھا کہ وہ اپنے عقائد پر یقین محکم رکھے۔ لوگ اس کے افکار و خیالات کو غلط قرار دینے کی حتی الوسع کوشش کریں گے۔ لیکن وہ اپنے افکار و خیالات اور اپنے عقائد میں مضبوط چٹان کی مانند رہے۔

دنیا! تو میرے جگر گوشے کو ایسی توانائی اور قوت عطا کر کہ دنیا کی بھیڑ میں وہ اپنا وجود کھو نہ سکے اسے ایک ایسی جدت اور نئے پن سے ہمکنار کر کہ وہ لاکھوں اور کروڑوں میں پہچان لیا جائے اور سارے لوگوں کی نگاہیں اس کی طرف مرکوز ہو جائیں۔ اسے یہ بتا کہ وہ ہر کس و ناکس کی بات کو غور و انہماک سے سنے۔ لیکن سچائی کے پردہ میں صرف انھیں باتوں کی نمائش کرے جو اچھی اور بھلی ہیں اور ذہن انسانی کو سنوار اور نکھار سکتی ہیں۔

اسے سکھا کہ وہ اپنے جسم اور دماغ کو نیلام یا اونچی بولی پر فروخت کر دے۔ لیکن اپنے دل اور اپنی روح پر کوئی بن چلتا اور شاپچہ نہ رکھے سے سکھا کہ وہ اپنے کانوں کو عوام الناس کی آہ و کراہ سننے سے دور رکھے۔ اور اگر وہ خود کو صحیح اور با اصول سمجھتا ہے تو اپنے اصول اور ضابطۂ حیات کے تحفظ کے لیے مضبوط چٹان کی طرح اپنے مرکز پر کھڑا ہو جائے اور مخالف ہواؤں کا مقابلہ اس وقت تک کرتا رہے جب تک ان کا وجود باقی رہے۔ اسے یہ سمجھا کہ اس کی یہ جنگ اصول اور قاعدے کی جنگ ہو گی۔ جو کسی طرح غلط نہ ہوگی۔

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

اپنی محنت کی کمائی

ناوک حمزہ پوری

اے میری پیاری گڑیا!
ننھی منی سی گڑیا!
چپ چاپ یوں بیٹھی ہو کیوں؟
مجھ سے روٹھی پھولی ہو کیوں
چوں چوں چیں چیں کرتی ہو تم
صاف نہیں کچھ کہتی ہو تم
کیا کھاؤ گی؟ بولو بھی تو
پیو گی کیا؟ منہ کھولو بھی تو
آ جاؤ گڑیا رانی!
تمھیں پلاؤں گا میں پانی
تم نے کچھ سمجھا، جانا بھی
تمھیں کھلاؤں گا دانہ بھی
گدّے دار بنا دوں گا گھر
کیجیو آرام اس میں جی بھر
میں اک ننھی سی گڑیا
یہ کہتی ہوں منّے بھیّا
نہ میں راجا نہ میں رانی
لوں گی نہ آپ کا دانہ پانی
محتاجی کا آب و دانہ
کھانے سے اچھا مر جانا
اپنی ہی محنت کی کمائی
کھاتی ہوں میں ناوک بھائی

فرحت قمر

پرندوں کا جلسہ

ایک کوا کئی سال تک دلّی میں رہ آیا تھا دلّی سے وہ اس لیے اپنے گاؤں لوٹ آیا تھا کیونکہ وہاں کچھ لوگوں نے کوؤں کو پکڑ پکڑ کر بیچنا شروع کر دیا تھا۔ گاؤں کی کھلی ہوا تو اس کو اچھی لگتی تھی مگر یہاں شہر کی سی رونق اور شہر کے سے مزے کہاں؟ اس نے دلّی میں پارلیمنٹ کا اجلاس بھی دیکھا تھا اور بڑے بڑے جلسوں میں شرکت کی تھی۔ اس کو سیاست سے کچھ دلچسپی سی ہو گئی تھی اور یہی اسے بڑی اچھی لگتی تھی مگر آدمی کے ظلم کی وجہ سے اس کو وہ پیارا شہر چھوڑنا پڑا تھا، پھر کیوں نہ وہ آدمی سے ناراض ہوتا۔

گاؤں پہنچ کر اس نے سوچا لیڈری کی جائے۔ شہر میں رہنے کی وجہ سے اس کی بولی بھی کچھ سدھر گئی تھی اس لیے گاؤں کے سیدھے سادے پرندوں نے اس کو اپنے سے بہتر مان لیا تھا اور جب اس نے ایک جلسے کی تجویز رکھی تو سب خوشی سے راضی ہو گئے۔

گاؤں سے باہر ایک ویران سا باغ تھا۔ جلسے کے لیے وہی جگہ چنی گئی کیونکہ بہت سے پرندے تو پہلے ہی وہاں رہتے تھے کئی کوؤں نے کائیں کائیں کر کے جلسے کی تاریخ اور جلسے کا وقت آس پاس کے سب پرندوں کو بتا دیا اور ہر پرندے اس نئے تجربے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ کسی نے پتھر پر رگڑ رگڑ کر اپنی چونچ صاف کی تو کسی نے ندی میں غوطہ لگا لگا کر اپنے پر صاف کیے۔ اس طرح تیاریوں میں جلسے کا دن آ گیا۔

ننھے جگنو کو بھی پر والا جاندار ہونے کے ناطے پرندوں کے اس جلسے میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی لیکن وہ اپنے چھوٹے پن کی وجہ سے اس جلسے میں شرکت کرنے سے جھجک رہا تھا۔ اُسے نہ آدمی سے بیر تھا نہ سیاست سے دلچسپی تھی پھر بھی وہ جلسے کا تماشا ضرور دیکھنا چاہتا تھا اس لیے دھیرے دھیرے اڑتا ہوا وہ بھی باغ کی طرف چل پڑا۔

اس کو رکتے تھمتے جاتے ہوئے دیکھ کر چڑیا نے اس سے پوچھا: ”ننھے میاں کہاں چلے آج“

”جلسے میں جا رہا ہوں۔“ جگنو نے کہا۔

”اگر اس رفتار سے چلو گے تو جلسہ ختم ہونے تک ہی وہاں پہنچ پاؤ گے۔“ چڑیا نے مذاق کیا اور آگے

نکل گئی۔

پھر ایک توتا ! "ٹائیں ٹائیں ! کہاں جارہے ہو جگنو میاں۔"

"جلسے میں جارہا ہوں۔"

"کیا کروگے جلسے میں جاکر۔ کسی کے پیروں میں دب گئے تو مفت جان گنواؤگے۔" توتے نے کہا اور ٹائیں ٹائیں کرتا ہوا آگے نکل گیا۔

جگنو کو اپنے چھوٹے پن پر افسوس سا ہونے لگا۔ اس نے سوچا کاش میری رفتار کچھ تیز ہوتی اسکے دل میں تو آیا کہ جلسے میں نہ جائے لیکن ہمّت سے کام لیا ہاں اس بات سے اس کو واقعی افسوس ہوا کہ کئی پرندوں نے اس کا مذاق تو اُڑایا مگر ان سے یہ نہ ہوسکا کہ اسے اپنے پروں میں چھپا کر جلسہ گاہ لے جاتے۔ خیر وہ بھی جوں توں کر کے جلسہ گاہ میں پہنچ ہی گیا جلسہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ جگنو ایک پتّے پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔

پاس بیٹھی مرغی نے جگنو سے کہا، "ارے میاں کیڑے تم کیوں آئے بھلا؟"

"میں کیڑا نہیں، میرے پر ہیں میں پرندہ ہوں"

"یہ منہ اور مسور کی دال۔ پرندے تو میری طرح انڈے دیتے ہیں۔" مرغی نے طنز کیا

اب کی بار جگنو خاموش نہ رہا اور بولا "تم انڈے دیتی ہو تو میں روشنی دیتا ہوں۔

"کہاں ہے وہ روشنی؟" مرغی نے پھر طنزیہ لہجے میں پوچھا

"دیکھو!" جگنو نے کہا۔ اس نے اپنی چھوٹی سی لالٹین جلادی، لیکن دن کی روشنی میں مرغی کو روشنی دکھائی نہیں دی، اس نے نفرت سے کہا۔

"جھوٹا کہیں کا۔"

جگنو کو پھر سے اپنے چھوٹا ہونے کا احساس ہوا کیونکہ وہ بالکل اکیلا تھا۔ باقی تمام پرندے خوش تھے۔ چہچہا رہے تھے، باتیں کر رہے تھے اور گانا گا رہے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ جلسے کی کارروائی شروع ہوگئی۔ ورنہ شاید جگنو بددل ہوکر وہاں سے چلا ہی آتا۔

"حضرات!" شہری کوّا ایک درخت کی اونچی شاخ پر بیٹھا بول رہا تھا "جلسہ کوئی بھی ہو اس کے لیے ایک صدر کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے سب سے پہلے آپ کسی کو صدر چن لیں۔"

"آپ سے بہتر صدر کون ہوسکتا ہے" کبوتر نے کہا اور ٹائیں ٹائیں چیں چیں، چوں چوں کا شور مچ گیا۔ سب نے اس تجویز کی حمایت کی اور کوّے نے کہا "حضرات! آپ کا شکریہ کہ آپ نے میری عزت افزائی کی۔ آج کے جلسے کے متعلق تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ آدمی ہم سب کو بہت ستاتا ہے ہم کو مارتا ہے، پکڑتا ہے، بیچتا ہے، کھاتا ہے۔ ہمیں آج آدمی کے ظلم سے بچنے کی کوئی ترکیب ڈھونڈنی

ہے۔ اس لیے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ میں سے جو چاہے اسٹیج پر آکر اپنے خیالات کا اظہار کرے۔"

ایک کوّا اسٹیج پر آکر بولنے لگا: "بڑے تو بڑے، آدمی کے بچّے بھی ہمارے جانی دشمن ہیں۔ ہم کو طرح طرح سے ستاتے ہیں۔ ہم کو پتھر مارتے ہیں۔ ہمارے گھونسلے اجاڑتے ہیں۔"

چڑیا نے کہا کہ آدمی کے بچے اس کے انڈوں کو صحیح سالم نہیں رہنے دیتے۔

توتے نے کہا، "آدمی محض اپنی تفریح کے لیے اس کو قید میں رکھتا ہے۔"

جنگلی کبوتروں نے کہا، "آدمی ان کو کھانے کے لیے چھرّوں کا نشانہ بناتا ہے۔"

پالتو کبوتروں نے آدمی کی ذرا سی حمایت کی کہ وہ اُن کے لیے دانہ بھی تو پیدا کرتا ہے تو ایک چیل نے طنز کیا: "کیوں نہیں، یہ پالتو کبوتر اور مرغیاں آدمی کے پالتو غلام ہیں نا۔ آدمی ان کو مفت میں کھلاتا ہے نا۔"

"مفت میں کیوں؟" مرغی نے کُڑ کُڑ کُڑک کا زوردار نعرہ لگا کر کہا، "ہم اس کو انڈے چوزے نہیں دیتے کیا؟"

لیکن مرغی اور کبوتر کی بات سنی نہیں۔ جلسے میں سے "شرم شرم" کے نعروں کی آواز آنے لگی اور پھر شور اتنا بڑھا کہ صاحب صدر جناب کوّا جی نے بڑی مشکل سے پرندوں کو قابو میں کیا۔

جلسے کی کارروائی پھر سے شروع ہوئی۔ کئی اور پرندوں نے آدمی کی برائی کی مگر یہ کوئی نہ بتا سکا کہ آدمی کا علاج کیا کیا جائے۔ ہاں گدھ نے ایک خطرناک تجویز ضرور پیش کی کہ تمام آدمیوں کی آنکھیں پھوڑ دی جائیں۔ اس تجویز پر پرندے جوش میں آ گئے۔ کسی نے بازو پھڑپھڑائے تو کسی نے پنجے بجائے۔ یہ جوش ذرا سرد ہوا تو ایک اُلّو نے بڑی سنجیدگی سے پرندوں کی توجہ اس بندوق کی طرف دلائی جو انسان کے پاس ہوتی ہے اور جسے وہ اپنی آنکھوں پر حملہ ہونے کی صورت میں استعمال کر سکتا ہے۔

بندوق کی بات سن کر پرندوں کے دماغ سرد سے پڑ گئے اور سارے جلسے میں سنّاٹا سا چھا گیا۔ کافی دیر تک کوئی نہ بولا تو صاحب صدر نے پھر سے جلسے کی کارروائی شروع کرنے کے لیے کوئی بات کہنی چاہی مگر اسی وقت اُن کا دھیان مغرب کی طرف چلا گیا۔ مغربی افق پر اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ ایک زبردست آندھی آ رہی تھی

ایک آواز آئی: "جلسہ برخاست کیا جائے تاکہ سب اپنے اپنے محفوظ ٹھکانوں تک پہنچ جائیں۔"

لیکن صاحب صدر نے یہ تجویز یہ کہہ کر رد کر دی کہ آندھی بہت قریب آ چکی۔ بعد اس

طرح پرندے میں ہی اس کی زد میں آ سکتے ہیں انہوں
نے حکم دیا کہ آندھی کے دوران سب پرندے اپنی
اپنی جگہ خاموشی اور مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں۔ آندھی
گزر جانے کے بعد پھر جلسہ شروع ہوگا۔

لیکن آندھی بہت زوردار تھی اور ساتھ ہی
تھی زوردار بارش۔ شام کا وقت پہلے ہی ہو چکا
تھا اور جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا باغ سے
باہر رہنے والے پرندوں کی فکر بڑھتی جا رہی تھی کہ
وہ اندھیرے میں کس طرح اپنے آشیانوں تک پہنچیں
گے۔

آندھی کا زور کم ہوا، بارش رک گئی مگر ہر
طرف اندھیرا تھا۔

"اب ہم گھر کیسے جائیں؟" کئی پرندوں نے
زور سے آواز لگائی۔

"آج کی رات اسی باغ میں گزار دو۔" صاحب
صدر نے زور سے کہا۔

مگر پرندوں کو اپنے بچوں کی فکر تھی۔ طوفان
میں نہ جانے ان پر کیا بیتی ہوگی۔ وہ اپنے گھر
پہنچنے کے لیے بے تاب تھے۔ لیکن جاتے بھی تو کیسے!
سب پریشان تھے

"آئیے حضرات میں ہی راستے میں آپ سب
کو آپ کے ٹھکانوں تک پہنچا دوں۔" ایک ننھی
سی آواز آئی۔

اور سب نے دیکھا کہ ننھا جگنو اپنی تیز چمکیلی
لالٹین جلائے واقعی اس خدمت کے لیے تیار ہے۔

جن پرندوں نے جگنو کو حقیر سمجھا تھا وہ شرمندہ
تھے مگر کیا کرتے۔ ان کو بھی جگنو کی لالٹین کا سہارا
لینا پڑا۔ آدھی رات تک جگنو نے سب پرندوں کو ان
کے ٹھکانوں تک پہنچا دیا۔ وہ بالکل تھک چکا تھا
مگر اس کو خوشی تھی کہ چھوٹا ہونے کے باوجود بھی
اس نے دوسروں کی خدمت کی۔

جواب پرچہ عام معلومات

(۱) چینی
(۲) چوگیال
(۳) آغا خان پیلس، (پونا) میں
(۴) رن کچھ
(۵) فیض احمد فیض
(۶) کبوتر
(۷) کاربن ڈائی آکسائڈ
(۸) روس نے سونے کے ۱۴۰، چاندی کے ۳۴۳، کانسے کے ۲۵۰۔ کل ۷۳۳ تمغے۔
(۹) نیپال میں نئے کے حکام پر
(۱۰) مہدی حسن، گلوکاری
(۱۱) جموں اور کشمیر
(۱۲) غار حرا میں۔

خلیل الرحمٰن

محمود غزنوی

غزنی کی تاریخ میں سلطان محمود غزنوی کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔ وہ غزنی کے ان مایۂ ناز حکمرانوں میں سے تھے جنھوں نے تن من دھن سے ملک کی خدمت کی۔ ایک نڈر دلیر اور بہادری کی منہ بولتی تصویر، خلیق اور خوش مزاج حاکم۔ ان کے دورِ حکومت میں رعایا کو ہر طرح کا آرام میسر تھا۔ کسی کو سلطان سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ رعایا خوش اور مطمئن تھی۔

تخت نشینی کے بعد ہمیشہ ان کی یہ عادت رہی کہ رات کو شہر میں پھر کر رعایا کی دیکھ بھال کرتے جس کو غم یا تکلیف میں دیکھتے اس کی مدد کرتے۔

ایک دفعہ آپ رات کو گھر سے نکلے اور بھیس بدلے ہوئے تھے تھوڑی دیر گئے ہوں گے، دیکھا کہ ایک ویرانے میں چار آدمی بیٹھے آپس میں گفتگو کر رہے ہیں۔

محمود نے کڑک کر پوچھا "آپ کون ہیں؟"

بولے:۔ "ہم چور ہیں سرکاری خزانے لوٹنا چاہتے ہیں۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]"

کرو۔"

پہلا چور بولا:۔ "میں جانوروں کی بولیاں سمجھنے میں کامل دست گاہ رکھتا ہوں۔"

دوسرے نے عرض کیا:۔ "خدا نے مجھے ایسی قوت شامّہ عطا کی ہے کہ میں صرف سونگھ کر مخفی خزانے کی کھوج لگا سکتا ہوں۔"

تیسرے نے کہا:۔ "میں کھل جا سم سم کہہ کر بغیر چابی کے تالا کھول لیتا ہوں۔"

چوتھا بولا:۔ "میری بصارت بے بدل ہے، میں جس شخص کو اندھیری رات میں دیکھ لیتا ہوں اگر وہ لاکھوں میں کھو جائے تو میں اس کو بہ آسانی نکال سکتا ہوں۔"

سلطان نے چوروں سے اپنا تعارف یوں کرایا "اگر کسی مجرم کو پھانسی ملی ہو اور میں سر ہلا دوں تو فوراً اس کی جان بچ سکتی ہے۔"

یہ سن کر چوروں نے کہا:۔ "ہم کو بے حد خوشی ہوئی کہ چار سے پانچ ہو گئے۔ بزرگوں کا قول ہے کہ دوستوں کی کثرت سے بلائیں ٹل جاتی ہیں۔ سمجھدار لوگ کہتے ہیں کہ دوست ہزاروں ہوں کم ہیں مگر دشمن ایک بھی

تو کبھی بہت سمجھو۔"

محمود کی دل نواز شخصیت، خوش اخلاقی، ہوشیاری اور دل کش باتوں کا اثر چوروں کے دلوں پر ایسا ہوا کہ کوشش کر اس کو بھی اپنے ساتھ لے چلنے پر تیار کر لیا پھر پانچوں آدمی منزل مقصود کی طرف چل نکلے۔ راستے میں ایک کتا بھونکا

سلطان نے پوچھا :۔ "یہ کیا بکتا ہے۔"

پہلا چور بولا :۔ "کتا یہ کہتا ہے کہ اس ٹولی میں ایک بادشاہ بھی موجود ہے۔"

سلطان نے سنی ان سنی کر دی۔ جب چور شاہی خزانہ لوٹنے میں مصروف تھے، سلطان ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر چلے گئے۔

دوسرے دن شہر میں ہلڑ مچ گیا کہ شاہی خزانے میں چوری ہو گئی، سپاہی چوروں کو گرفتار کرنے بھیج دیئے گئے۔ نیز سلطان نے حکم دیا، "انہیں میرے روبرو مت لاؤ۔ انہیں موت کی سزا دی جائے گی مگر جب تک میں حکم نہ دوں ان کو قتل نہ کرنا۔"

چور آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے کہ ہمارا پانچواں رفیق کہاں ہے۔

پہلا چور بولا : "رات کتے نے خبر دی تھی، شاید وہی بادشاہ ہو۔"

چوتھا چور بولا :۔ "اگر وہ بادشاہ ہے تو میں ایک نظر میں پہچان لوں گا۔"

چور ... کو مقتل ... گر

ایک ڈاکو :۔ (جلاد سے) "موت کی سزا پانے سے پہلے میں ایک بات کی بھیک مانگتا ہوں۔"

جلاد :۔ "وہ کیا؟"

ڈاکو :۔ "مرنے سے پہلے میں ایک بار بادشاہ کا دیدار کرنا چاہتا ہوں۔"

جلاد :۔ "منظور ہے۔"

سلطان اسی وقت مقتل تشریف لے آئے۔ چوروں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی، مارے خوف کے ان کے دل تھرا رہے تھے۔

چوتھا چور آگے بڑھا اور اپنے ساتھیوں سے بولا :۔ "چہرے، مہرے، چال اور ڈھال سے مترشح ہوتا ہے کہ یہی وہ شخص ہے جو رات ہمیں جل دے کر چپکے سے کھسک گیا تھا۔"

دوسرے چور نے آگے بڑھ کر رحم اور مروت کے اس پیکر سے کہا :۔ "عالی جاہ! یہ کتنے ستم کی بات ہے کہ آپ کے خونی فیصلے کی ننگی تلواریں ہمارے سروں پر لٹک رہی ہیں اور آپ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ آپ کا سر معہود و وعدہ کیا گیا سر کب ملے گا۔"

سلطان نے اختیار مسکرا دیے اور چوروں کو رہا کر دیا۔

چوروں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک پڑے اور وہ دلی دعاؤں کا ڈھیر کا ڈھیر دے کر رخصت ہو گئے۔

دعوتِ عمل

محبوب راہی

روشنی بن کے نگاہوں میں سمائیں آؤ
ایک مقام اپنا ہر اک دل میں بنائیں آؤ

دوستو! خونِ جگر اپنا جلائیں آؤ
تیرگی صفحۂ ہستی سے مٹائیں آؤ

جا بجا پھول محبت کے کھلائیں آؤ
ریگزاروں کو چمن زار بنائیں آؤ

تفرقے اپنے پرائے کے مٹائیں آؤ
سب کو اپنائیں، گلے سب کو لگائیں آؤ

خوابِ غفلت سے زمانے کو جگائیں آؤ
ایک ترغیبِ عمل سب کو دلائیں آؤ

مدتوں بھول نہ پائیں ہمیں دنیا والے
نام کچھ ایسا زمانے میں کمائیں آؤ

یہ مصائب کی چٹانیں یہ غموں کے کہسار
راستے سے انھیں سب مل کے ہٹائیں آؤ

سانس لینے ہی کو جینا تو نہیں کہتے ہیں
طور جینے کے زمانے کو سکھائیں آؤ

حُسنِ تدبیر سے تقدیر سنور جاتی ہے
راز یہ زیست کا دنیا کو بتائیں آؤ

سب کی دنیا ہے برابر کے ہیں حقدار سبھی
ایسی تحریک جہاں بھر میں چلائیں آؤ

وہ غلامی کا سیہ دور تھا جو بیت گیا
جشنِ آزادیٔ انسان کا منائیں آؤ

حُسنِ تدبیر کی سوغات اسے پیش کریں
اپنی روٹھی ہوئی قسمت کو منائیں آؤ

مہر و اخلاص کی برسات جہاں میں کرکے
آتشِ بغض و عداوت کو بجھائیں آؤ

ایسا ہر کام جسے لوگ سمجھتے ہیں محال
عزمِ محکم سے وہی کر کے دکھائیں آؤ

روشنی علم کی پھیلا کے زمانے بھر میں
اب جہالت کے اندھیروں کو مٹائیں آؤ

ظلم پہ ٹوٹ پڑیں قہر کی آندھی بن کر
عدل کی دھاک زمانے پہ جمائیں آؤ

روشنی خاک کے ذرّوں کو عنایت کرکے
اپنی دھرتی کو ستاروں سے سجائیں آؤ

لوگ بوسیدہ روایات سے اوب اٹھے ہیں
انقلابات کے طوفان اُٹھائیں آؤ

اس ریا اور نمائش کے جہاں سے ہٹ کر
ایک دُنیائے خلوص اور بسائیں آؤ

گریہ و زاری تو مردوں کا نہیں ہے شیوہ
بوجھ آلام کا ہنس ہنس کے اٹھائیں آؤ

رہبروں کے رہیں محنت کشِ احساں کب تک
راہیؔ اب راستہ خود اپنا بنائیں آؤ—

غلام حیدر نقوی

میرے اُستاد

حسینی صاحب آرٹسٹ

میں اب تک اپنے کچھ ایسے استادوں کے بارے میں لکھ چکا ہوں جو کسی نہ کسی صورت میں میری اسکول کی تعلیم میں میرے استاد رہے تھے۔ اس سلسلے میں میں نے جو کچھ بیان کیا وہ یہ تھا کہ انھوں نے مجھے دنیا میں زندگی گزارنے، ذہن بنانے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنے اور میرے کردار کو بنانے میں میری کیا مدد کرنی چاہی۔ لیکن اب میں جن چند استادوں کے متعلق لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ وہ میری اسکول کی زندگی یا اس کے بعد کی تعلیمی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ہیں کچھ دن ان کے قریب رہا اور ان کی چند خصوصیتوں اور کردار کے کچھ مضبوط پہلوؤں نے میرے دماغ پر اثر کیا، بس میں اسی چیز کو بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

شاید ساتویں جماعت کا امتحان دے کر جب گھر گیا تو میرے بڑے بھائی قیصر نقوی صاحب نے بتلایا کہ اب کی بار ہم لوگ یہ چھٹیاں ایک دلچسپ اور کارآمد کام سیکھنے میں گزاریں گے۔ یہ تھا چپل بنانے کا کام۔ شروع شروع میں یہ بات کچھ عجیب سی لگی۔ ہم لوگوں کو چپل بنانے اور چمڑے کا کام سکھایا جائے گا۔

دہلی کے ایک محلے احاطہ کالے خاں میں مولانا عزیز الرحمن صاحب جامعی مرحوم سماجی کام اور تعلیم کا ایک مرکز چلا رہے تھے۔ انہی کے اس مرکز میں یہ کلاس شروع ہو رہی تھی۔ کچھ شوق اور کچھ حیرت کے ساتھ وہ دن آیا جب یہ کلاس شروع ہونے والی تھی۔ ہم جب اپنی جماعت میں پہنچے تو ہم نے کچھ عجیب منظر دیکھا۔ ہمارے ہم جماعتوں میں میرے اور میرے ایک ہم عمر دوست ممتاز کے علاوہ سارے لوگ بہت بڑے تھے۔ عمر میں بھی اور مرتبے اور حیثیتوں میں بھی۔ ہم نے اپنے دائیں، بائیں شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب مرحوم (جن کے متعلق اس سلسلے میں غالباً تیسرے مضمون میں لکھ چکا ہوں)، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم (ہندوستان کے سابق صدر) وغیرہ کو دیکھا۔ ان کو اپنی کلاس میں بیٹھا دیکھ کر کم سے کم یہ تو یقین ہو ہی گیا کہ چپل بنانا یا چمڑے کا

کام کوئی ایسا گرا ہوا کام نہیں ہے جس کے کرنے والے
کو ہم صرف نیچے درجے کا کام کرنے والا سمجھتے ہیں۔
اور پھر جب اس جماعت کے استاد کو دیکھا تو
حیرت کی حد نہ رہی۔ میلے کچیلے، پھٹے پرانے کپڑے پہنے
ایک موچی کی جگہ ایک انتہائی صاف ستھرے انسان
کو پایا۔ ہاتھ کے کتے کھادی کے سفید کرتے پاجامے میں
ملبوس کندھوں پر ایک چادر پڑی ہوئی لمبے لمبے بال
کانوں سے نیچے گردن تک جھولتے ہوئے، بھاری بھرکم جسم
سانولا چہرہ جس میں نرمی، محبت، شفقت، پوری طرح
جھلک رہی تھی۔ استاد جماعت میں داخل ہوگئے۔ ہم
سب لوگ کھڑے ہوگئے۔

ہمارے اس نئے استاد کا نام تھا حسینی صاحب
(مجھے اب تک بھی ان کا نام اس سے زیادہ معلوم نہیں
ہوسکا)۔ پہلی ہی بات جو ان کے منہ سے نکلی وہ یہ تھی
کہ میں نے اس کام کو صرف اس لیے چنا ہے کہ اسے
ہمارے ملک میں سب سے نیچے اور گھٹیا کاموں میں
سمجھا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے میں خود اپنے ذہن کی
تربیت اور تعلیم پوری کرنی چاہتا ہوں اور میرے
خیال میں مزدوری کی عزت اور نچلے درجے کے کاموں
کو احترام اور قدر کی نظر سے دیکھنے کے لیے یہی
تعریفوں اور تقریروں سے [illegible] کہیں اچھا اور
کامیاب طریقہ یہی ہے کہ آدمی وہ کام خود کرنے
لگے [illegible]
[illegible]

محبت ہوتی ہے اور اس کے کرنے والے کی تکلیفوں
پریشانیوں اور الجھنوں کا بھی احساس ہوتا ہے ہم
جب سردیوں میں تھوڑی سی دیر کپڑے دھوتے ہیں
تبھی ہمیں پتا چلتا ہے کہ اس غریب دھوبی پر کیا
گزرتی ہے جو پورے پورے دن ٹھنڈے پانی
میں کھڑا رہ کر ہمیں اُجلا رکھنے کے لیے تکلیف اٹھاتا
ہے اور اس کے بعد ہی ہم اس سے محبت کرنا
سیکھتے ہیں۔

حسینی صاحب کا میں کیسے شکریہ ادا کروں۔
انھوں نے مجھے صرف رانپی سے چمڑا کاٹنا اور ستلی
سے چند ٹانکے لگا لینا ہی نہیں سکھایا۔ گو کہ یہ کام
کبھی کبھی بڑے آڑے وقتوں میں کام آجاتے ہیں۔
انھوں نے سچ مچ میرے ذہن کی ایسی تربیت کی
کہ اس کے لیے شاید اور کوئی طریقہ ممکن نہیں تھا
اگر مثالیں دوں تو شاید خود اپنے منہ میاں مٹھو
بننے کا الزام مجھ پر لگ جائے گا۔ لیکن اتنی بات
ضرور کہوں گا کہ اب جب کسی مزدور سے کوئی کام
کرواتا ہوں تو کوشش کرتا ہوں کہ اگر میرے بس میں ہو تو اس کی مانگی
ہوئی اجرت سے کچھ زیادہ ہی اسے دے دوں۔

حسینی صاحب صرف چپل سازی ہی کے استاد
نہیں ہیں۔ یہ کام تو انھوں نے ایک مقصد کو سامنے
رکھ کر اٹھایا تھا۔ اصل میں یہ ایک آرٹسٹ ہیں
اپنے دل، دماغ، روح اور پورے وجود کے ساتھ
ایک بہت بڑے آرٹسٹ [illegible]

اس لیے میں اپنے قلم یا زبان کو ان کے آرٹ کے فن کی باریکیاں، اچھائیاں اور کمزوریاں گنانے کے لیے نہیں کھول سکتا۔ لیکن شکر کرتا ہوں کہ ایسی آنکھ یا ذہن قدرت نے ضرور دے دیا ہے کہ اچھی چیز اچھی لگے۔ میں نے اپنی زندگی میں خوب صورت تصویریں پہلی بار اسی آرٹسٹ کی دیکھی تھیں۔ اور پہلی بار یہ سبق بھی حاصل کیا تھا کہ آرٹ یا تصویریں بنانا صرف کسی چہرے کی ہو بہو تصویر بنا دینے، کسی خوب صورت سے منظر کو کاغذ پہ اتار دینے، یا اچھے اور خوب صورت رنگوں سے کسی خیالی منظر کو کھینچ دینے کا نام نہیں ہے۔ آرٹ اپنے دل اور دماغ کی گہرائیوں اور اپنے احساس اور جذبے کو تصویر کے ذریعے پیش کر دینے کا ایک ایسا ہی ذریعہ ہے جیسے قلم سے نظم یا مضمون لکھنا۔ ہر تصویر کے پیچھے اس کے بنانے والے کا احساس، ایک خیال اور جذبہ ہوتا ہے جسے وہ اپنی تصویر میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے، بالکل ایسے ہی جیسے میں اپنے خیالات کو اپنے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

حسین صاحب کی کچھ تصویریں دیکھنے کا ہی نہیں انھیں اچھی طرح سمجھنے کا بھی موقع ملا۔ انسان میرلی غریب گلیوں اور گندے جھونپڑوں میں رہنے والے انسان سے لے کر بڑے سے بڑے فلسفی انسان تک نے ان کے ہنر اور ان کے برش پر اثر کیا ہے۔

انھوں نے ایسے ایسے مشکل خیالوں، شعروں بلکہ پوری پوری نظموں کو اپنی تصویروں کے ذریعے اس طرح بنا کر پیش کیا ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہ تصویر اور وہ خیال دل اور دماغ پر نقش ہو گئے ہیں۔

انھوں نے اپنی زندگی کو ملک میں فرقہ وارانہ اتحاد اور ایکتا کے لیے وقف کر دیا ہے۔ بلکہ یہ جذبہ اب صرف ایک ملک کے فرقوں اور مذہبوں کی حدوں سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ اب ان کے نزدیک پوری دنیا میں ہر ملک، مذہب، قوم اور نسل کے لوگ ایک ہی خاندان یا ایک گھر کے لوگ ہیں۔ اس مضمون یا خیال پر انھوں نے بڑی بڑی خوب صورت تصویریں بنائی ہیں بلکہ شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ اب تو پچھلے پچیس تیس سال سے ان کا پورا فن اور آرٹ صرف اسی مقصد کے اظہار اور پرچار کا ایک ذریعہ ہو گیا ہے۔

ان کی کچھ تصویروں اور ان کے مرکزی خیال سے گاندھی جی اور جواہر لال نہرو اتنے خوش ہوئے تھے کہ انھوں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار حسینی صاحب سے اپنے خطوں میں بھی کیا تھا۔

جامعہ میں آتے ہی یہ یہاں کچھ ایسے گھل مل گئے کہ جیسے وہ بہت پہلے سے اسی کا ایک حصہ تھے۔ جلدی ہی انھیں اپنے اسی سفید کھادی کے لباس اور کندھوں پر پڑی چادر کے ساتھ جامعہ نگر کے آس پاس کے گاؤں میں سماجی کام اور ان [illegible] تعلیم میں مصروف کیا جانے [illegible] پھر کئی سال [illegible]

انجام دینے کے بعد اپنی ذاتی مجبوریوں کی وجہ سے اپنے وطن اورنگ آباد واپس لوٹ گئے، لیکن اپنے جاننے والوں کے حلقے پر ان کی شخصیت [illegible] آج بھی جو لوگ انھیں جانتے ہیں، عزت و احترام کے ساتھ ان کا نام لیتے ہیں۔

بیس اکیس سال بعد ابھی پچھلے نومبر کے مہینے میں میرا اورنگ آباد جانے کا ارادہ ہوا۔ 'اجنتا' اور 'ایلورا' کے غار دیکھنے کے لیے۔ اورنگ آباد کا نام ذہن میں آتے ہی حسینی صاحب یاد آئے میں نے ایک صاحب سے پتا معلوم کیا تو انھوں نے کہا کہ گھر کا پتہ دینے کی ضرورت نہیں ہے صرف اورنگ آباد اور شاہ بازار کافی ہے۔ تھوڑی سی حیرت ضرور ہوئی۔

اورنگ آباد پہنچتے ہی بس اسٹینڈ پر صبح ۶ بجے ناشتے کے لیے ایک پھیری والے سے کیلے خریدتے ہوئے میں نے شاہ بازار کے متعلق پوچھا تو اس نے مجھ سے یہ معلوم کیا کہ مجھے کہاں جانا ہے ممکن ہے اس نے کچھ اندازہ میرے کھدر کے کرتے، پاجامے، واسکٹ اور چہرے پر بالوں سے لگایا ہو۔ میں نے بتلایا کہ مجھے حسینی صاحب آرٹسٹ کے یہاں جانا ہے۔ اس نے مجھے بتلایا کہ اب شاہ بازار [illegible] نام [illegible] تو لوگ مجھے شاہ آباد دکان کا پتا بتا دیں گے۔

پھر اسی طرح ایک ہوٹل کے بیرے سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی انھیں جانتا ہے۔ اب میں حیران [illegible] اتنی کہ [illegible] ان کی شہرت۔

شام کو اجنتا کے غار دیکھنے کے بعد جب میں ان کا گھر تلاش کرنے کا ارادہ کیا تو کچھ اتنی ہی آسانی سے وہاں پہنچ گیا جیسے میں اس گھر کو پہلے سے ہی جانتا تھا، صرف وقتی طور پر بھول گیا تھا۔ [illegible] جھٹکا لگا صرف اس وقت جب میں ایک [illegible] دیوار میں ایک پرانے اور کافی حد تک [illegible] مکان کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا اور یقین نہیں ہو رہا تھا کہ یہ ایک اتنے بڑے فنکار کا ہی گھر ہوگا۔ اگلے دو دن میں یہیں رہا۔ ان کی بنائی ہوئی تصویروں کی خوبصورتی پھولوں کی جھاڑیوں، بیلوں اور پیڑوں کے قدرتی حسن کو چھوڑ کر حسینی صاحب کا گھر [illegible] کے گھر سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ دیواروں کے کچھ حصوں پر تصویریں بنی ہوئی تھیں صرف وہیں کا پلاستر بالکل صحیح تھا، بہت سی وہ تصویریں جو بیس پچیس سال پہلے بنی تھیں انھیں بارش کے پانی اور سیلن نے خراب کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک بڑا کمرہ ان کا اسٹوڈیو بھی ہے، تصویروں کا گودام بھی ہے جہاں غار بھی ہے یا جو چاہیے آپ نام دیجیے۔ اس کی بغل میں ایک چھوٹا سا رہائشی کمرہ ہے [illegible] کے [illegible] سیں جنھیں میں اندر سے نہیں دیکھ سکا کیونکہ آج کا دن تھے مگر میں شاید یہ کچھ بہتر حال میں ہوں۔

اور یہ فقیر آرٹسٹ اپنے دل میں ایک [illegible] تھا، محبت اور بھائی چارے اور اخلاق [illegible] کی ایک [illegible] لیے اسی گھر میں [illegible]

لگتا رہا ہے۔

گفتگو کے دوران جب میں نے ایک بار کہا کہ حسینی صاحب، آپ کے ذہن کو ایک ہی موضوع یا ایک ہی خیال نے بہت سختی سے جکڑ رکھا ہے جس کا اثر آپ کی تمام تصویروں میں جھلکتا ہے تو انھوں نے اس کا جو جواب دیا وہ میرے دل و دماغ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نقش ہو گیا ہے۔ کہنے لگے:

"جب میں کچھ بنانے کے لیے برش اٹھاتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میرے چاروں طرف ننگے بھوکے جسموں، سوکھے ہاتھ پیروں اور مرجھائی ہوئی آنکھوں کی ایک بھیڑ سی لگی ہوئی ہے اور ان میں سے ہر ایک میرے برش کو پکڑ کر کہتا ہے کہ تم میری تصویر بناؤ۔ بتاؤ، میں اس بھیڑ سے کیسے الگ ہو سکتا ہوں! یہ میرے بھائی ہیں، بہنیں ہیں، مائیں ہیں، یہی میرے سب کچھ ہیں۔"

رہتے بھی ایسی بستی میں ہیں جہاں آس پاس غریبوں کی آبادی ہے۔ شہر کے بڑے لوگ بھی انھیں خوب جانتے ہیں۔ مگر حقیقی محبت شہر کا غریب طبقہ کرتا ہے میرے خیال میں شاید ہی کسی اور کا طبقہ نہ کرتا ہو۔ اس کی مثال ان کے ساتھ میرے ڈیڑھ دن کے قیام میں ہی نظر آگئی۔ اورنگ آباد میں ایک دل چسپ کھیل یا تماشا ہوتا ہے جس کی مثال نہ میں نے کہیں اور دیکھی ہے نہ سنی ہے۔ یہ ہے بھینسوں کی دوڑ۔ یہ ایک عجیب دل چسپ میلا ہوتا ہے جس میں شہر کی بھینسیں دوڑتی ہیں اور عرف گھوسی جن کو پالتے ہیں۔

میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ انھیں بلانے چلے آرہے ہیں اور وہ انھیں یہ کہہ کر واپس لوٹا دیتے ہیں کہ ایک مہمان دہلی سے ان کے یہاں ٹھہرے ہیں۔ آخر میں میں نے خود ہی حسینی صاحب سے کہا کہ وہ میری وجہ سے اپنا کوئی پروگرام ملتوی نہ کریں۔ پھر کچھ لوگ بھی آکر ان سے ضد کرنے لگے۔ ان کا وہاں پہنچنا بہت ضروری تھا۔ میں ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میلا تو خیر دل چسپ تھا ہی، جس کے متعلق کبھی پھر لکھنے کا ارادہ بھی ہے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ابھی کچھ دن پہلے جس شخص کو اس کی ایک تصویر پر پچاس ہزار روپے ملے ہوں، ملک کے بڑے بڑے لیڈر جس کے فن کی قدر کرتے ہوں، اسے شہر کا ہر گھوسی بھی اتنی ہی اچھی طرح جانتا ہے اور محبت کرتا ہے جیسے یہ انھیں کے سماج کا ایک فرد ہو۔ حقیقت میں ان کی برادری کی یکتا اور محبت کا یہ جذبہ آسانی سے حاصل نہیں ہوتا۔

کچھ ایسی ہی محبت، شفقت اور اپنائیت سے پیش آئے کہ مجھے خود افسوس رہا کہ میں صرف دو دن کے لیے ہی ان کے پاس ٹھہرا اور زیادہ دن کیوں نہ رہا۔ شہر کے کچھ دوسرے لوگوں سے ملاقات کی اور ایک تاثر اپنے ذہن پر چھوڑا۔

دل میں آہٹ اور [illegible] اس کو پھیلانے کے جذبے کا یہ حال ہے کہ ایک تصویر پر پچاس ہزار روپیہ ملا تھا، [illegible]

قادرہ کی حاضر جوابی

مصری کہانی نمبر (۱)

قدیم زمانے میں شہر قاہرہ کا حکمران ایک نوجوان شہزادہ تھا۔ وہ ایک عالی شان محل میں رہتا تھا۔ اس محل کے قریب ایک سبزی بیچنے والا بھی رہتا تھا۔ اس کے تین لڑکیاں تھیں۔ ان کا نام فاطمہ، فوزیہ اور قادرہ تھا۔ یہ سبھی صورت شکل کی اچھی تھیں لیکن سب سے چھوٹی لڑکی قادرہ کی کچھ اور ہی بات تھی۔ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ سب سے زیادہ چالاک اور ہوشیار بھی تھی۔

لڑکیوں کا باپ خوش حال تھا۔ اس کا نام علی تھا۔ ان کے کھیت دریائے نیل کے کنارے کنارے پھیلے ہوئے تھے۔ مٹی زرخیز تھی۔ اسی لیے سویابین کی فصل نہایت اچھی ہوتی تھی۔ ہر سال موسم بہار میں نیل میں سیلاب آتا اور جب اس کا پانی اتر جاتا تھا تو زرخیز مٹی کی ایک نئی تہہ بچھ جاتی تھی۔ اس طرح علی خوش قسمت تھا اور سویابین کی فصل کو اگا کر قاہرہ کے بازار میں [illegible] منہ مانگے دام پاتا۔ علی کا مکان بھی [illegible] شہزادے کے محل سے متصل تھا۔

شہزادہ نوجوان تھا۔ حکومت کے داؤ پیچ سے ابھی وہ پوری طرح واقف نہیں تھا یا یوں سمجھیے کہ حکومت چلانا اسے ٹھیک سے نہیں آتا تھا۔ بعض کہتے کہ وہ گھمنڈی تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے آپ کو وہ بڑا اونچا انسان سمجھتا تھا۔ تکبر کی آن سے وہ بھرپور تھا۔ اگرچہ وہ خوبرو بھی تھا اور جب وہ ریشم کے قیمتی کپڑے پہنتا اور ان میں ہیرے جواہرات جڑے ہوتے تو وہ اسے زیب دیتے۔ اس کی پگڑی بھی بھلی معلوم ہوتی تھی اور تلوار چم چم کرتی تھی۔ قاہرہ کی سب ہی لڑکے لڑکیاں اس سے باتیں کرنے کو ترستے۔ شہزادے کا حلیہ ہی بڑی کشش رکھتا تھا۔ اس کی کالی آنکھیں، نرم ریشمی کالے بال اور اس کی گھونگھریالی داڑھی ان سب کا کیا کہنا!

کبھی کبھی شہزادہ اپنی محل کی زندگی سے تنگ آجاتا۔ عیش و عشرت و شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ سے اسے کچھ کوفت محسوس ہوتی۔ وہ چاہتا تھا کہ باہر جا کر دیکھے کہ شہر میں لوگ کیسے رہتے ہیں۔ لیکن آداب و روایات سے وہ مجبور تھا۔ آنا ممنوع تھا کیونکہ ہر [illegible]

سے پھاٹک کی کھڑکی کے پاس آکر بیٹھ جاتا اور آنے
جانے والوں کو دیکھتا رہتا۔ اونٹ لادے پھندے
گزرتے۔ قلی سروں پر سامان لے جاتے نظر آتے
لوگوں کا ایک تانتا بندھا رہتا۔ لڑکیاں جو قبیر ہو تیں
کے منہ میں اس کی طرف دیکھتیں اور مسکراتیں۔

ہر روز صبح سویرے نوجوان شہزادہ علی کی
لڑکیوں کو ڈھونڈتا۔ پھر جو وہاں سے گزرتی تو
اس کی آنکھیں ان لڑکیوں کو تلاش کرتیں اتفاق
کی بات کہ یہ لڑکیاں صبح بل بوٹے گل بوٹے اور نقش
و نگار کے سبق سیکھنے کے لیے ادھر سے گزرتیں۔
ان کے چہرے ایک نیلے رنگ کے نقاب سے ڈھکے ہوتے
نقاب میں سے صاف دکھائی دیتا کہ وہ کتنی دیدہ زیب
ہیں۔ ان کی آنکھیں بڑی اور کٹورے کے مانند
ہیں جنہیں دیکھتے ہی شہزادہ کھل اٹھتا اور کہتا: علی
کی لڑکیوں! تم سب کو سلام۔"

بڑی لڑکی ماطمہ بڑھ کر سلام کا جواب دیتے ہوئے
کہتی :- "شہزادے، وعلیکم السلام، خدا تمہاری عمر
دراز کرے۔"

منجھلی لڑکی نوزیہ بھی کہتی "وعلیکم السلام" لیکن
قادرہ ایک طرف مڑ جاتی اور خاموش رہتی۔ شاید
اسے شہزادے کا تکبر پسند نہیں تھا۔ اگر شہزادہ گھمنڈی
تھا تو وہ بھی کم گھمنڈی نہیں تھی۔ بہرحال ممکن ہے کوئی
بات اور ہو لیکن یہ طے ہے کہ قادرہ کبھی اس کے سلام
کا جواب نہیں دیتی تھی۔

قادرہ کا یہ روکھا پھیکا انداز شہزادے کو پسند نہیں
تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی جوان لڑکی اس سے
اس طرح پیش آئے۔ [illegible] ہو کر وہ قادرہ کو اپنی
طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا۔
"قادرہ اس سال تمہارے باپ کی فصل کیسی ہوئی
ہے۔"
"تم جیسے بڑے آدمی اور شہزادے کو بھلا اس
سے کیا سروکار۔" قادرہ پلٹ کر کہتی۔
یہ بے باکی دیکھ کر شہزادہ قادرہ کو گھور کر رہ جاتا۔
ظاہر ہے کہ قادرہ کوئی ایسی ویسی لڑکی تو تھی نہیں۔
وہ چنچل ہونے کے ساتھ ساتھ بہت خوب صورت تھی
بلکہ آن دنوں شہر میں اس کا بڑا چرچا تھا اور وہ
ملکۂ حسن کے نام سے مشہور تھی۔
مصر میں بڑی بوڑھیوں کی کہاوت ہے کہ مرد ہمیشہ
ایسی چیز کو تلاش کرتا ہے جو اس سے دور بھاگتی
ہے۔ اس طرح شہزادہ قادرہ کے جتنی قریب آنے
کی کوشش کرتا وہ اپنا دامن جھاڑ کر صاف بچ نکلتی
شہزادہ عجیب مخمصے میں گرفتار۔ ادھر قادرہ کے
چرچے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ خوب صورتی کے ساتھ
ساتھ لوگ اس کے اخلاق کی بھی بہت تعریف
کرتے۔
شہزادہ برابر کشمکش و رنج میں مبتلا رہتا اس کو یہ
فکر تھی کہ آخر قادرہ اس کے سلام کا جواب کیوں نہیں

بہت دنوں تک ادھیڑبن میں مبتلا رہنے اور انتہائی کوشش کے باوجود جب وہ اس کو [illegible] طرف متوجہ نہ کر سکا تو اسے بہت غصہ آیا۔ اس نے سوچا کہ اسے کوئی سزا دینی چاہیے اور اس کے باپ کو بلانا چاہیے۔

علی کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا۔ طیش کھاتے ہوئے شہزادے نے اس سے کہا:۔

"تمہاری لڑکی وحشی ہے اور چونکہ تم اس کے باپ ہو اس لیے تمہیں اس کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ کان کھول کر سن لو۔ تین دن کے بعد تم کو محل میں پھر آنا ہے لیکن یاد رکھو کہ جیسے ہی تم داخل ہو گے تمہیں ایک ساتھ ہنسنا بھی پڑے گا اور رونا بھی۔ اگر تم ایسا نہیں کر پاؤ گے تو تمہارا مال ضبط ہو جائے گا اور سارے کا سارا خزانے میں داخل کر لیا جائے گا۔"

علی جب گھر لوٹا تو بڑا متفکر کہ اب کیا ہوگا۔ اپنے باپ کا چہرہ دیکھتے ہی قادرہ بھانپ گئی۔ اس نے پوچھا:۔

"والد محترم! آپ غمگین کیوں ہیں؟"

علی نے جواب دیا:۔ "غمگین ہونے کی بات ہی ہے بیٹا! تین دن بعد مجھ کو محل میں حاضر ہونا ہے اور اسی وقت ہنسنا بھی پڑے گا اور رونا بھی۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے! ورنہ تو ہماری ساری جائداد ضبط ہو جائے گی۔"

[illegible]

"اس کا حل بہت آسان ہے۔ پیاز کی ایک گٹھی لیجیے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر لیجیے۔ جب محل میں جائیے تو پیاز کے ٹکڑوں کو ناک کے نیچے چھپا کر رکھ لیجیے۔ شہزادے کے دیکھنے سے پہلے پیاز کا رس آنکھ پر رگڑ لیجیے پھر خود ہی آنسوؤں کی دھار بہہ نکلے گی۔ اس کے بعد شہزادے کو دیکھ کر قہقہہ لگایئے۔ اُدھر آنسو کی دھار نکلے گی اِدھر قہقہہ لگایئے گا۔"

تین دن بعد سوداگر بیچنے والا محل میں حاضر ہوا شہزادے کو دیکھتے ہی اس نے قہقہہ لگانا اور رونا شروع کر دیا اس لیے کہ پیاز کا رس لگانے سے اس کی دونوں آنکھوں سے پانی کی دھار اس طرح بہہ رہی تھی گویا کہ موسم بہار میں ندی نالے پھوٹ پڑے ہوں۔

شہزادہ حیران اور سمجھنے سے قاصر کہ آخر یہ علی کو ترکیب سوجھی کیسے؟ اس نے سوچا ہو نہ ہو یہ قادرہ کی حرکت ہے اسی نے اپنے باپ کو یہ ترکیب بتائی ہوگی۔ لیکن شہزادہ بہرحال شہزادہ تھا وہ شکست ماننے والا کہاں! اس نے علی سے کہا:۔

"دوسرا حکم یہ ہے کہ تین دن کے بعد تمہیں پھر یہاں آنا ہے لیکن یاد رکھو کہ جب تم میرے سامنے آؤ گے تو ایک ہی وقت میں تم کو ننگا بھی ہونا پڑے گا اور کپڑوں میں ملبوس بھی۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو ہم تمہیں قید خانے میں بند کرا دیں گے۔"

علی جب گھر لوٹا تو اس نے اپنی لڑکی سے کہا:۔ "اب تو خدا نگہبان ہے شہزادے نے [illegible]

حکم دیا ہے کہ بیک وقت تم کو ننگا ہونا ہے اور کپڑوں میں ملبوس بھی ہونا ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"
چھوٹی لڑکی نے باپ کے بازو کو تھپتھپاتے ہوئے کہا:۔
"یہ تو بہت آسان ہے آپ ایسا کیجیے کہ فوراً ہی دریائے نیل کے کنارے چلے جائیے اور کسی مچھیرے سے ایک بڑا سا جال خرید لائیے اس جال سے میں آپ کے لیے ایک بڑا سا لبادہ (گاؤن) بنا دوں گی جسے پہن کر سر سے پیر تک آپ اپنے کو ڈھک لیں گے۔ اس طرح لباس میں آپ ملبوس ہو جائیں گے اور ننگے ہی نظر آئیں گے اس لیے کہ جال کے سوراخوں سے جسم صاف دکھائی دے گا۔"
اس طرح گھمنڈی شہزادے کو ایک بار پھر شکست ہوئی۔ اس نے سوچا :۔ "یقیناً یہ اُسی کی حرکت ہے اور وہی اپنے باپ کو سکھا پڑھا کر بھیجتی ہے۔ واقعی وہ کتنی چالاک ہے مطلب یہ ہے کہ وہ جتنی خوب صورت ہے اتنی عقلمند بھی ہے۔ کاش کہ میری اس سے شادی ہو جائے"
اس کے بعد اس نے کہا:۔
"اے سبزی بیچنے والے! آخر تمہاری لڑکی میرا کب تک مذاق اڑاتی رہے گی۔ اچھا اب تیسرا حکم سنو۔ اب کی بار وہ بھی تمہاری مدد نہیں کر پائے گی۔۔
حکم یہ ہے تین دن کے بعد تم دربار میں

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

رؤف انجم

جشنِ جمہوریت

جشنِ جمہوریت منانا ہے
گیت انسانیت کے گانا ہے
امن اور آشتی، صلح جوئی
اک جہاں کو سبق پڑھانا ہے
اپنے آپس کے سارے جھگڑوں کو
صفحۂ ہند سے مٹانا ہے
دوستو مشعلِ اخوت سے
سارے عالم کو جگمگانا ہے
مادرِ ہند کی بقا کے لیے
بھینٹ اپنا لہو چڑھانا ہے
بیکس و بے نوا ملے کوئی
اس کو بڑھ کر گلے لگانا ہے
علم کی شمع ہاتھ میں لے کر
ہم کو شانِ وطن بڑھانا ہے
خدمتِ خلق کی لگن لے کر
کام اچھے بڑوں کے آنا ہے
پیڑ تخریب کے جلا ڈالو
فصل تعمیر کی اگانا ہے
اپنے کردار کی بلندی سے
[illegible]

تیرہ برس کا تھا۔ یہ وہی سکندر تھا جو آگے چل کر سکندر
اعظم کے نام سے مشہور ہوا۔ سکندر کا اتالیق مقرر
ہونے کے بعد ارسطو نے سائنس پر مزید تحقیق کا کام شروع کیا
اس نے سات سال تک سکندر کو پڑھایا اور اس
کے بعد ایتھنز میں اپالو میں عبادت گاہ کے ساتھ اپنی
درس گاہ کھولی جہاں اس نے نوجوانوں کو علم و حکمت
کے درس دینا شروع کیے۔ ارسطو کی عادت تھی کہ جب
وہ پڑھایا کرتا تو ٹہلتا جاتا اور بولتا جاتا۔ اس کے
شاگرد بھی اس کے ساتھ ٹہلتے اور ساتھ ساتھ
مشکل سوالوں کے جواب پوچھتے جاتے۔ ارسطو کے
اس طریقۂ تعلیم کو "پیری پیٹیٹک" کا نام دیا گیا یعنی
ٹہلنے والا۔

جب تک سکندر زندہ رہا۔ ارسطو ایتھنز میں
لوگوں کو تعلیم دیتا رہا۔ دنیا کے کونے کونے سے طلبہ
اس کے پاس آتے تھے۔ سکندر کی موت کے بعد
ایتھنز کے لوگوں نے مقدونیہ کے خلاف بغاوت
کر کے اپنی حکومت قائم کر لی۔ ارسطو چونکہ سکندر
کا معلم رہ چکا تھا اس لیے ایتھنز والے اسے بری
نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ ارسطو نے اپنی یونیورسٹی
بند کر دی اور ایوبیا کے جزیرے میں سکونت پذیر ہو
گیا۔ جہاں ایک ہی سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔
مورخوں کے مطابق ارسطو نے تقریباً بارہ سو
کتابیں لکھیں۔ لیکن آج اس کی لکھی ہوئی صرف ۴۷ کتابیں
موجود ہیں اور اصحاب علم و فن کے لیے مشعل۔ —

سرور جمال

سفید چوہا

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بڑے گودام کے بل میں دو چوہے رہتے تھے۔ کھانے کو خوب ملتا تھا اس لیے بڑے عیش و آرام سے گزر ہو رہی تھی۔ لیکن ایک دن خالہ بلّی کی نظر اُن پر پڑ گئی۔ ایسے موٹے تازے چوہے دیکھ کر اُن کا حال بُرا ہو گیا۔ موقع پا کر ایک بار جو جھپٹی تو بھورا چوہا اُن کے ہاتھ آگیا۔ سفید چوہا سخت گھبرایا اور اپنے دوست کی جان بچانے کی فکر کرنے لگا۔ اپنی جان ہتھیلی پہ رکھ کر وہ بلّی کے پاس گیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا:۔

"خالہ بلّی! میرے دوست کو چھوڑ دو، میں تمہارا بہت احسان مانوں گا۔"

بلّی بولی:۔ "احسان سے پیٹ تو بھرتا نہیں۔ میں اگر اسے چھوڑ دوں تو خود بھوکی رہ جاؤں گی۔ ہاں اگر تو میرے لیے تھوڑا دودھ لا دے تو میں تیرے دوست کو چھوڑ دوں۔"

سفید چوہا بھاگا بھاگا گائے کے پاس

"اے مہربان گائے مجھے تھوڑا سا دودھ چاہیے تاکہ میں اُسے بلّی کو دوں۔ خالہ بلّی دودھ پا کر میرے دوست کو چھوڑ دے گی۔"

گائے بولی:۔ "میرے ننھے دوست! میں خود بھوکی ہوں۔ دودھ کہاں سے دوں۔ ہاں اگر تو میرے لیے کچھ گھاس لا دے تو میں تجھے کچھ دودھ دے سکتی ہوں۔"

سفید چوہا دوڑا دوڑا کسان کے پاس گیا اور بڑی منت بھری آواز میں بولا:۔ "اے کھیتوں کے مالک! مجھے تھوڑی گھاس چاہیے۔ میں گھاس گائے کو دوں گا۔ گائے مجھے دودھ دے گی۔ دودھ میں خالہ بلّی کو دوں گا تو وہ میرے دوست بھورے چوہے کو چھوڑ دے گی۔"

کسان بولا:۔ "بہادر چوہے! میں تمہیں گھاس کیسے دوں! میرے کھیت تو خود سوکھ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ میرے یہاں شکر بھی نہیں ہے۔ ہاں اگر تو کہیں سے مجھے شکر لا دے تو میں تجھے گھاس دے سکتا ہوں۔"

سفید چوہا یہ سن کر بنیے کے پاس سرپٹ بھاگا،
اور اس کی دکان پر جا کر دم لیا۔
"مہاراج! مجھے تھوڑی شکر چاہیے۔ شکر
میں کسان کو دوں گا۔ کسان مجھے گھاس دے گا۔
گھاس میں گائے کو دوں گا۔ گائے مجھے دودھ دے گی۔
دودھ خالہ بلی پیے گی تب میرے دوست کو چھوڑ
دے گی۔"

بنیا بولا:- "شکر تو میرے پاس ہر قسم کی
ہے۔ لیکن، دکان میں چوہے بہت ہو گئے ہیں اگر
تم ان چوہوں کو میری، دکان سے بھگا دو تو
میں تمہیں بہترین قسم کی خالص شکر دوں۔" چوہا
فوراً دوکان کے اندر گیا۔ بلوں سے تمام چوہوں
کو اکٹھا کیا اور بولا:-

"بھائیو اور بہنو! تم اس چھوٹی سی دوکان
میں ناحق اتنی تکلیف اٹھا رہے ہو۔ اگر میرے
ساتھ چلو تو میں تمہیں ایک بڑے گودام کا پتا
بتا دوں جہاں تم کھانے ہی کھانے ہیں۔"

چوہے یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور بلوں
سے چھوٹے چوہے، بڑے چوہے، موٹے چوہے
اور دبلے چوہے، کالے چوہے اور گورے چوہے
سب کے سب سفید چوہے کے بتائے ہوئے
پیچھے دوڑ پڑے۔

بنیے نے خوش ہو کر سفید چوہے کو ڈھیری
شکر دی۔ وہ شکر لے کر کسان کے پاس گیا
اس نے فوراً گھاس کا ایک گٹھر دے دیا۔ سفید چوہا
اسے لڑھکاتا ہوا گائے کے پاس لے گیا۔ گائے
اتنی ساری ہری ہری گھاس دیکھ کر بہت خوش
ہوئی اور اسے خوب دودھ دیا۔ خالہ بلی کو جب
اس نے اتنا زیادہ اور میٹھا میٹھا دودھ دیا تو
خوش ہو کر اس نے فوراً بھورے چوہے کو آزاد کر دیا۔

دونوں دوست ناچتے گاتے اپنے بل میں
چلے گئے اور بقیہ زندگی آرام و چین سے گزار دی۔

بقیہ صفحہ ۸

دنیا تو میرے نور نظر کو نرمی اور رحم دلی کے ساتھ
سکھا۔ لیکن میں تجھ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ اس
کی ناز برداری ہرگز نہ کر۔ ناز برداری اس کے حق میں
مفید نہ ہوگی۔ آگ کی بھڑکتی ہوئی تپش سے ہی لوہا
فولاد میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

دنیا! مجھے اس امر کا احساس ہے کہ میں نے
اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کے لیے تیرے سامنے ایک
طویل حکم نامہ رکھا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ تو اس
حکم نامہ کو کہاں تک پایۂ تکمیل کو پہنچا سکتی ہے —
دھیان رکھ میرا لاڈلا چھوٹا، بڑا فرشتہ صفت اور
بھولا بھالا ہے۔

عقل مند کسان

روسی لوک کہانی

... رہتا تھا۔ ایک دن جب اس کے گھر کھانے پینے کو کچھ نہیں رہ گیا تو اس نے سوچا کہ کیوں نہ راجا کے دربار سے کچھ مانگ لایا جائے۔ وہ تو بہت رحم دل ہیں ضرور کچھ نہ کچھ دے دیں گے پھر اسے خیال آیا کہ خالی ہاتھ دربار جانا بھی ٹھیک نہیں۔ کوئی نہ کوئی تحفہ بھی لیتے جانا چاہیے مگر وہ تحفہ ہو کیا؟ بہت کچھ سوچنے کے بعد اس نے ایک راج ہنس بھنوایا اور خوشی خوشی راج محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

تحفہ پاکر راجہ بہت خوش ہوئے کچھ سوچ کر انہوں نے کسان سے کہا "بھائی تمہارا تحفہ تو عمدہ ہے مگر ہمارے گھر میں اس کی تقسیم کیسے ہو گی، جب کہ ہم چھ افراد ہیں ایک ملکہ، دو راج کمار، دو راج کماریاں اور ایک میں خود۔ آخر تحفے کا حق تو سب کو پہنچتا ہے؟"

کسان نے جواب دیا۔ "جہاں پناہ، اس کے لیے آپ فکر نہ کریں میں خود اسے تقسیم کیے دیتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر اس نے ایک چھری منگوائی اور راج ہنس کو ذبح کر ڈالا۔ سر کو الگ کرتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ "عالم پناہ! چوں کہ آپ کنبے کے سردار ہیں اس لیے راج ہنس کا سر آپ کے حصے میں رہا۔" اس کے بعد اس نے پیٹھ کو کاٹ کر رانی کو پیش کرتے ہوئے کہا "آپ کی پیٹھ پر کنبے کی خانہ داری کا بوجھ رہتا ہے اس لیے یہ آپ کے حصے میں آئی۔" راج ہنس کے دونوں پیروں کو کاٹ کر دونوں راج کماروں کے سامنے رکھ کر کہنے لگا۔ "آپ لوگوں کو اپنے والد بزرگوار کے نقش قدم پر چلنا ہے اس

لیے یہ پر آپ لوگوں کے لیے پیش کرتا ہوں۔"
پھر اس نے دونوں راج کماریوں کو راج ہنس کے پر دیتے ہوئے کہا "آپ دونوں جلد ہی بابل (میکے) چھوڑ کر سسرال (شادی کے بعد) اڑ جانے والی ہیں، اس لیے دونوں پروں کو آپ ہی لوگ سنبھالیں۔

"اب باقی ماندہ حصّہ میرے حصّے میں رہا۔" یہ کہہ کر اس نے راج ہنس کا باقی ماندہ حصّہ اپنے پاس رکھ لیا۔

کسان کی عقلمندی اور دانائی پر راجا بہت خوش ہوئے اور انہوں نے کافی دولت انعام دے کر اسے رخصت کیا۔

جب یہ بات گاؤں کے ایک دولت مند کسان نے سنی تو اسے لالچ آ گیا۔ وہ بھی انعام کے لالچ میں پانچ عدد راج ہنس لے کر راجا کے دربار میں حاضر ہو گیا۔ راجا نے کہا "تم بھی راج ہنس ہی لے آئے، خیر کوئی بات نہیں مگر میری ایک رانی ہے، دو بیٹے ہیں، دو بیٹیاں ہیں اور ایک میں خود۔ کل چھ آدمی ہوئے۔ اب تم اپنے تحفے کو سب لوگوں میں برابر برابر کس طرح تقسیم کرو گے۔"

یہ سوال سن کر دولت مند کسان گھبرا گیا اس نے دماغ میں لے کا کوئی حل نہیں آ رہا تھا۔ آخر راجا نے آدمی بھیج کر گاؤں سے پھر اسی غریب مگر عقلمند کسان کو بلوایا اور راج ہنسوں کی تقسیم کا مسئلہ پیش کیا۔

غریب کسان نے ایک ہنس کو اٹھا کر راجہ اور رانی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"لیجیے، راج ہنس کو ملا کر اب آپ تعداد میں تین ہوئے۔" پھر ایک ہنس کو لے کر لڑکوں کو دے دیا اور کہا:

"دو آپ لوگ اور ایک یہ ہنس، اب آپ بھی تین ہو گئے۔"

اسی طرح ایک ہنس کو دونوں راج کماریوں کو دیتے ہوئے انہیں بھی تین بنایا۔ بقیہ دو ہنس اپنے حصّے میں رکھتے ہوئے کہا:

"راج ہنس کو لے کر اب ہم بھی تین ہیں سب کا حصّہ برابر ہو گیا۔"

دولت مند کسان منہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ راجا ہنستے ہوئے دولت مند کسان سے مخاطب ہوئے اور بولے۔

"یہاں انعام و اکرام ہنس پر نہیں بلکہ ذہانت اور عقلمندی پر دیے جاتے ہیں۔"

اس بار بھی غریب کسان انعام لے کر دربار سے رخصت ہوا اور لالچی کسان خالی ہاتھ منہ لٹکائے گھر واپس آ گیا۔

میری ایک بی اے پاس پڑوسن کو کئی مرتبہ انٹرویو دینے کے بعد جب کامیابی نہ ہوئی تو اسے کوچنگ کلاس شروع کرنے کا خیال آیا۔ دوسرے دن اشتہار بانٹ دیے گئے۔

"آپ کے محلے میں چھوٹے بچوں کے لیے کوچنگ کلاس شروع ہونے والی ہے اپنے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کے لیے جلد سے جلد داخلہ کروائیں فیس داخلہ دو روپے اور فیس ماہانہ پانچ روپے ہوگی۔ داخلے کی آخری تاریخ ۳ جنوری ہے۔

مسز ورما بی اے"

مسز ورما کو محلے کے لوگ اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لیے لوگوں کو سمجھنے میں دقت نہ ہوئی۔ دوسرے ہی دن ان کے گھر پر لوگوں کی قطار لگ گئی۔

۴ جنوری کو ۱۰ بجے دن میں کوچنگ کلاس شروع ہوگئی اور کمرہ بچوں سے بھر گیا۔ زیادہ تر بچے چار سال سے کم عمر کے تھے، کیوں کہ اس سے زیادہ عمر کے بچے اسکول جاتے تھے۔ یہی بچے گھر میں رہتے تھے۔

مسز ورما نے بہت اچھے سلیقے سے بچوں کو قطار میں بٹھایا، ایک ایک ٹافی دی، نام پوچھا اور چھٹی دیدی۔ بچے سب خوش ہوگئے۔ دوسرے دن کچھ اور بچے آگئے۔ مسز ورما کو اپنے کارنامے پر فخر ہو رہا تھا۔ مسز ورما آپ ہی آپ مسکرا پڑیں بچوں کو قطار سے بٹھانے کے بعد وہ بلیک بورڈ کو صاف کرتی ہوئی بولیں۔ "دیکھو بچو! اس طرف دیکھو۔ یہ بورڈ پر "ہ" لکھا ہے۔" اور انھوں نے بڑا سا "ہ" لکھ دیا۔ "تم سب لکھو۔"

وہ باری باری سے ہر ایک کے پاس گئیں۔ کچھ بچوں نے خود لکھ لیا تھا اور جو نہ لکھ سکے تھے تو انھوں نے ہاتھ پکڑ کر سکھایا۔ بچوں کو "ہ" لکھنا آگیا۔

مسز ورما اب آگے بتانے والی تھیں کہ ایک بچہ

چکا۔ گڈو مجھ کو مارتا ہے۔"

مسز دعا نے گڈو کو ڈانٹا۔ گڈو نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ "میں ممی کے پاس جاؤں گا۔ ممی! ممی ....."

وہ دوڑ کر گڈو کے پاس پہنچ کر چپ کرا ہی رہی تھیں کہ ایک بچی چلائی: "مجھ کو پیشاب آ رہا ہے۔" اور اس نے اپنی چڈی گیلی کر دی۔ ایک اور بچی چیخنے لگی: "مجھ کو متلی آ رہی ہے۔"

اور جب تک مسز دعا ادھر دوڑیں۔ اس کے کپڑے خراب ہو گئے۔ مسز دعا بہت گھبرا گئیں: "جاؤ تم سب اب گھر جاؤ۔ چھٹی ہو گئی!" بچے شور کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

تیسرے دن بچوں کے ساتھ اُن کی ممی آئیں تو شکایت کرنے لگیں۔ ایک عورت نے کہا: "میڈم! آپ تو بچوں کو بہت جلدی چھٹی دے دیتی ہیں۔ اگر اس طرح آپ روز چھٹی دیں گی تو داخلہ کرنے سے کیا فائدہ؟" مسز دعا: "بچے بہت چھوٹے ہیں۔ آہستہ آہستہ ہی تو ان کو روکا جا سکتا ہے۔ چھ سات ماہ میں ٹھیک ہو جائیں گے تو وقت پر چھٹی دوں گی۔"

دوسری عورت: "میں دس بجے آفس جاتی ہوں اور پانچ بجے واپس آتی ہوں۔ اس وقت تک میرے بچے کو گھر میں رکھیے۔ اس کے کھانے کے لیے بسکٹ اور پینے کے لیے ڈبے دودھ کے یہاں رکھ دوں گی۔ جب روئے تو دے دینا مہربانی ہوگی۔"

دوسری عورتوں نے بھی ایک زبان ہو کر کہا: "بہن جی ہم بھی آفس جانے لگیں اور بچے سنبھالنے لگیں۔ ہمارے بچوں کو بھی اپنے گھر میں رکھیں۔ کل آپ نے چھٹی دے دی اور وہ سڑک پر کھیلتا رہا۔ اگر ایکسیڈنٹ ہو جاتا تو ...!"

ایک عورت فوراً بولی۔ "میں تو آفس نہیں جاتی ہوں مگر گھر کا ہر کام خود کرتی ہوں۔ میری بچی بہت تنگ کرتی ہے۔ آپ اس کو اپنے گھر میں ہی رکھا کیجیے۔ جب مجھ کو فرصت ملے گی تو لے جایا کروں گی۔"

پھر دو چار عورتوں نے ہاں میں ہاں ملائی "ہمارے بچوں کو بھی ....."

مسز دعا جھنجھلا گئیں۔ "آپ لوگ آیا کیوں نہ رکھ لیں۔ جو بچوں کو سنبھالیں۔"

ایک عورت فوراً بولی۔ "استانی جی! جو کام پانچ روپے مہینے میں ہو سکتا ہے اس کے لیے اس مہنگائی میں ساٹھ روپے کیوں خرچ کیے جائیں۔"

اور مسز دعا سر تھام کر بیٹھ گئیں۔

روشنی کے لیے

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب انسان کا ظہور
نہیں ہوا تھا۔ یہ دنیا روشنی سے محروم تھی۔ نتیجے کے
طور پہ دنیا کی ساری مخلوق تاریک خلا میں بھٹکتی
پھرتی تھی۔ کبھی وہ کسی درخت سے ٹکرا جاتی کبھی
کسی پہاڑ سے اور کبھی کسی جانور سے۔

چنانچہ اس مستقل اندھیرے سے نجات حاصل
کرنے کے لیے ان لوگوں نے ایک ہنگامی میٹنگ
کا اعلان کیا۔ میٹنگ بلائی گئی اور سبھوں نے
اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق اپنے خیالات ظاہر کیے لیکن
کسی کے پاس کوئی ایسا نسخہ نہ تھا جس کی مدد سے تاریک
خلا میں روشنی پیدا کی جاسکے۔

کسی نتیجے پر پہنچے بغیر میٹنگ ختم ہونے ہی والی تھی
کہ [illegible]

[illegible]

مل کر تھوڑی سی روشنی کے لیے اُن سے درخواست کریں تو
وہ لوگ انکار نہیں کریں گے۔"

مجوزہ کے اس اعلان پر سبھوں کے چہرے خوشی سے دمک
اٹھے لیکن لومڑی نے مجوزہ کی تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے
کہا:

"یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ روشنی کے ملک میں رہنے والے
لوگ رحم دل اور فراخ دل ہی ہوں گے اور وہ ہماری
مدد ضرور کریں گے پھر کیوں نہ اُن کے یہاں سے تھوڑی روشنی چوری کرلی
جائے۔" لومڑی کی اس تجویز کو سبھوں نے بغیر کسی اعتراض کے
قبول کرلیا، مگر دوسرے ہی لمحہ یہ مسئلہ ان کے لیے آن
کھڑا ہوا کہ روشنی لائے گا کون اور ایک بار پھر یہ لوگ فکرمند
ہوگئے کیونکہ روشنی لانے والے کا مضبوط اور توانا
ہونا ضروری تھا۔ بالآخر گدھ نے اپنی خدمات
پیش کیں اور وہ اپنے مشن پر روانہ ہوگیا۔ وہ پرواز کرتا
ہوا روشنی کے شہر میں جا پہنچا۔ لیکن جیسے ہی وہ اس شہر
میں پہنچا سورج چمک رہا تھا اور روشنی کی [illegible]
[illegible]

نہیں دیکھ سکتا۔ اسی وجہ سے اُلّو اکثر رات ہی کو اپنے
گھونسلے سے باہر نکلتے ہیں، مگر اس تکلیف کے باوجود
اُلّو نے حوصلہ نہیں ہارا اور سورج کے قریب پہنچ کر
تھوڑی سی روشنی اپنی دم میں چھپالی۔ لیکن روشنی
میں اتنی حدّت تھی کہ اس کی نرم و نازک دم اس کو
برداشت نہ کر سکی اور اس کی دُم روشنی میں جل کر
خاک ہوگئی۔ اُسے اپنی خوب صورت دُم سے بھی ہاتھ
دھونا پڑا۔

اُلّو کی ناکامی کے بعد شاہین اس مشن پر روانہ
ہوا، اس نے دعویٰ کیا کہ وہ " روشنی کو " اپنی
پیشانی میں چھپا کر لائے گا۔ چنانچہ بلا خوف و خطر،
اُلّو کی طرح روشنی کے شہر میں جا پہنچا اور ایک جھپٹا
مار کر اس نے تھوڑی سی روشنی کو اپنے پنجے میں
چھپا لیا اور اپنے شہر کی طرف واپس لوٹا، مگر اس
کی خوب صورت پیشانی بھی روشنی کی حدّت کو برداشت
نہ کر سکی اور اس بُری طرح جھلس گئی کہ یہ گنجا ہوگیا۔

روشنی حاصل کرنے کی کوشش میں بار بار ناکامی
سے تقریباً سب لوگ اداس ہوگئے۔ ان کی سمجھ میں
نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ اتنے میں ایک
بوڑھی نحیف سی مکڑی نے سبھوں کی حوصلہ افزائی
کرتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگ گھبرائیے نہیں۔ جو کام
آپ لوگوں سے نہ ہوسکا اسے میں کر دکھاؤں گی۔"

مکڑی نے اپنے منصوبے کے تحت زمین سے
تھوڑی سی چکنی اور نرم مٹی لی اور اس سے ایک چھوٹا
سا پیالہ بنا لیا اور پھر وہ اپنے جالے [illegible]
(تاکہ وہ اس کے سہارے آسانی سے واپس آسکے)
مشرق کی جانب چل پڑی۔ روشنی کے شہر میں پہنچ کر
دوسروں کی نظریں بچاتی [illegible]
جا پہنچی اس نے سورج کے جھکتے ہوئے شعلے سے
تھوڑی سی روشنی نکالی اور اسے اس برتن میں ڈال
لیا جو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ جب وہ اپنے وطن
واپس آئی تو لوگوں نے اس کا پُرجوش خیر مقدم
کیا اور "مکڑی نانی زندہ باد" کے نعرے
لگائے۔

آپ نے مکڑی کی جالیاں یقیناً دیکھی ہوں گی
آپ نے غور کیا ہوگا کہ اس کی جالیاں سورج
کی سنہری کرنوں کی طرح قرص نما ہوتی ہیں۔ آپ
کو شاید یہ بھی پتا ہوگا کہ مکڑیاں سورج نکلنے سے
پہلے ہی اپنے جالے کیوں بناتی ہیں۔

(ایک لوک کہانی)

بقیہ صفحہ ۲۴

حاضر ہو لیکن بیک وقت گھوڑے کی سواری بھی کرتے
رہو اور پیدل بھی چلو۔ اگر ایسا نہیں کروگے تو
تمہیں کوڑوں کی مار پڑے گی۔"

شہزادے کا خیال غلط تھا کہ اب کی بار تو وہ
کچھ نہ کر پائے گی، جب [illegible]

عشرت عرفان

سریش ایک غریب لڑکا تھا۔ پیٹ بھرنے کے لیے اُسے اِدھر اُدھر مزدوری کرنی پڑتی تھی۔

سریش کو تصویریں بنانے کا بہت شوق تھا۔ مزدوری کر کے جب وہ گھر لوٹتا تو تصویریں بنانے بیٹھ جاتا۔ اس طرح اس نے گھر کی دیواروں پر طرح طرح کی تصویریں بنا رکھی تھیں۔ گاؤں کے لوگ ان تصویروں کو دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے۔ وہ کہتے:

"شاباش سریش! تم تو بہت چالاک ہو۔ اگر مشق کرتے رہے تو ایک دن اچھے آرٹسٹ بنو گے۔"

سریش ان کی باتیں سن کر بہت خوش ہوتا۔ وہ تصویریں بنانے کی اور زیادہ مشق کرنے لگا۔ لیکن اس کے پاس کوئی برش نہ تھا۔

سریش سوچا کرتا: "اگر میرے پاس ایک برش ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔"

آخر ایک دن سریش کی یہ خواہش پوری ہو گئی۔ ایک دن جب وہ گھر آ رہا تھا تو اُسے ایک برش پڑا ملا۔ برش کو دیکھ کر وہ خوشی سے بھر گیا۔ جب وہ برش اٹھانے لگا تو اُسے ایک کاغذ دکھائی دیا۔

اس نے دونوں چیزوں اٹھا لیں۔ کاغذ پر لکھا تھا:

"یہ جادو کا برش ہے۔ اسے سوچ سمجھ کر کام میں لانا۔"

"کتنا اچھا برش ہے! اس سے میں اچھی اچھی تصویریں بنا سکوں گا۔" برش کو اس نے ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ پھر وہ ایک چڑیا کی تصویر بنانے لگا۔ تصویر پوری ہوتے ہی چڑیا سچ مچ کی چڑیا کی طرح اُڑ گئی۔ سریش تعجب میں پڑ گیا۔ اب اس نے کتے کی تصویر بنانی شروع کی۔ جیسے ہی کتے کی تصویر پوری ہوئی، ایک سچ مچ کا کتا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"ارے یہ تو سچ مچ کا جادو کا برش ہے۔" وہ خوشی سے چلاّ اٹھا۔

سریش اس برش سے جو بھی تصویر بناتا وہ اصلی شکل میں آ جاتی۔ اس لیے وہ خوب سوچ سمجھ کر گاؤں والوں کی ضرورت کی چیزیں بناتا۔ پھر وہ ان چیزوں کو گاؤں والوں کو دے دیتا۔ اس سے گاؤں والے بہت خوش ہوتے۔ دھیرے دھیرے سارے علاقے میں سریش کا نام پھیل گیا۔

سریش اور اس کے برش کی بات راجا تک پہنچ گئی۔ راجہ کو بہت تعجب ہوا۔ اور اس نے سریش کو بلا کر طرح طرح کی تصویر بنانے کو کہا۔ سریش جانتا تھا کہ راجا کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے اس نے کوئی تصویر نہیں بنائی۔

راجا کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے سریش سے برش چھین کر کہا۔ دیکھو میں تم سے کیا کیا چیزیں بناتا ہوں۔

راجا نے سونے کے پہاڑ کی تصویر بنانی شروع کی۔ لیکن جیسے ہی تصویر پوری ہوئی اس کے سامنے ایک پتھر کا پہاڑ کھڑا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پہاڑ کے پتھر ادھر ادھر گرنے لگے۔

راجا کو بہت تعجب ہوا۔ اب وہ سونے کی چھڑی کی تصویر بنانے لگا اور جیسے ہی تصویر پوری ہوئی سونے کی چھڑی کی جگہ ایک کالا سانپ بن گیا۔ سانپ بڑی تیزی سے راجا کی طرف جھپٹا۔ لیکن فوراً وزیر نے اسے مار دیا۔ یہ دیکھ کر راجا بری طرح ڈر گیا اور اس نے برش ایک طرف پھینک دیا اور سپاہیوں کو حکم دیا: "اس شیطان کو پکڑ لو اور جیل میں بند کر دو۔"

سریش نے دوڑ کر برش اٹھایا ہی تھا کہ سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور جیل میں بند کر دیا۔

جیل کی کوٹھری میں بڑا اندھیرا تھا۔ وہاں ٹھنڈ بھی بہت تھی۔ سریش نے [illegible]

تین چار دن بعد راجا سریش کو دیکھنے آیا۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا کہ سریش کے پاس سب طرح کا سامان موجود ہے اور وہ آرام سے تصویریں بنا رہا تھا۔

یہ دیکھ کر راجا غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ اس نے سپاہیوں سے کہا: "اسے پکڑ کر میرے پاس لاؤ۔"

حکم پاتے ہی سپاہی کوٹھری میں گھس گئے۔ پر وہاں کوئی نہیں تھا۔ سپاہیوں نے باہر دیکھا کہ سریش ایک گھوڑے پر چڑھ کر بھاگا جا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر سپاہی اپنے اپنے گھوڑوں پر بیٹھ کر اس کا پیچھا کرنے لگے۔

سریش نے دیکھا کہ کچھ سپاہی اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اس نے جلدی سے اپنے اور سپاہیوں کے بیچ میں ایک سمندر کی تصویر بنا دی۔ اپنے سامنے سمندر دیکھ کر سپاہی آگے نہ بڑھ سکے۔

اس طرح سریش راجا کی پہنچ سے باہر ہو گیا۔ اب وہ جہاں کہیں بھی جاتا غریب لوگوں کی ضرورت کی چیزوں کی تصویریں بنا کر ان کی مدد کرتا۔ لوگ اس سے بہت خوش تھے۔

(بقیہ صفحہ ۲۰)

خرید کر اس ایک چھوٹی سی عمارت جو اکثر طالب علموں کو [illegible] کام

[illegible]

آدھی ملاقات

...... اس شمارے کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ لکھنے والوں کے ناموں سے پہلے جناب یا محترمہ لکھنے کا پرانا رواج ختم ہوگیا ہے۔

حصہ نثر میں دو مضامین ہیں: جن میں ایک میرا ("اہرام مصر") جس کے بارے میں اچھی بُری رائے پیامی بھائی بہن ہی دے سکتے ہیں اور دوسرا غلام حیدر نقوی صاحب کا جو حسب معمول مفید اور دلچسپ ہے

دیگر تخلیقات میں کوثر سہروردی صاحب کی کہانی "کبوتر، مرغی اور کوّا" بڑی جاندار ہے۔ زبان بھی بہت شستہ اور رواں استعمال کی گئی ہے۔ اگر اس کہانی پر کچھ توجہ کی جاتی تو یہ ایک شاہکار چیز بن سکتی تھی۔ کہانی کار کو اس بات کا خاص دھیان رکھنا چاہیے کہ اس کی کہانی کا کوئی واقعہ حقیقت سے پرے نہ ہو۔ جیسے "مرغی دن بھر محنت مزدوری کر کے لاتی اور شام کو اپنے بچوں کو کھلا پلا کر خود بھی آرام کرتی ہے۔" مرغی ہمیشہ اپنے چوزوں کو اپنے ساتھ لے جایا کرتی ہے۔ انھیں کبھی تنہا نہیں چھوڑتی ہے۔ اسی طرح کی ایک غلطی ستمبر کے پیام تعلیم میں "کوئل" (ریاض اللہ آشیکی) نامی کہانی میں کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئل اپنا گھونسلہ ہی نہیں بناتی ہے۔ بلکہ کوّے کے گھونسلے میں انڈے دیتی ہے۔ ...... رضا مہدی صاحب نے "شاہ صاحب" کا بڑا دلچسپ خاکہ پیش کیا ہے ایک گدھا دو کہانیاں" "محنت کا پھل" اور "قربانی" اچھی کہانیاں ہیں۔

سلیمان ظفر

...... میں جولائی ۷۹ء سے اپریل ۸۰ء تک استادوں کے مدرسہ میں زیر تربیت رہا ہوں۔ اس لیے جامعی کہلاتا ہوں۔ کیونکہ وہی ایک سال میری زندگی کے ۴۰ سال پر بھاری ہے۔ پیام تعلیم ہمارے اسکول میں ہمیشہ سے آتا رہا ہے اور ہم پابندی سے پڑھتے ہیں۔ ساتھی مدرسین بھی بڑی دلچسپی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ سلیمان ظفر اور خلیق انجم اشرفی کی کوئی بھی تحریر ہو بہت پسند کی جاتی ہے۔ لیکن غلام حیدر نقوی کا عنوان "میرے استاد" سب سے زیادہ کشش رکھتا ہے۔ فی الحال یہی سلسلہ پیام تعلیم کی جان ہے۔ [illegible]

[illegible]

... کی کہانیاں اور نظمیں بہت ہی عمدہ ہیں
اشعار مختار عباسی صاحب نے بھی شرکت کی
ہے۔ ان کی نظمیں بچوں کے تقریباً سبھی رسائل میں
شائع ہو چکی ہیں۔ میں بہت دنوں سے پڑھتا
آرہا ہوں۔ تعجب ہے کہ پیام تعلیم جیسا معیاری
رسالہ کیوں ان کے قلمی تعاون سے اب تک محروم
تھا؟

محترم رشید حسن خاں صاحب کا مضمون
"اردو ہے جس کا نام" بچے پسند آیا۔ اتنے بہترین
مضمون کے لیے میں ان کو پرخلوص مبارک باد
پیش کرتا ہوں۔ مضمون معلوماتی ہونے کے ساتھ
ساتھ انتہائی مفید اور دلچسپ ہے۔ اس طرح
کے مضامین کی سخت ضرورت ہے۔ وقت کا
ایک اہم تقاضا تھا جس کو انھوں نے محسوس
ہی نہیں بلکہ پورا کرنے کا بھی بیڑا اٹھایا ہے۔
بچوں کے رسائل کا مقصد محض تفریح طبع نہیں بلکہ
ان کی دلچسپی اور ذوق و شوق کو برقرار رکھتے ہوئے
انھیں مفید اور آئندہ کام آنے والی باتوں کی تعلیم
سکھانی چاہیے۔ اس طرح بچے اسے قبول کرنے
میں اچھے اور کوئی بار محسوس نہیں کریں گے
اور بہت ہی ذوق و شوق سے [illegible] رسائل کا [illegible]
[illegible] کا پورا [illegible]

جہاں تک خط لکھنے والوں کے [illegible] کا
[illegible] ہو چکا ہے۔ بہت
[illegible] رائے [illegible] ہیں جو [illegible]
[illegible] کے اعتبار سے [illegible] ہیں
[illegible] - [illegible] بڑھے

بھی اس غلطی کا شکار رہیں۔ میری ذاتی رائے یہ ہے
کہ یہ سلسلہ مستقل جاری رکھنا چاہیے۔ اس سے
بچوں کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ اور انھیں
اپنی صحیح زبان بولنے اور لکھنے کا طریقہ معلوم ہوگا
اسے کہیں بھی بولا جاتا ہو لیکن شہر الٰہ آباد میں ایک لفظ
بہت بولا جاتا ہے ——— اور وہ یہ کہ اگر یہ کہنا
ہوگا کہ "وہ اس کی مخالفت کرتا ہے" تو یہ کہنے
کے بجائے، لوگ یہ کہتے ہیں کہ "وہ اس کی خلافت
کرتا ہے۔" غالباً خلاف سے خلافت بنا لیا گیا ہے
کیا محترم رشید حسن خاں صاحب آئندہ اس
پر بھی روشنی ڈالیں گے۔

آدھی ملاقات میں جہاں تک اس بات
کا سوال ہے کہ خطوط اتنے طویل ہوتے ہیں کہ دوسروں
کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اس سے مجھے بھی
اتفاق ہے۔ کوئی بھی رسالہ بچوں کا ہو یا بڑوں کا کسی
شخص واحد یا کسی خاص مکتبہ فکر کے لوگوں کا ترجمان
نہیں ہوتا۔ بلکہ رسالے کے صفحات ہر اس شخص
کے لیے ہوتے ہیں جو کہ اس رسالے کو پڑھتا ہو۔
اور اس کو اپنا سمجھتا ہو۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ
ہر ایک کو اظہار خیال کا موقع ملنا چاہیے۔

ہمیشہ اس کالم میں انھیں خطوط کو جگہ ملنی چاہیے
جو تنقیدی ہوں۔ اس سے رسالے کو بہتر بنانے
اور سنوارنے میں آسانی ہوگی۔ لکھنے والوں کو بھی
اپنی کمیوں کا احساس ہوگا۔ انھیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ
بچے کس طرح کے مضامین پسند کرتے ہیں۔ اور پھر
لکھنے والے اس روشنی میں [illegible] کوشش [illegible] کریں گے
[illegible] سے [illegible] رسالے کا معیار

اور بھی بلند ہو جائے گا۔

محمد عرفان نجف علیمی ایم اے

رزق تا ابتدم ہر گیا کہ نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

..... پیامیوں کی خوش قسمتی ہے کہ طویل خاموشی کے بعد محترم رشید حسن خاں صاحب نے پھر پیام تعلیم پر عنایت فرمائی ۔ "اردو ہے جس کا نام" کی پہلی قسط بہت دلچسپ ہے ۔ باتوں ہی باتوں میں کیسی کیسی کام کی باتیں بتائی ہیں ۔ ابھی سے اگلی قسط کا بےچینی سے انتظار ہے۔

رشید الدین صاحب کے مضمون سے مرحوم و مغفور غلام ربانی صاحب کے بارے میں بڑی مفید اور سبق آموز معلومات حاصل ہوئیں۔ "میرے استاد" کی یہ قسط بھی حسب معمول دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ محترم قیصر سرمست نے ایک عرصے کے بعد پیام تعلیم پر نظر عنایت فرمائی ہے اور بڑا عمدہ تحفہ لائے ہیں ۔ یوں قیصر صاحب جانے مانے آرٹسٹ اور ماہر حیوانیات ہیں اگر وہ شکاریات یا حیوانیات پر بھی کچھ مضامین عنایت فرمائیں تو اُن کا کرم ہوگا۔

کہانیاں سبھی اچھی ہیں ۔ "جاپان کا بیربل" خورشید درخشاں صاحب یا صاحبہ) بہت دلچسپ ہے ۔ اس سلسلے میں یہ عرض کردوں کہ "ادنی" "آفندی" کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور یہ کوئی اور نہیں دیا ہم سب کے جانے پہچانے ملا نصرالدین آفندی ہیں ان کا تعلق چینی ترکستان سے تھا اور دنیا کی بیشتر زبانوں میں اُن کے لطیفے چھپ چکے ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ ہر مترجم نے انہیں اپنے ہی ملک کا بنا دیا ہے ۔ احمد جمال پاشا صاحب کی کہانی دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی ۔ "تلاش" (رعنا سہروردی صاحبہ) کی مرتب اشاعت مشہور ہے ۔ بہر حال اپنی سبق آموزی کے باعث یہ کہانی بار بار پڑھے جانے کے لائق ہے ۔ محترمہ مسعودہ حیات کی ترجمہ کردہ کہانی (ماں کی للکار) بھی سبق آموز ہے ۔ اپنی کہانی (سیم کے بیج ہیں) کے سلسلے میں بھی بزرگوں اور احباب خصوصاً ننھے پیامیوں کی رائے کا منتظر رہوں گا۔

نظمیں تینوں ہی سبق آموز ہیں ۔ محترم نیر صاحب کی نظم میں یہ خوبی ہے کہ اس کی زبان آسان ہے ۔ نثار عباسی اور رشید اشرف صاحبان نظمیں نسبتاً مشکل زبان میں ہیں لیکن عباسی صاحب کی نظم اپنے خیال اور جوہر صاحب کی نظم "اچھا بچہ" اپنی روانی کے باعث پسند آئیں۔

خلیق انجم اسفرقی

gd. No D(S)-097

JANUARY 1977

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI 110025

پیام تعلیم

بچّوں کی کتابیں

مذہب

کتاب	مصنف	قیمت
[illegible] اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	-/۶۰
آں حضرتؐ (اُردو)	الیاس احمد مجیبی	-/۸۰
آں حضرتؐ (ہندی)	الیاس مجیبی	-/۶۰
[illegible] کہانیاں (دو حصّوں میں)	مقبول احمد سیوہاری	۳/-
[illegible]	الیاس احمد مجیبی	۲/۵۰
خلفائے اربعہؓ	خواجہ عبدالحئی فاروقی	۳/-
رسولِ پاکؐ	عبدالواحد سندھی	۲/-
عقائدِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	-/۶۰
مسلمان بیبیاں	مولانا اعجاز الحق قدوسی	۱/-
نبیوں کے قصّے	خواجہ عبدالحئی فاروقی	۱/۵۰
ہمارے رسولؐ	خواجہ عبدالحئی فاروقی	۲/۴۰
ہمارے نبیؐ (اُردو)	سیّد نواب علی رضوی	۱/۴۰
ہمارے نبیؐ (ہندی)	سیّد نواب علی رضوی	-/۴۰
سرکارِ دو عالمؐ	محمد حسین حسان ندوی	۳/-

معلومات

کتاب	مصنف	قیمت
[illegible] کی کہانی	مشتاق احمد	۲/-
[illegible] عجائب خانہ (چار حصّے)	محمد حسین حسان ندوی	۲/-
[illegible] ہند کی کہانیاں اوّل	خجستہ سلطان	۱/-
〃 دوم	ضیاء الرحمٰن	۱/۴۰
〃 سوم	مشتاق احمد اعظمی	۱/-
〃 چہارم	مشتاق احمد اعظمی	۱/۲۵
خبر رسانی کے طریقے	رضیہ منظور الامین	۱/-
دنیا کے بچّے	محمد حسین حسان ندوی	۱/۲۵
دہلی	ڈاکٹر عابد حسین زیدی	۲/-
سماجی زندگی (چار حصّے)	احمد شکیل و غلام ابرار	۴/۹۰
قدرت کے کرشمے	(مرتبہ) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	-/۸۰
سمندر کے کنارے	سلطانہ آصف فیضی	۱/۵۰
سمندر کے نیچے	سلطانہ آصف فیضی	۳/-
میر انیس	محمد حسین حسان ندوی	۲/-

کہانیاں، ڈرامے، ناول

کتاب	مصنف	قیمت
تاک دنا دن تاکے سے	عبدالواحد سندھی	-/۶۰
روٹی کس نے بنائی	〃	-/۶۰
پھر میں چکوں کیا خاک	〃	-/۶۰
پانچ بونے	〃	-/۶۰
چیونٹی رانی	〃	-/۶۰
بچّوں کی کہانیاں	〃	-/۶۰
جادو کے کھیل	اطہر پرویز	-/۶۰
ایک دیس ایک خون	صالحہ عابد حسین	۱/۴۰
جن حسن عبدالرحمٰن (ناول) دو حصّے	ترجمہ: قرۃ العین حیدر	۵/-
پریم کی جیت (ڈراما)	اسد اللہ کاظمی	-/۳۷
تانبیل خاں (کہانی)	محمد حسین حسان ندوی	-/۵۰
ترکوں کی کہانیاں (کہانی)	مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	-/۵۵
تیس مار خاں کے کارنامے (ناول)	م۔ ندیم	۱/۵۰
چپاوت کا آدم خور شیر (سچی کہانی)	محمد معین	-/۳۵
چھوٹی لالٹین	مشتاق احمد	-/۳۵
چقماق کی ڈبیا	برکت علی فراق	-/۴۰
خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا	کوثر بانو	-/۴۰
شیدلا	پروفیسر محمد مجیب	-/۵۰
چنبیلی	محمد حسین حسان ندوی	-/۵۰
ستاروں کی سیر (ناول)	کرشن چندر	۲/-
کوے داوا (سچی کہانی)	مجیب احمد خاں	۲/-
مزہ چکھائیں گے (کہانی)	مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	-/۴۵
ننھا ٹٹو (کہانی)	خورشید سلطان	-/۴۰

ماہنامہ

پیام تعلیم

نئی دہلی ۲۵

جلد ۱۴ شمارہ ۲

ایڈیٹر

ولی شاہجہانپوری

صفیہ حسان

فروری ۱۹۷۷ء

قیمت فی پرچہ ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ سات روپے

فہرست

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے

شوکت پردیسی

نیا عزم

میں پڑھ لکھ کے ہو جاؤں گا جب جواں
کروں گا نہ علم و ہنر رائے گاں

مشقت سے اپنی کماؤں گا میں
شرافت نہ ہرگز گنواؤں گا میں

نہ بیچوں گا دنیا میں اپنا وقار
کماؤں گا روزی بصد افتخار

اگر نوکری مل گئی، خوب ہے
نہیں کام کوئی بھی معیوب ہے

نہ کھاؤں گا دنیا میں رزقِ حرام
بنوں گا نہ دولت کا ہرگز غلام

عطا کی جو دولت خدا نے مجھے
سنبھالا جو سب کی دعا نے مجھے

غریبوں کے کام آؤں گا میں ضرور
کروں گا میں بیدار ان میں شعور

سکھاؤں گا جینا انھیں شان سے
سرِ راہ ہیں بھیک جو مانگتے

یہ ننھے بھکاری گرانبار ہیں
غلط تربیت سے یہ بےکار ہیں

انھیں راہ سیدھی دکھاؤں گا میں
یہ سوئے ہوئے ہیں، جگاؤں گا میں

یہ دنیا کچھ اتنی ہوس کار ہے
کہ اب اس سے ہر شخص بیزار ہے

اگرچہ ازل سے ہے یہ سلسلہ
امیری، غریبی میں اک فاصلہ

مگر یہ تضاد اس قدر تو نہ تھا
یہ اندازِ شام و سحر تو نہ تھا

یہ آپس میں کیوں بھائی چارہ نہیں
مجھے یہ تفاوت گوارہ نہیں

اگر دل کو احساس ہوتا ذرا
تو بڑھتا نہ اتنا کبھی فاصلہ

کروں گا میں بیدار احساس کو
مٹاؤں گا دنیا سے افلاس کو

بچوں سے باتیں

جنوری کا پیام تعلیم آپ کو بہت دیر سے ملا ہمیں اس کا احساس ہے کہ آپ کو کافی انتظار کرنا پڑا۔ لیکن ہم کیا کرتے کہ معاملہ ہمارے قابو سے باہر ہو گیا تھا۔ ہوا یہ کہ جس پریس میں پیام تعلیم چھپتا تھا۔ وہ بند ہو گیا۔ مجبوراً دوسرے پریس میں کاپیاں بھیجی پڑیں۔

نئے پریس کے کارکنوں کی لاپروائی سے کاپیاں پلیٹ پر اچھی طرح نہیں جمیں اور پروف اتنے خراب آئے کہ ان کا پڑھنا ناممکن معلوم ہوا۔ اب درستی ہو تو کیوں کر؟ سنگ سازی کے لیے مسودے پریس کو دیے گئے کہ ان کی مدد سے پلیٹوں کو درست کریں۔ اس کے لیے وقت بھی درکار تھا اور محنت بھی۔ وقت تو لیا گیا مگر افسوس کہ محنت اور توجہ جتنی چاہیے تھی نہیں کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی غلطیاں راہ پا گئیں۔ ان میں سے بعض تو بہت فاش ہیں۔ جیسے "ابراہیم لنکن" کو "اجرا رحم لنکن"، اور شوکت بنارسی کا نام شوکت پردیسی۔

جہاں تک مضامین کا تعلق تھا۔ ہم نے کوشش کی تھی کہ آپ کو پسند آنے والی نظمیں اور کہانیاں چھپیں عام طور پر انھیں پسند بھی کیا گیا ہے۔

بہرحال، جنوری کے پرچے میں تاخیر اور اس کے تمام نقائص کا ہمیں افسوس ہے۔ مگر اس سے زیادہ افسوس اس کا ہے کہ یہ شمارہ بھی آپ کو توقف کے ساتھ مل رہا ہے۔ کیوں کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے ہاں نئے پریس کا نام داخل کرنے کی تاریخ ۳۔ فروری کا ملی ہے۔

بعض مجبوریوں کے باعث اس مرتبہ غلام حیدر نقوی صاحب کا مضمون اس شمارے میں شریک نہ کیا جا سکا۔

رشید حسن خاں صاحب غالباً بہت مصروف رہے۔ بہرحال ان کا مضمون دیر سے ملا اور اگلے شمارے میں آپ پڑھ سکیں گے۔ پھر بھی آپ کے پسند کی کئی چیزیں آپ کو مل جائیں گی۔

عرصے کے بعد م۔ ندیم صاحب چھوٹا سا ڈراما لے کر آئے ہیں۔

اسرار ندوی صاحب نے معروف افسانہ نگار منشی پریم چند کی کہانی "منتر" کو آپ کے لیے آسان زبان میں لکھ دیا ہے۔ بڑی سبق آموز کہانی ہے بوڑھے بھگت کا کردار ایسا ہے کہ ہم سب کو اس کی تقلید کرنی چاہیے

محمد امین صاحب کی کہانی۔ قادرہ کی عاصر جبانی کی دوسری اور آخری قسط اور تاخم میواتی صاحب کی کہانی "موت کا خریدار"، بھی دلچسپ ہے اور پسند آنی چاہیے۔

سائنسی مضامین وقت کا اہم تقاضا ہیں خوشی کی بات ہے کہ اظہار اثر صاحب نے اس موضوع

پر مضامین لکھنے پر آمادگی ظاہر کی ہے اور اپنا مضمون بھی عنایت فرمایا ہے۔ جس کی پہلی قسط اس شمارے میں آپ پڑھیں گے۔ لائق مضمون نگار نے اسے سائنس کی الف ب سے شروع کیا ہے۔ تاکہ آگے آنے والے مضامین کے سمجھنے میں بچوں کو دشواری نہ پیش آئے۔

نظموں میں شوکت پردیسی صاحب کی نظم "نیا عزم" کیف صدیقی صاحب کی ۲۶ جنوری، ناوک حمزہ پوری کی "ہمارے فرائض" اپنے اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت عمدہ نظمیں ہیں۔ اور اس قابل ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے۔

پیامیوں کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ پیام تعلیم کے بزرگ سرپرست پروفیسر رشید احمد صدیقی کا ۱۵ جنوری کو انتقال ہوگیا۔ شروع شروع میں آپ نے پیام تعلیم کے لیے بہت کچھ لکھا ہے۔ بچوں کے لیے آپ کی مشہور کتاب "شیخ نیازی" سب سے پہلے پیام تعلیم ہی میں قسط وار شایع ہوئی تھی۔ آپ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین لکھنے والوں کے امام کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

یہ کاپیاں پریس جارہی تھیں کہ ہمارے ایک ساتھی ریحان احمد عباسی صاحب نے دوپہر کے بعد یہ المناک خبر سنائی کہ آج (۲۸ جنوری کو) برکت علی صاحب فراق نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کردی۔ انّا للّٰہ وانّا الیہ راجعون۔

فراق صاحب مرحوم جامعہ ملیہ کے ابتدائی طالب علموں میں سے تھے یہیں سے بی اے کیا اور یہیں ملازمت کے ساری عمر جامعہ ملیہ کی خدمت میں گزار دی۔ مرنے کے بعد جامعہ ہی کی خاک کے پیوند ہوگئے۔

ان دنوں جامعہ کے مدرسہ ثانوی میں تاریخ کے استاد تھے۔ صبح تقریباً دس بجے کچھ طبیعت خراب ہوئی تو خود ہی پیدل چل کر قریبی ہسپتال گئے، جہاں انھیں روک لیا گیا اور ڈیڑھ بجے کے قریب وہیں روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

راقم سے تقریباً پچیس سال سے مراسم تھے۔ اوّل روز جس خلوص سے ملے، آخر وقت اسی طرح ملتے رہے۔ وضعداری میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ جب ملتے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے اور ایسی دلچسپ باتیں کرتے کہ ان کے پاس سے اٹھنے کو جی نہ چاہتا۔

جون ۶۸ء کے پیامِ تعلیم میں غلام حیدر نقوی صاحب نے "میرے استاد" کے زیرِ عنوان فراق صاحب مرحوم کے حالات لکھے ہیں ان سے مرحوم کے کردار پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

پیام تعلیم میں اکثر لکھا کرتے تھے۔ آخری مضمون اگست ۶۷ء کے شمارے میں "جمہوریت کیا ہے؟" کے زیرِ عنوان شایع ہوا تھا۔ اس سے ان کی معلومات اور طرزِ تحریر کا اندازہ ہوگا۔

راقم ایک پرانے اور مخلص رفیق سے محروم ہوگیا اور پیام تعلیم ایک لائق قلم کار سے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ اور پسماندگان کو اس غم کا بوجھ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ پیام تعلیم اور مکتبہ جامعہ مرحوم کی بیوہ ان کے صاحبزادوں اور صاحبزادیوں کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

اسٹوری سینڈروم
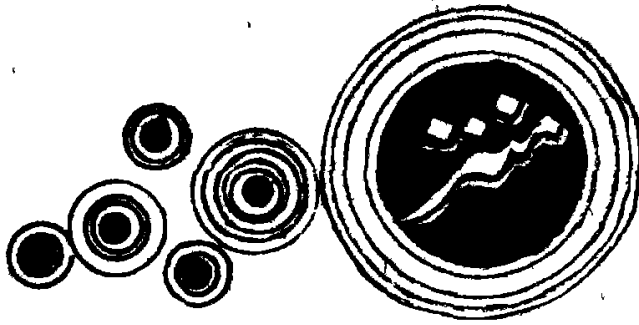
یہ منشی پریم چند کی ہندی کہانی ہے۔ اسے پیامِ تعلیم کے لائق بنا کر لکھا گیا ہے۔ پریم چند اپنے وقت کے بڑے کہانی لکھنے والوں میں تھے۔ اردو، ہندی دونوں زبانوں میں اُن کی کہانیاں بہت پسند کی جاتی تھیں۔ یہ پہلے شخص تھے جن کی کہانیوں، افسانوں اور ناولوں نے لوگوں کو بتلایا کہ اصل ہندوستان دیہاتوں میں ہے۔ (اسرار)

شام کا وقت تھا۔ ڈاکٹر چڈھا کھیلنے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ موٹر دروازے پر کھڑا تھا کہ دو کہار ڈولی لے کر آتے دکھائی دیے۔ ڈولی کے پیچھے ایک بوڑھا بھی آتا دکھائی دیا۔ ڈولی ڈسپنسری کے سامنے رک گئی۔ بوڑھے نے ہمت کر کے دروازے پر پڑے پردے کے اندر جھانکا۔ اتنی صاف ستھری زمین پر میلا پیر رکھتے ہوئے بڈھا جھجک رہا تھا کہ کوئی ڈانٹ نہ بیٹھے۔

ڈاکٹر صاحب اپنی میز کے سامنے کھڑے تھے۔ اندر سے رعب دار آواز میں پوچھا۔

"کون ہے؟ کیا چاہتا ہے؟۔"

"حضور! میں غریب آدمی ہوں۔ میرا بچہ کئی دن سے بے سدھ ....."

بوڑھا ابھی بات پوری کر بھی نہ پایا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "کل آؤ، کل سویرے۔ ہم اس وقت مریض نہیں دیکھتے۔"

بوڑھے نے گھٹنے ٹیک کر سر زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔ "دوہائی سرکار کی! لڑکا مر جائے گا۔ حضور چار دن سے آنکھیں نہیں کھولی ہیں۔"

ڈاکٹر نے گھڑی دیکھی اور اسے اٹھا کر جلدی سے گولف کھیلنے کی چھڑی کھونٹی سے اتارتے ہوئے کہا۔ "کل سویرے آؤ۔ یہ کھیلنے کا وقت ہے۔" بوڑھے نے پگڑی اتار کر چوکھٹ پر رکھ دی اور کہنے لگا:۔ "حضور ایک نگاہ دیکھ لیں۔ بس ایک نگاہ۔ لڑکا ہاتھ سے نکل جائیگا سرکار۔ سات لڑکوں میں یہی ایک بچ رہا ہے سرکار!"

ایسے گنوار دیہاتی یہاں لگ بھگ روز ہی آتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ان کی عادت سے واقف تھے۔ کوئی کتنا ہی سمجھائے وہ اپنی رٹ لگائے جائیں گے۔ کسی کی سنیں گے نہیں۔ انھوں نے پردہ ہٹایا اور موٹر کی طرف چل دیے۔

بوڑھا یہ کہتے ہوئے ان کی طرف دوڑا:۔ "سرکار

بڑا دھرم ہوگا۔ حضور رحم کیجیے۔ بڑا دکھی ہوں سرکار میرا دنیا میں اور کوئی نہیں ہے بابوجی۔"

ڈاکٹر صاحب نے موٹر پر بیٹھتے ہوئے کہا: "کل سویرے آنا کل سویرے۔

موٹر چلا گیا، بوڑھا کچھ دیر اسی طرح بت بنا کھڑا رہا۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنی دلچسپیوں کے آگے کسی کی جان تک کی پرواہ نہیں کرتے۔ یہ اس کی زندگی کا نیا تجربہ تھا بوڑھا ان پرانے لوگوں میں تھا جو لگی ہوئی آگ کو بجھانے، مردے کو کاندھا دینے اور کسی جھگڑے کو نپٹانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ بابو لوگ اتنے کٹھور ہوتے ہیں وہ جانتا نہ تھا، جب تک بوڑھے کو موٹر دکھائی دیتا رہا وہ ٹک ٹکی لگائے دیکھتا رہا۔ شاید اسے اب بھی ڈاکٹر صاحب کے لوٹ آنے کی امید تھی جب گاڑی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تو اس نے کہاروں سے ڈولی اٹھانے کو کہا، وہ ہر طرف سے ناامید ہوکر ڈاکٹر چڈھا کے پاس آیا تھا۔ بڑی تعریف سنی تھی۔ اب اس نے قسمت ٹھونک لی۔ کسی اور کے پاس نہ گیا۔

اسی رات اس کا سات سالہ بچہ ماں باپ کو روتا پیٹتا چھوڑ کر دنیا سے چل بسا۔ ماں باپ کے گھر کا یہ آخری چراغ تھا، بجھ گیا۔

(۲)

اس واقعہ کو کئی سال گزر گئے۔

ایک دن ڈاکٹر چڈھا کے ہاں بڑی چہل پہل تھی۔ بنگلے کے باہر رنگ برنگ کی موٹروں کا جماؤ تھا۔ بڑوں کے ملنے والے بھی بڑے ہی ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے لڑکے کی بیسویں سال گرہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی صرف دو اولادیں تھیں، ایک لڑکا ایک لڑکی۔ لڑکی بیاہ کر اپنے گھر جا چکی تھی۔ اب یہی لڑکا گھر کا چراغ تھا کالج میں پڑھتا تھا اور بڑا ہونہار تھا۔

شام کا وقت تھا ہری ہری گھاس پر کرسیاں لگی تھیں۔ ایک طرف شہر کے رئیس اور حکام کھانا کھا رہے تھے دوسری طرف کالج کے لڑکے بجلی کی روشنی میں سارا میدان جگمگا رہا تھا۔ چھوٹا سا ڈرامہ کھیلنے کی تیاری ہو رہی تھی۔ ڈراما کیلاش ہی نے لکھا تھا، وہی ہیرو بھی تھا۔ وہ اس وقت ریشمی لباس میں ادھر سے ادھر دوستوں کی خاطر تواضع میں دوڑ رہا تھا۔ کوئی اسے اپنی طرف بلاتا، کوئی اپنی طرف پکارتا سب ہی اُسے چھیڑ رہے تھے۔ بیچارے کو دم مارنے کی چھٹی نہیں مل رہی تھی۔

کیلاش کو سانپ پالنے کی ہابی (HOBBY) شوق تھی۔ طرح طرح کے سانپ اس نے پال رکھے تھے۔ ان کی عادتوں اور مزاج سے وہ خوب واقف تھا اس نے ایک بار سانپوں کے بارے میں تقریر بھی کی تھی۔ اس کی معلومات اور کمال پر اس کے پروفیسروں نے بڑی تعریفیں کی تھیں۔ اس کے ایک دوست کو کیلاش کے سانپ اور اس کا ناچ یاد آگیا پھر تو کئی دوستوں نے اصرار کرنا شروع کر دیا۔ کیلاش نے بہت ٹالا کہ آج موقع نہیں ہے۔ بہت بھیڑ لگ جائے گی۔ سانپوں کو ناگوار ہوگا۔ یہ وقت ان کے آرام کا ہے، چھیڑنا اچھا نہیں۔ دوستوں

نے ایک نہ سنی۔ کیلاش مجبور ہو گیا۔ وہ اپنے دوستوں کو لے کر سانپوں کے ڈربے کی طرف چلا۔ ان لوگوں کو کچھ دور کھڑا کیا۔ ڈربے کے خانے کھولے۔ بین بجائی، سارے سانپ جگ گئے۔ اس نے باری باری سے ایک ایک کو نکالا۔ کسی کو ہاتھوں میں، کسی کو سر پر۔ کسی کو گردن میں لپیٹ لیا۔ دیکھنے والے حیرت میں تھے۔

ایک صاحب بولے :۔ "بھئی کمال کر دیا تم نے کیلاش"

دوسرے نے کہا :۔ "تمہارے سدھانے سکھانے کا کمال ہے بھیا۔ یہ اس طرح تمہارا حکم مان رہے ہیں جیسے شاگرد استادوں کے۔ کوئی کاٹ کھانے کی ہمت نہیں کر رہا ہے، زندہ باد کیلاش۔"

ایک صاحب جن کو کیلاش کی تعریف شاید بری لگی، بول اٹھے :۔ "اجی دانت توڑ دیے ہوں گے۔"

"مسٹر! یہ مداریوں کا تماشا نہیں۔ یقین نہ آئے تو دیکھ لیجیے۔" کیلاش نے کہا۔

"ہاں، یقین تو نہیں آتا پر تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔" وہی صاحب بولے۔

"نہیں نہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر مانیے۔ میرے کہنے سے نہیں۔" یہ کہہ کر کیلاش نے ایک خانے میں ہاتھ ڈالا اور بڑا سا ایک سانپ نکالا :۔ "دیکھیے، اس سے زیادہ زہریلا سانپ میرے پاس نہیں۔ اس کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں ہے۔ لہر تک نہ آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے آدمی مر جائے۔" یہ کہہ کر کیلاش نے سانپ کی گردن پکڑی اور اپنے دانت دبا کر اس زور سے اس کی گردن دبائی کہ اس کو منہ کھول دینا پڑا۔ سانپ کو کیلاش سے اس بے رحمی کی امید نہ تھی۔ اس نے جانا کہ یہ ہمیں مار ڈالنا چاہتا ہے۔ اپنی حفاظت کی تیاری کرنے لگا۔

کیلاش نے سب کو سانپ کا زہریلا دانت دکھاتے ہوئے کہا۔ "اب تو آپ سب کو یقین آ گیا کہ میں نے دانت نہیں توڑے ہیں۔" دانت دیکھ کر اس کے دوست سنّاٹے میں آ گئے۔

دانت دکھانے کے بعد کیلاش نے سانپ کی گردن ڈھیلی کر دی اور اسے ڈربے میں رکھنا چاہا۔ کالا ناگ غصّے سے بھوت ہو رہا تھا۔ گردن ڈھیلی پڑتے ہی چٹ سے اس نے کیلاش کی انگلی پکڑ لی اور اس زور سے ڈسا کہ اس کی انگلی سے ٹپ ٹپ خون ٹپکنے لگا۔ اس نے اپنی انگلی کس کے دبائی اور اپنے کمرے کی طرف دوڑا۔ میز کی دراز میں ایک جڑی تھی۔ اسے پیس کر لگانے سے زہر رفو چکر ہو جاتا تھا۔

دوستوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ باہر لان امیدان میں محفل جمی تھی، وہاں خبر پہنچی تو بھاگ دوڑ مچ گئی۔ ڈاکٹر چڈھا بے تحاشہ دوڑے۔ جڑی پیس کر لگائی جا چکی تھی۔ ڈاکٹر صاحب جڑی وڑی کے قائل نہ تھے۔ وہ سانپ کے ڈسے ہوئے حصے کو نشتر سے کاٹ دینا چاہتے تھے۔ کیلاش کو اپنی جڑی پر پورا بھروسہ تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ کیلاش کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ ہونٹ کالے پڑنے لگے

سارے مہمان ہال میں جمع تھے۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا، کوئی کچھ۔ جتنے منہ اُتنی باتیں۔ اب کیلاش سے بیٹھا نہ گیا۔ وہیں فرش پر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور ہاتھ سے پنکھا جھلنے کا اشارہ کیا۔ ٹیبل فین لگا دیا گیا۔ ماں نے بیٹے کا سر گود میں لے لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے جھک کر پوچھا: "بیٹا کیسی طبیعت ہے؟" کیلاش بول نہ سکا صرف ہاتھ اٹھا دیا۔

کسی نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا:

"کیا جڑی کام نہیں کر رہی ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے ہاتھ پر سر رکھتے ہوئے کہا:

"کیا بتاؤں۔ میں لڑکے کی باتوں میں آگیا۔ اب تو نشتر لگانے کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔"

تیزی سے کیلاش کی حالت ابتر ہوتی گئی آنکھیں پتھرا گئیں۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے، چہرے کی چمک جاتی رہی اور آخر نبض بھی ڈوب گئی۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ ماں سینہ پیٹنے لگی۔ ڈاکٹر چڈھا کو لوگوں نے پکڑ لیا۔ وہ اپنا نشتر پیٹ میں اُتار لینا چاہتے تھے۔ کچھ دیر بعد ایک صاحب نے کہا:

"کوئی اچھا جھاڑنے والا ملے تو اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔"

ایک اور صاحب بولے: "ارے صاحب قبر میں پڑی لاش زندہ ہو جاتی ہے۔ ہاں جھاڑنے والا چاہیے۔"

"اُف! میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے میں نے لڑکے کی بات مان لی۔ نشتر لگا دیتا تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔ بار بار سمجھایا کہ بیٹے یہ سانپوں کا شوق اچھا نہیں ہے۔ لیکن ایک نہ سنی۔ بلائیے کسی جھاڑنے والے کو۔ وہ میری ساری دولت لے لے۔ اور مجھے میرا کیلاش دے دے۔ کیلاش! پیارا کیلاش!!"

(۳)

شہر سے کئی میل دُور ایک جھونپڑی میں ایک بوڑھا اور بڑھیا انگیٹھی کے سامنے بیٹھے جاڑوں کی اندھیری رات کاٹ رہے تھے۔ گھر میں چارپائی تھی نہ بچھونا۔ ایک کنارے تھوڑی سی پوال پڑی تھی۔ اسی کوٹھری میں دوسری طرف چولھا تھا۔ بڑھیا دن میں اِدھر اُدھر سے لکڑیاں چنتی۔ بوڑھا رسّی بٹ کر بازار سے کچھ پیسے لے آتا۔ یہی ان کی گزر بسر کا ذریعہ تھا۔ ان لوگوں کو کسی نے روتے دیکھا نہ ہنستے۔ بوڑھے تھے۔ موت دروازے پر کھڑی تھی۔ رونے ہنسنے کی چھٹی کسے تھی۔

بڑھیا نے کہا: "کل کے لیے سُن تو نے نہیں رسّی کا ہے کی ہوگی؟"

"جا کر جھگڑو کی دکان سے دس سیر لے آؤں گا۔"

"اُس کے پہلے کے ہی دام باقی ہیں، اور اُدھار کیسے دے گا؟"

"نہ دے گا تو گھاس کہیں گئی ہے؟ کاٹ کر بیچ لاؤں گا۔"

اتنے میں کسی نے دروازے پر آواز دی۔

"بھگت، بھگت کیا سو گئے۔"

بھگت نے اٹھ کر کواڑ کھول دیے ایک آدمی نے اندر آتے ہوئے کہا:۔ "کچھ سنا، ڈاکٹر چڈھا بابو کے لڑکے کو سانپ نے کاٹ لیا۔"

بوڑھے نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا: "چڈھا بابو کے لڑکے کو، وہی چڈھا بابو جو چھاؤنی کے بنگلے میں رہتے ہیں۔"

"ہاں، ہاں وہی شہر میں ہلّا مچا ہوا ہے۔ جاتے ہو تو جاؤ، آدمی بن جاؤ گے۔"

بوڑھے نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا: "میں نہیں جاؤں گا، یہ وہی چڈھا ہے، اپنے لڑکے کو لے کر میں اس کے پاس گیا تھا۔ اس کے پیروں پڑا تھا لیکن اس نے سیدھے منہ بات بھی نہیں کی تھی۔ سچو کو اب معلوم ہوگا کہ بیٹے کی موت کیا ہوتی ہے۔ اس کے تو کئی بیٹے ہونگے۔"

"نہیں جی، بس یہی ایک لڑکا ہے، سنا ہے سب نے جواب دے دیا ہے۔"

"خدا سب کو دیکھتا ہے، اس وقت میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے۔ میرا بیٹا دم توڑ رہا تھا اور تمہارے چڈھا بابو کو کھیل میں جانے کی جلدی تھی۔ آج میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں وہ لڑکا بھی ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔ تم جاؤ، میں آج چین کی نیند سوؤں گا (بڑھیا سے) ذرا ایک چلم اور لاؤ۔ بابو صاحب کی سب صاحبی نکل جائے گی۔ میرا کیا بگڑا جہاں چھ گئے تھے ایک اور گیا تھا، تو راج سونا ہو جائے گا۔ اسی لڑکے کے لیے لوگوں کے گلے دبا دبا کر روپے جمع کر رہے تھے نا؟ ایک بار جاؤں گا، کچھ دن بعد مزاج پوچھنے۔"

آدمی چلا گیا۔ بوڑھا کواڑ بند کر کے چلم پینے لگا۔

بڑھیا نے کہا:۔ "اتنی رات گئے، جاڑے پالے میں اتنی دور کون جائے گا۔"

"ارے دوپہر بھی ہوتی تو میں نہ جاتا۔ سواری دروازے پر آتی تو بھی نہ جاتا۔ پنا کی صورت آج بھی آنکھوں میں گھوم رہی ہے۔ اس ظالم نے ایک نظر دیکھا بھی نہیں کیا میں نہ جانتا تھا کہ وہ بچے گا نہیں۔ چڈھا بھگوان نہ تھے۔ دل کی تڑپ تھی جو دوڑا گیا تھا۔ ایک نظر دیکھ لینے تسلی ہو جاتی۔

اسّی سال کی عمر میں بھگت کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ وہ سانپ کے کاٹنے کی سن کر بیٹھا رہ گیا۔ جاڑوں کی اندھیری رات، گرمی کی دھوپ اور لو، برسات کے چڑھے ہوئے ندی نالوں کی اس نے کبھی پروا نہ کی۔ وہ فوراً گھر سے نکل پڑتا تھا۔ اسے لالچ نہ تھا۔ اس نے سیکڑوں کو نا امیدی کے بعد زندگی دی تھی۔ زندگی کی قیمت کون دے سکتا ہے یہ ثواب کا کام تھا۔ لیکن آج بھگت سانپ کے کاٹنے کی خبر سن کر سونے جا رہا تھا۔

بڑھیا لیٹ چکی تھی بھگت نے کپی بجھائی تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا پھر لیٹ گیا۔ سانپ کے کاٹنے کی خبر جیسے اس کے دل پر ڈنک مار رہی تھی۔ اس کا دل ملامت کرنے لگا۔ ڈاکٹر ظالم ہے، بھگت کیا تم بھی ظالم ہو؟ اسے پسینہ آنے لگا۔ ایسا محسوس کرنے لگا جیسے کوئی اسے باہر کی طرف دھکیل رہا ہو۔ بڑھیا خراٹے لینے لگی بوڑھے باتیں کرتے کرتے سو جاتے ہیں۔ اور ذرا سی آہٹ پر جاگ جاتے ہیں بھگت اٹھا اپنی لاٹھی اٹھائی اور دھیرے سے کواڑ کھولے

"کہاں جاتے ہو؟ ۔" بڑھیا نے پوچھا
"کہیں نہیں، دیکھتا تھا کتنی رات گئی ہے۔ نیند نہیں آتی۔"

"نیند کاہے کو آئے گی۔ دل تو چڈھا کے گھر پر لگا ہوا ہے۔"

"چڈھا نے میرے ساتھ کون سی نیکی کی ہے جو وہاں جاؤں۔ وہ آ کر پیروں پڑے تو بھی نہ جاؤں۔"

"اٹھے تو تم اسی ارادے سے تھے۔"

"نہیں ری، میں پاگل ہوا ہوں جو میرے لیے کانٹے بوئے میں اس کے لیے پھول بوتا پھروں۔"

بڑھیا پھر سو گئی، بھگت نے کواڑ بھیڑ دیے اور آکر بیٹھ گیا۔ بھگت کا دل اس ابھاگے (بدقسمت) نوجوان کے پاس تھا جس کے لیے ایک پل کی دیر بھی خطرے سے خالی نہ تھی۔

بھگت اٹھا، چپکے سے کواڑ کھولے۔ باہر نکلا، بڑھیا سوتی رہی، کوئی ایک بجا ہوگا۔ گاؤں کا چوکیدار پہرا دے رہا تھا۔ اس نے بھی ڈاکٹر چڈھا کے لڑکے کو سانپ کے کاٹنے کی خبر دی۔ دس ہزار روپے انعام کی بات کہی جانے کی سفارش کی۔

بوڑھے نے صاف انکار کر دیا:۔ "دس ہزار تو کیا، دس لاکھ بھی دیں تو میں نہ جاؤں۔ میں کیا کروں گا روپے لے کر۔ آج مر جاؤں، کل روپے یاروں کے۔"

چوکیدار چلا گیا، بھگت نے قدم آگے بڑھائے۔ بھگت پر اب جیسے نشہ سوار تھا۔ نشے میں آدمی کا بدن قابو میں نہیں ہوتا۔ قدم رکھتا کہیں ہے جاتا کہیں ہے۔ بولنا چاہتا کچھ اور ہے زبان سے نکلتا کچھ اور ہے، جس نے تلوار کبھی نہیں چلائی، ارادہ کرنے پر بھی نہیں چلا سکتا۔

بھگت لاٹھی کھٹ کھٹ کرتا تیز تیز قدم دھرتا چلا جا رہا تھا۔ آدھا راستہ گیا ہوگا کہ یکایک رک گیا: ارے میں کہاں جا رہا ہوں۔ مجھے کسی کے مرنے جینے سے کیا مطلب، میری کسی نے پرواہ کی تھی کہ میں کسی کے لیے مرتا پھروں۔"

گھوڑا جب اڑنے لگے تو اسے پھیر دو، پھر وہ ہوا سے باتیں کرنے لگے گا۔ عقل نے اس کی لگام موڑی:۔ "تم جھاڑ پھونک کے لیے تھوڑا ہی جا رہے ہو بھگت! تم تو جا رہے ہو یہ دیکھنے کہ امیر لوگ کس طرح روتے ہیں، سر پیٹتے ہیں پچھاڑیں کھاتے ہیں یا صبر کر جاتے ہیں، وہ تو پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔" وہ پھر آگے بڑھا۔

دو آدمی ادھر سے بولتے آ رہے تھے:۔ "ڈاکٹر چڈھا کا گھر اجڑ گیا، یہی ایک لڑکا تھا۔ بڑا سیدھا اور ہونہار تھا۔"

بوڑھے کے قدم اور تیز ہو گئے۔ تکان سے قدم نہ اٹھتے تھے۔ پر پتا نہیں کون سی طاقت اسے دھکیلے لیے جا رہی تھی۔ تھوڑی دور اور چلا ہوگا کہ ڈاکٹر کا بنگلہ دکھائی دیا۔ بجلی جل رہی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ بھگت کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا، کہیں آنے میں دیر تو نہیں ہو گئی؟ وہ دوڑنے لگا۔ اپنی عمر میں وہ اتنا کبھی نہیں دوڑا تھا۔

(۴)

۲ بج چکے تھے۔ مہمان جا چکے تھے۔ گھر کے لوگ رو پیٹ کر تھک چکے تھے۔ آسمان کے تارے اب بھی رو رہے تھے لوگوں کو صبح کا انتظار تھا کہ صبح ہو تو لاش کو گنگا کی گود میں دے دیا جائے۔

اتنے میں بھگت نے آواز دی۔ ڈاکٹر صاحب سمجھے کوئی مریض ہے اور دن ہوتا تو دھتکار دیتے، مگر آج باہر نکل آئے۔ دیکھا ایک بوڑھا ہے۔ کمر جھکی ہوئی، پوپلا منہ، بھویں سفید۔ لاٹھی ہاتھ میں لیے کھڑا کانپ رہا ہے۔

"کیا ہے، آج تو ہم پر ایسی مصیبت پڑی ہے کہ کچھ کہتے نہیں بنتا، پھر کبھی آنا۔"

"سن چکا ہوں بابوجی، اسی لیے تو آیا ہوں۔ بھیا کہاں ہیں، ذرا میں بھی دیکھ لوں۔ خدا بڑا رحم کرنے والا ہے، ہو سکتا ہے اسے رحم آ جائے۔"

"چلو دیکھ لو مگر کئی گھنٹے ہو چکے ہیں۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ بہت سے جھاڑنے پھونکنے والے دیکھ کر جا چکے۔" ڈاکٹر نے بہت نرم لہجے میں کہا اور اس خیال سے کہ بوڑھے کا دل نہ ٹوٹے اسے اندر لے گئے۔

بھگت نے لاش کو ایک منٹ دیکھا پھر مسکرا کر بولا:— "ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے بابوجی! خدا نے چاہا تو بھیا آدھے گھنٹے میں اٹھ بیٹھیں گے۔ آپ دل چھوٹا نہ کیجیے بابوجی! کہاروں سے کہیے پانی تو بھریں۔"

پائپ بند ہو چکا تھا۔ کہار کم تھے۔ جو مہمان رہ گئے تھے باہر کے کنویں سے پانی بھر بھر کے کہاروں کو دے رہے تھے اور کیلاش کو نہلا رہے تھے، بوڑھا بھگت مسکرا مسکرا کر منتر پڑھ رہا تھا جب ایک منتر ختم ہوتا تو بوڑھا ایک جڑی کیلاش کی ناک کے سامنے لے جاتا۔ نہ جانے کتنے گھڑے کیلاش کے سر پر انڈیلے گئے اور نہ جانے کتنی بار بھگت نے کیلاش پر منتر پھونکا۔ یکایک کیلاش نے لال لال آنکھیں کھولیں۔ پھر انگڑائی لی، پھر پینے کو پانی مانگا۔ ڈاکٹر صاحب خود پانی لینے دوڑے۔ ان کی بیوی بھگت کے پیروں پر گر پڑی۔ کسی نے پوچھا: "اب کیسی طبیعت ہے کیلاش؟"

منٹوں کے منٹ میں یہ خبر چاروں طرف پھیل گئی۔ دوست احباب مبارک باد دینے آنے لگے ڈاکٹر چڈھا بڑی ملائمت سے ہر ایک کے سامنے بوڑھے کے کمال کا ذکر کرتے پھر رہے تھے۔ سب لوگ بھگت کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو اٹھے۔ مگر اندر باہر بھگت کا کہیں پتا نہ تھا۔ نوکروں نے کہا:

"ابھی تو یہیں بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ ہم لوگوں نے تمباکو دی تو نہیں لی۔ اپنے پاس سے نکال کر بھری۔"

یہاں چاروں طرف بھگت کی تلاش ہو رہی تھی اور بھگت جلد جلد قدم مارتا چلا جا رہا تھا کہ بڑھیا کے جاگنے سے پہلے وہ گھر پہنچ جائے۔

سب لوگ چلے گئے تو ڈاکٹر چڈھا نے بیوی سے کہا —" وہ بوڑھا جانے کہاں چلا گیا؟ ایک چلم تمباکو کا بھی روادار نہ ہوا۔"

"ارے میں نے تو سوچا تھا کہ اسے ایک بڑی رقم دوں گی"

(باقی صفحہ ۲۱ پر)

اظہار اشرف

سائنس کیا ہے

فطرت کے رازہائے سربستہ کے بارے میں کسی ترتیب و ضابطہ کے ساتھ معلومات حاصل کرنے کو سائنس کہا جاتا ہے۔ "سائنس" اگرچہ انگریزی زبان کا لفظ ہے لیکن لاطینی زبان کا لفظ Scio سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں "جاننا" اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مادّی کائنات کے بارے میں کسی اصول اور ضابطے کے ساتھ علم حاصل کرنے کا نام سائنس ہے۔

ہماری کائنات اس قدر عظیم ہے کہ سائنس کی اس قدر ترقی کے باوجود ہم ابھی تک پوری کائنات کو نہیں سمجھ پائے۔ کائنات کے ایک "خورد بینی" ذرہ (وہ ذرہ جسے صرف خورد بین سے ہی دیکھا جا سکتا ہے) سے لے کر کہکشاؤں تک کو سمجھنے کے لیے سائنس کے کئی بنیادی شعبے بنائے گئے ہیں تاکہ الگ الگ شعبوں میں لوگ علم حاصل کرکے نتائج نکال سکیں اور فطرت کو سمجھ سکیں۔ سائنس کے ان بنیادی شعبوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

علم طبیعیات:۔ (PHYSICS) مادّہ کے عمل اور رد عمل، روشنی اور توانائی سے متعلق سائنس کا علم۔

علم کیمیا: (CHEMISTRY) کائنات میں پائے جانے والے عناصر اور ان کے مرکبات سے متعلق علم۔

علم الحیات یا حیاتیات: (BIOLOGY) کرۂ ارض پر پائی جانے والی مختلف اقسام کی "حیات" کا علم۔

علم فلکیات: (ASTRONOMY) کہکشاؤں، ستاروں، سیاروں سے متعلق علم۔ ان چار بنیادی سائنسی علوم سے ہٹا کر سائنس کی بے شمار شاخیں وجود میں آ چکی ہیں مثلاً جیولوجی، فزیولوجی، میٹیوررولوجی، کاسمولوجی، آپٹیکس، پایونکس، جے نی ٹکس وغیرہ وغیرہ

ان علوم کے ماہرین کو سائنس داں کہا جاتا ہے (عام طور پر ایک سائنس داں ایک ہی علم میں مہارت حاصل کر پاتا ہے) فطرت کے بارے میں باضابطہ طور پر علم حاصل کرنے کے بارے میں پندرھویں صدی کے ایک سائنس داں بیکن نے (جو جدید تجرباتی سائنس کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے) کہا ہے۔

"ایک سائنس داں کے لیے ضروری ہے کہ پہلے وہ بغور مشاہدہ کرکے حقائق جمع کرے اس کے بعد ایک نظریہ بنائے جو اُن حقائق کو ایک لڑی میں پرو سکے اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کی وضاحت کر سکے۔ اُس کے بعد مسلسل تجربات سے یہ ثابت کرے کہ اس کا نظریہ غلط ہے یا درست۔"

سائنس میں اگرچہ بہت سی دریافتیں اور ایجادیں کسی حادثے یا اتفاق کے باعث ہوئی ہیں لیکن ان دریافتوں اور ایجادات کو بھی اصول اور ضابطہ سے سمجھے بغیر کوئی بنیادی نظریہ نہیں بنایا جا سکتا۔ سائنس کسی مخصوص دور کا علم نہیں، نہ ہی کسی ایک یا چند اشخاص کی میراث ہے۔ بلکہ سائنس ایک مسلسل جاری رہنے والے عمل کا نام ہے۔ ہزاروں برس

سے انسان جو کچھ اپنے مشاہدات اور تجربات سے سیکھتا آیا ہے، آنے والی نسلیں ان مشاہدات اور تجربات میں مزید اضافہ کے ساتھ اپنے سے آگے، آنے والی نسلوں کے حوالے کر دیتی ہیں اس طرح علم و عمل کا تسلسل سائنس کو نظریاتی شکل میں ڈھلنے کا سبب بنتا ہے۔
مثلاً ہزاروں سال پہلے کسی نے پہیہ بنایا اسی پہیے سے گاڑی بنی پھر اس پہیے کو مشین میں استعمال کیا جانے لگا۔ چنانچہ آج جس قدر جدید مشین، موٹریں، اور ریلیں وغیرہ ہیں اسی پہیے کی وجہ سے ہیں۔ اگر کوئی ذہین شخص پہیہ ایجاد نہ کرتا تو ہمیں آج یہ آسائشیں میسر نہ ہوتیں جو سائنس کے بتدریج ارتقا کے باعث ہمیں حاصل ہیں۔

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ جب انسان غاروں میں رہتا تھا تو چاند اور سورج دونوں ہی انسان کے لیے حیرت کا باعث تھے۔ کیونکہ سورج دن میں روشنی اور حرارت دے کر رات کو غائب ہو جاتا تھا اور چاند رات کی تاریکی میں کچھ مدت تک چمکتا تھا اور پھر آہستہ آہستہ غائب ہو جاتا تھا پھر انھوں نے مشاہدہ کیا کہ چاند چودہ[14] دن میں آہستہ آہستہ بڑھ کر پورا گولا بن جاتا ہے اور چودہ[14] دن میں ہی گھٹ کر چھپ جاتا ہے۔ یہ مشاہدہ علم فلکیات کی ابتدا تھا۔ جوں جوں زمانہ گذرتا رہا نئی نسلیں آتی رہیں اور اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر اس علم میں اضافہ کرتی رہیں۔ حتیٰ کہ سب سے پہلے یونان کے ایک ماہر نجوم تھیلز نے پہلی بار مستقبل میں ہونے والے چاند گرہنوں کی پیشین گوئی کرنا شروع کی۔ اس کے بعد پولینڈ کے مشہور سائنس داں کوپرنیکس نے دنیا کو بتایا کہ زمین اور دوسرے سیارے سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ اس طرح نسل در نسل یہ سائنس ترقی کرتے کرتے آج اس منزل میں آگئی ہے کہ انسان اُس چاند کی سطح پر قدم رکھ چکا ہے جو کبھی دیوتا مانا جاتا تھا۔

یہ ارتقا کبھی رُکا نہیں بلکہ جاری ہے۔ کیوں جانتا ہے کہ مستقبل میں فلکی سائنس کیا صورت اختیار کرے۔ وہ انسان جو آج اپنی دنیا کا قیدی ہے ممکن ہے مستقبل میں کائنات میں پھیلے ہوئے دوسرے سیاروں تک پہنچ جائے اور پھر وہاں سے دوسری کہکشاؤں تک پہنچنے کے منصوبے بنانے شروع کر دے۔

غرض یہ کہ سائنس کسی رک جانے والے یا ختم ہو جانے والے علم کا نام نہیں، بلکہ یہ علم مسلسل آگے بڑھتا رہتا ہے اور انسان کے سوچنے سمجھنے کے لیے نئے نئے دروازے کھولتا رہتا ہے۔ آنے والی ہر نسل گذشتہ نسل کے علم میں اضافہ کرتی ہے اور سائنس کو ارتقا کی اگلی منزل کی طرف لے جاتی ہے۔

مادّہ کیا ہے؟

ہمیں اپنے گرد و پیش اور پوری کائنات کا علم اور احساس مادّہ اور توانائی (ENERGY) کے عمل سے اس وقت ہوتا ہے جب یہ چیزیں ہمارے حواسِ خمسہ کو متاثر کرتی ہیں (حواس خمسہ سونگھنے، سُننے، چکھنے، دیکھنے اور چھونے کی حسوں یعنی قوتوں کو کہا جاتا ہے) مثلاً ہماری قوتِ ذائقہ اور قوتِ شامہ (چکھنے اور سونگھنے کی حس) مادہ کے براہ راست تعلق سے متاثر ہوتی ہیں۔ کیوں کہ زبان پر کوئی چیز براہ راست رکھ کر اس کا ذائقہ محسوس کرتے ہیں اور گیس کی شکل میں کسی چیز کو سونگھ کر اس کی "بو" پہچانتے ہیں۔ اس کے برخلاف ہماری قوّت باصرہ اور قوت سامعہ یعنی دیکھنے اور سُننے کی قوتیں توانائی سے متاثر ہوتی ہیں جو مادّہ کی ہی دوسری شکل ہے۔ مثلاً روشنی کی لہروں کے ذریعے ہم کسی شے کو دیکھتے ہیں اور آواز کی لہروں سے ہم مختلف آوازیں سنتے ہیں۔ ہماری پانچویں حس قوتِ لامسہ یعنی کسی شے کو چھو کر پہچاننے کی قوت بیک وقت مادہ اور توانائی دونوں سے متاثر ہوتی ہے۔ مثلاً

باقی صفحہ ۳۴ پر

ہم انگلیوں سے چھوکر مادّے کی موجودگی محسوس کرتے ہیں ۔ اس کے ساتھ ہی سورج کی گرمی اپنے جسم پر محسوس کرتے ہیں، توانائی کا احساس ہوتا ہے ۔ انھیں حواسِ خمسہ کے عمل اور ردّ عمل سے انسان نے نتائج نکال کر کائنات کو سمجھا ہے اور علمِ سائنس کی بنیاد رکھی ہے ۔ ایک بات یہاں سمجھ لینی ضروری ہے کہ مادّہ اور توانائی دو الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ توانائی بھی مادّہ کی ہی ایک شکل کا نام ہے جس کے بارے میں تفصیل سے ہم آگے بتائیں گے ۔

مادّے کے بارے میں سائنس دانوں کا نظریہ یہ ہے کہ زمین، چاند، ستارے، سورج اور کہکشائیں غرض اس کائنات کی ہر شئے مادّے سے بنی ہے ۔ ہماری زمین پر درخت، انسان، جانور، کیڑے مکوڑے سمندر، پہاڑ وغیرہ بھی اسی مادّے سے وجود میں آئے ہیں ۔

آپ اس رسالے کے جس ورق کو پڑھ رہے ہیں یہ بھی مادّہ ہے، اس پر چھپے ہوئے حروف کی روشنائی بھی مادّہ ہے ۔ آپ کے کمرے میں کرسی، میز، قلم، خود آپ کے جسم کا ہر عضو مادّہ ہے ۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مادّہ کیا ہے ؟

یہ بات سمجھنے کے لیے آپ کو ذرا خوردبین استعمال کرنی پڑے گی ۔ یہ صفحہ جو آپ پڑھ رہے ہیں آپ کو بظاہر ایک مسلسل شئے نظر آتا ہے یعنی یہ پورا صفحہ صرف ایک ٹکڑے کی صورت میں آپ کے سامنے ہے ۔ لیکن اگر آپ اس صفحہ کے کسی بھی حصّہ کو کسی معمولی سی خوردبین کے نیچے رکھ کر دیکھیں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ دراصل یہ صفحہ باریک باریک ریشوں کا مجموعہ ہے ۔ یہ ریشے دراصل لکڑی یا گھاس پھوس ہیں جن کو گلا کر اور کوٹ کر یہ کاغذ بنایا گیا ہے ۔ یہ اس قدر قریب قریب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں کہ ہمیں ایک ہموار اور مسلسل تختے کی شکل میں نظر آتے ہیں ۔

عام خوردبین سے دیکھنے کے بعد اگر آپ ان ریشوں کو بھی کسی بہت طاقتور خوردبین کے نیچے رکھ دیں جو ان کو کم از کم ایک لاکھ گنا بڑا کر کے دکھا سکے ۔ (ایسا صرف الیکٹرانک خوردبین سے ممکن ہے) تو آپ دیکھیں گے کہ یہ ریشے بھی کوئی مسلسل شئے نہیں ہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے ذرّات سے مل کر بنے ہیں ۔ ان ہی ننھے ننھے ذرّات کو "ایٹم" کہا جاتا ہے ۔ اس مثال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مادّہ کوئی مسلسل شئے نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے ذرّات کا مجموعہ ہے ۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر آپ کچھ اور زیادہ طاقتور خوردبین استعمال کر سکیں تو آپ کو پتا چلے گا کہ خود ایٹم بھی بہت ہی ننھے ننھے ذرّات کا مجموعہ ہے ۔ چنانچہ جدید نظریہ کے مطابق مادّہ نظر نہ آنے والے بہت ہی باریک باریک ذرّات کا مجموعہ ہے اور انھیں ایٹمی ذرّات کے عمل اور ردِّ عمل سے مادّہ توانائی میں یا توانائی مادّے میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں ۔ یہی مادّہ حالات کے مطابق اپنی شکلیں تبدیل کرتا رہتا ہے ۔ مثلاً جب ہم لکڑی کو جلاتے ہیں تو لکڑی کے مادّے میں مختلف عناصر کے ایٹموں پر مختلف ردِّ عمل ہوتے ہیں ۔ اور وہ مادّہ جو لکڑی کی صورت میں یکجا تھا ۔ عناصر کی شکل میں بکھرنا شروع ہو جاتا ہے ۔ کچھ مادّہ گیس بن کر فضا میں شامل ہو جاتا ہے اور کچھ راکھ بن کر رہ جاتا ہے ۔

یا جب ہم کھیتوں میں کھاد ڈالتے ہیں تو اناج کے پودے کھاد میں شامل کیمیاوی عناصر کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں، اس طرح کھاد کا بہت سا اہم حصّہ اناج میں مل جاتا ہے یعنی مادّہ ایک شکل سے دوسری شکل اختیار کر لیتا ہے ۔

مادّہ کی تین شکلیں عام طور پر ہر شخص جانتا ہے ۔

باقی صفحہ ۴۲ پر

جلیل اشرف

بازار میں طبیعت نہ لگی اور میں خلاف توقع شام ہوتے ہی گھر لوٹ آیا۔ سوچ رہا تھا کہ کچھ دیر بھابی اور بچوں کے بیچ [illegible] وقت گزار لوں گا۔ لیکن جیسے ہی گھر میں قدم رکھا بچوں نے آپس میں کچھ کانا پھوسی کی۔ تھوڑی دیر کے بعد جولی اپنی نگرانی میں بچوں کی جماعت کو لے کر میرے پاس آئی اور بہت ہی معصومیت سے بچوں کی مانگ کو شکایت بھرے لہجے میں میرے سامنے پیش کیا، جولی بولی ــــ ،، اشرف انکل! کئی بار آپ ہم لوگوں سے کہانی سن چکے ہیں۔ لیکن جب آپ کی باری آتی ہے۔ تب ہمیشہ چکمہ دے کر نکل جاتے ہیں۔ مگر آج آپ کو کہانی سنانا پڑے گی۔ ہم بچوں نے فیصلہ کیا ہے کہ بغیر کہانی سُنے آپ کو نہیں چھوڑیں گے "۔ سبھی بچوں نے یک زبان ہو کر جولی کی تائید کی۔ ابھی میں کوئی فیصلہ بھی نہ کر پایا تھا کہ سیما، جاوید، ولی، نکہت، چنو اور پونم، میرے چاروں طرف پھیل کر دائرے میں بیٹھ گئے۔

آج کہانی سنائے بغیر نجات پانا مشکل ہے۔ میں نے طے کیا کہ ایک چھوٹی سی کہانی سنا کر پیچھا چھڑا لوں اور اپنا فیصلہ سناتے ہوئے بچوں سے کہا ــــ " پیارے بچو! ،، آج میں تم لوگوں کی فرمائش ضروری پوری کروں گا "، ابھی میں اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ سبھی بچوں نے تالی بجا کر میرے نام پر زور سے ایک نعرہ بلند کر دیا۔ میں نے ان لوگوں کو خاموش کرتے ہوئے کہا ــــ " لیکن ایک شرط ہے وہ یہ کہ کہانی سنانے کے بعد میں کسی بھی بچے کا امتحان لوں گا۔ کہ کس نے اس کہانی سے سبق حاصل کیا۔ بولو شرط منظور ؟

،، منظور ،، سبھوں نے حامی بھر دی۔

اور میں کہانی سنانے لگا۔

پیارے بچو! ذرا دھیان سے سنو، بہت پہلے کی بات ہے کہ کسی جنگل میں ایک شیر رہتا تھا۔ وہ بہت طاقت ور اور خونخوار تھا۔ وہ جنگل کا راجا تھا۔ اُسی جنگل میں ایک گیدڑ بھی رہتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت عقل مند سمجھتا تھا اسی لیے وہ اپنی برادری کے لوگوں سے سیدھے مُنھ بات نہ کرتا تھا۔ اس نے اپنی برادری کے لوگوں کو چھوڑ کر جنگل کے راجا سے دوستی کرنے کی ٹھانی۔ گیدڑ کئی دنوں تک شیر سے ملاقات کرنے کے لیے جنگل میں اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا مگر ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ چہل قدمی کر رہا تھا کہ اتفاق سے شیر دکھائی دیا۔ گیدڑ بہت ہمت کر کے ڈرتے جھجکتے شیر کے نزدیک پہنچا اور بہت ہی ادب سے شاہی انداز میں آداب بجا لایا اور پوچھا خیریت ہے نا عالم پناہ ؟

شیر گیدڑ کی اس ادا سے بہت خوش ہوا اور اس نے اُسے اپنا ساتھی بنالیا۔ اب وہ دونوں گہرے دوست ہو گئے اور ایک ساتھ رہنے لگے۔ ایک ہی ساتھ گھومنے پھرنے کو نکلتے۔ ایک دن، دونوں نے شکار کا پروگرام بنایا۔ اور شکار کو نکلے۔ گیدڑ بہت خوش تھا وہ راستہ

پھر سوچتا جا رہا تھا کہ اب ہمیشہ بڑھیا بھوجن ملا کرے گا۔ کچھ دور چلنے کے بعد شیر نے ایک بھینسے کو مار گرایا اور بادشاہ نے اس کو تین حصوں میں بانٹ دیا۔ اس کے بعد اس نے کہا —— میں جنگل کا بادشاہ ہوں۔ اس لیے ایک حصہ تو میرا بحیثیت بادشاہ کے ہے۔ دوسرا حصہ میرا اس لیے ہوا کہ میں نے شکار کیا ہے۔ تیسرے حصے کے بارے میں یہ بات ہے کہ ہم اور تم کشتی لڑ کر دیکھ لیں، جو جیت جائے گا تیسرا حصہ اس کا ہوگا۔"

گیدڑ یہ سن کر اداس ہوگیا اور وہاں سے خاموش چلا آیا۔

کہانی ختم اب میری باری ہے۔ اب تم لوگ یہ بتاؤ کہ اس کہانی سے کیا سیکھا۔ میں کہانی سنانے کے درمیان دیکھ رہا تھا کہ جولی کہانی سننے کے بجائے اونگھ رہی ہے جب جواب دینے کی باری آئی تو پہلو بچانے لگی۔ میں نے پہلا سوال اسی سے پوچھا۔ مگر وہ ٹھیک سے جواب نہ دے سکی صرف اتنا کہا —— "کوا چلا ہنس کی چال۔"

اول ہوں —— اور میں نے دیکھا جاوید کا بھی رنگ آج کچھ اڑا سا ہے۔ میں نے دوسرا سوال جاوید سے کیا۔ اور اس نے بہت معصومیت کے ساتھ کہا۔ "انکل —— ذرا ٹھہریے مجھے جادو کا ڈنڈا مل جائے تو میں شیر اور گیدڑ بن کر دیکھوں گا اور تب میں آپ کے سوال کا جواب دوں گا۔" سارے بچوں کے ساتھ میں بھی ہنس پڑا۔

اس کے بعد سیما کی باری تھی۔ اس نے چند لمحوں تک سوچا پھر بولی۔

"انکل میں نے تو یہ سبق سیکھا کہ ظالم کی دوستی پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔"

ناوک حمزہ پوری

ہمارے فرائض

یہ باتیں ہیں کام کی اے عزیز
عمل کر کے ان پر بنو باتمیز

نہ ٹالو کبھی حکم ماں باپ کا
برا کام ہے، یہ بڑے پاپ کا

بڑھاپے میں اُن کو نہ "اف" بھی کہو
انھیں ہر طرح راضی و خوش رکھو

کرو رشتہ داروں سے اچھا سلوک
یہ ہے نیک کام اس سے جانا نہ چوک

نہ تکلیف کوئی، پڑوسی کو دو
اگر ہو سکے اس کی خدمت کرو

برابر ہیں سارے صغیر و کبیر
نہ سمجھو کبھی دوسروں کو حقیر

نہ گالی بکو، ہو اگر عقلمند
نہ پہنچاؤ ہرگز کسی کو گزند

ہمیشہ بزرگوں کی عزت کرو
جو چھوٹے ہوں ان سے محبت کرو

برائی کسی کی جو معلوم ہو
کسی سے نہ ذکر اس کا ہرگز کرو

بھلے کام پر سب کو اکسائیو
برے کام سے روکیو بھائیو!

کرو رحم تم سارے ذی روح پر
ہو وہ آدمی یا کہ ہو جانور

یہ کچھ باتیں ناوک اگر مان لو
بھلا ہوگا اپنا ہی یہ جان لو

م۔ ندیم علیگ

کودار

راجا۔ وزیر اعظم۔ سپاہی۔ درباری۔ دو عورتیں
اور ایک بچہ۔

پہلا منظر

(راجا کا دربار لگا ہوا ہے۔ راجا تخت پر بیٹھا ہے۔
اس کے سر پر مکٹ ہے۔ گلے میں موتیوں کی مالائیں
پڑی ہیں۔ بھڑکدار لباس پہنے ہوئے ہے۔ دو
نوکر مورچھل جھل رہے ہیں، سامنے قطاروں میں
درباری کھڑے ہوئے ہیں۔)

راجا:۔ کوئی مقدمہ ہو تو پیش کیا جائے۔
(دو عورتیں آتی ہیں۔ ایک کی گود میں بچہ ہے۔
ہے آگے آگے سپاہی ہے)

سپاہی:۔ (ادب سے سر جھکا کر) مہاراج کی جے ہو!

راجا:۔ ان عورتوں کے ساتھ کیا ظلم ہوا ہے کس نے
ان کو ستایا ہے؟

سپاہی:۔ مہاراج کی جے ہو! مہاراج کی نگری میں ایک
بھی ظالم نہیں رہا۔ چور، اچکے، ڈاکو بھی نہیں۔
ٹھگ، کم تولنے والے، رشوت خور اور جعلساز
سب نگری چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں، جنتا چین

پھیلا کر سوتی ہے اور مہاراج کو دعائیں دیتی
ہے۔

راجا:۔ پھر ان عورتوں کو کس نے ستایا ہے اور اُن کی
گود میں یہ معصوم بچہ مجھ سے کس ظلم کی فریاد کرنے
آیا ہے؟

سپاہی:۔ مہاراج بات یہ ہے کہ یہ دونوں عورتیں آپس
میں لڑ رہی تھیں....

راجا:۔ کیا صرف دو عورتوں کی لڑائی سے ہماری نگری
کے امن کو خطرہ ہو سکتا ہے؟

سپاہی:۔ مہاراج! ان دو عورتوں کی لڑائی میں ایک
معصوم بچہ کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ لڑائی کا
سبب یہ معصوم بچہ ہی ہے۔

راجا:۔ وہ کیسے؟

سپاہی:۔ یہ دونوں عورتیں اس بچے کو اپنا بچہ بتاتی ہیں۔

راجا:۔ واہ، اس میں لڑنے کی کیا بات ہے۔ میں سمجھتا
ہوں، یہ بچہ بڑا ہی خوش قسمت ہے۔ اسے دو مائیں
مل کر پرورش کریں گی۔

سپاہی:۔ نہیں مہاراج بچے کو دو مائیں مل کر نہیں پال
سکتیں۔ کیوں کہ ایک اصلی ہے اور دوسری

نقلی۔ ایک پورب میں رہتی ہے اور دوسری پچھم میں۔

راجا:۔ یعنی انسان کے بچے سے جانور کا بچہ اچھا ہوتا ہے۔ (وزیر کی طرف مخاطب ہوکر) کیوں منتری جی کیا خیال ہے آپ کا۔

وزیراعظم:۔ ہاں مہاراج! آپ سچ فرماتے ہیں۔ جانور کے بچے کو دو انسان مل کر پال سکتے ہیں لیکن انسان کے ایک بچے کو مل کر دو عورتیں نہیں پال سکتیں۔

راجا:۔ پس ثابت ہوا کہ بعض معاملوں میں جانور انسان سے برتر ہیں۔

وزیراعظم:۔ اتفاق ہے مہاراج ....!

راجا:۔ (ایک عورت سے مخاطب ہوکر) کیا یہ تمہارا ہی بچہ ہے۔

عورت:۔ ہاں مہاراج، یہ میرا ہی بچہ ہے۔ مجھے دلوا دیجیے.....

دوسری عورت:۔ نہیں مہاراج، یہ میرا بچہ ہے۔ یہ عورت ڈائن ہے، میرے بچے کو مار ڈالنا چاہتی ہے۔ بھگوان کے لیے انصاف کیجیے۔

راجا:۔ معاملہ گمبھیر ہے (ذرا دیر سوچتا ہے.... پھر وزیراعظم کے کان میں کچھ کہتا ہے، وزیر سر ہلاتا ہے) خوب، خوب، بہت مناسب حل ہے (چٹکی بجا کر) چونکہ بچہ ایک ہی ہے اور اس کی مائیں دو ہیں، اس لیے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ بچے کے دو برابر برابر ٹکڑے کردیے جائیں اور دونوں کو دیدیے جائیں

وزیراعظم:۔ بالکل ٹھیک ہے مہاراج!

راجا:۔ (ہنستا ہے) جلاد کو فوراً حاضر کیا جائے۔ (ایک عورت سے مخاطب ہوکر) کیوں کیا ہمارا فیصلہ تم کو منظور نہیں۔

عورت:۔ (سہم کر) مہاراج کا انصاف سر آنکھوں پر، آپ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ مجھے منظور ہے، بھلا میں آپ کے فیصلے کو نہ مانوں گی۔

دوسری عورت:۔ (بلک بلک کر روتی ہے) نہیں مہاراج رحم کیجیے، میرے بچے کو نہ ماریے۔

راجا:۔ (ناراض ہوکر) تیری یہ مجال کہ ہمارے فیصلے کو للکارے.... ہم جو فیصلہ کرتے ہیں خوب سوچ بچار کر کرتے ہیں۔

عورت:۔ (ہاتھ جوڑ کر) مہاراج، آپ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیے، کیا کوئی ماں اپنے بچے کے ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھ سکتی ہے۔ میں یہ نہیں ہونے دوں گی"
— میرا لال جیتا رہے۔ اسے اس بے ایمان عورت کو دے دیجیے مہاراج، لیکن بھگوان کے لیے دیا کیجیے اس کے دو ٹکڑے نہ کیجیے۔ میں اپنے لال کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی، کبھی نہیں دیکھ سکتی۔

راجا:۔ (مسکرا کر) تیری ہمت اور بے باکی سے ہم بہت خوش ہوئے، تو سچ کہتی ہے کوئی بھی ماں اپنے بچے کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے ہوئے کبھی نہیں دیکھ سکتی۔ میں تو صرف یہ پرکھنا چاہتا تھا کہ کون اصلی

ماں ہے اور کون نقلی۔ تو ہی اصلی ماں ہے۔
(حکم دیتا ہے) بچے کو اس کی اصلی ماں کے سپرد کیا جائے اور نقلی ماں کو قید خانے میں ڈال دیا جائے ہماری نگری میں ہمارے ہوتے ہوئے کسی کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔

(سارے درباری نعرہ لگاتے ہیں)

"مہاراج کی جے ہو۔"

راجا:- نہیں.... کہو" انصاف کی جے ہو۔"

درباری:- انصاف کی جے ہو، مہاراج کی جے ہو۔

(پردہ گرتا ہے)

آریہ بھٹ بقیہ ص ۳۲ سے

میں دوسری یونٹوں کو چالو کرنے وغیرہ کے بارے میں ہو سکتی ہیں۔
آریہ بھٹ کو ہدایات دینے اور معلومات وصول کرنے کا ابتدائی زمینی اسٹیشن مدراس سے ۱۰۰ کلومیٹر شمال میں اندھرا پردیش کے سری ہری کوٹہ کے مقام پر واقع ہے
آریہ بھٹ کو فضا میں چھوڑنے کا مقصد بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد ٹکنالوجی کے میدان میں سودیشی مہارت حاصل کرنا ہے۔ بچو! تمہیں معلوم ہوگا کہ ہمارا ملک ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ اس کا رقبہ کافی بڑا اور آبادی کثیر ہے۔ ملک کی معاشی اور سماجی اور تمدنی سرگرمیوں کے شعبوں میں خلا سے متعلق تحقیقی سرگرمیوں کا گہرا اثر پڑتا ہے سیٹے لائٹ یعنی مصنوعی سیارے سے متعلق ٹیکنالوجی کے استعمال سے بالخصوص ہماری ترقی کے تین شعبوں ــــــ وسائل کا جائزہ لینا، موسم کی پیشین گوئی اور رسل و رسائل ــــــ میں بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

۲۶ چھبیس جنوری

کیفہ احمد صدیقی

آؤ ہم سب دھوم مچائیں آئی ہے چھبیس جنوری
اچھلیں کودیں ناچیں گائیں آئی ہے چھبیس جنوری

آج وطن کے ہر گوشے میں آزادی کی دھوم مچی ہے
آج کے دن کتنی مستی میں بھارت ماتا جھوم رہی ہے
ہم بھی خوشی کے گیت سنائیں آئی ہے چھبیس جنوری
آؤ ہم سب دھوم مچائیں آئی ہے چھبیس جنوری

آج وہ دن ہے جس دن رائج جمہوری دستور ہوا تھا
آج کے دن ہی بھارت سے ہر انگریزی قانون مٹا تھا
آزادی کے نغمے گائیں آئی ہے چھبیس جنوری
آؤ ہم سب دھوم مچائیں آئی ہے چھبیس جنوری

آج کے دن ہر اہلِ وطن کے دل میں نہ ہو کیوں اتنی شادی
آج کے دن ہی سارے وطن نے پائی تھی پوری آزادی
جمہوری پرچم لہرائیں آئی ہے چھبیس جنوری
آؤ ہم سب دھوم مچائیں آئی ہے چھبیس جنوری

آؤ ہم سب یاد کریں ان جانبازوں کے اسمِ گرامی
جن کی بدولت ٹوٹی تھی بھارت ماں کی زنجیرِ غلامی
ہم بھی انھیں جیسے بن جائیں آئی ہے چھبیس جنوری
آؤ ہم سب دھوم مچائیں آئی ہے چھبیس جنوری
اچھلیں کودیں ناچیں گائیں آئی ہے چھبیس جنوری

مرغوب عابدی

کسی زمانے میں دریائے بگھیر تھی کے قریب ایک غار میں لومڑیوں کا ایک جوڑا رہتا تھا اور دریا میں ایک مگرمچھ رہتا تھا جس سے اس جوڑے کا محفوظ رہنا بہت ہی مشکل تھا۔ جانور جب دریا میں پانی پینے آتے، بڑی احتیاط سے پانی پیتے۔ انہیں ڈر لگا رہتا کہ کہیں مگرمچھ انہیں پانی میں گھسیٹ نہ لے۔ جانور جو پانی پینے آتا، ایک لمحے کے توقف سے چاروں طرف دیکھتا اور جب تک مطمئن نہ ہو جاتا کہ قریب میں کہیں مگرمچھ نہیں ہے، تب تک پانی پینے آگے نہ بڑھتا۔

ایک دن ایک لومڑی کو بڑی پیاس لگی تھی۔ پانی پینے دریا کے کنارے آئی اور پیاس کی بیتابی میں اتنی احتیاط سے کام نہ لے سکی جیسا کہ پہلے لیا کرتی تھی۔ جلدی میں مگرمچھ کو نہ دیکھ پائی جو پانی کی سطح پر گیلی لکڑی کی طرح خاموش پڑا تھا۔ لومڑی دریا کے ڈھلوان کنارے سے نیچے اتری اور پانی میں ایک درخت کے نیچے اس کی بڑی بڑی جڑوں کے درمیان کھڑی ہو گئی۔ قبل اس کے کہ لومڑی پانی پیتی مگرمچھ نے پھرتی سے اس کی اگلی ٹانگ پکڑ لی۔

لومڑی گھبرائی لیکن اس کی سمجھ نے بجلی کی طرح کام کیا۔ اس نے سوچا کہ بہت جلدی کوئی تدبیر کرنا چاہیے ورنہ جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اپنے خوف کو ایک قہقہے سے چھپاتے ہوئے لومڑی اپنے نزدیک اڑتے ہوئے ایک پرند سے بولی...... "یہ مگرمچھ کیسا اندھا اور بیوقوف ہے اسے میرے پیر اور درخت کی جڑ میں کوئی فرق ہی نظر نہیں آتا! میرے پیر کے بجائے پیڑ کی اس جڑ کو اس نے کس مضبوطی سے جکڑ لیا ہے؟"

مگرمچھ نے فوراً لومڑی کی ٹانگ چھوڑ دی اور پاس والی ایک جڑ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ جونہی اس کا پیر چھوٹا، لومڑی اچھلی اور اپنے غار کی طرف دوڑی۔ مگرمچھ نے جب دیکھا کہ لومڑی اسے دھوکا دے گئی تو اس نے طے کر لیا کہ وہ اس کا بدلہ ضرور لے گا۔ اور قسم کھائی کہ آج رات چاند غروب ہونے سے پہلے ہی وہ لومڑی کو کھا جائے گا۔

اس دن چاند کے طلوع ہوتے ہی مگرمچھ نے دریا چھوڑ دیا اور لومڑی کے غار کی طرف آہستہ آہستہ رینگنا شروع کر دیا۔ غار کے قریب پہنچ کر وہ خاموشی سے رک گیا اور خود سے کہنے لگا...... "اگر میں یہیں پڑ بیٹھا

رہوں اور خود کو مردہ ظاہر کروں تو لومڑی بلا خطر مجھ تک پہنچ جائے گی۔ جب وہ میرے قریب پہنچے گی تو میں اپنی دُم کی مدد سے اُسے نیچے گرا دوں گا اور پکڑ لوں گا۔

لومڑیوں کا جوڑا جو کہ بلیے شکار کو گیا ہوا تھا۔ آدھی رات سے پہلے ہی واپس لوٹ آیا تھا۔ وہ بڑی ہوشیاری سے غار تک پہنچے تھے۔ جب انھوں نے وہاں بھی اپنے دشمن کو لیٹا ہوا پایا تو دونوں میں سے کسی نے دھوکہ نہیں کھایا۔ اُنھیں مگرمچھ سے مذاق کرنے کی سوجھی۔ مگرمچھ سے اتنے فاصلے پر کھڑے ہو کر کہ ان کی بات وہ سُن سکے، انھوں نے آپس میں بات چیت شروع کر دی۔

لومڑی نمبرا ایسا لگتا ہے کہ میرے دروازے کے راستے میں بے چارہ غریب مگرمچھ مر گیا۔

یہ تو تمھیں بھی توقع نہ ہوگی کہ وہ اتنی جلدی مر جائے گا

لومڑی نمبر۲ میں سمجھتی تھی کہ مگرمچھ صدیوں تک جیتے ہیں۔ یہ ایک اتفاق ہی ہے۔"

لومڑی نمبرا "ہاں مجھے بڑا افسوس ہوا، کل ہی میں نے اُسے اپنے جبڑے میں ایک درخت کی جڑ پکڑے ہوئے دیکھا تھا اور آج وہ مر بھی گیا، کیسی عجیب بات ہے۔"

لومڑی نمبر۲: "مجھے تو یقین نہیں آتا کہ وہ مر گیا۔ جب تک یقین نہ ہو جائے، اُس کے نزدیک نہیں جانا چاہیئے۔"

لومڑی نمبرا: "اچھا یہ کس طرح سمجھا جائے کہ مگرمچھ سچ مچ مر گیا۔"

لومڑی نمبر۲: "وہ تو بہت آسان ہے۔ میں نے سنا ہے کہ جب مگرمچھ مر جاتے ہیں تو ان کی دُم اُس کتے کی طرح ہلنے لگتی ہے جو مالک کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتا ہے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مگرمچھ نے اپنے کو مردہ ثابت کرنے کے لیے ایسا کرنے کا ارادہ کر ہی لیا اور اپنی دم سے زمین پر جھاڑو دینا شروع کر دی۔ دُم کا ہلنا تیز ہوتا گیا کیونکہ وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ سچ مچ مر چکا ہے۔ لومڑیوں نے اپنی ترکیب کی کامیابی پر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور ایک لومڑی نے کہا۔

"چلو واپس چلیں۔" بیچارہ مگرمچھ واقعی مر گیا ہے۔

بقیہ: "منتو" صفحہ ۱۱ کا

"رات میں نے اسے نہیں پہچانا۔ کچھ صاف ہوا تو پہچان گیا۔ ایک بار یہی کسی مریض کو لے کر آیا تھا۔ مجھے اب یاد آرہا ہے۔ میں کھیلنے جا رہا تھا۔ مریض کو دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ مریض شاید ہی بچا ہو۔ میں ساری عمر اس کی کھوج لگاؤں گا اس کے پیروں پر سر رکھ کر اپنی غلطی کی معافی چاہوں گا۔ وہ کچھ نہیں لے گا۔ میں جانتا ہوں۔ وہ بے غرض لوگوں کی خدمت کے لیے زندہ ہے اس نے مجھے انسانیت کا ایسا سبق دیا ہے کہ میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔

••

ناظم میوانی سہسرامی

مفت کا خریدار

معتصم باللہ بغداد کا ایک جلیل القدر اور شاندار خلیفہ امیر المومنین تھا۔ عرب کے ایک بدوی پر اس کی توجہ ہوگئی۔ اس نے اسے اپنا مصاحب بنالیا۔ وہ بدوی بغیر اجازت کے بھی جب جی چاہتا آجایا کرتا اور باریابی حاصل کرلیا کرتا۔ اس کے لیے کسی قسم کی رکاوٹ نہ تھی۔

معتصم باللہ کا ایک وزیر تھا، وہ بہت حاسد تھا۔ اس نے سوچا کہ میں اتنے دنوں سے اس دربار کا خادم ہوں پھر بھی مجھے یہ جرأت نہیں کہ بغیر اجازت کے خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو سکوں۔ نہ معلوم اس بدوی نے خلیفہ کو کیا جل دیدیا ہے اور کیا فریب کھیل رکھا ہے کہ محض تھوڑے ہی دنوں میں اس کا دل اپنے ہاتھ میں کرلیا ہے۔ وہ خود تو بہت زیادہ قریب ہو ہی گیا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نے میرے خلاف خلیفہ کے دل میں نفرت پیدا کردی ہے۔ اسے اس بات سے بہت تکلیف تھی اس لیے وہ بدوی سے بہت جلتا تھا۔ لیکن کرتا کیا، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

بالآخر وزیر نے سینے پر پتھر رکھ کر آہستہ آہستہ اس بدوی سے دوستی پیدا کرلی اور گھات میں لگا رہا۔ موقع سے ایک دن اسے کھانے کی دعوت دے دی اور بدوی نے اسے قبول بھی کرلیا لیکن جب وہ کھانے کے لیے گھر پر آیا تو اسے ایسا کھانا کھلایا جس میں لہسن بہت زیادہ تھا، بدوی نے جب یہ کھانا کھالیا تو اسے یہ سمجھایا کہ دیکھو خلیفہ کے پاس یوں ہی نہ چلے جانا، تمھارے منہ میں لہسن کی بدبو ہے اس لیے منہ پر رومال رکھ لینا، خلیفہ کو لہسن کی بو سے سخت نفرت ہے اگر وہ جان جائے گا تو تمھیں سخت سزا دیگا۔ سیدھے سادے بدوی نے وزیر کی یہ بات مان لی۔

اس کے بعد وزیر خلیفہ کے دربار میں حاضر ہوا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے کرتے بدوی کا ذکر بھی چھیڑ دیا اور اس کی شکایتوں سے خلیفہ کے کان خوب اچھی طرح بھر دیئے یہ بھی کہہ دیا کہ حضور والا! بدوی نے تو لوگوں میں یہ بات بھی پھیلا رکھی ہے کہ امیر المومنین کے بدن سے بدبو پھوٹتی رہتی ہے۔ کیا کروں، جب کبھی اس کے پاس جاتا ہوں تو ناک پر رومال رکھ لیا کرتا ہوں۔ حضور! اگر وہ کبھی آپ کے پاس آئے گا تو میری صداقت کا ثبوت خود مل جائے گا۔

بدوی جب دربار میں آیا تو معتصم باللہ نے دیکھا کہ واقعی وہ دور دور رہتا ہے۔

قریب آنے کا حکم دیا تو اس نے منہ پر رومال رکھ لیا۔ خلیفہ نے یہ حرکت دیکھی تو اسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ وزیر نے بدوی کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ بالکل ٹھیک ہے۔ یہ بدوی یقیناً عوام میں میرے خلاف افواہیں پھیلایا کرتا ہوگا یہ بڑا نمک حرام ہے۔ میں نے اسے مالا مال کر دیا اور بڑی سے بڑی عزت دی اس پر بھی اس کا یہ حال ہے نہ معلوم آگے چل کر یہ کون سا فتنہ کھڑا کر دکھائے گا۔ معتصم باللہ نے سوچا تو بہت کچھ لیکن زبان سے کہا کچھ بھی نہیں۔ آہستہ سے قلم اٹھایا اور ایک گورنر کے نام لکھا "یہ تحریر دیکھتے ہی بغیر کچھ پوچھے حامل رقعہ کی گردن اڑا دو" دستخط اور مُہر کے بعد لفافہ بدوی کے حوالہ کر دیا اور کہا کہ فلاں گورنر کے پاس جاؤ اور فوراً جواب لاؤ۔

بیچارا بدوی اپنے قتل کا پروانہ اپنے ہاتھ میں لیے خوش خوش باہر نکلا۔ وزیر گیٹ پر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟" بدوی نے کہا "فلاں گورنر کے پاس یہ پروانہ لے کر جا رہا ہوں" وزیر نے سوچا یقیناً آج اس بدوی کو کوئی بڑی رقم ہاتھ لگنے والی ہے اسے لالچ آ گیا۔ بدوی سے کہا "ارے، یار! تم کہاں جاؤ گے یہ پروانہ لے کر ۔۔۔ تمھارے منہ میں لہسن کی بدبو ہے۔ نہ معلوم وہاں گورنر تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے۔ یہ لو، دو ہزار دینار اور پروانہ مجھے دے دو۔ تم جاؤ اپنے گھر بیٹھو، میں تمھارا یہ کام کیے دیتا ہوں" بدوی نے کہا "آپ حاکم ہیں، آپ جو مناسب سمجھیں کریں" وزیر نے فوراً دو ہزار دینار بدوی کے ہاتھ پر رکھ کر قتل کا وہ پروانہ بخوشی خرید لیا۔ گورنر کے ہاتھ میں پروانہ دے کر اس کی لالچی آنکھیں چمک اٹھیں لیکن افسوس ۔۔۔ حکم کی تعمیل میں اس کے سر سے اس کی گردن اڑ گئی۔

چند روز ہو گئے لیکن وزیر دربار میں دکھائی نہ دیا۔ خلیفہ کو اس کی فکر ہوئی۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ کئی دنوں سے اس کا پتا نہیں اور جب بدوی کے بارے میں پوچھا تو کہنے والوں نے کہا وہ حضرت تو صبح و شام شہر میں گشت کیا کرتے ہیں لیکن نہ معلوم کیوں دربار کا رخ نہیں کرتے۔" خلیفہ نے پہلے تو اس خبر پر یقین ہی نہیں کیا اس لیے بدوی کو فوراً حاضر کیے جانے کا حکم دے دیا لیکن جب اسے صحیح سلامت زندہ دیکھا تو حیرت میں پڑ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس میں قدرت کی کسی مصلحت کا ہاتھ ہے۔ اس نے بدوی سے پوچھا۔

"تم دربار میں حاضری کیوں نہیں دیتے؟"

"حضور! آپ کے خط کے جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"اوہ، تم نے وہ خط کیا کیا؟"

"اسے تو آپ کے وزیر نے لے لیا۔"

"وہ کیوں؟"

"اس نے کہا تھا کہ تمھارے منہ سے لہسن کی بو آ رہی ہے، تم گورنر کے پاس نہ جاؤ، ورنہ مارے جاؤ گے۔"

"تو پھر؟"

"تو پھر کیا، اس نے مجھے دو ہزار دینار دیے اور

پروانہ لیکر کہا جاؤ تم گھر بیٹھو میں تمھارا کام کر کے آتا ہوں۔ حضور اب تک اس کے انتظار میں ہوں، نہ معلوم کہاں چلا گیا۔"

معتصم باللہ سمجھ گیا کہ وزیر نے اپنی موت کا پروانہ خود ہی خرید لیا ہے لیکن ایک اور بات صاف کرنے کے خیال سے پھر پوچھا " تم نے یہ افواہ کیوں پھیلا رکھی تھی کہ خلیفہ کے بدن سے بدبو پھوٹتی رہتی ہے؟" بدوی نے جواب دیا " معاذ اللہ، امیرالمومنین! میرا منہ اور یہ بات! مجھ حقیر کی اور یہ مجال!! یہ کیا فرمایا آپ نے؟" اب خلیفہ نے پھر سوال کیا " تو پھر اس دن ناک پر رومال رکھ کر تم میرے سامنے کیوں آئے تھے؟" بدوی نے عرض کیا حضور والا اس دن وزیر نے اپنے گھر پر بلا کر مجھے لہسن کھلایا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ آپ کو اس کی مہک سے سخت نفرت ہے اس لئے مجھے آپ سے دور دور رہنا چاہیئے اور اگر قریب جانا ہی پڑے تو منہ پر رومال رکھ لینا چاہیے، تاکہ بو نہ لگے ورنہ سخت سزا ہو گی۔

معتصم باللہ اب سارا معاملہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا اس نے کہا " چاہ کن را چاہ در پیش، حاسد اور لالچی وزیر اپنے جال میں خود پھنس گیا۔ اس نے جو گڑھا تمہارے لیئے کھدوایا تھا اس میں وہ خود کود پڑا اور کیفر کردار کو پہنچ گیا۔ تم میرے مخلص دوست ہو، خدا کا شکر ہے کہ تم بے داغ بچ گئے۔

▲▲

عبد المنان منصوری۔ بمبئی

بہت زمانے کی بات ہے کہ کسی شہر میں مان سنگھ نام کا راجا راج کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بھگوان اور دیوتا کہتا تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا "اے ہماری رعایا تم کو کس چیز کی ضرورت ہے، جو مانگو گے وہ ہم دیں گے"

شہر کے کچھ لوگ تو اس بیوقوف راجا کی بات مان کر اپنا بھگوان ماننے لگے کیونکہ یہ لوگ پیسے پیسے کے لیے ترستے تھے، اور جس چیز کی ضرورت ہوتی راجا کے آگے ہاتھ پھیلا دیتے۔ لیکن اسی شہر میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ اس بیوقوف کو اپنا بھگوان نہیں مانتے تھے وہ کہتے کہ ایک انسان ہمارا بھگوان کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ بھی انسان ہے اور ہم بھی انسان ہیں، پھر ہم اسے اپنا دیوتا کیسے مان سکتے ہیں؟ ہم میں سے ہی ضرور ایسا بندہ پیدا ہوگا جو اس کا بدلہ لے گا ہم اسے بھگوان ہرگز نہیں مان سکتے، ہمارا بھگوان ہمیں نظر نہیں آتا مگر ہمارے ساتھ رہتا ہے وہ کسی کو غریب بناتا ہے اور کسی کو امیر۔ ہمیں جب کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو ہم اسی کے سامنے سر جھکائیں گے اور وہی ہماری مرادیں پوری کرے گا۔

جب یہ بات راجا کو معلوم ہوئی تو وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ اس نے اپنی طاقت سے کچھ لوگوں کو جان سے مار ڈالا اور کچھ کو بے بس اور مجبور کر ڈالا۔ کسی کو اپنی جادوئی شکتی سے اندھا اور لنگڑا کر دیا۔ اسی شہر میں ایک غریب آدمی کے گھر ایک عقلمند اور ہوشیار بچہ پیدا ہوا۔ ایک دن اس بچے کے گھر ایک سادھو آیا اور اس نے دعائیں دیتے ہوئے کہا کہ یہ بچہ ایک دن بڑا ہو کر اپنا نام روشن کرے گا اور ساری حکومت اس کے ہاتھوں ہوگی۔ یہ سننا تھا کہ گھر کے سب لوگ خوشی سے پھولے نہیں سمائے اور اس خوشی میں خوب دھوم دھام سے جشن منایا گیا۔

جب یہ بات راجا مان سنگھ کو معلوم ہوئی تو اس لڑکے کے باپ کو اپنی جادوئی شکتی سے اندھا کر دیا۔ اس کی ماں کے ساتھ بے عزتی سے پیش آیا اور اس دودھ پیتے ہوئے بچے کو پانی میں پھینک دیا۔ بچہ پانی پر تیرنے لگا اور اسی پانی پر بھگوان نے بستر بچھا دیا جب یہ بچہ روتے ہوئے ہوا کے جھونکے کے ساتھ دریا کے اس کنارے پر پہنچا تو ایک دم گھنا جنگل تھا، اس جنگل میں بہت سے خونخوار جانور تھے۔ جب اس بچے کے

پروانہ لیکر کہا جاؤ تم گھر بیٹھو تمہارا کام کر کے آتا ہوں۔ حضور اب تک اس کے انتظار میں ہوں، نہ معلوم کہاں چلا گیا!

معتصم باللہ سمجھ گیا کہ وزیر نے اپنی موت کا پروانہ خود ہی خرید لیا ہے لیکن ایک اور بات صاف کرنے کے خیال سے پھر پوچھا" تم نے یہ افواہ کیوں پھیلا رکھی تھی کہ خلیفہ کے بدن سے بدبو پھوٹتی رہتی ہے؟" بدوی نے جواب دیا" معاذاللہ امیرالمومنین! میرا منہ اور یہ بات! مجھ حقیر کی اور یہ مجال!! یہ کیا فرمایا آپ نے؟" اب خلیفہ نے پھر سوال کیا" تو پھر اس دن ناک پر رومال رکھ کر تم میرے سامنے کیوں آئے تھے؟" بدوی نے عرض کیا حضور والا اس دن وزیر نے اپنے گھر پر بلا کر مجھے لہسن کھلایا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ آپ کو اس کی مہک سے سخت نفرت ہے اس لیئے مجھے آپ سے دور دور رہنا چاہیئے اور اگر قریب جانا ہی پڑے تو منہ پر رومال رکھ لینا چاہیے، تاکہ بو نہ لگے ورنہ سخت سزا ہوگی۔

معتصم باللہ اب سارا معاملہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا اس نے کہا" چاہ کن را چاہ در پیش، حاسد اور لالچی وزیر اپنے جال میں خود پھنس گیا۔ اس نے جو گڑھا تمہارے لیئے کھودا تھا اس میں وہ خود کود پڑا اور کیفر کردار کو پہنچ گیا۔ تم میرے مخلص دوست ہو، خدا کا شکر ہے کہ تم بے داغ بچ گئے۔

▲▲

عبدالمنان منصوری ۔ بمبئی

بہت زمانے کی بات ہے کہ کسی شہر میں مان سنگھ نام کا راجا راج کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بھگوان اور دیوتا کہتا تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا "اے ہماری رعایا تم کو کس چیز کی ضرورت ہے، جو مانگو گے وہ ہم دیں گے۔"

شہر کے کچھ لوگ تو اس بیوقوف راجا کی بات مان کر اپنا بھگوان ماننے لگے کیونکہ یہ لوگ پیسے پیسے کے لیے ترستے تھے، اور جس چیز کی ضرورت ہوتی راجا کے آگے ہاتھ پھیلا دیتے۔ لیکن اسی شہر میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ اس بیوقوف کو اپنا بھگوان نہیں مانتے تھے وہ کہتے کہ ایک انسان ہمارا بھگوان کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ بھی انسان ہے اور ہم بھی انسان ہیں، پھر ہم اُسے اپنا دیوتا کیسے مان سکتے ہیں؟ ہم میں سے ہی ضرور ایسا بندہ پیدا ہوگا جو اس کا بدلہ لے گا ہم اسے بھگوان ہرگز نہیں مان سکتے، ہمارا بھگوان ہمیں نظر نہیں آتا مگر ہمارے ساتھ رہتا ہے وہ کسی کو غریب بناتا ہے اور کسی کو امیر۔ ہمیں جب کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو ہم اسی کے سامنے سر جھکائیں گے اور وہی ہماری [illegible] پوری کرے گا۔

جب یہ بات [illegible]

ہوگیا۔ اس نے اپنی طاقت سے کچھ لوگوں کو جان سے مار ڈالا اور کچھ کو بے بس اور مجبور کر ڈالا۔ کسی کو اپنی جادوئی شکتی سے اندھا اور لنگڑا کر دیا۔ اسی شہر میں ایک غریب آدمی کے گھر ایک عقلمند اور ہوشیار بچہ پیدا ہوا۔ ایک دن اس بچے کے گھر ایک سادھو آیا اور اس نے دعائیں دیتے ہوئے کہا کہ یہ بچہ ایک دن بڑا ہو کر اپنا نام روشن کرے گا اور ساری حکومت اس کے ہاتھوں ہوگی۔ یہ سننا تھا کہ گھر کے سب لوگ خوشی سے پھولے نہیں سمائے اور اس خوشی میں خوب دھوم دھام سے جشن منایا گیا۔

جب یہ بات راجا مان سنگھ کو معلوم ہوئی تو اس لڑکے کے باپ کو اپنی جادوئی شکتی سے اندھا کر دیا۔ اس کی ماں کے ساتھ بے عزتی سے پیش آیا اور اس دودھ پیتے ہوئے بچے کو پانی میں پھینک دیا۔ بچہ پانی پر تیرنے لگا اور [illegible]

جب یہ [illegible]

کے اس [illegible]

جنگل میں [illegible]

رونے کی آواز ہاتھی نے سنی تو وہ بھاگ کر آیا اور اس بچے کو مارنے کے بجائے آہستے اپنی سونڈ میں لپیٹ کر خشکی کی طرف لے آیا۔ اتنے میں جنگل کے بہت سے ہاتھی اور بندر آگئے بندروں نے پتوں اور لکڑیوں کا ایک جھولا تیار کیا اور اس جھولے میں بچے کو لٹا کر ہلانے لگے۔ اس طرح سے سال بھر جانوروں نے ہی اس بچے کی پرورش کی اور یہ بچہ جانوروں میں گھل مل گیا، دھیرے دھیرے یہ بچہ بڑا ہونے لگا۔

ایک دن کسی ڈاکو نے اس کی ماں کا پیچھا کیا۔ وہ چلاتی ہوئی جنگل تک آپہنچی اور بچاؤ بچاؤ کے نعرے بلند کرنے لگی۔ بچے نے جب یہ بات سنی تو وہ فوراً ہی سب جانوروں کے ساتھ آیا اور اس ڈاکو کو مار بھگایا۔ اس طرح سے اس لڑکے نے اپنی ماں کی جان بچالی۔ لیکن اس نے نہ تو اپنی ماں کو پہچانا اور نہ ہی ماں اپنے بچے کو پہچان سکی۔ ماں نے محبت سے پوچھا: "تم کہاں رہتے ہو اور تمہارے ماں باپ کہاں ہیں۔" بچے نے کہا "میں جنگل میں رہتا ہوں اور یہی جانور سب میرے ساتھی ہیں، میرے ماں باپ کہاں ہیں یہ تو میں بھی نہیں جانتا، کیا تم میری ماں بن سکتی ہو؟" ماں نے اقرار کر لیا، پھر اس نے پوچھا: "ماں بابا کہاں ہیں؟" ماں نے کہا: "بیٹے اس شہر میں مان سنگھ راجا ہے۔ اس نے ان کی بڑی درگت بنائی ہے وہ وہاں پر پڑے ہوئے ہیں۔"

جب بچے نے اپنے باپ کو اس حالت میں دیکھا تو کانپ گیا اور کہا کہ وہ اس کا بدلہ لے گا۔

آخر ایک دن یہ بچہ مان سنگھ کے محل پر پہنچا بچے کو دیکھ کر راجا کو بڑا تعجب ہوا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس چھوٹے سے بالک کو محل میں گھسنے کی اجازت کس نے دی لیکن بچہ نے اپنی میٹھی باتوں سے اس راجا کا دل موہ لیا اور اسے اپنے ماں باپ کے پاس لے گیا۔ راجا نے دونوں کو دیکھتے ہی کہا: میں اسے کبھی کبھی اچھا نہیں کر سکتا کیوں کہ اس نے میری نافرمانی کی ہے لڑکے نے راجا کی بہت منت سماجت کی لیکن وہ واپس چلا گیا۔ اب لڑکے کو ایک ترکیب سوجھی۔ وہ جنگل کے تمام جانوروں کو لے کر راجا کے محل کے سامنے پہنچا۔ جانوروں کو دیکھ کر دروازے کے پہرے دار تو نو دو گیارہ ہو گئے۔ سب جانور اندر گھس پڑے محل میں بھگدڑ مچ گئی جانوروں نے سب کچھ توڑ پھوڑ ڈالا۔ راجا چاہتا تھا کہ اس بچے کو اپنی جادوئی شکتی سے اندھا کر دے لیکن جس چیز سے وہ جادو کرتا تھا وہ چیز اس بچے کے ہاتھ لگ گئی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اب راجا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بچے نے جادوئی انگوٹھی اپنے قبضے میں کر لی۔ راجا کے خوف سے اس نے انگوٹھی کو اپنے منہ میں چھپا لیا لیکن جیسے ہی انگوٹھی منہ میں پہنچی وہ سب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا، اس طرح سے بچے نے خوب ڈٹ کر راجا کا مقابلہ کیا اور آخر میں اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا۔

راجا کے مرتے ہی راجہ کے ظلم و ستم کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ عوام نے لڑکے سے خوش ہو کر اسے اپنا راجا بنا لیا۔ ●●

جناب محمد امین

دوسری قسط

قادرہ کی حاضر جوابی

اُس نے باپ سے کہا "گھبرائیے نہیں! ہمارے پڑوس میں جو حکیم صاحب رہتے ہیں ان کے یہاں ایک خچر کا بچہ ہے۔ ابھی مشکل سے ایک ہفتہ کا ہوا ہے لیکن بہرحال وہ آسانی سے چل لیتا ہے۔ آپ اس بچے کو لے آئیے اور اس پر سوار ہو جائیے۔ ظاہر ہے کہ پیر آپ کے زمین کو چھوتے ہوئے چلیں گے۔ اس طرح آپ کا کام بن جائے گا سواری کی سواری اور پیدل کے پیدل۔"

تین دن کے بعد محل میں سویابین بیچنے والا حاضر ہوا۔ وہ ایک چھوٹے سے خچر کی سواری کر رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر شہزادے کا چہرہ لمبا ہو گیا۔ لیکن اب کی بار اُسے غصہ نہیں آیا۔ فوراً ہی اسے قادرہ کا خیال آ گیا۔ اس کے متعلق بھلا وہ کسی سے کیا کہے۔ وہ حیران و پریشان کہ آخر کرے تو کیا کرے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ شہزادے کو اس خوبصورت اور چالاک لڑکی سے بڑی دلچسپی تھی۔ تاہم اس نوجوان کا عشق اتنا شدید نہیں تھا جتنا کہ اس کا تکبر۔ وہ برابر یہی سوچتا رہا کہ اس لڑکی کو شکست کیسے دوں۔

قادرہ کتنی ہوشیار تھی اس کا ایک اور ثبوت یہ تھا کہ اس نے اندازہ کر لیا تھا۔ کہ اس کے متعلق شہزادہ کیا سوچ رہا ہوگا۔ قبل اس کے کہ اس کو سزا دینے کی کوئی نئی ترکیب شہزادہ عمل میں لائے قادرہ نے خود اسے بدھو بنانے کا پلان بنا لیا۔ وہ سیدھی ایک دوکان پر پہنچی جہاں ہتھیار ساز و سامان بکتے تھے۔ اس نے دوکاندار سے کہا "مجھے ایک ایسا لباس چاہیے جو پتلا ہو لیکن اس میں بہت سے گھنگھرو جڑے ہوں اور جب میں اُسے پہن کر چلوں یا قدم اٹھاؤں تو ان میں ایسی جھنکار پیدا ہو گویا بادل گرج رہے ہوں۔"

اس لباس کو پہن کر بہادر لڑکی نے اس کے اوپر ایک اور لبادہ پہن لیا۔ سر پہ بڑا سا رومال باندھ لیا اور اپنے بالوں کو چھپا لیا تاکہ وہ ریگستان کا شیخ نظر آئے۔ ہاتھ میں ایک بڑا سا ڈنڈا لے لیا۔ اس کا حلیہ صحیح معنی میں ایسا ہو گیا گویا کہ وہ جنگلی گھوڑ سوار ہے اور کہیں دور دراز ریگستان یا صحرا سے آیا ہے۔

نیا لباس پہن کر جب وہ چلی تو کیا کھنک پیدا ہوئی۔ اس کا نیا روپ دیکھ کر، آواز سُن کر محل کی نوکرانیاں اور دوسرے نوکر چاکر خوف زدہ ہو گئے بھاگ کر میز اور کرسیوں کے نیچے دبک گئے۔ چہروں پر پردے ڈال لیے۔ کیا مجال کہ کوئی اُس کا راستہ روکتا۔ بے باکی سے محل میں داخل ہو کر قادرہ سیدھی اس کمرے کی طرف بڑھی جہاں شہزادہ نائی سے اپنے بال کٹوا رہا تھا۔

شہزادہ اس جنگلی جانور کے یک بیک ظاہر ہونے سے حیران و پریشان ہو گیا۔ اس نے سنتریوں کو آواز دی

لیکن بھلا کسی کی کہاں ہمت کہ اس خوفناک درندے کو بھگا سکے۔ یہاں تک کہ نائی بھی ڈر گیا اور شہزادے کو تنہا چھوڑ کر بھاگ گیا۔ قبل اس کے کہ شہزادہ اپنی کرسی سے اُٹھے قادرہ نے چیختے ہوئے اور ڈانٹ کر کہا "شہزادے سُنو! میں شیطان کا قاصد بن کر آیا ہوں۔ چپ چاپ بیٹھ جاؤ۔ اگر اٹھنے کی ہمت کی تو میں ابھی خنجر بھونک دوں گا"

لڑکی نے بڑھ کر قینچی اور اُسترا جو نائی گرا گیا تھا اٹھالیا۔ پھر اُس نے سجو ب اور گھمنڈی خوبرو شہزادے کی نصف داڑھی تراش لی۔ اُس کے بعد آناً فاناً وہ وہاں سے غائب ہو گئی۔

شہزادہ حیران و ششدر۔ اُس کے ہوش آنے سے پہلے قادرہ وہاں سے غائب ہو گئی۔ قبل اس کے کہ محل کے ملازم اپنی ملوں اور چھپنے والی جگہوں سے باہر نکلیں وہ صحیح و سالم اپنے گھر پہنچ چکی تھی۔ جھٹ پٹ اس نے اپنا لباس اُتار کر باغ میں زمین کے نیچے گاڑ دیا۔ اب قادرہ پھر علی کی لڑکی تھی اور اپنا گل بوٹے بنانے میں مصروف۔

اگلے دن صبح تینوں بہنیں حسبِ معمول پھر محل کے پھاٹک سے گزریں۔ شہزادہ کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ لیکن اس کے سر پر ریشم کی پگڑی سندھی ہوئی تھی اور چہرہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بہنوں نے دیکھا کہ محض اس کی کالی کالی آنکھیں نظر آ رہی ہیں جن سے خفگی ظاہر ہوتی تھی اور غصہ بھی۔

شرافت اور نرمی سے مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "سویاں بیچنے والے علی کی لڑکیو! تم سب کو سلام"

اب کی بار قادرہ نے جواب دیتے ہوئے کہا "وعلیکم السلام خدا تمھیں سلامت رکھے!" پھر وہ مُسکرائی اور شرارتاً اس نے کہا: "لیکن شہزادے! تمھاری بھویں کہاں ہیں؟ اور تمھاری خوبصورت نصف داڑھی کہاں غائب ہے؟"

اُس کے بعد شہزادے کو حقیقت کا پتہ چلا۔ وہ سمجھ گیا کہ کل والی حرکت قادرہ کی تھی اور یہی شیطان کا قاصد بن کر آئی تھی اور اسی نے اسے ڈرایا تھا اور اُس کا مذاق اڑایا تھا۔

اُس نے سوچا۔ مانا کہ یہ خوبصورت ہے اور یہ بھی مانا کہ مجھے اس سے عشق ہے۔ لیکن اب کی بار تو اس نے حد ہی کر دی۔ آخر میں ایک شہزادہ ہوں۔ اتنی بڑی حرکت اسے نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اس کے لیے قادرہ کو سزا بھگتنی پڑے گی اور شاید اُسے جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔

اس نے سوچا۔ دماغ پر زور دیا۔ کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آئی کہ اس لڑکی کو کیسے گرفتار کرائے اور کڑی سے کڑی سزا دلوائے۔ اِسے محل میں لانا آسان نہیں۔ ہر پہلو پر نظر رکھنی پڑے گی۔

آخرش اس نے سویاں بیچنے والے کو بلوا بھیجا۔ اس سے کہا: "تمھاری لڑکی قادرہ اچھی ہے، چالاک ہے۔ میں اسے محل کی شہزادی بنانا چاہتا ہوں۔ تم انکار نہ کرنا ورنہ خیریت نہیں۔ میں تم کو اور تمھارے خاندان میں ہر ایک کو صحرا میں دفن کروا دوں گا"

علی نے قادرہ سے کہا: "یہ بڑی اچھی بات ہے کہ تم محل کی رانی بن رہی ہو۔ خدا مبارک کرے۔ شہزادہ تم کو یقیناً پسند کرتا ہے ورنہ تم کو اپنی بیگم نہ بناتا۔ تم رضامند ہو جاؤ ورنہ ہم سب کی خیریت نہیں"

خلافِ توقع قادرہ خاموش رہی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ شہزادے کی محبت میں خود گرفتار ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر اسے چھیڑتی رہی ہو تاکہ وہ اس کی توجہ کا مرکز بنی رہے۔

لیکن اب بھی قادرہ کو شاہزادے پر بھروسا نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ تنگ کرنے کی وجہ سے وہ خفا ہو اور غصے میں

سمجھتا بیٹھا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شادی کرنا اس کی نئی سازش
ہو۔ بہرحال ہر حالت میں اُسے چوکنّا رہنا چاہیے۔
شادی طے ہوگئی اور اس کی تاریخ قریب آگئی۔ ایک
دن پہلے قادرہ نے نان بنانے والے سے ایک نئی فرمائش کی
نان بائی سے اُس نے کہا:
"میرے لیے چینی اور آٹے کی ایک گڑیا بنا دو۔ اس کا
سائز اور صورت شکل بالکل میرے برابر اور مجھ جیسی ہو۔ مضبوط
بھی کافی ہونی چاہیے۔ تاکہ چھونے سے بگڑنے نہ پائے۔"
قادرہ نے اس کیک کی گڑیا کو ایک لمبی سی ٹوکری میں
رکھ لیا۔ شادی ہوجانے کے بعد جب جہیز کا سارا سامان شہزادے
کے محل میں گیا تو دلہن کے سامان کے ساتھ اس کی گڑیا بھی گئی
قادرہ نے محل میں اس گڑیا کو اپنا شادی کا لباس پہنا دیا اور پھر
اُسے مسہری پر لٹا دیا۔ مچھر دانی کے اندر لیٹی ہوئی یہ گڑیا اصلی
دلہن معلوم ہوتی تھی۔ قادرہ خود کمرے میں ایک طرف کونے
میں چھپ گئی۔ خاموشی سے وہ انتظار کرتی رہی کہ دیکھو اب
کیا ہوتا ہے۔

دولھا صاحب چہل قدمی کرتے ہوئے دروازے سے
داخل ہوئے۔ قادرہ نے دیکھا کہ وہ مسہری کے پاس گیا اور
اس پر لیٹی ہوئی شکل کو اس نے غور سے دیکھا پھر اس نے
میان سے ایک خنجر نکالا۔ قادرہ کا اندازہ بالکل سچ تھا۔ دولھا
نے خنجر کی نوک دولہن کے جسم میں پیوست کردی۔
اس کے بعد یہ دیکھ کر قادرہ کو حیرت ہوئی کہ دولھا
میاں کے رخسار پر آنسوؤں کی دھارا بہہ رہی ہے اور وہ
بہت ہی مغموم اور خاموش ہے۔ آنسوؤں کی وجہ سے وہ
ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا اس لیے کہ ملیش کی وجہ سے اُسے
دکھائی نہیں پڑا کہ کیک کی شکل کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے
ہیں۔ ایک چھوٹا ٹکڑا بھی مچھر دانی سے باہر آگیا اور

وہ ٹھیک اُس کے منہ میں آکر گرا اور اُس نے جو اُس کو
چکھا تو میٹھا محسوس ہوا۔
شہزادے نے چیختے ہوئے کہا۔ "ہائے قادرہ،
میری پیاری قادرہ! آخر تم نے یہ میرے ساتھ کیا کیا؟
جب تم زندہ تھیں تو کڑوے الفاظ منہ سے نکالتی تھیں۔
اب جب کہ تم مرچکی ہو تو تم میں کتنی مٹھاس ہے۔ ہائے یہ میں
نے کیا کیا؟" پھر آنسوؤں سے اُس کے رخسار تر ہوگئے۔
اس قدر ماتم کرتے دیکھ کر قادرہ کا مغرور دل بھی
پگھل گیا۔ شہزادے کی محبت اس کے دل میں عود کر آئی۔
وہ اپنے کو روک نہ سکی اور پردے کے پیچھے سے باہر نکل
آئی۔ پھر اُس نے شہزادے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر نرمی
سے کہا۔ "پیارے شہزادے مجھے معاف کرو۔ میں بھی تمھاری
طرح گھمنڈی اور مغرور تھی۔ اب جہاں تک میرا تعلق
ہے میں تم کو معاف کرتی ہوں حالاں کہ اپنے غرور کے نشے
میں تم نے مجھے مارنے کی کوشش کی۔ اس کے باوجود بہتر
یہی ہے کہ آخر میں ہم ایک دوسرے کو معاف کر دیں۔
اب ہم مل جل کر خوش رہیں اور اطمینان سے زندگی
بسر کریں۔"
شہزادے کی چیخ نکل گئی۔ "میری پیاری قادرہ!
خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔"
اور خدا کا شکر ہے کہ پھر دونوں ہنسی خوشی
رہنے لگے۔

جوابی پرچہ عام معلومات

(۱) لندن میں (۲) سورج (۳) میر ببر علی انیس
(۴) کولمبو (۵) وٹامن اے (حیاتین (الف)
(۶) دین الٰہی (۷) مولانا شبلی نعمانی (۸) مشہور باکسر
محمد علی کلے۔ (۹) غار ثور میں۔

مشرف عالم ذوقی آروی

ایک چھوٹا سا بچہ روتا ہوا سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ اس کا نام احمد تھا۔ اس کے کپڑے پھٹے اور گندے تھے۔ یکایک اُس کے قدم رُک گئے۔ سامنے اسکول کی بلڈنگ تھی۔ اس کو دیکھ کر وہ بڑے پیار سے اُس اسکول کو دیکھ رہا تھا۔

"ہم غریب ہیں اس لیے ہم نہیں پڑھ سکتے۔"

وہ بچہ رو پڑا۔ نہ جانے کون سی کشش تھی جو اسے اسکول کی طرف کھینچ رہی تھی۔

اُسے کل کا واقعہ یاد آ گیا جب اس نے اپنے باپ سے کہا تھا۔ "ابا میں بھی پڑھوں گا۔"

"نہیں ... " یہ اس کے سوال کا جواب تھا۔ "کتنی بار سمجھایا کہ ہم غریب ہیں، ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ پڑھتے تو وہ ہیں جن کے پاس دولت کے ڈھیر ہوتے ہیں۔"

احمد سوچ میں گم ہو گیا۔ وہ سکار رہی آتا اسکول اُس کے لیے نہیں ہے۔ مگر معین تو کہہ رہا تھا کہ ادرگانا بھی کہتی ہیں کہ ہمارا ملک اس لیے پچھڑا ہے کہ یہاں کے لوگ پڑھائی پر دھیان نہیں دیتے، غریب لوگ غریبی کے سبب اپنے بچوں کو اسکول نہیں بھیجتے۔

کچھ دیر کے لیے اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

وہ بھی پڑھ سکے گا۔ معین، انور اور سیام کی طرح۔

"مگر بابا ... " وہ رو پڑا۔ نہ جانے کب تک روتا رہا۔ اچانک اُس کے سر پر کسی نے ہاتھ پھیرا۔

"کیوں روتے ہو بیٹا؟"

آج تک گھر میں کسی نے بھی اُس کے ساتھ ہمدردی نہیں دکھائی تھی۔

"اچھے بچے کبھی نہیں روتے۔ اگر کوئی مشکل پڑتی ہے تو وہ اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ تم بھی اچھے بچے ہو۔ اس لیے چُپ ہو جاؤ۔"

اجنبی نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "کس کلاس میں پڑھتے ہو؟"

"جی! ... " وہ پھر رو پڑا "بابا کہتے ہیں۔ غریب نہیں پڑھتے صرف دولت والے پڑھتے ہیں۔"

"کیوں نہیں پڑھتے؟ پڑھائی میں امیری اور غریبی کا فرق نہیں دیکھا جاتا۔ دل کی لگن سچی ہو تو ہر کوئی پڑھ سکتا ہے۔"

اجنبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم پڑھو گے بیٹے!"

"ہاں!" وہ خوش ہو گیا۔ "مگر ہمارے پاس پیسا نہیں ہے۔"

"پیسے کی کیوں فکر کرتے ہو بیٹے؟ میں اس اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہوں۔ کل سے اسکول آ جانا اور پڑھائی شروع کر دینا۔"

"مگر کتابیں۔"

"وہ تمہیں اسکول لائبریری سے مل جائیں گی۔"

آج وہ زندگی میں پہلی بار بہت خوش تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، اب پاپا بھی اُسے پڑھنے سے نہیں روکیں گے۔ ماں کتنی خوش ہوگی۔ وہ پڑھے گا۔ پڑھ لکھ کر آگے بڑھے گا۔ نوکری کرے گا۔ تب وہ ابّو، امّاں اور اپنے والد کو کوئی کام نہیں کرنے دے گا۔ وہ ایک خوبصورت سا گھر بنائے گا۔ گھر کے میدان میں ایک چھوٹا سا اسکول کھولے گا —— بچوں کا اسکول۔ چھوٹے بچے اُس میں پڑھنے آئیں گے۔ جب وہ گھر آئے گا اور اپنے اسکول کو دیکھے گا تو اُسے اپنا بچپن یاد آجائے گا۔

"اوہ!" وہ اُچھل پڑا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔

گنگناتا ہوا وہ آگے بڑھا جا رہا تھا۔ یکایک اُسے موٹر کا دھکا لگا۔ اور وہ دوسری طرف پھینکا گیا۔ اُس کے سر سے خون بہنے لگا۔ ڈرائیور نے جلدی سے بریک لگا کر گاڑی روک لی۔

یہ گاڑی معین کے پاپا جاوید صاحب کی تھی۔ معین اپنے والد کے ساتھ [illegible] تھا۔ وہ دونوں گاڑی سے نیچے اُترے۔

"ارے یہ تو احمد ہے!"

"احمد......؟"

"ہاں پاپا! یہ میرا گہرا دوست ہے۔ بیچارہ غریب ہے۔ غریبی کے سبب پڑھ نہیں پاتا ہے۔ اُس کے دل میں سچی لگن ہے!"

"چلو بیٹا! اس کو ہاسپٹل لے چلیں!"

احمد کو جب ہوش آیا تو اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ ہاسپٹل میں تھا۔ اُس کے چاروں طرف ماں باپ اور دوسرے لوگ کھڑے تھے۔ اس کی نظر دوسری طرف گئی جہاں معین لیٹا ہوا تھا۔ وہ برسوں کا مریض نظر آرہا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ اس کو ساری بات یاد آگئی۔

"ماں! یہ معین لیٹا ہوا ہے۔ کیا ہوا ہے اس کو؟"

"بیٹا تم ہوش میں آگئے!"

"میری بات کا جواب دیجیے ماں!"

"معین کے پاپا کی گاڑی سے تمہارے سر میں چوٹ آگئی تھی۔ ڈھیروں خون بہہ گیا تھا۔ اپنے دوست کا شکریہ ادا کرو جس نے تمھیں خون دیا ہے۔"

"خون؟"

"ہاں! تمھارے جسم سے بہت سارا خون نکل گیا تھا۔ سارے وارڈ میں کسی کا خون تمھارے خون سے میل نہیں کھاتا تھا۔ لیکن معین کا خون تمھارے خون سے مل گیا۔ اس لیے تم بچ گئے۔"

"مگر!......"، اُس کی ماں رو پڑی۔

"تم روتی کیوں ہو ماں۔"

ایک آواز آئی۔

"بیٹا! ڈرائیور کی غلطی سے ایکسیڈینٹ ہوگیا۔ تم مجھے معاف کردو۔ اس حادثہ میں تمھارا ایک پیر بیکار ہوگیا۔"

"پاؤں؟" احمد نے اپنے پیر کی طرف دیکھا جہاں لکڑی کا پیر اس کا منہ چڑھا رہا تھا۔

اُس کی چیخ نکل گئی۔

"مجھے معاف کردو بیٹا! میں معین کا باپ ہوں۔

باقی صفحہ [illegible] پر

عادل کہل گانوی

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جس دن اسے بازار میں نہ دیکھا گیا ہو۔ وہ صبح سے شام تک پھیری کرتا تھا اس کے پاس چوہا مارنے کی دوا تھی۔ بہت دنوں سے میں اُسے دیکھتا آرہا تھا۔ اور اس دن راستے ہی میں اس سے میری جان پہچان بھی ہوگئی۔ بازار سے ہوکر گزرنے پر ہی اس بوڑھے کی تقریر ضرور سننے کو ملتی۔ سفید داڑھی ایک پھٹی ہوئی دھوتی اور ایک میلی سی قمیص پہنے ہوئے۔ منہ میں ایک لاؤڈ اسپیکر جو شاید بیٹری سے چلتا تھا۔

اسے دیکھ کر مجھے دکھ ہونے لگتا۔ دن بھر اس قدر تکلیف جھیل کر اشتہار دینے کا معاوضہ بھلا وہ کیا پاتا ہوگا۔ اس کی دوا کا نام "چوہا مار" (RAT-END) تھا لیکن کیا نام کا اثر چوہوں پر پڑتا ہوگا ––– میں اکثر یہ سوچ کر ہنس دیتا۔

ایک دن ابّو کے ساتھ میرا بازار کی طرف جانا ہوا۔ دُکان کے سامنے مجھے کھڑے رہنے کی ہدایت دے کر ابّو اندر چلے گئے۔ اسی درمیان وہ بوڑھا "چوہا مار، چوہا مار" کی رٹ لگاتا ہوا میرے سامنے سے گزرا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا ––– "کیوں منّے تم کو چوہا مار کی ضرورت نہیں ہے کیا؟ بڑی اچھی دوا ہے۔"

"اس وقت میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اچھا بھلا یہ تو بتائیں کہ ایک پیکٹ دوا سے کتنے چوہے موت کے گھاٹ اُتر سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کم سے کم دس تو مریں گے ہی۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"اچھا تو میں پوچھتا ہوں" دن بھر میں کل کتنے پیکٹ فروخت کرتے ہوں گے آپ؟"

"اچھا سیلنگ (فروخت) ہے، یہی کوئی ... ؟"

"جلدی آؤ اخلاق –––" والد نے آواز دی۔

اور میں بوڑھے کا مکمل جواب سنے بغیر ہی ابّو کے ساتھ وہاں سے چل پڑا۔ اس کی آواز لوگوں کے شور و غل کے درمیان دب کر رہ گئی۔

بوڑھے کی تقریر مجھے تقریباً زبانی یاد ہوگئی تھی۔ میں روزانہ اس کی تقریر کو غور سے سُنا کرتا۔ ایک دن میں ذرا جلد بازی میں بازار کی طرف بھاگ رہا تھا کہ کانوں سے آواز ٹکرائی ––– "کیا آپ جانتے ہیں؟" میں فوراً سمجھ گیا۔ مڑ کر دیکھا تو آپ گاندھی چوک کے قریب نظر آئے۔ وہ لوگوں کی بھیڑ سے مخاطب تھے ––– "کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ چوہے دیش کا ہزاروں ٹن

غلہ ایک سال میں چٹ کر جاتے ہیں اور پھر اس نے حساب لگا کر ان روپیوں کی تعداد بھی جو بتلائی جو چوہوں کی وجہ سے ہر سال ضایع ہوتی ہے۔ چند اور دوسرے اعداد و شمار بھی بتلائے لیکن میں دھیان سے نہیں سن سکا۔

بوڑھے کی تقریر بڑی مچھے دار ہوا کرتی۔ اس لیے لوگ اچھی خاصی تعداد میں جمع ہو جاتے۔ اسی تقریر بازی کے دوران چند پیکٹ دوا بھی فروخت ہو جاتی تھی۔ ہم لوگوں نے بھی اس سے دو چار پیکٹ ضرور خریدے ہوں گے لیکن استعمال کیے یا نہیں، یہ میں ٹھیک سے نہیں بتلا سکتا۔

عمر کے ساتھ میرا کلاس پروموشن (ترقی) بھی ہوتا گیا۔ اور اب مجھے پہلی جیسی فرصت نہیں رہی۔ پڑھائی کا بوجھ دھیرے دھیرے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس لیے اب میرا شاید ہی کبھی بازار کی طرف جانا ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ بوڑھے کی تقریر سے لطف اندوز ہونے کا موقع کم ہی ہاتھ آتا تھا۔ دو چار مہینے یوں ہی خالی بیت گئے۔ میرا سالانہ امتحان سر پر آ چکا تھا۔ اتوار کی ایک شام بازار سے لوٹتے ہوئے اسپتال روڈ پہ بوڑھا نظر آ گیا۔ لیکن اس کی تقریر میں اب پہلی جیسی روانی نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ میں مائیکروفون کے بدلے ایک ٹین کا چونگا تھا۔ دل میں خیال گذرا کہ شاید اس کی تجارت پھیکی پڑ گئی ہو یا پھر "چوہا مار" دوا نے ہمارے شہر سے چوہوں کا صفایا ہی کر دیا ہو ورنہ اس انقلاب کی اور کیا وجہ ہو سکتی تھی!

چند روز اور گزر گئے۔ ایک دن اچانک عبدل چاچا ہمارے گھر تشریف لائے۔ بڑے دلچسپ آدمی ہیں وہ۔ ان کو دیکھتے ہی ہمارے گھر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ انھوں نے تجویز پیش کی کیوں نہ آئندہ اتوار کو پکنک کا پروگرام رکھا جائے۔ اتفاق رائے سے ان کی اس تجویز کو منظوری مل گئی۔

مقررہ وقت کے مطابق ہم سب کھانے پینے کا سامان لے کر شانتی نگر کالونی کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر ایک برگد کے پیڑ کے نیچے صاف جگہ دیکھ کر ہم سب بیٹھ گئے، کچھ دیر تک کھیل تماشے کا شغل رہا پھر کھانے پینے کی باری آئی۔ انڈے، ٹوسٹ، پراٹھے، کیک اور میوہ جات وغیرہ ساتھ تھے۔ خوب پیٹ بھر کر اور مزے لے لے کر سب نے کھائے لیکن کھانے کے بعد پینے کے پانی کا سوال اٹھا۔ وہ ساتھ لانا بھول ہی گئے تھے۔

"ذرا ادھر ادھر تلاش کر کے دیکھو کہیں ٹیوب ویل ہے یا نہیں!" شاہینہ باجی نے مجھ سے کہا۔

میں پانی کی تلاش میں نکلا ہی تھا کہ سامنے سے ایک بوڑھا آدمی آتا دکھائی دیا۔ سوچا چلو اسی سے معلوم کر لیا جائے۔ قریب پہنچ کر دیکھا تو یہ وہی دوا فروش تھا۔ میں نے کہا "کیسے کیسے ہیں آپ؟ کاروبار خوب چل رہا ہے نہ؟"

بوڑھا خوشی سے چہک اٹھا بولا "آہا چھوٹے میاں تو آپ مجھے بھولے نہیں ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے یہ۔ آپ کی تشریف آوری یہاں کیسے ہوئی؟"

"ہاں ہم لوگ ادھر ذرا سیر کرنے کو نکل آئے ہیں۔

لیکن ایک مشکل آپڑی ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہاں پینے کا پانی کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے؟"

"میرے یہاں ہوتے ہوئے بھلا آپ لوگوں کو کیا تکلیف ہو سکتی ہے؟۔ آیئے ہمارے دروازے پر۔ صاف اور شفاف برف جیسا ٹھنڈا پانی سب کو پلائے دیتا ہوں۔" بوڑھے نے پُر خلوص لہجے میں ہم سب کو دعوت دی۔ آخر ہم سب بوڑھے کے ساتھ اس کے گھر پہنچے۔ بڑھیا ہم کو دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ دوڑ کر ہمارے واسطے پانی لے آئی۔

اسی دوران اچانک میری نگاہ اُن کے توشک اور تکیوں کی طرف اُٹھ گئی۔ دیکھا کہ وہ جگہ جگہ سے کٹ پھٹ گئے تھے اور روئی ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔

"آپ کے توشک اور تکیوں کی یہ درگت کیسے ہوئی؟" میں نے پوچھا۔ بڑھیا نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "کیا کہہ رہے ہو بیٹا۔ ان چوہوں نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔"

یہ سُن کر میں سناٹے میں آگیا۔ ✱ ✱

جناب سلیمان ظفر

پرچہ عام معلومات

(اس پرچے کے ذریعے آپ اپنی معلومات کا امتحان بھی لے سکتے ہیں۔ اور اس میں اضافہ بھی کر سکتے ہیں۔ جواب کے لیے صفحہ ۲۹ دیکھیے)

(۱) دنیا میں پہلی مرتبہ زیرِ زمین ریلیں کہاں چلائی گئیں؟

(۲) زمین سے قریب ترین ستارہ کون سا ہے؟

(۳) یہ مشہور شعر کس کا ہے ؎

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

(۴) سری لنکا (سیلون) کی راجدھانی کونسی ہے؟

(۵) رات کا اندھاپن (رتوندھا) کا مرض کس وٹامن (حیاتین) کی کمی کی وجہ سے ہوتا ہے؟

(۶) مغل شہنشاہ اکبر کے جاری کردہ نئے مذہب کا نام کیا تھا؟

(۷) اُردو کی مشہور کتاب "شعر العجم" کس کی لکھی ہوئی ہے؟

(۸) دنیا کا امیر ترین کھلاڑی کون ہے؟

(۹) ہجرت کرتے ہوئے آنحضرتؐ نے کس غار میں آرام فرمایا تھا۔

بقیہ صفحہ ۳

۱۔ گیس

۲۔ رقیق (پانی جیسی شکل)

۳۔ ٹھوس۔

آپ کسی بھی مادّے کو ان تینوں شکلوں میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس کی سب سے آسان مثال برف ہے جو مادّے کی ٹھوس شکل ہے، پگھل کر وہ رقیق یعنی پانی بن جاتا ہے اور جب مزید حرارت پہنچائی جاتی ہے تو وہ بھاپ بن کر گیس کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

مادّے کی ایک چوتھی شکل "پلازما" کہلاتی ہے جو دراصل برقی مقناطیسی گیس ہوتی ہے لیکن اس چوتھی شکل کا تعلق ہماری روزمرّہ کی زندگی سے نہیں ہوتا بلکہ علم طبیعیات اور علم فلکیات میں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔

جانور جو نہ ہنس سکتا تھا!

ع۔ صدیقہ۔

کتنا عجیب وقت تھا بیچارے جنگل کے جانوروں کے لیے۔ زندگی میں کبھی بھی ایسا وقت نہیں آیا تھا۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں۔ اس سے قبل تو کبھی بھی ایسا نہیں ہوا تھا۔

گلہری، خرگوش، بھالو سبھی ایک جگہ جمع تھے سب ہی یہ پتا لگانے کی کوشش میں تھے کہ یہ عجیب مخلوق کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔

گلہری نے پوچھا: "آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

جواب ملا:۔ "گوڈاکس" اس سے قبل اس کا نام پوچھنے پر معلوم ہوا تھا کہ اس کا نام 'بق جق' ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ کون سا نام ہے کس زبان میں ہے۔

چیتے نے سوچا یہ آسٹریلیا کا رہنے والا بھی نہیں معلوم ہوتا۔ روس کا رہنے والا بھی نہیں ہے۔ آخر کہاں سے آیا

"اپکیس" اس جانور نے کہا۔

"ہو سکتا ہے یہ اس جگہ کا نام ہو" بھالو نے سوچا

"اے کاش، یہ جانور اپنی زبان جانتا ہوتا۔" ناامیدی کی حالت میں گلہری نے سوچا۔

"چلو، کسی عقلمند کے پاس چلیں۔" گلہری سوتے الّو کو جگانے پیڑ پر گئی۔ الّو آنکھ ملتا ہوا پیڑ پر سے اترا اور بولا:

"ہم سب لوگوں کو اس نو وارد سے ہمدردانہ برتاؤ کرنا چاہیے۔ یہ بیچارہ اپنے کو ضرور اکیلا محسوس کر رہا ہوگا۔

سارے جانور اس بات پر متفق ہو گئے۔ کچھ نے کھانا پیش کیا۔ کچھ نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ چیتے نے دوستانہ دھپ لگایا۔ دھپ لگاتے ہی 'گاپ' کی آواز کے ساتھ حلق سے مینڈھک باہر آگیا۔ "ارے یہ کیا ہوا"

"شکریہ! بہت بہت شکریہ چیتے بھائی! تمہارے اس دھپ کی وجہ سے میرے حلق کا پھنسا ہوا مینڈھک گلے سے باہر آگیا۔ کتنا سکون ہوا مجھے۔ نہ جانے کب سے یہ مجھے پریشان کیے ہوئے تھا۔

سارے جانوروں نے دیکھا کہ یہ کوئی اور نہیں تھا بلکہ ایک بڑی بطخ تھی۔ گلے میں مینڈھک کے پھنسنے کی وجہ سے گردن بے تکی اور لمبی ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے سب حیرت میں پڑ گئے تھے۔

سارے جانور حیرت اور شرمندگی کے ملے جلے احساس کے نتیجے میں ہنس پڑے... خوب زور سے..... ہا ہا... ہا .... ہی .... ہی .... اور ہو، ہو، ہو.... دل کھول کر.... ایسی ہنسی جو اپنی حماقت پر آنسو نکال دیتی ہے ** (انگریزی سے)

عشرت جبیں برنی

آریہ بھٹ

بچو! تم نے آریہ بھٹ کا نام تو سنا ہوگا — ہندوستان کا پہلا مصنوعی سائنسی سیارہ ہے جو ۱۹- اپریل ۱۹۷۵ء کو آسمان میں چھوڑا گیا تھا۔ یہ مصنوعی سیارہ جس کا وزن ۳۶۰ کلوگرام ہے، ۹۶/۴ منٹ کے بعد زمین کے اردگرد ایک چکر پورا کر لیتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ سیارہ ہندوستانی سائنس دانوں نے اپنی ہی محنت اور اپنے ہی سامان سے تیار کیا تھا۔ اس کا ڈیزائن بھی ہمارے ہی سائنس دانوں نے تیار کیا تھا۔

ہندوستان کا یہ پہلا سیارہ ہیرے کی شکل کا خلا میں پرواز کرنے والا ایک طیارہ ہے جس کی کل ۲۶ سطحیں ہیں۔ یہ نیلے اور بنفشی رنگ کی ہیں۔ اس کا قطر ۱.۴۷ میٹر ہے اور اونچائی ۱.۱۹ میٹر۔ اس کی رفتار کافی تیز ہے۔ یہ تقریباً ۳۰ ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے زمین کے اردگرد گھوم رہا ہے۔ یہ ۴۴۳۰۰ کلومیٹر کا ایک چکر تقریباً ۹۶ منٹوں میں پورا کرتا ہے۔ زمین کی طرح آریہ بھٹ اپنے محور کے گرد بھی گھوم رہا ہے لیکن ایک منٹ میں یہ ایسے پچاس چکر پورے کر لیتا ہے۔

خلا میں چکر کاٹتے ہوئے اس مصنوعی سیارے کو بیٹریوں کے ذریعے سے قوت ملتی ہے۔ گردش کے دوران جب اس پر زمین کا سایہ پڑتا ہے تو قوت فراہم کرنے کا کام "نکل کیڈمیم بیٹریاں" کرنے لگتی ہیں جو سورج کی روشنی کے سیلوں سے جڑی ہوتی ہیں۔ اس "پاور سسٹم" سے تقریباً ۴۶ واٹ بجلی پیدا ہوتی ہے۔ ان مختلف "سب سسٹموں" کے اچھی طرح کام کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مصنوعی سیارے کے اندر کے درجۂ حرارت میں اتار چڑھاؤ کو معقول حد تک محدود رکھا جائے۔ اس مقصد کے لیے ایک سا تھرمل کنٹرول سسٹم تیار کیا گیا ہے جو اندرونی درجۂ حرارت کو صفر سے لے کر ۴۰ ڈگری سینٹی گریڈ تک محدود رکھتی ہے۔

بچو، تم یہ پوچھو گے زمین سے سیارے کا تعلق قائم کرنے کی کیا تدبیر ہوگی؟ اس کے لیے ہمارے سائنس دانوں نے ٹیلی کمانڈ یونٹ میں ایک "این کوڈر" لگا دیا ہے جو زمین سے سیارہ کو ہدایت دیتا رہتا ہے۔ "این کوڈر" بھیجی جانے والی ہدایات کو ہندسوں اور "کوڈ" یعنی کچھ اشاروں کی صورت میں بدلتا ہے اور ایک ٹرانسمیٹر لگایا گیا ہے جو انھیں سیارے تک پہنچاتا ہے۔ سیارے پر لگا ہوا ٹریسٹنگ انٹینا زمین سے بھیجے جانے والے ان ہدایاتی اشاروں کو وصول کرنے کے لیے ایریل کا کام کرتا ہے اور انھیں سیارے میں لگے ہوئے ایک ریسیور تک پہنچاتا ہے جو پھر سے ان ہدایات کو ان کے اصلی روپ میں بدل دیتا ہے۔ اس ڈھنگ سے ۲۵ طرح کی ہدایات بھیجی جا سکتی ہیں اور یہ ہدایات سیارے کے بجلی کے سپلائی کے سسٹموں کو چالو یا بند کرنے، ٹیپ ریکارڈ کرنے اور ریکارڈ شدہ آواز کو واپس بھیجنے، "سین اپ" سسٹم کو چالو کرنے اور کسی ایک سسٹم کے کام بند کر دینے کی [illegible]

باقی صفحہ [illegible] پر

آدھی ملاقات

دسمبر ۷۶ء کا پیام تعلیم جلد ہی مل گیا۔ ویسے ہر ماہ پیام تعلیم باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ جس کے لیے بہت بہت شکریہ۔ اس ماہ سرورق بے حد پیارا ہے۔ اس ماہ کا سرورق دیکھ کر میرے سب سے چھوٹے ۵ سالہ بچے "قدیر خاں" نے بھی میرے جوتے صاف کیے ہیں۔ میرے پوچھنے پر کہنے لگے کہ پیام تعلیم والی یہ لڑکی کیسے اپنے ابا کے جوتے صاف کر رہی ہے۔ اس لیے ہم نے بھی آپ کے جوتے صاف کر دیے۔ چلیے جناب پیام تعلیم نے اپنی افادیت کا عملی ثبوت دے دیا۔

اس مرتبہ کتابت اور چھپائی کی ساری پچھلی روایات ٹوٹ چکی ہیں۔ دونوں چیزیں کافی نکھری ہوئی ہیں۔ کتابت البتہ دو طرح کی نظر آئی۔ جس میں باریک حرفوں والی کتابت اچھی ہے۔

بہت دنوں کے بعد محترم شفیع الدین نیر صاحب کی نظم پیام تعلیم میں دیکھنے کو ملی۔ واقعی یہ نظم اس سال کا تحفہ ہی ہے کیونکہ نظم بے حد پیاری، سبق آموز اور رواں دواں ہے ——

موصوف کی ذات ان تعریفی الفاظ کی محتاج تو نہیں ہے، لیکن ان سطور کو لکھتے وقت میں اپنے قلم کو روک بھی نہیں پا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ پیام تعلیم نے ہی ایک مرتبہ موصوف کو "بچوں کے چندا ماما" کے خطاب سے نوازا تھا۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ موصوف کی ادبی کاوشیں بچوں کے ادب کے افق پر ہمیشہ چاند کی طرح روشن رہینگی۔ دیگر منظومات اور سبھی کہانیاں نصیحت آمیز ہیں۔

آپ کو اور تمام ساتھیوں کو میری طرف سے نئے سال کی مبارکباد۔

رؤف انجم

دسمبر ۱۹۷۶ء کا "پیام تعلیم" ملا۔ چشم بد دور۔ ایک عرصے کے بعد اتنے سارے بڑے بڑے نام یک جا ہو پائے ہیں۔ وہ بھی اپنی بہترین تخلیقات کے ساتھ۔ اب تک حاصل کردہ معیار کی ساری بلندیاں پست معلوم ہونے لگیں۔

رشید حسن خاں صاحب کا سلسلۂ مضامین "اردو ہے جس کا نام" کو شامل کر کے آپ نے ہم پر کرم ہی نہیں، احسان کیا ہے۔ کیا بڑے کیا چھوٹے۔ سبھی اس کو پسند کریں گے۔ امید ہے یہ سلسلہ کافی طویل ہوگا۔

رشید الدین صاحب نے "بچوں کے دوست مولوی غلام ربانی مرحوم" پر مضمون لکھ کر نہ صرف اپنا قرض اتارا ہے بلکہ "پیام تعلیم" کو بھی بہت بڑی ذمہ داری سے سبک دوش کر دیا ہے جو مولوی صاحب کی عنایات کی وجہ سے اس پر عائد تھی۔

"میرے استاد" (غلام حیدر نقوی) اپنی روایات برقرار رکھتے ہوئے بہت ہی جاندار اور بڑا ہی دلچسپ ہے مذہبی مضمون کی کمی قیصر سرمست صاحب نے "کتنے خوش نصیب تھے وہ" کے ذریعے پورا کر دی ہے۔ اسلامی تاریخ کے ایک واقعے کو بڑے ہی مؤثر طریقے پر پیش کیا ہے، توقع ہے کہ وہ اس طرح کی چیزوں سے "پیام تعلیم" کو نوازتے رہیں گے۔

خلیق انجم اشرفی صاحب ایک عمدہ کہانی کے ساتھ تشریف لائے ہیں "ٹین کا سپاہی" (اگست ۱۹۷۶ء) کے بعد سے ان کی کمی بڑی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔

مسعودہ حیات صاحبہ، خورشید رخشاں صاحبہ اور سیدہ رعنا ذکی سہروردی صاحبہ کی تخلیقات کافی پسند آئیں۔

احمد جمال پاشا صاحب کی راجستھانی لوک کہانی میں نے بچپن میں اپنی کسی درسی کتاب میں پڑھی تھی۔ اس میں آم کی بجائے ناریل کے درخت پر لٹکے کنجوس کی مدد کو اونٹ سوار اور اس کے بعد گھوڑ سوار سہرے اور جیسا کہ کہانی میں ہے وہ دونوں ایک دوسرے کے پیروں کو پکڑے لٹک جاتے ہیں میری پڑھی کہانی میں کنجوس کے پیچھے دلدل نہیں تھی، جو حقیقت سے زیادہ قریب بھی ہے، کیوں کہ دلدل میں ہاتھی، اونٹ، گھوڑا اور گدھا وغیرہ کیسے آ سکتے تھے۔ بہر حال کہانی بڑی کلاسیکی، دلچسپ اور عمدہ انداز میں کہی گئی ہے۔

خلیق انجم اشرفی صاحب اور میرے بارے میں بعض پیامیوں کی رائے جان کر دکھ ہوا۔ محض منہ تنقید یا تبصرے کے بغیر ہم اپنی علمی اور ادبی کاوشوں میں نکھار نہیں لا سکتے ہیں۔ اسی مہینے "آدمی ملاقات" میں خلیق انجم اشرفی نے اقوام متحدہ کی سرکاری زبانوں کے بارے میں اردو کی طرف جو اشارہ کیا ہے اس کا مقصد اصلاح کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں ہمیشہ سے ہی اشرفی صاحب کا مداح رہا ہوں اور میرا خیال ہے وہ بھی میری گزارشات کو قدر کی نگاہ سے ضرور دیکھتے ہوں گے۔ چونکہ "بچوں سے باتیں" میں اس الزام کی تردید "سرکاری طور پر" کی جا چکی ہے۔ اس لیے مزید کچھ عرض کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔

سلیمان ظفر

پیام تعلیم پابندی سے مل رہا ہے اس کے لیے میں آپ کا انتہائی شکر گزار ہوں۔ رسالہ اس بار کافی تاخیر سے موصول ہوا لیکن کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی کیوں کہ آپ نے اپنی پریشانیوں سے پہلے ہی مطلع کر دیا تھا۔

اس شمارے کی کتابت و طباعت انتہائی خراب رہی۔ جا بجا الفاظ بھی چھپنے سے رہ گئے ہیں۔ کاغذ بھی اچھا استعمال نہیں کیا گیا۔ کتابت کی غلطیوں کا برا اثر پیامیوں پر پڑے گا کیوں کہ اس عمر میں بچوں کا ذہن پختہ نہیں ہوتا۔ ان میں اچھے اور برے کی تمیز نہیں ہوتی......

اس طرح بچوں کے رسائل کے مطالعہ کا جو اولین اور بنیادی مقصد ہے وہ فوت ہو کر رہ جائے گا۔ اور بچوں کو رسائل کے مطالعہ سے بجائے فائدے کے الٹا نقصان ہوگا۔ لہذا میرا پر خلوص مشورہ ہے کہ آئندہ کتابت و طباعت کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔

اس شمارے کی سبھی نظمیں قابل تعریف اور موقع کی مناسبت سے بھی بہت ہی عمدہ ہیں۔ خصوصاً جناب شوکت پردیسی محترم نیتر صاحب اور جناب محبوب راہی کی نظمیں بے حد پسند آئیں۔ حصۂ نثر ضرور کچھ اس بار کمزور رہا۔ پھر بھی حسب معمول مفید اور دلچسپ رہا۔ ابراہیم لنکن کا ہدایت نامہ بھی خاصہ معلوماتی مضمون ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی مضامین و کہانیاں پسند آئیں۔

محمد عرفان نجف علیمی الہ آباد

بقیہ سچی لگن صفحہ سے

تم اسکول جاؤ گے اور ضرور جاؤ گے"۔

وقت کی رفتار تیزی سے بدلتی رہی۔ احمد کی سچی لگن رنگ لائی۔ معین اس کو سائیکل پر بٹھا کر روزانہ اسکول لے جاتا ہے۔ اور سہارا دیتا ہوا واپس بھی لاتا ہے۔ دونوں دل لگا کر پڑھتے ہیں۔

پیام تعلیم کیلنڈر سنہ ۱۹۷۷ء

نہایت افسوس ہے کہ یہ خط جس میں کیلنڈر تھا۔ اس وقت ملا جب جنوری کا پرچہ پریس جاچکا تھا ورنہ ہمیشہ کی طرح جنوری میں ہی شایع ہوتا۔ (ادارہ)

عبدالمجید آنیکل بنگلور					مئی	اگست	فروری مارچ نومبر	جون	ستمبر دسمبر	اپریل جولائی	جنوری اکتوبر
۲۹	۲۲	۱۵	۸	۱	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ
۳۰	۲۳	۱۶	۹	۲	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار
۳۱	۲۴	۱۷	۱۰	۳	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر
★	۲۵	۱۸	۱۱	۴	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل
★	۲۶	۱۹	۱۲	۵	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ
★	۲۷	۲۰	۱۳	۶	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات
★	۲۸	۲۱	۱۴	۷	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ

21 سال کی
عمر سے پہلے
شادی نہ کیجئے
قانون اِس کی مُمانعت کرتا ہے۔
davp 76/678

نہرو بال پستکالیہ

ہندوستان کی اہم زبانوں اور انگریزی میں بچوں کے لیے بہترین اور سستی کتابیں شائع کرنے کے لیے کتابوں کے اس سلسلے کا آغاز کیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں بسنے والوں، مختلف زبانوں کے جاننے والوں کے لیے ایک ہی سا ادب مہیا کیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہو سکیں اور اس سے قومی ایکتا مضبوط ہو۔

اب تک حسب ذیل کتابیں شائع ہوئی ہیں جو اُردو کے علاوہ انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ملتی ہیں۔ ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے (۱/۵۰) ہے۔ یہ سب کتابیں رنگین تصویروں کے ساتھ فوٹو آفسیٹ پر شائع ہوئی ہیں۔

۱۔ [illegible] (حصہ اول دوم) مصنف: سی فری ٹاس، مترجم: صالحہ عابد حسین
۲۔ [illegible] کا ساتھی سب کا دوست ، اماشنکر جوشی، مترجم: انور کمال حسینی
۳۔ کشمیر مصنف بالا سنگھ، مترجم: خدیجہ بیگم، تصویر: پریما نند
۴۔ پرندوں کی دنیا مصنف: جال آرا، مترجم: محمد شفیع الدین نیر
۵۔ ہمالیہ کی چوٹیوں پر ، بریگیڈیر گیان سنگھ، مترجم: محمد ذاکر
۶۔ ہماری ندیوں کی کہانی حصہ اول، مصنف: لیلا مجمدار، مترجم: رضیہ سجاد ظہیر
۷۔ [illegible] کی سیر اور دوسری کہانیاں، مصنف: لیلا بھاگوت، مترجم: رضیہ سجاد ظہیر
۸۔ [illegible] کہانیاں ، منوج داس ، صغرا مہدی
۹۔ آزادی کی کہانی حصہ اول دوم ، دشنو پربھاکر ، انور کمال حسینی
۱۰۔ ہماری ریلیں ، جگ جیت سنگھ ، عرش ملسیانی
۱۱۔ ہندوستان میں غیر ملکی سیاح ، کے۔ سی۔ کھنہ، تصاویر: کرشن کھنہ
۱۲۔ آؤ [illegible] کھیلیں مصنف: اوما نند، مترجم: رفیعہ منظور الامین
۱۳۔ [illegible] کا خاندان مصنف: منوہر داس چترویدی، مترجم: شفیع الدین نیر
۱۴۔ [illegible] حصہ اول ، چوکسی پی ایم جوشی، مترجم: رضیہ سجاد ظہیر
۱۵۔ [illegible] کی کہانیاں ، راجندر اوستھی ، انور کمال حسینی
۱۶۔ [illegible] ، کرشن چیتنیہ ، انور کمال حسینی
۱۷۔ [illegible] کہانیاں ، شانتا رنگا چاری ، انور کمال حسینی
۱۸۔ [illegible] نے دنیا [illegible] حصہ اول دوم ، میر نجابت علی ، سیدہ احسان

۱۹۔ سونا کی سیر مصنف: تارا تیواڑی، مترجم: انور کمال حسینی
۲۰۔ بڑا پانی ، لیلا مجمدار ، صالحہ عابد حسین
۲۱۔ مورا ، ملک راج آنند ، انور کمال حسینی
۲۲۔ ہاکی کا کھیل ، سرد یندر سانیال ، پریتم لال
۲۳۔ پھول اور شہد کی مکھی ، اشوک داور ، انور کمال حسینی
۲۴۔ روپا ہاتھی ، مکی پٹیل ، ایس، اے، رحمان
۲۵۔ ہندوستان نے آزادی کیسے حاصل کی ، کرشن چیتنیہ ، انور کمال حسینی

ذاکر حسین سیریز

۲۶۔ پرانوں کی کہانیاں مصنف گوپی چند نارنگ قیمت ۴/۲۵
۲۷۔ ابو خاں کی بکری ، ڈاکٹر ذاکر حسین ، ۳/-
۲۸۔ انوکھی دکان ، قدسیہ زیدی ، ۲/۵۰
۲۹۔ گلابو چوہیا اور پری زاد ، ، ، ۲/-
۳۰۔ دنیا کے جانور ، ، ، ۲/۵۰
۳۱۔ راجہ رام موہن رائے ، عرش ملسیانی ، ۴/۵۰
۳۲۔ خواجہ الطاف حسین حالی ، صالحہ عابد حسین ، ۶/۵۰
۳۳۔ سلطان زین العابدین بڈشاہ مصنف: رضیہ سجاد ظہیر ، ۶/۵۰
۳۴۔ ذاکر صاحب کی کہانی ، سعیدہ خورشید عالم ، ۱/۵۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔ اُردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

Regd. No. D(S)-097 FEBRUARY 1977

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

لبرٹی آرٹ پریس، پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دریا گنج دہلی 110002

davp 76/676

پیام تعلیم
پیام تعلیم

نہرو بال پستکالیہ

ہندوستان کی [illegible] زبانوں [illegible] کے لیے بہترین [illegible] شائع [illegible] کے لیے کتابوں کے اس سلسلے کا آغاز کیا گیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں بسنے والوں، مختلف زبانوں کے جاننے [illegible] ایک ہی سا ادب [illegible] کیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہو سکیں اور [illegible] قومی ایکتا [illegible]۔

اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہوئی ہیں جو اُردو کے علاوہ انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ملتی ہیں۔ ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے (۱/۵۰) ہے۔ یہ سب کتابیں رنگین تصویروں کے ساتھ فوٹو آفسیٹ پر شائع ہوئی ہیں۔

۱۔ [illegible] (حصہ اول دوم) مصنف: سی فری ڈاس، مترجم صالحہ عابد حسین
۲۔ [illegible] کا ساتھی سب کا دوست " اما شنکر جوشی، مترجم۔ انور کمال حسینی
۳۔ کشمیر مصنف بالا سنگھ، مترجم، خدیجہ بیگم، تصویر۔ پریما نند
۴۔ پرندوں کی دنیا مصنف۔ جہاں آرا، مترجم: محمد شفیع الدین نیر
۵۔ ہمالیہ کی چوٹیوں پر " بریگیڈیر گیان سنگھ، مترجم۔ محمد ذاکر
۶۔ ہماری میوں کی کہانی حصہ اول، مصنف تا مجمدار، مترجم رضیہ سجاد ظہیر
۷۔ جنت کی سیر اور دوسری کہانیاں " ۔ لیلا بھاگ[illegible] مترجم رضیہ سجاد ظہیر
۸۔ رسیلی کہانیاں " منوج داس " صغرا مہدی
۹۔ آزادی کی کہانی حصہ اول دوم [illegible] پربھاکر " [illegible]
۱۰۔ ہماری ریلیں " جگ جیت سنگھ " عرش ملسیانی
۱۱۔ ہندوستان میں غیر ملکی سیاح " کے سی۔ کھنہ، تصاویر کرشن کھنہ
۱۲۔ آؤ بھاگ کھیلیں مصنف: اوما نند، مترجم رفیعہ منظور الامین
۱۳۔ خالہ بلی کا خاندان مصنف۔ منوہر داس چترویدی، مترجم شفیع الدین نیر
۱۴۔ بہت دن ہوئے حصہ اول " چوکسی بی ایم جوشی، مترجم۔ رضیہ سجاد ظہیر
۱۵۔ بہادروں کی کہانیاں " راجندر اوستھی " انور کمال حسینی
۱۶۔ روہنت و سندریہ " کرشن چیتنیہ " انور کمال حسینی
[illegible]دا بہار کہانیاں " شانتا رنگاچاری " انور کمال حسینی
[illegible] سے دنیا [illegible]ل دوم " میر [illegible] علی " سید احسان
[illegible] کی سیر مصنف۔ تارا تیواری، مترجم۔ انور کمال حسینی
۲۰۔ بڑا پانی " لیلا مجمدار " صالحہ عابد حسین
۲۱۔ مورا " ملک راج آنند " انور کمال حسینی
۲۲ ہاکی کا کھیل " سریندر سانیال " پریتم لال
۲۳۔ پھول اور شہد کی مکھی " اشوک دادر " انور کمال حسینی
۲۴۔ روپا ہاتھی " ممکی پٹیل " ایس اے رحمان
۲۵۔ ہندوستان نے آزادی کیسے حاصل کی " کرشن چیتنیہ " انور کمال حسینی

ذاکر حسین سیریز

۲۶۔ پرانوں کی کہانیاں مصنف گوپی چند نارنگ قیمت [illegible]
۲۷۔ ابو خاں کی بکری " ڈاکٹر ذاکر حسین " ۳/-
۲۸۔ انوکھی دکان " قدسیہ زیدی " ۲/۵۰
۲۹۔ گلابو چوہیا اور پری زاد " " " ۲/-
۳۰۔ دنیا کے جانور " " " ۲/۵۰
۳۱۔ راجہ رام موہن رائے " عرش ملسیانی " ۴/۵۰
۳۲۔ خواجہ الطاف حسین حالی " صالحہ عابد حسین " ۶/۵۰
۳۳۔ سلطان زین العابدین بڈشاہ مصنف: رضیہ سجاد ظہیر " ۶/۵۰
۳۴۔ ذاکر صاحب کی کہانی " سعیدہ خورشید عالم " ۶/۵۰

لٹھ [illegible] امہ نگر نئی دلی ۲۵۔ اُردو بازار جامع مسجد دلی ۶۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳۔ علی گڑھ ۱

davp 76/678

ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دہلی ۲۵

جلد ۱۴ شمارہ ۵

اڈیٹر

ولی شاہجہانپوری

معاون

صفیہ حسان

مئی ۱۹۷۷ء

قیمت فی پرچہ ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ ۷ روپے

★

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دلی ۲۵ سے شائع کیا۔

★

فہرست

★

بچوّں سے باتیں

مارچ کے مہینے میں ملک میں بہت بڑا انقلاب آیا۔ چھٹی پارلیمنٹ کے انتخابات کے نتیجے نے ہندستان ہی نہیں ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ کانگریس کی نوّے سالہ خدمات اور تیس سالہ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ ملک میں پہلی بار غیر کانگریسی حکومت کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اس سے اس قول کی پھر تصدیق ہو گئی کہ دنیا میں کسی چیز کو دوام نہیں ہے۔

آپ نے تاریخ میں پڑھا ہوگا کہ بڑے بڑے بادشاہ آن کی آن میں فقیر ہو گئے، بڑے بڑے ظالم اور جابر موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ یہ قانون قدرت ہے۔ سیاست میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔

خیر چھوڑیے اس قصے کو۔ ہم نے پہلے بھی آپ کو مشورہ دیا تھا کہ آپ اپنا کام یعنی تعلیم، محنت اور لگن کے ساتھ جاری رکھیں۔ اب تو سالانہ امتحان شروع ہو گئے ہیں اور مئی کی پندرہ تاریخ کو ختم بھی ہو جائیں گے۔ ہمیں امید بلکہ یقین ہے کہ اگر آپ نے جی لگا کر پڑھا ہوگا تو آپ کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی اور کامیابی ضرور آپ کے قدم چومے گی۔ اچھا یہ تو بتایے کہ دو مہینے کی چھٹیوں میں آپ کیا کریں گے؟ صرف سیر و تفریح اور کھیل کود؟ ٹھیک ہے۔ دس مہینے کی محنت کے بعد آرام بھی ضروری ہے۔ لیکن چوبیس گھنٹے آرام بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بھی جی اوب جاتا ہے۔ اس لیے ہمارا مشورہ ہے کہ اس درمیان میں آپ کو اپنے محلّے اور پاس پڑوس میں لڑکوں اور بڑوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے کے لیے چند گھنٹے ضرور نکالنا چاہیے۔ یہ آپ کا قومی فرض ہے۔ اس سے جہالت کو ختم کرنے میں مدد ملے گی اور قوم اور ملک کا سدھار ہوگا۔

جب ہم کہتے ہیں کہ ان پڑھ لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھایے تو ہمارا مقصد صرف یہ نہیں ہوتا کہ انھیں کسی عبارت کا پڑھنا اور لکھنا آ جائے بلکہ یہ کہ انھیں اچھا شہری بنایا جا سکے، اس میں بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت، صفائی، ستھرائی، دوسروں کی خدمت کا احساس اور جذبہ سب کچھ شامل ہے۔ اس سے آپ کا گھر نمونے کا گھر، آپ کا محلہ نمونے کا محلہ، آپ کا شہر نمونے کا شہر اور بالآخر آپ کا ملک نمونے کا ملک بن جائے گا۔ کاش یہ تمنا پوری ہو سکے اور اس میں آپ کی کارکردگی زیادہ سے زیادہ ہو۔

آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اس سال اتر پردیش اُردو اکیڈمی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے چیرمین اور پیام تعلیم کے سرپرست، پروفیسر محمد مجیب کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں پانچ ہزار روپے کا انعام عطا کیا ہے۔ مجیب صاحب کو یہ اعزاز اب سے بہت پہلے ملنا چاہیے تھا۔ بہر حال اکیڈمی کا یہ فیصلہ اسے ہمارے شکریے کا مستحق بنا دیتا ہے۔ محترم مجیب صاحب کی خدمت میں ہم ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

بمبئی میں ایک صاحب ہیں یوسف ناظم۔ کسی زمانے میں آپ کے پیام تعلیم میں بڑی دلچسپی لیتے تھے اور مزے مزے کے مضامین لکھ کر پیام تعلیم کی بزم میں شرکت کرتے تھے۔ آپ کے مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ "پلک نہ مارو" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ حکومت اتر پردیش نے اس کتاب پر انعام بھی دیا تھا۔

اب خبر آئی ہے کہ مہاراشٹر کی اردو اکیڈمی نے بھی آپ کو ایک ہزار روپے کے انعام سے نوازا ہے۔ ہم یوسف ناظم صاحب کو مبارک باد پیش کرتے ہیں اور یہ دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ بچوں کے ادب میں آپ کی خدمات کا اعتراف دو دو حکومتوں نے کر لیا ہے۔ اس کے باوجود کیا آپ اب بھی بڑوں ہی کے لیے لکھنے پر مُصر رہیں گے اور بچوں کو نظر انداز کرتے رہیں گے؟

اس شمارے میں پہلی بار اسمٰعیل حسنین نقوی صاحب (پٹنہ) ہماری بزم میں شریک ہوئے ہیں۔ ہم ان کا خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آپ برابر ہمیں نوازتے رہیں گے۔

پٹنے ہی کے ایک صاحب اعجاز علی ارشد [illegible] بہت عمدہ مضمون "مولانا مظہر الحق" ارسال کیا ہے۔ ہم چاہیں گے کہ قومی رہنماؤں کے زیادہ سے زیادہ حالات سے آپ کو واقف کرائیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ یہ سلسلہ جاری رہے۔ اور ارشد صاحب مزید معلوماتی مضامین آپ کے لیے لکھتے رہیں۔

۳ سال سے زیادہ مدت گزری کہ ہم [illegible] ایک استاد سے جو عربی کے لکچرر ہیں یہ فرمائش کرتے آئے ہیں کہ اس قسم کے مضامین سلسلہ وار لکھ کر پیامی برادری کو ان بزرگوں کے حالات سے واقفیت بہم پہنچائیں۔ جن کے قومی اور وطنی کارناموں کو لوگ بھولتے جا رہے ہیں۔ یہ حضرت ابھی تک ادھر مائل نہ ہو سکے۔ اس کا ہمیں افسوس ہے اور اس سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ ہمیشہ یہ فرما دیا کرتے ہیں کہ "مسالا تیار ہے بس ایک آنچ کی کسر ہے"۔ اب ہمیں ان کی طرف سے مایوسی سی ہونے لگی ہے۔ اور ان سے تقاضا نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

قارئین کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ ہماری ایک مضمون نگار مس نشاط حیدری کے والد جناب غلام حیدر کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ ایک اور کرم فرما جناب محبوب راہی کو ان کا ایک بچہ داغ مفارقت دے گیا۔ ہماری ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں۔ اور ہم ان کے غم میں

نشاط حیدری

زندگی کے دو رُخ

عرصہ ہوا کسی شہر میں ایک مصوّر رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے حضرت عیسیٰؑ کی زندگی سے متعلق تصویریں بنانے کا فیصلہ کیا اور اپنا کام شروع کر دیا یہاں تک کہ اس نے تمام تصویریں مکمل کر لیں سوائے دو کے، ایک حضرت عیسیٰ کے بچپن کی تصویر اور دوسری یہودا کی۔ ان دونوں کے لیے اُسے ماڈلوں کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنے آس پاس بہت تلاش کیا۔ لیکن نہ اسے کوئی اتنا معصوم بچّہ ملا جو حضرت مسیح کے کردار کی عکاسی کرتا اور نہ ہی کوئی اس قدر بدصورت و بدکردار شخص ملا جو یہودا کا ماڈل بن سکے۔

اس نے ان ماڈلوں کے لیے دوسرے شہروں میں تلاش شروع کر دی۔ گاؤں گاؤں، اور قصبہ قصبہ کے چکر لگائے بچّوں میں حضرت عیسیٰؑ کی معصومیت ڈھونڈھی۔ بُری بُری جگہوں پر گیا جہاں یہودا جیسے بدکردار انسان مِل سکتے تھے۔ لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔

آخر ایک دن جب کہ مصوّر مایوس ہو کر اپنے شہر لوٹ رہا تھا، ایک گلی سے گزرتے ہوئے۔ اُسے بارہ تیرہ سال کا ایک بچّہ نظر آیا اس کے چہرے پر فرشتوں کی سی پاکیزگی تھی۔ مصوّر بہت خوش ہوا اور اس سے حضرت عیسیٰؑ کی تصویر کا ماڈل بننے کے لیے کہا۔ بچّہ راضی ہو گیا اور اس کے ساتھ آ گیا۔ رفتہ رفتہ حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کی تصویر مکمل ہو گئی۔

اب اُسے یہودا کے ماڈل کی فکر ستانے لگی۔ اور یہ سب سے زیادہ مشکل کام ثابت ہوا۔ اس نے ہر طرف تلاش کیا۔ لیکن اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ کہیں بھی اتنی مکروہ صورت نظر نہ آئی جو یہودا کے ماڈل کے لیے مناسب ہوتی۔

مدّت کے بعد ایک دن مصور ایک شراب خانے میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ پھٹے پُرانے، میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ایک شخص زمین پر پڑا۔ ”شراب! شراب!!“ چلّا رہا ہے۔ اس آدمی کا چہرا تمام برائیوں سے بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کیوں نہ میں اُسے یہودا کا ماڈل بنا لوں مصور نے سوچا۔ یہ سوچ کر وہ اٹھا، اس شخص کے پاس گیا اور کہا۔ ”میں تمھیں کھانا، کپڑا، شراب، سب دوں گا تم میرے ساتھ چلو“ وہ بدہیئت کریہہ صورت آدمی اُس کے ساتھ ہو لیا۔ مصور نے اُس سے ماڈل بننے کی درخواست کی جسے اُس نے فوراً قبول کر لیا۔ تصویر بنتی گئی۔ مگر اُس کے ساتھ ساتھ مصوّر نے ایک عجیب بات محسوس کی۔ جوں جوں تصویر بنتی جا رہی ہے، اس کا ماڈل پریشان سا ہوتا جا رہا ہے۔ ایک دن مصوّر نے اس سے پوچھا۔ ”میرے بیٹے! تمھیں کیا تکلیف ہے بتاؤ شاید میں تمھاری مدد کر سکوں“ اجنبی نے سسکیاں بھرتے ہوئے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ مصوّر کے بہت اصرار پر اس نے کافی دیر بعد اپنا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا اور روتے

(باقی صفحہ پر)

رؤف انجم پارسی ٹاکلی

جیسی کرنی ویسی بھرنی

دنیا ہے ایک کھیتی بچّو
جیسا بوؤ ویسا پاؤ

نفرت کے بیجوں سے بھائی — جس نے بھی ہو فصل اُگائی
محنت سے حاصل کی اس نے — کیا خوبی اور کیا اچھائی
املی کے پیڑوں پر یارو — کیسے آم کا پھل آئے گا
دنیا کا دستور یہی ہے — جیسا بوئے گا، پائے گا
بیری اور ببولوں سے ہم — چمپا کے گل پائیں کیسے؟
کانٹے دار کسی جھاڑی پر — بھونرے امنڈ لائیں کیسے؟
کانٹوں کا بدلہ ہے کانٹے — اس کا مطلب خوب سمجھ لو

دنیا ہے اک کھیتی بچّو
جیسا بوؤ ویسا پاؤ

جو الفت کے پھول کھلائے — وہ الفت کی خوشبو پائے
پیڑ محبت کے دیتے ہیں — عیش کے ٹھنڈے ٹھنڈے سائے
اپنا پن جتلا کر ہم نے — غیروں سے بھی کام لیا ہے
انسانوں کی ہمدردی نے — شیروں کو بھی رام کیا ہے
چندن کا چھوٹا سا ٹکڑا — کیا اچھا بدلا دیتا ہے
دھار کو ظالم کلہاڑی کی — خوشبو دار بنا دیتا ہے
نرم دلی کا تحفہ دے کر — دشمن کو بھی یار بناؤ

دنیا ہے اک کھیتی بچّو
جیسا بوؤ ویسا پاؤ

خالد عرفان
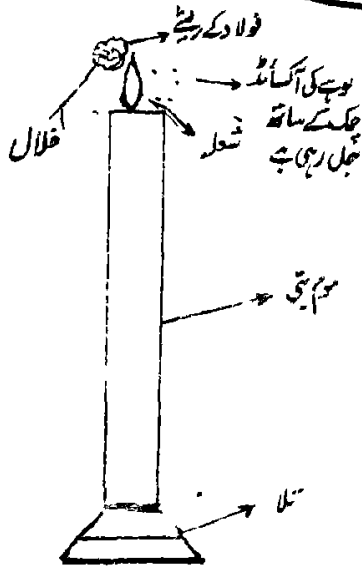
آگ ایک ایسی قوت ہے جو سخت سے سخت چیز کو بھی جلا کر رکھ دیتی ہے یہاں تک کہ سخت ترین لوہے یعنی فولاد کو بھی خود آپ کو یقین آ جائے گا، اگر آپ ایک اور معمولی تجربہ کر لیں۔

اس تجربے میں آپ فولاد کے ریشے استعمال کریں گے۔ آپ کو ایک خلال کی ضرورت پڑے گی اور آپ کے پاس موم بتی اور دیا سلائی کی ڈبیا تو ہوگی ہی - خلال اپنے دادا ابا یا نانا ابا سے مانگ لیجیے گا۔

ننھے سے خلال کے ایک طرف ریشے لپیٹ دیجیے اور اس گچھے کو جلتی موم بتی کی لو میں پکڑیے۔ کچھ ہی دیر میں آپ دیکھیں گے کہ میز پر جلتے فولاد کی چنگاریاں گر رہی ہیں - ان ننھی ننھی چنگاریوں میں فولاد کے ننھے ننھے ذرّات ہی ہوتے ہیں جو آکسیجن کے ساتھ مل کر جلتے ہیں اور فولاد کی آکسائڈ بن کر گرتے ہیں - فولاد کو بھی جلا دیا آپ نے!

(شکل ۵)

فولاد کے ریشے
لوہے کی آکسائڈ
چمک کے ساتھ
جل رہی ہے
شعلہ
خلال
موم بتی
تلا

اگر میں کہوں کہ لوہے کی اور دوسری دھاتوں کی بنی بے شمار اشیا جو آپ کے اردگرد پھیلی ہوئی ہیں بہت ہی آہستہ آہستہ آپ کو نظر آئے بغیر ہمیشہ جلتی رہتی ہیں تو غالباً آپ چونک پڑیں گے - اس لیے کہ ہوا میں جلنے کے ساتھ روشنی اور حرارت تو ان سے خارج ہوتی تھی، لیکن آپ کو ایسی کوئی بات نظر نہیں آ رہی ہے نہ تو روشنی ہے نہ حرارت، پھر کیسے آپ مان لیں کہ اشیا جل رہی ہیں ؟! بھئی اس جلنے کو کہتے ہیں " زنگ لگنا " جب لوہے کو زنگ لگتا ہے تو بالکل یہی ہوتا ہے جو

جلتے وقت ہوتا ہے، یعنی لوہا آکسیجن کے ساتھ مل کر
لوہے کی آکسائڈ بن جاتا ہے۔ ہاں اس زنگ لگنے
کے لیے آکسیجن کے ساتھ ایک اور چیز کی ضرورت ہوتی
ہے جو ہوا ہی میں پائی جاتی ہے۔ یعنی رطوبت ہوا کا
نم یا خنک ہوتا زنگ لگنے میں بہت مدد دیتا ہے۔ اگر
ہوا میں پانی کے ذرات نہ پائے جائیں یعنی ہوا خشک
ہو تو لوہے یا کسی اور چیز کو زنگ نہیں لگے گا۔
زنگ لگنے کے معنی ہیں آکسیجن کے ساتھ پانی کے
ذرات کی موجودگی میں لوہے کا مل کر لوہے کی آکسائڈ
بننا یعنی چیزوں کا جلنا اور دھاتوں کا زنگ پکڑنا،
دونوں عمل آکسیجن کی کرامات ہیں۔

اب آئیے، اسی آکسیجن کے دوا اور جادوئی
کرتبوں سے اپنے دوستوں کو اچنبھے میں ڈال
دیں۔

کبھی کبھار آپ کے کپڑوں پر روشنائی تو گر
جاتی ہوگی۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ روشنائی کے دھبوں
کو کیسے کپڑوں سے دور کریں۔ بات آسان ہے۔
ان دھبوں کی روشنائی کو کیوں نہ آکسیجن کے ساتھ ملنے دیا جائے
شاید دھبے غائب ہو جائیں! آپ میرا منھ کیوں تکنے
لگے۔ شاید سوچ رہے ہوں گے کہ میں ان دھبوں
کو جلانے کی بات کر رہا ہوں۔ اوہ، نہیں بھئی، ان
دھبوں کو جلانا ہے تو کپڑوں کو آگ لگانی ہوگی اور
اس طرح دھبوں کے ساتھ کپڑا بھی غائب ہو جائے
گا۔ میں کیوں آپ کا نقصان کرنے لگا! میں چاہتا ہوں
کہ ان دھبوں کو آکسیجن سے ملنے تو دیا جائے۔
لیکن یہ آکسیجن ہم ہوا سے نہ لیں ....
--- تو پھر یہ آکسیجن آئے کہاں سے؟

ایک اور ہوا کی طرح مفت اور آسانی سے ملنے والی چیز
ہے۔ آپ نے ٹھیک سمجھا، ہوا کی طرح مفت اور زیادہ
مقدار میں ملنے والی چیز ہے پانی، اور پانی میں چھپی
ہوتی ہے آکسیجن۔ اسی کے ساتھ ایک اور گیس ہے،
بالکل ہلکی، چاہے دوسروں کو جلنے میں مدد نہ دے
لیکن خود جلنے والی۔ اس گیس کو کہتے ہیں۔ ہائیڈروجن
پانی دراصل ان ہی دو گیسوں کا کیمیائی مرکب ہوتا ہے،
یعنی اگر ہائیڈروجن کے دو حصوں کو آکسیجن کے ایک
حصے کے ساتھ کیمیائی طور پر ملنے دیا جائے تو پانی
بن جائے گا۔ ظاہر بات ہے اگر پانی کو کیمیائی یا کسی
دوسرے طریقے سے تقسیم کیا جائے تو وہ ان ہی دو گیسوں
میں بٹ جائے گا۔ یعنی آکسیجن بھی ملے گا اور ہائیڈروجن
بھی۔ اب روشنائی کے دھبے کو دور کرنے کے لیے اسی
ترکیب سے کام چلانا ہوگا۔ یعنی پانی سے ہائیڈروجن
کو الگ کرنا ہوگا، اس طرح بچ رہے گی آکسیجن،
اس آکسیجن کو روشنائی سے ملنے دیا جائے تو روشنائی
غائب!

آپ خواہ مخواہ کپڑوں پر روشنائی الٹ کر اچھے
بڑھیا کپڑوں کو کیوں گندہ کریں، آئیے اس تجربے
کو ایک اور آسان طریقے سے انجام دیں۔ اس کے لیے
آپ کو بازار تک جانا ہوگا اور دوائیوں کی دکان سے یا جنرل
اسٹور سے رنگ کٹ سفوف (Bleaching Powder)
خرید لانا ہوگا تھوڑا سا۔ بلیچنگ پوڈر ایک سفید سفوف ہوتا ہے
اس کو اکثر دھوبی بھی استعمال کرتے ہیں، کپڑے صاف کرنے
کے لیے اور کبھی بڑے بڑے شہروں میں پانی کو صاف کرنے
کے لیے بھی اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔ بالکل
ہی قلیل مقدار میں۔ اگر مقدار بڑھ جائے تو لینے

کے دستے پڑ جائیں، پینے والے جان سے جائیں۔

تو صاحب، حاصل کر لیا نا آپ نے رنگ کٹ سفوف اب یوں کیجیے، اپنے دوستوں کو اکٹھا کر لیجیے اور ان سے کہیے کہ آپ کے پاس ایک ایسا منتر ہے جس سے سرخ اور نیلے شربت کو بے رنگ پانی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ وہ ہنس دیں گے۔ ہنسی کی پروا نہ کیجیے، چپکے سے دو گلاس لیجیے۔ ایک کی تہ میں پہلے سے رنگ کٹ سفوف کی دو چار چٹکیاں ڈال رکھیے۔ شکل ۱

پانی جس میں روشنائی گھلی ہوئی ہے

گلاس کی تہ میں بلیچنگ پوڈر کے ذرات

شکل ۱

اب دوسرے گلاس میں آدھے گلاس تک تو پانی لیجیے، پھر اس میں سرخ یا نیلی، جس رنگ کی چاہے روشنائی اس قدر ڈالیے کہ رنگ پکا ہو جائے جی چاہے تو پھیکا بھی رکھ سکتے ہیں۔ اپنے دوست سے کہیے کہ ذرا وہ غور سے دیکھے پھر روشنائی ملے پانی کو بظاہر کوئی منتر پڑھتے ہوئے دوسرے گلاس میں انڈیلیے، ارے یہ کیا، رنگین شربت دوسرے گلاس میں جاتے ہی بے رنگ بن گیا۔ رنگ سرخ یا نیلا غائب ہو گیا۔ (شکل ۲)

روشنائی جو پانی بن گئی ہے

شکل ۲

ذرا قریب آیئے، ایک پتے کی بات بتاتا چلوں، یہ کرتب بہت پرانا ہے۔ اس کو تقریباً ہر شعبدہ باز جانتا ہے اور اپناتا ہے!

کرتب تو آپ نے دکھا دیا، اب اگر آپ کے دوست پوچھیں کہ ایسا کیسے ہوا تو آپ کیا بتائیں گے راز کو راز ہی رہنا ہے آپ بھلا کیوں بتانے لگے کہ یہ سب کچھ آکسیجن کا کمال ہے۔ پر میں آپ کو ضرور بتاؤں گا ہوتا یہ ہے کہ بلیچنگ پوڈر (رنگ کٹ سفوف) ہے، اس میں بھی ہوتی ہے ایک اور گیس اس کو کہتے ہیں کلورین یا سبزین۔ یہ وہی گیس ہے جو کھانے کے نمک کا بھی لازمی جزو ہوتی ہے اور اس کلورین کو ہائیڈروجن گیس سے بڑا انس ہوتا ہے، جہاں بھی دونوں ایک دوسرے کو دیکھ لیں بس بغل گیر ہو جاتے ہیں، مل جاتے ہیں اور ایک اور گیس بن جاتی ہے ہائیڈروجن کلورائڈ۔ تو بات ہو رہی تھی رنگ کٹ سفوف کی، جیسے ہی پانی اس سفوف سے ملتا ہے کلورین گیس اس سفوف میں سے نکلتی ہے اور یہ کلورین گیس اب پانی میں پائی جانے والی ہائیدروجن گیس کھینچ نکال لیتی ہے اور ہائیدروجن کلورائڈ بن جاتی ہے، پانی اس طرح پھٹ کر ہائڈروجن اور آکسیجن میں بٹ جاتا ہے، ہائڈروجن کو تو کلورین ساتھی مل گئی اور رہ گئی بیچاری آکسیجن اکیلی۔ غصہ ہی تو آئے گا اس کو، اور وہ اپنا غصہ اتارے گی کس پر، روشنائی پر ہی نا! اور اس غصے کی بدولت روشنائی بن جاتی ہے پانی! ہوئی نا مزے کی بات! ایک اور کمال دیکھیں اسی آکسیجن گیس کا!

آپ جانتے ہیں بعض چیزیں بہ جلد جل اٹھتی ہیں، آگ پکڑ لیتی ہیں اور بعض کو زیادہ گرم کرنا

پڑتا ہے۔ تب کہیں جاکر وہ جلتی ہیں۔ جب آپ کسی چیز کو گرم کر رہے ہوتے ہیں۔ تب بھی وہ آکسیجن سے ملتی رہتی ہے لیکن آہستہ آہستہ اسی اصول کو اپنا کر آپ اپنے دوست کو خفیہ پیغام بھیج سکتے ہیں آپ کے پاس جادو کی روشنائی جو ہوگی! اسی سے آپ اپنا پیغام سادہ کاغذ پر لکھیں گے، پھر تھوڑی ہی دیر میں آپ کا لکھا ہوا پیغام غائب ہو جائے گا اور کاغذ کورا رہ جائے گا۔ اس کورے کاغذ کو پاکر آپ کے دوست منہ بنائیں گے۔ ان کو غصہ آئے گا۔ اور اگر انھیں معلوم نہیں ہے کہ آپ نے جادو کی روشنائی سے خط لکھا ہے تو وہ اس کورے کاغذ کو پھاڑ پھینکیں گے۔ لیکن انھیں راز معلوم ہے تو۔ تو کیا؟ وہ آپ کا پیغام پڑھ لیں گے۔

یہ جو جادو کی روشنائی ہے اس کے لیے آپ کو نہ تو زیادہ محنت کرنی ہے نہ روپے خرچ کرنے ہیں، بس بازار سے آپ کو ایک لیمو خرید لانا ہے۔

آپ کے پاس کوئی قلم تو ہوگا۔ نب والا۔ اس کی نب دھوکر صاف کر لیجیے۔ لیجیے آپ تیار ہیں خفیہ پیغام بھیجنے کے لیے۔

لیمو کو اپنی امی سے کہہ کر آدھا آدھا کاٹ لیجیے۔ صاف کی ہوئی نب کو اس کٹے ہوئے لیمو کی قاش میں چبھوئیے، اس طرح کہ اس کی نوک پر کافی رس آجائے۔ اب فوراً ایک صاف سفید کاغذ پر اس رس سے موٹے موٹے حروف میں اپنا پیغام لکھیے۔ بار بار نب کو روشنائی میں یعنی لیمو کی قاش میں ڈبو لیا کیجیے۔ اب اس کاغذ کو کچھ دیر کے لیے ہوا میں [illegible] جادو کی روشنائی خشک ہوگی تو بالکل نظر نہیں آئے گی اور کاغذ بالکل سادہ لگے گا۔ شکل ۹

اب بتائیے آپ کے دوست اس پیغام کو پڑھیں گے کیسے؟ کچھ نہیں، ان کو اتنا کرنا ہوگا کہ اس کاغذ کو آگ کے قریب کر دیں اور کچھ دیر پکڑے رہیں، بس اتنی دیر کہ وہ گرم ہو جائے جلے نہیں (کاغذ جل اٹھا تو آپ کا خفیہ پیغام ہمیشہ کے لیے خفیہ رہ جائے گا نا!) اب جیسے جیسے کاغذ گرم ہوگا آپ کی جادو کی روشنائی آکسیجن سے ملنا شروع ہوگی اور کاغذ پر آپ کا لکھا ہوا پیغام ابھر آئے گا۔ لگے گا آپ نے نارنجی روشنائی سے اپنا پیغام لکھا ہے!!

کتنی آسان ترکیب ہے خفیہ پیغام بھیجنے کی، اسی طرح آپ پیاز کے رس یا سرکہ سے بھی لکھ کر خفیہ پیغام بھیج سکتے ہیں۔

جلنے کے راز کو تو آپ نے پہچان لیا، خفیہ پیغام بھی بھیجنا آپ کو آگیا، اب سستا لیجیے، مزید باتیں اگلی بار!

★★

اسمٰعیل حسنین نقوی

میں نے بھی حساب سیکھا

میں نے بھی تصویر ٹانگی، میں نے بھی افسانے لکھے، میں نے بھی شعر کہے، میں نے بھی اداریئے لکھے، میں نے بھی تقریریں کیں، میں نے بھی دوکانداری کی، میں نے بھی مرغیاں پالیں، میں نے بھی چھلانگیں لگائیں، میں نے بھی خواب محل بنائے اور انھیں تاج محل بنایا...... میں نے بھی نشانہ سیکھا اور میں نے بھی شیر مارے...... کے بیسوں دعوے لوگ کرتے ہیں یا کرتے ہوئے لوگوں کو میں نے سُنا ہے۔ ان دعووں کے ہجوم میں اگر یہ ناچیز یہ کہے کہ ''میں نے بھی حساب سیکھا''، تو غلط کیا ہوگا۔!!

حساب کی سب سے پہلی مشق تو میری اس تعلیم سے تعلق رکھتی ہے جو میں نے دادی اماں کی گود میں حاصل کی تھی۔ دادی اماں سے میں اکثر ضد کرتا کہ مجھے پیسے دیجیے، مٹھائیاں خریدوں گا اور وہ مجھے کبھی لال پیسے (تانبے کے سکّے کبھی اجلے (چاندی کے سکّے) کبھی چھوٹے اور کبھی بڑے پیسے دے دیا کرتی تھیں۔ مجھے لال پیسے بہت پسند تھے۔ اور جب وہ چھوٹے یا بڑے اجلے پیسے دیتیں تو میں پچھاڑیں مارتا کہ نہیں! مجھے لال پیسے دیجیے۔ وہ ہزار کہتیں کہ یہ بڑے ہیں۔ لیکن میں انھیں نہیں سمجھتا۔ ہاں البتہ جب کچھ شعور ہوا تو یہ سمجھ پایا کہ اجلے پیسے میں زیادہ مٹھائیاں آتی ہیں اور لال میں کم۔ پھر بھی میں دونوں کے فرق کو اس قدر نہیں سمجھ سکا جتنا کہ آج سمجھتا ہوں..... کاش! اس وقت سمجھتا تو دادی اماں کے پاس کے سارے اُجلے پیسے لے لیتا، لیکن آہ...... اب تو لال پیسے دیکھنے کو بھی آنکھیں ترس گئیں ہیں — نہ وہ دادی اماں رہیں اور نہ وہ دور۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرا دوسرا سبق حساب کا تب شروع ہوا جب میں دادی اماں کو گوالن (دودھ والی) کا حساب چکاتے دیکھا کرتا تھا۔ لکڑی کے کوئلہ کی نہ جانے کتنی لکیریں دیواروں پر اور کبھی دروازوں پر، کبھی کواڑوں پر ڈالی جاتیں اور اور پھر نہ جانے کیسے مہینہ بھر میں ان سب کو دادی اماں گوالن کے دیتے ہوئے دودھ کا حساب گن لیتیں اور گوالن اور ترکاری والیاں خاموشی سے اپنا حساب سمجھ کر چلی جاتیں، مجھے وہ حساب تب سے اب تک سمجھ میں نہیں آیا۔

میں نے اس گنتی کو دیکھ کر اپنے ہاتھوں کی انگلیاں گنیں، پھر ہاتھ پیر دونوں کی۔ پھر بدن کے

سارے اعضا کی ۔۔۔ اور اکثر چاندنی رات
میں گھر کی انگنائی میں لیٹا ہوتا تو میں دادی اماں
سے کہتا کہ دادی اماں مجھے آسمان کے تارے گننا
سکھا دیجیے ۔۔۔ اور وہ کہتیں ہاں بیٹا !
بڑے ہو کر گن لوگے ۔۔۔ تمھارے ابّا جان
اب بڑے بڑے حساب کرتے ہیں ۔ سارے صوبے
اور دیش کی آمدنی اور خرچ کا حساب کرنے والے
دفتر میں کام کرتے ہیں ۔ دیکھتے نہیں ؟ ان کے سر کے
بال کیسے اڑ گئے ہیں ۔

سر کی بات اور بال کی بات چھیڑتے
ہی میں اکثر دادی اماں سے کہتا ۔۔۔ دادی اماں
لائیے میں آپ کے سر کے بال گن ڈالوں اور وہ
کہتیں ، بیٹے ! تم تھک جاؤ گے اور میں کہتا نہیں
تھکوں گا ۔ یہاں تک کہ میں ان کے بال گنتے گنتے
ان کے سر کو ایسا کر دیتا جیسے پتنگ کی الجھی ہوئی ڈور
تب میں کہتا چھوڑیے آپ کے بال بڑے ایسے ہیں ۔
اب میں صرف اجلا بال گنوں گا اور اجلے بال گنتے
گنتے میں سو جاتا اور جب اٹھتا تو پھر بھول جاتا
کہ کتنے گنے تھے ۔ نہ جانے کتنے دن اور کتنی راتیں
ان باتوں کے شمار میں گزر گئے اور آخر تک ان کی
گنتی نہ ہو سکی ننھی سی عقل بھلا کیا جانتی تھی کہ یہ
مسئلہ لا محدود (INFINITY) کا مسئلہ ہے ۔

کاش اس وقت سے ہی مجھے ڈاکٹر آر شکلا (ہندستان
کے مشہور حساب داں) کے علم کا ایک عشر عشیر ہی
مل گیا ہوتا تو میں نہ دادی اماں کو تنگ کرتا اور نہ
خود تھک کر سو جایا کرتا ۔ علم الحساب کا علم میں
نے پاٹھشالہ میں گرو جی سے بھی حاصل کیا ۔ مجھے اچھی
طرح یاد ہے کہ جب میں بچہ کلاس میں اپنے گاؤں
(KUJHWA) ضلع سیوان (بہار) کے پرائمری اسکول
میں داخل کیا گیا اور مجھے گنتی سکھانے کے لیے اردو
ہندسوں کی مشق کرائی گئی تو ہمیشہ ۲ کی بجائے
۶ اور چھ کی بجائے ۲ لکھتا رہا ۔ اس سے آگے
بڑھا ، اب بڑے بڑے ہندسے لکھائے جانے
لگے سو (۱۰۰) تک کی گنتی تو ہوگئی پھر بھی
یاد ہے کہ جب میرے مولوی صاحب مجھے
ایک سو دو لکھنے کو کہتے تو میں لکھتا ۱۰۰۲ ۔
جب مجھے کتاب کے ایک سو بارہ صفحے
کھولنے کو کہا جاتا تو میں اکثر اپنے استاد سے
یہ کہتا کہ کتاب میں ۱۰۰۱۲ تو ہیں ہی نہیں ۔۔۔
باوجود اس کے کہ ۱۱۲ نمبر کا صفحہ کتاب میں موجود
ہوتا ۔ کبھی مجھے ایک ہزار تیس لکھنا ہوتا تو میں
یوں لکھتا ۱۰۰۰۳۰ ۔ اس طرح نہ جانے کتنی بار
پٹائی ہوئی ہوگی اور کتنے بار کان ملے گئے ہوں
گے ۔ تب بھائی نقوی نے یہ سکھا کر دہائی ،
سیکڑے اور ہزار کی اکائی کیا ہے

میری گنتی کا سبق ختم ہو گیا ، عمر ابھی چھ سال
کی تھی کہ مولوی کرامت علی صاحب نے فرمان سنایا
کہ کل سے پہاڑا سیکھنا ہوگا ۔۔۔ میں گھر گیا
تو دوسرے دن میں نے امّی جان سے کہا کہ میں
اسکول نہیں جاؤں گا ۔ امّی جان کے دریافت
کرنے پر میں نے کہا کہ مولوی کرامت علی صاحب
نے آج پہاڑ توڑنے کو کہا ہے ۔ امی جان بھی
تعجب کرنے لگیں ۔ انھوں نے کہا کہ تو میں پہاڑ
کہاں جو مولوی صاحب تم سے توڑوائیں گے ؟

میں نے کہا آپ نہیں سمجھتیں! گنتی ختم ہو گئی ہے
اب پہاڑ کا بھی بڑا پہاڑا کی طرف چلتا ہے۔ وہ
ہنسیں اور میں رو دیا!! کیا آپ بھی ہنس رہے ہیں؟
کسی طرح بہلا کر میں اسکول بھیجا گیا تو آج یہاں سے
پہاڑے یا پہاڑا کا سلسلہ شروع ہوا۔ میرا جو اندازہ
تھا صحیح نکلا - جان پر بڑی بنی کئی دنوں تک گھنٹوں
آنکھیں ملتے دن گزرے اور سوچتے سوچتے رات
کٹی تب پھر کچھ سمجھ میں آیا کہ یہ پہاڑ پر چڑھنے کی سیڑھی
ہے۔

بچپن کی یہ بھولیں کتنی پیاری اور کتنی نرالی
ہیں، میں کچھ نہیں سکتا۔ جب میں ان باتوں کو سوچتا
ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ انسانی دماغ کس قدر
بڑا ہے اور اس کی وسعتیں کتنی زیادہ!! آج میں
انسانوں کی ایجاد کردہ مشینوں کو دیکھتا ہوں تو میری
حیرت کی انتہا نہیں رہتی آج مشینیں جوڑتی
ہیں گھٹاتی ہیں، ضرب اور تقسیم کرتی ہیں - بڑے
سے بڑے حسابات منٹوں میں بنا کر ان حل پیش
کر دیتی ہیں دادی اماں کی لکیروں سے
لے کر (COMPUTORS) کی کارفرمائیوں اور
علم طبیعیات (PHYSICS) کے (CALCULATIONS)
جو (FRACTION OF SECOND) تک صحیح ہوتے
ہیں کے بارے میں سوچتا ہوں تو انسانی عظمت اور
اپنے بڑاپے کا بھی احساس ہوتا ہے۔ میں بچپن میں
بھولا کرتا تھا ہوں، خیال کر کے مسکرا دیتا ہوں۔ اب تو میں
بہت بڑا حساب داں ہو گیا ہوں لیکن PSYCHLO[illegible]
(G 1976) نے صحیح کہا ہے " کہ بچپن کی بھولیں
[illegible] سے اکثر ابھرتی رہتی ہیں " یہ ایک حقیقت

ہے۔ آج بھی تو میں دن، تاریخ اور مہینہ اکثر
بھولتا ہوں اور آج بھی اپنے گھر کا بجٹ بناتے
وقت RS.350/- کا بجٹ بنا کر ٹوٹل RS. 250
لگاتا ہوں اور امی جان کو بینک سے RS 250/-
لا کر دیتا ہوں اور دس دنوں کے بعد وہ سر تھام کر
بیٹھی نظر آتی ہیں کہ سب پیسے ختم ہو گئے۔ جب
میں بجٹ پر نظر ثانی کرتا ہوں اور پھر سے ٹوٹل
کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ــــ آہ!
یہ تو امی جان کی ساری مصیبت میاں نقوی
کے حساب دانی میں کمزور ہونے کی وجہ سے
ہے سوائے خاموشی کے کیا کیا جائے؟
کاش نقوی میاں پھر دیوار پر دادی اماں
کی کھینچی لکیریں گنا کرتے یا ان کے بال یا آسمان
کے تارے گنتے تو یہ مصیبتیں نہ ہوتیں۔

پیام تعلیم کا

محمد شفیع الدین نیر نمبر
زیر ترتیب ہے۔ کچھ اچھے مضامین موصول ہو گئے
ہیں۔ کچھ اصحاب نے وعدے کیے ہیں کہ وہ بھی اپنی
تخلیقات بھیج رہے ہیں ان کا انتظار ہے انشاء اللہ
جلد ہی یہ عظیم نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہو گا۔
اس ضخیم نمبر کی قیمت زیادہ ہو گی، مگر مستقل خریداروں
سے علاحدہ قیمت نہیں لی جائے گی۔
حفاظت کے خیال سے جو صاحب اسے رجسٹری
کے ذریعہ منگانا چاہیں وہ دو روپے کے ٹکٹ اپنے
پتے کے ساتھ بھیج دیں۔

(مدیر)

شوکت پردیسی

کام کی باتیں!

اچھی صحبت میں بیٹھنے والا
ہر بُرائی سے دُور رہتا ہے
بے سلیقہ کبھی نہیں ہوتا
با ادب، باشعور رہتا ہے

بھائی، بہنوں سے جو جھگڑتے ہیں
اُن کو سچّی خوشی نہیں ملتی
سب ہی رہتے ہیں دور دور ان سے
گھر میں راحت کبھی نہیں ملتی

ایسے بچّے کبھی نہیں لڑتے
جن کو اچھے، بُرے کا ہو احساس
لگتے ہیں وہ ہر ایک کو اچھے
سب بٹھاتے ہیں ان کو اپنے پاس

ایسے بچّے کہ با ادب جو ہیں
بات کرتے ہیں وہ سلیقے سے
ان سے جاتا نہیں بھرم گھر کا
لاج رکھتے ہیں ہر طریقے سے

کھیلتا ہے جو صرف کھیل کے وقت
سب سے اونچا بنا کھلاڑی وہ
جس کو اسکول کا نہ ہوش رہا
رہ گیا علم میں اناڑی وہ

جن کی عادت ہے مار کھانے کی
وہ مٹھائی پہ جان دیتے ہیں
اپنے ماں باپ سے جنھیں ہے پیار
وہ پڑھائی پہ جان دیتے ہیں

شہر سے دور گاؤں ہے لیکن
ہے بُرائی یہاں بھی کثرت سے
نظر آتے ہیں ہر جگہ شوکتؔ!
اپنے پیسوں کو ہارتے بچّے

سرور جمال

رابلے آس کی عقلمندی

فرانس میں ایک بہت بڑے عالم گزرے ہیں۔ ان کا نام رابلے آس تھا۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ وہ پیرس سے بہت دور چلے گئے۔ اتفاق سے ان کے پاس خرچ کے لیے ایک پیسہ بھی نہ بچا۔ یہاں تک کہ واپسی کے لیے ٹکٹ تک کے پیسے نہ رہے۔

کچھ غور کرنے کے بعد انھوں نے ایک ترکیب سوچی۔ انھوں نے اینٹ کا ایک ٹکڑا لیا۔ اسے باریک پیس کر سفوف بنایا۔ سفوف کو تین حصّوں میں تقسیم کرکے تین پڑیاں بنالیں۔ پھر ایک پر لکھا:-

"مال داروں کے لیے زہر"

دوسری پر لکھا:

"شہزادے کے لیے زہر۔"

اور تیسری پر لکھا۔

"بادشاہ کے لیے زہر"

اس کارروائی کے بعد ان پڑیوں کو اس طرح ہوٹل کے بڑے ہال کی میز پر رکھا کہ ہوٹل کے منیجر کی نظر پڑ جائے۔ منیجر نے دیکھا اور فوراً اسٹیٹ کے سکریٹری کو اس بات کی اطلاع دی۔

سکریٹری نے رابلے آس کے پاس ایک خاص اہل کار بھیجا اور ان کو باغی کہہ کر گرفتار کرا لیا۔ پھر ان کو پیرس بھیجنے کے انتظامات کیے گئے اور پولیس کی نگرانی میں بھیجا گیا۔ راستے بھر سرکار کی طرف سے ان کے کھانے پینے کا انتظام ہوا۔

لیکن رابلے آس جب پیرس پہنچے تو لوگوں نے ان کو فوراً پہچان لیا۔ زہر کی پڑیوں کو دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ کیوں کہ وہ مٹی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ اس طرح اپنی عقلمندی سے بغیر قرض لیے یا کسی سے امداد مانگے وہ واپس اپنے گھر آگئے۔

★★

پنڈت سدرشن
ترجمہ
ریاض اللہ آتیکل

باپ کا دل

(قسط ۔۲)

(۳)

کچھ دنوں بعد یحییٰ صاحب کے مکان پر قوالی کا پروگرام ہوا۔ ان کے دفتر کے کلرکوں نے انھیں دنوں ایک مجلس (قوال کمیٹی) قائم کی تھی۔ اس مجلس میں بہت سے قوال اور گانے بجانے والے تھے۔ ہر سنیچر کی رات کو کسی نہ کسی ممبر کے مکان پر جمع ہوتے، اور دو گھڑی دل بہلاتے تھے۔ یحییٰ صاحب گانا بجانا بالکل نہ جانتے تھے۔ مگر گانا سننے کا شوق انھیں بچپن سے تھا۔ "قوال کمیٹی" کے ممبر بن گئے۔ آج ان کے یہاں اسی مجلس کی ہفتہ وار میٹنگ تھی۔ اندر باہر دوڑتے پھرتے تھے۔ تاراچند گاتا تھا۔ ہنس راج ہارمونیم بجاتا تھا اور باقی لوگ مست ہو کر سنتے تھے۔ یہ تاراچند راگی نہ تھا۔ نہ اسے موسیقی کا تجربہ تھا، مگر اس کی آواز ایسی سریلی تھی کہ سن کر جوش آجاتا تھا، لوگ کہتے کہ تیری آواز میں جادو ہے، تبھی تو من موہ لیتا ہے۔ مگر اس وقت یحییٰ صاحب کا ادھر خیال بھی نہ تھا۔ وہ ممبروں کے استقبال میں مشغول تھے۔ سوچتے تھے کہ کوئی یہ نہ کہے کہ ان کا انتظام ٹھیک نہ تھا۔ کسی کو سگریٹ دیتے تھے، کسی کو دیا سلائی، کسی کو پان سپاری۔ اتنے میں ایک صاحب بولے " بابو تاراچند کا گلا بیٹھ جاتا ہے۔ مصری اور الائچی دو، نہیں تو گانا بدمزہ ہو جائیگا۔"

یحییٰ صاحب بھاگے، بھاگے گھر کے اندر گئے، اور بیوی سے بولے " مصری اور الائچی کہاں ہے؟"

فریدہ نے الماری سے ایک پلیٹ نکال کر شوہر کے ہاتھ پر رکھی اور پوچھا۔ "یہ کون گا رہا ہے؟"

یحییٰ: اس کا نام تاراچند ہے۔

فریدہ: بہت خوب گاتا ہے۔ آواز میں بڑی مٹھاس ہے۔

یحییٰ: کیا کہنا! سبھی مست ہو رہے ہیں!

یہ کہہ کر وہ لوٹنے ہی والے تھے کہ فریدہ نے جلدی سے کہا۔ ذرا ایک بات تو سنتے جاؤ۔

یحییٰ: (ٹھہر کر) کیا کہتی ہو۔ جو کچھ کہنا ہو، جلد کہو، دیر ہوگئی تو طعنے ماریں گے کہ مصری گھر میں نہ ہوگی، بازار سے لائے ہو۔

فریدہ: کیا یہ لوگ اتنے جلد باز ہیں؟

دوسروں کی عزت کی پرواہ ہی نہیں کرنے؟

یحییٰ: ایک جگہ کام کرنے سے بے تکلفی ہو جاتی ہے اس میں برائی کیا ہے؟ کہو کیا کہتی ہو؟

فریدہ: بچوں کو بھی لے جاؤ۔ بار، بار جاکر جھانکتے ہیں۔

یحییٰ: جھانکنے دو، اندر جاکر کیا کریں گے؟ گانے کی آواز باہر سے بھی سنائی دیتی ہے اور بالکل صاف۔

فریدہ: ایک طرف بٹھا دو، بیٹھے رہیں گے۔

یحییٰ: اور جو شرارت کی تو پھر؟

دونوں بچے سامنے کھڑے اپنے قسمت کا فیصلہ سننے کے انتظار میں تھے۔

فریدہ نے پوچھا: "کوئی شرارت تو نہیں کروگے؟"

حمیدہ: چپ چاپ بیٹھے رہیں گے۔

یحییٰ: تم چپ چاپ بیٹھنا جانتے ہی نہیں چپ چاپ کیسے بیٹھوگے؟

حمید کا منھ لٹک گیا۔ وہ ایک کونے سے لگ کر رونے لگا۔ لیکن پروین اتنی جلدی پیچھا چھوڑنے والی نہ تھی۔ اس نے باپ کے ٹانگوں سے لپٹ کر کہا۔

"پل وین نہیں ایں، ایں، ایں۔ پل وین نہیں ایں ایں، ایں۔" اور ماں کا ڈوپٹہ پکڑ کر اسے زور، زور سے کھینچنے اور رونے لگی، جس کا مطلب یہ تھا کہ اسے بھی لے چلیں۔

فریدہ نے کہا: شرارت نہیں کریں گے، لے جاؤ۔

یحییٰ صاحب کا دل نہیں مانتا تھا کہ یہ بچے وہاں اطمینان سے بیٹھیں گے۔ مگر بیوی کے سامنے

بولتے ہوئے انھیں ڈر لگتا تھا۔ سوچنے لگے کہ اگر اسے غصہ آگیا تو ابھی کڑکنے لگے گی اس کی آواز باہر تک سنائی دے گی۔ سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ ایک جلسہ باہر ہو رہا ہے، ایک اندر ہونے لگے گا۔ بے بسی سے بولے۔ "خیر آجاؤ، مگر شور نہ مچانا"

حمید کے بہتے ہوئے آنسو رک گئے۔ چہرے پر ہنسی آگئی۔ کرتے سے آنکھ صاف کرتے ہوئے بولا۔ "نہیں شور نہیں مچائیں گے۔

یحییٰ: پروین کو اٹھالو، اور چلے آؤ۔

حمید بہن کو لے کر باہر آگیا، اور اس کمرے میں جہاں گانا ہو رہا تھا، جاکر ایک طرف بیٹھ گیا اور پروین کو بھی پاس بٹھالیا۔ پروین نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے اتنے آدمی دیکھے تو ڈر گئی اور اٹھ کر بھائی کے گود میں جا بیٹھی۔

یحییٰ صاحب مصری اور الائچی بانٹنے لگے۔ جب تک دور تھے۔ پروین چپ رہی۔ مگر جب بالکل قریب آگئے، تب کچھ ہمت بندھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنے سر کے لمبے بالوں کو پیچھے ہٹایا اور دوسرا ہاتھ پھیلا کر کہا، "میں ا" جو پاس بیٹھے تھے، وہ ہنسنے لگے یحییٰ صاحب نے تین چار مصری کے ٹکڑے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے اور کہا، "یہ لو، یہ"میں" کی ڈلیاں ہیں۔ چپ چاپ کھالو"

حمید کے دل میں کچھ، کچھ ہونے لگا۔ اس کی نظر بھی مصری پر تھی۔ وہ اپنی زبان ہونٹوں پر پھیرتا تھا۔ اسے امید تھی، ابھی مجھے بھی ملتی ہے۔ مگر یحییٰ صاحب آگے بڑھ گئے اور اسے مصری نہ ملی۔ حمید کی آنکھیں تر ہو گئیں، اس کا چہرہ

اتر گیا۔ وہ سوچنے لگا، سب کو ملی ہے مجھے ہی کیوں نہیں ملی؟ اگر ماں ہوتی تو یہ ناانصافی کبھی نہ کرتی جب بڑا ہوں گا، اور روپے کماؤں گا، تو ڈھیر ساری مصری لے آؤں گا، اور پیٹ بھر کھاؤں گا اور سب کو بھی دوں گا۔ مگر آپا کو ایک ڈلی بھی نہ دوں گا۔ مانگیں تو کہوں گا۔ تم نے کبھی تو مجھے نہیں دی تھی، اب پروین سے مانگو۔

مگر بڑا ہونے کا، روپے کمانے کا اور پیٹ بھر مصری کھانے کا وقت ابھی بہت دور تھا، اور پروین کی مصری جلدی، جلدی ختم ہو رہی تھی۔ حمید نے ایک ڈلی اٹھا کر منھ میں ڈال لی اور منھ دوسری طرف پھیر لیا۔ اگر پروین نہ دیکھتی تو کسی کو پتا بھی نہ ہوتا، مگر اس نے دیکھ لیا اور مچل گئی۔ حمید اُسے خاموش کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اور وہ غصّے سے اس کا منھ نوچتی تھی، کہ میری مصری تم نے کھائی کیوں؟ اس کے بعد وہ زمین پر لیٹ گئی اور زور، زور سے رونے لگی۔ گانے میں ایک آواز بھی سنائی دے تو گانا بدمزہ ہو جاتا ہے۔ تاراچند نے بند کر دیا اور پوچھا، "یہ روتی کیوں ہے؟" کئی آدمیوں نے پروین کو سمجھانے کی کوششیں کیں، مگر وہ خاموش نہ ہوئی، اور بھی زور، زور سے رونے لگی۔ جہاں گانے کی سریلی آواز گونجتی تھی وہاں شور و غل مچ گیا۔ یحییٰ صاحب کسی کام سے اندر گئے تھے، باہر آئے تو یہ منظر دیکھا۔ لپک کر پروین کے پاس پہنچے اور لال، لال آنکھیں نکال کر بولے۔ "کیا ہوا، جو یوں چلا رہی ہے؟"

ایک آدمی نے کہا، "نادان ہے۔ آہستہ بولیے کہیں ڈر نہ جائے۔" پروین کی گئی ہوئی ہمت پھر واپس آگئی ——— اس کی آنکھوں کے آنسو آنکھوں ہی میں رک گئے۔ ڈرتی، ڈرتی، بولی "حمید نے میری مصری چھین لی ہے۔"

یحییٰ صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی، مگر اتنے آدمیوں کے سامنے کیا کہتے؟ خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے اور کڑکتے ہوئے بولے۔ "دونوں باہر نکل جاؤ۔"

بچے ہماری باتیں سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ مگر وہ ہماری آنکھوں کا مطلب سمجھنے میں کبھی غلطی نہیں کرتے۔ پروین نے سمجھ لیا کہ اس وقت چوں بھی کی تو مار کھائے گی۔ چپ چاپ بھائی کی گود میں چلی گئی۔ حمید اسے لے کر باہر نکل گیا۔ مگر یحییٰ صاحب کا غصّہ ابھی تک تازہ تھا۔ انھوں نے آنگن میں جا کر حمید کو پکڑ لیا، اور گرجتی ہوئی آواز میں بولے۔ "کیوں پاجی! تو نے اس سے مصری کیوں چھینی؟ لوگ کیا کہتے ہوں گے؟ یہی نہ کہ اس نے کبھی مصری کا منھ نہیں دیکھا؟"

حمید نے بہن کو اتار کر زمین پر کھڑا کر دیا اور سر جھکا کر نیچے دیکھنے لگا۔ یحییٰ صاحب شیر کے مانند اس کے سامنے کھڑے ہوئے تھے، اور غصّے سے ہونٹ چبا رہے تھے۔

پروین نے مار پیٹ کا یہ منظر دیکھا تو روتی ہوئی بھاگ گئی اور باورچی خانے میں جا کر ماں سے بولی، "ماں ابّا، حمید ——— ماں، ابّا حمید" جس کا مطلب یہ تھا کہ ابّا حمید کو مار رہے ہیں۔

فریدہ نے جلد باہر نکل کر دیکھا تو یحییٰ صاحب لڑکے کو بُری طرح مار رہے تھے ایسی بے دردی سے کہ دھوبی کپڑے کو بھی پتھر پر نہ پٹکتا ہوگا۔ ماں کا

دل پارہ پارہ ہوگیا۔ اُدھر ماں کو دیکھ کر حمید کی آوازیں نکل آئیں۔ فریدہ نے حمید کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنی طرف کھینچ لیا اور کہا "بس بھی کرو۔ کیا مار ہی ڈالو گے؟"

یحییٰ: (کانپتے ہوئے) میں نے کہا نہ تھا کہ انھیں اندر ہی رہنے دو۔ اُس وقت تو مانتی ہی نہ تھیں۔

فریدہ: تو کیسے قتل کر آیا ہے یہ جو اس کو جان سے مارنے پر تُل گئے ہو؟

یہ کہہ کر اپنے دوپٹے کے آنچل سے حمید کے آنسو پونچھنے لگی۔

یحییٰ: کیسے قتل کیا؟ ساری مجلس کا قتل۔

فریدہ: بہت اچھا کیا، بہت ٹھیک کیا۔ یہ گھر ہے، ٹاؤن ہال نہیں ہے۔ ایسی مجلسیں کرنی ہوں تو، باہر جا کر کیا کرو۔

یحییٰ: ذرا اور زور سے بولو، تمھاری آواز تو ابھی باہر جاتی ہی نہیں۔

فریدہ: جاتی ہے، تو جائے مجھے کسی کا ڈر نہیں۔

یحییٰ: لوگوں کو تماشہ دکھاؤ، شرم تو نہ آتی ہوگی۔

فریدہ: دنیا کی ساری شرم میرے ہی لیے رہ گئی ہے؟ جب تمھیں معصوم بچے کو مارتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ تب مجھے اسے بچاتے ہوئے کیوں شرم آئے؟

یحییٰ: دیکھو میں بے شرم ہوں، لیکن اتنا گیا گزرا نہیں ہوں، کہ تمھاری بکواس کو سامنے کھڑا سنوں۔

فریدہ: اور میں بھی اتنی گئی گزری نہیں ہوں کہ بے گناہ بچے کو سامنے پٹتے دیکھوں۔ اور چپ رہوں۔ یہ ناممکن ہے۔ اگر کوئی ہڈی، وڈی ٹوٹ گئی ہو تو، مصیبت مجھ پر ہی ٹوٹ پڑے گی تمھارا کیا ہے؟ تم تو دفتر چلے جاؤ گے۔

یحییٰ صاحب نے بیوی کی طرف دیکھا تو سہم گئے۔ اِس وقت اُس کے چہرے پر غصّہ تھا، آنکھوں میں آگ کی چنگاریاں۔ یحییٰ صاحب سمجھ گئے کہ اب اگر ایک بات بھی کہوں، تو وہ بارود کے ڈھیر پر دیا سلائی کا کام دے جائے گی۔ چپ چاپ کمرے میں چلے گئے۔ مگر وہاں سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے، گانا کیوں بند کر دیا؟

"قوال کمیٹی" کے ممبروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، مانو آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے پوچھا کہ یہاں تو شوہر اور بیوی میں جھگڑا پیدا ہو گیا ہے، اب ٹھہریں یا چلنے کی تیاری کریں۔

یحییٰ صاحب سیدھے سادے آدمی تھے، مگر بہت سمجھ دار تھے۔ اِن نگاہوں کا مطلب سمجھنے میں انھیں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ شرم سے وہ پانی، پانی ہو رہے تھے۔ مگر ہمّت سے بولے۔ "گاؤ نا! گاتے کیوں نہیں؟"

تارا چند پھر گانے لگا۔ ہنس راج کی انگلیاں پھر ہارمونیم پر دوڑنے لگیں۔ اِدھر یہ رنگ برنگ پروگرام ہو رہا تھا، اُدھر گھر کے اندر معصوم بچّہ سسکیاں بھر کر رو رہا تھا، اور فریدہ اُسے گلے سے لگا کر سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

(۴)

دوسرے دن حمید سخت بخار میں بے خبر

پڑا تھا۔ یحییٰ صاحب ڈر گئے سوچنے لگے کیسی بیوقوفی
کی، اب فریدہ شیر ہو جائے گی کہے گی، اس وقت
مارتے تھے، اب گھر میں بیٹھ کر علاج کرو۔ فریدہ
کے سامنے اُن کی آنکھیں نہ اُٹھتی تھیں نہ اُن
میں اُس سے بات چیت کرنے کی ہمت تھی۔ وہ سمجھتے
تھے، میں نے زبان کھولی اور فریدہ نے برسنا شروع
کیا۔ فریدہ کی کڑک ان کے لیے بجلی کی کڑک سے
بھی ڈراؤنی تھی۔ چپ چاپ جاکر ڈاکٹر کو بُلا لائے
اور راہ میں سارا واقعہ سنا دیا۔

ڈاکٹر نے حمید کو دیکھا اور نسخہ لکھنے لگا،
فریدہ نے پردے کی آڑ میں سے شوہر سے کہا،
"پوچھو کر کوئی ہڈی وڈی تو نہیں ٹوٹی؟"

یحییٰ صاحب کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔

ڈاکٹر نے کہا "نہیں، ڈر گیا ہے۔ اسی سے بخار
چڑھ آیا ہے۔"

یحییٰ صاحب کی جان میں جان آئی۔ فریدہ
نے پھر پوچھا، "کب تک اُتر جائے گا؟"

ڈاکٹر نے کہا "ایک دو دن میں گھبرانے کی بات
نہیں (نسخہ دے کر) دو تین دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔"

مگر تین روز گزر گئے، اور بخار نہ اترا فریدہ فکر
میں ڈوبی جارہی تھی۔ ساری، ساری رات جاگتی
رہتی، چوتھی رات یحییٰ صاحب نے کہا۔ "آج تم
سو رہو، اس کے پاس میں بیٹھوں گا۔"

فریدہ: تم کو جاگنے کی عادت نہیں، بیمار
ہو جاؤ گے۔

یحییٰ: نہیں ہوں گا۔ تم جاکر آرام کرو۔

فریدہ: تمہیں تکلیف ہوگی۔

یحییٰ: کبھوں کبھی تو میری ہی ہے۔

فریدہ: کل دفتر کیسے جاؤ گے؟

یحییٰ: دفتر سے چھٹی لے لوں گا۔

فریدہ: نہ کبھی! میں تمہیں نہ جاگنے دوں
گی۔ جاؤ جاکر آرام کرو، نہیں تو کل سارا دن طبیعت
خراب رہے گی۔

یحییٰ: معلوم ہوتا ہے، تم نے بیمار ہونے کی
ٹھان لی ہے۔

یہ کہہ کر یحییٰ صاحب سونے چلے گئے۔ فریدہ
نے حمید کی نبض دیکھی، اور ٹھنڈی آہ بھری۔ بخار
ابھی تک نہ اترا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں پانی آگیا،
اور دل میں بُرے، بُرے خیالات آنے لگے۔

اتنے میں گھڑی نے بارہ بجائے۔ حمید نے
یکایک چلاکر کہا، "ماں!" "پانی" فریدہ نے پیار
سے حمید کو ہاتھ کا سہارا دے کر بٹھا دیا اور کہا،
"پہلے دوا پی لو، پھر پانی ملے گا۔"

حمید: نہ! پہلے پانی دو۔ بڑی پیاس لگی
ہے۔ یہ کہتے، کہتے وہ رونے لگا۔

فریدہ مان گئی۔ ہم بیمار بچے پر سختی نہیں
کر سکتے۔ اس نے حمید کو پانی پلا دیا، اور کہا۔
"دوا ٹھہر کر پلاؤں گی۔"

حمید نے ماں کی طرف پیار بھری نظر سے دیکھا
اور کہا، "میرے ساتھ لیٹ جاؤ۔"

فریدہ لیٹ گئی۔ حمید نے اپنا سر اس کی
چھاتی میں چھپا لیا، اور اپنا ہاتھ اس کے منہ پر
پھیرنے لگا۔

ماں کی محبت جاگنا چاہتی تھی، تھوڑی دیر

پھر فریدہ کو نیند آ گئی۔ اب اُسے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ اُدھر یحییٰ صاحب اپنے بستر پر تڑپ رہے تھے، مگر انہیں نیند نہ آ رہی تھی، وہی چیز، جس نے ماں کو سُلا دیا تھا، باپ کو جگا رہی تھی۔ وہ سوتا بنے ہوئے تھے، سونے کی کوشش کر رہے تھے، مگر نیند ان سے کوسوں دور تھی۔ آخر اُٹھ بیٹھے۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ میں کیا کر رہا، کدھر جا رہا ہوں، مگر وہ چل رہے تھے۔ وہ ننگے پاؤں، ننگے سر گھر سے نکلے اور گھر کے قریب کی مسجد کی طرف چل پڑے۔

رات کا وقت تھا، ایک بج چکا تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ لوگ اپنے، اپنے گھروں میں آرام کی نیند سو رہے تھے۔ ماں کی آنکھیں بھی بند ہو گئی تھیں۔ مگر باپ کی محبت بیٹے کی جان کی سلامتی کی بھیک مانگنے کے لیے ننگے پاؤں ننگے سر، مسجد کی طرف بھگائے لیے جا رہی تھی مگر مسجد کے دروازے بند تھے، اور موذن صاحب اپنی کوٹھری میں پڑے سو رہے تھے۔

یحییٰ صاحب مسجد کی سیڑھیوں پر اوندھے منہ گر پڑے، اور گڑگڑا کر خدا سے بیٹے کی سلامتی کے لیے دعا مانگنے لگے ان کے آنسوؤں سے مسجد کی ساری سیڑھیاں تر ہو گئیں۔

یہ وہی بے پرواہ، وہی سنگ دل باپ تھا، جسے بچوں سے ذرا بھی پیار نہ تھا، جس نے ان کو کبھی گود میں لے کر ان کا منہ نہ چوما تھا۔ آج وہی باپ رات کے اندھیرے میں بیٹے کے لیے دعا مانگنے آیا تھا۔

سویرے ہی جب فریدہ کی آنکھ کھلی، تو ساڑھے سات بج چکے تھے۔ اُسے اپنے آپ پر غصہ آیا کہ میں سو کیوں گئی؟ تب اُس نے اپنا ہاتھ حمید کے جسم پر پھیرا، اور اُس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں —— حمید کا بخار اُتر چکا تھا، اور وہ اُس وقت مزے سے سو رہا تھا۔ فریدہ جلدی سے اُٹھ کر شوہر کو یہ خوش خبری سنانے کے لیے ان کے کمرے کی طرف دوڑی۔ مگر ان کی چارپائی خالی تھی۔ کمبل، کپڑے، جوتا سب کچھ وہیں تھا۔ صرف وہ نہ تھے۔ فریدہ نے کونا، کونا ڈھونڈا، لیکن ان کا کہیں پتا نہ تھا۔ اتنے میں اُس کی نظر سیڑھیوں کی طرف گئی پورا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ فریدہ ڈر گئی۔

اتنے میں نوکرانی نے اوپر آ کر کہا: "بابو جی قریب والی مسجد کی سیڑھیوں پر پڑے رو رہے ہیں اور کسی کے اٹھائے نہیں اُٹھتے۔"

فریدہ نے یہ بات تعجب کے ساتھ سُنی، اور سب کچھ سمجھ گئی۔ وہ دنگ رہ گئی۔ اُسے آج معلوم ہوا کہ وہ جسے خشک نالا سمجھی بیٹھی تھی، وہ خاموش سمندر تھا۔ اوپر ریت تھی، نیچے پانی لہر مارتا تھا۔ اُس نے ریت دیکھی۔ پانی نہ دیکھا، مگر آج یہ پانی ریت کے پردوں کو پھاڑ کر باہر چھلک رہا تھا، جیسے فوارے سے پانی کی دھار اُچھلتی ہے فریدہ کی آنکھیں تر ہو گئیں آج اس کو ایسا معلوم ہوا، جیسے مدت کا پیار ایک منٹ میں پورا ہو گیا ہو۔ آج اُس کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ آج وہ پھولے نہ سماتی تھی۔ آج اُسے اپنا شوہر فرشتہ دکھائی دیتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ماں باپ حمید کے پاس بیٹھ کر ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

فریدہ: بُرا نہ ماننا۔ میں یہی سمجھتی رہی کہ تمہیں بچوں سے ذرا بھی پیار نہیں۔

یحییٰ: اور آج ؟

فریدہ: آج تمھارا اصلی روپ دیکھ لیا۔

یحییٰ: (مسکراکر) یہ بھی ہماری چال تھی، کھا گئیں نہ دھوکا!

فریدہ: چلو، ہٹو آپ تمھاری باتوں میں نہ آؤں گی۔ کہتے ہیں، چال تھی! کوئی اس وقت دیکھتا، تو حیران رہ جاتا۔ کیسے بھاگے، بھاگے گئے تھے؟ تن بدن کی سُدھ نہ تھی، دروازہ کھلا چھوڑ گئے۔ کوئی چور اچکا آجاتا تو سب کچھ بٹور کر ہی لے جاتا۔ کیوں ؟

یحییٰ: مگر جو چیز پالی، وہی سارے سامان سے قیمتی ہے۔ میرا خیال ہے۔ اُس کے سامنے دُنیا کی ساری چیزیں بیکار ہیں۔

فریدہ کسی دوسری دنیا میں پہنچ گئی۔ بولی۔ یہ پیار آج تک کہاں چھپا ہوا تھا؟

یحییٰ صاحب نے مسکراکر بیوی کی طرف دیکھا، اور کہا ـــ تمھارے دل میں۔ ★★

★ مشاہدہ سب سے بڑا استاد ہے۔

★ ناکامیابی کامیابی کا زینہ ہے۔

★ قوتِ فیصلہ دانائی کا تختِ طاؤس ہے۔

★ اپنے جذبات پر قابو رکھو۔

★ جھوٹ تمام اخلاقی برائیوں کی جڑ ہے۔

بہار آگئی

عادل کھلگانوی

بہار آگئی دوستو اب وطن میں
خوشی کے ترانے ہیں ہر انجمن میں
عجب شان سے مسکراتی ہیں کلیاں
بہار اپنی سب کو دکھاتی ہیں کلیاں
خزاں کا اثر ختم ہونے چلا ہے
دلوں سے غموں کا نشاں مٹ گیا ہے
دمکنے لگے پھول گلشن میں سارے
فلک پر چمکتے ہیں جیسے ستارے
پرندے چہکنے لگے گلستاں میں
مسرت کی دولت ہے بکھری جہاں میں
ہوا کی لطافت دلوں کو لبھاتی
ہے باغوں میں کوئل یہی گیت گاتی
دیا ہے سبق اس نے زندہ دلی کا
نکھرتا چلا رنگ اب زندگی کا

اعجاز علی ارشد۔ پٹنہ

مولانا مظہرالحق

پٹنہ سے تقریباً آٹھ کلو مغرب سے دریا ئے
گنگا کے متوازی سڑک پر ایک خوبصورت سی دو منزلہ
عمارت ہے، جس کا نام صداقت آ[illegible] ہے۔ آج کل
یہ عمارت بہار پردیش کانگریس کمیٹی کا صدر دفتر ہے مگر
آج سے تقریباً چھپن برس پہلے یہ عمارت سارن ضلع
کے ایک کامیاب وکیل مظہرالحق کی روحانی پناہ گاہ تھی۔

مولانا مظہرالحق صرف ایک کامیاب وکیل ہی نہ
تھے بلکہ ایک جمہوریت پسند صوفی بھی تھے۔ وہ پٹنہ
ضلع کے منیر تھانہ میں واقع ایک چھوٹے سے گاؤں
بہپورہ میں ۲۲۔ دسمبر ۱۸۶۶ء کو پیدا ہوئے۔ ان
کے والد شیخ احمد اللہ ایک چھوٹے سے زمیندار تھے۔
ان کی والدہ ایک بے حد نیک اور خداترس خاتون
تھیں۔ مظہرالحق نے ۱۸۸۶ء میں پٹنہ کالجیٹ اسکول سے
میٹرک پاس کرنے کے بعد پٹنہ کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں
سے صرف ایک سال بعد ۱۸۸۷ء میں کیننگ کالج میں
نام لکھانے کے لیے لکھنؤ چلے گئے۔ کچھ ہی دنوں بعد
ان کے دل میں قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے
انگلینڈ جانے کا خیال پیدا ہوا۔ اپنے والدین کے اکلوتے
بیٹے ہونے کے سبب ان کے والد انہیں سے الگ کرنے
پر کبھی راضی نہ ہوتے اور بغیر ان کی رضامندی کے
سفر خرچ ملنا مشکل تھا۔ اس لیے مظہرالحق کو اپنی خواہش
پوری ہوتی نظر نہیں آئی مگر ارادہ مضبوط ہو تو ساری
مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ مظہرالحق نے اپنی ایک بہن
سے [illegible] کی درخواست کی جو بخوشی منظور کر لی گئی اور
وہ بمبئی سے مکہ مکرمہ جانے وا[لے] حاجیوں کے ایک
جہاز پر سوار ہو کر عدن پہنچ گئے۔

عدن سے مظہرالحق نے اپنے والد کو خط لکھ کر اس
سفر کی اطلاع دی اور مدد کی درخواست کی
اس لیے کہ بہن سے حاصل کی ہوئی معمولی سی رقم یہاں
تک کے سفر میں خرچ ہو چکی تھی۔ ان کے والد نے
خط ملتے ہی مطلوبہ رقم ان کو بھیج دی اور اس طرح
مظہرالحق ستمبر ۱۸۸۸ء میں لندن پہنچ گئے۔ اسی سفر کے
دوران مظہرالحق کی ملاقات مہاتما گاندھی سے ہوئی۔
دونوں نے ساتھ ہی ساتھ قانون کی تعلیم حاصل کی اور
گاندھی جی کے صرف ایک ماہ بعد یعنی جولائی ۱۸۹۱ء
میں مظہرالحق نے ہائی کورٹ میں اپنا رجسٹریشن کرا لیا۔
انھوں نے پٹنہ میں پریکٹس شروع کی اور جلد ہی ان کا
شمار ملک کے مشہور وکیلوں میں ہونے لگا۔

اپنے ایک دوست سر ولیم مارکبیٹ کی تحریک
پر ۱۸۹۲ء میں وہ یوپی میں منصف ہو گئے۔ لیکن

ان کی آزاد اور بلند فطرت اس غلامانہ زندگی کو زیادہ دنوں تک گوارا نہ کر سکی۔ اسی زمانے میں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آگیا۔ مظہرالحق نے اعلیٰ نسل کے غیر ملکی کتوں کے کئی جوڑے پال رکھے تھے۔ ایک دن اس کمشنر نے جس کی ماتحتی میں وہ کام کر رہے تھے ان سے گرے ہاؤنڈ کا ایک جوڑا مانگ لیا۔ مظہرالحق کی خوددار طبیعت کو یہ فرمائش گراں گزری۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اس کی خواہش پوری کرنے سے انکار کر دیا بلکہ اسے [illegible] ملامت بھی کی۔ کمشنر اس وقت تو خاموش رہ گیا مگر مظہرالحق نے محسوس کر لیا کہ وہ انگریز آفیسر آگے آئندہ کبھی تنگ کر سکتا ہے۔ اس لیے انھوں نے اپریل ۱۸۹۶ء میں سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا اور چھپرہ میں پریکٹس شروع کر دی۔ ۱۹۰۲ء میں وہ بلا مقابلہ چھپرہ میونسپل بورڈ کے وائس چیرمین منتخب ہوئے اور بڑی ذمہ داری سے کام کیا۔

۱۹۰۶ء میں مظہرالحق عوامی خدمت کے جذبے سے مجبور ہو کر پھر پٹنہ آگئے اور جلد ہی یہاں شہرت حاصل کر لی۔ ۱۹۱۳ء میں کانپور مسجد کا تاریخی مقدمہ شروع ہوا جس میں مظہرالحق نے انگریزی حکومت کے خلاف بحث کی اور آخرکار حکومت کو جھکنا پڑا۔ اسی درمیان ملک کی خدمت کے خیال سے ۱۹۰۶ء میں وہ انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو گئے تھے ۱۹۱۲ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس کا ستائیسواں سالانہ اجلاس پٹنہ میں ہوا تو انھوں نے اس موقع پر ایک طویل اور سبق آموز خطبہ پڑھا جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان یکجہتی اور اتفاق پیدا کرنے پر زور دیا گیا تھا۔ ۱۹۱۴ء میں وہ کانگریس ڈیلیگیشن کے ممبر منتخب ہو کر لندن گئے وہاں سے واپسی میں ترکی کا سفر کیا جہاں شاہی مہمان ہوئے ۱۹۲۰ء میں انھوں نے گاندھی جی کی شروع کی ہوئی عدم تعاون کی تحریک میں حصہ لیتے ہوئے پریکٹس چھوڑ دی، انگریزی لباس پہننا ترک کر دیا اور داڑھی رکھ لی۔

۱۹۲۱ء میں انھوں نے گاندھی جی کی روحانی تعلیمات سے متاثر ہو کر صداقت آشرم کی بنیاد ڈالی۔ صداقت آشرم کی تعمیر کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ ڈاکٹر راجندر پرساد نے اپنی کتاب آپ کتھا میں اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ ہوا یوں کہ ایک دن انجینیرنگ کالج کے کچھ طالب علم مولانا مظہرالحق کے پاس آئے ان لوگوں نے درخواست کی کہ انھوں نے انگریزی حکومت کے خلاف تحریک میں حصہ لیتے ہوئے کالج چھوڑ دیا ہے۔ اس لیے ان کے رہنے کا کوئی معقول بندوبست کیا جائے۔ مولانا مظہرالحق ان دنوں فریزر روڈ، پٹنہ میں واقع ایک عالیشان اور آرام دہ مکان "سکندر منزل" میں رہتے تھے۔ وہ چاہتے تو ان طالب علموں کو کسی دوسری جگہ بھی ٹھہرا سکتے تھے مگر وہ باتوں کے ہی نہیں عمل کے بھی دھنی تھے۔ انھوں نے فوراً اپنی شاندار قیام گاہ چھوڑ دی اور ان طالب علموں کو ساتھ لے کر پٹنہ دانا پور روڈ پر دیگھا کے ایک باغ میں چلے آئے۔ وہاں کچھ جھونپڑیاں قائم کی گئیں۔ پھول لگائے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک آشرم تیار ہو گیا۔ جس کا نام "صداقت آشرم" رکھا گیا۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۶ء تک مظہرالحق خود بھی یہیں رہتے رہے مگر ۱۹۲۶ء کے آخری مہینوں میں وہ صداقت آشرم کی

باقی [illegible]

غازی ادیب

اتفاق باہمی

باپ نے بیٹوں سے یہ اک دن کہا
اے میرے بچو! ادھر آؤ ذرا
بیٹھ جاؤ آ کے سب میرے قریب
بات اک تم کو بتانی ہے عجیب
بات کیا ہے ایک رازِ بے بہا
خوبیاں ہیں جس کی بس لا انتہا
اس پہ جو کوئی رہے گا کاربند
اس کو پہنچے گا نہیں ہرگز گزند
اس سے ہونا چاہتے ہو باخبر
اس کا عامل بننا چاہو تم اگر
تو بتاؤں میں تمھیں اس کا عمل
تجربہ کر لو تم اس کا برمحل
باپ نے یہ کہہ کے اک تنکا دیا
پھر کہا "لو اس سے جھاڑو دو ذرا"

اس طرف ٹکڑا پڑا ہے اینٹ کا
اپنے تنکے سے اسے دو تم ہٹا
لے کے تنکا ہاتھ میں جھاڑا اگر
کچھ نہ جنبش دے سکے اس کے پسر
سینک اک ان کے تھما دی ہاتھ میں
پہلے تنکے کے ملالی ساتھ ہیں
پھر بھی کچھ مطلب نہ حاصل ہو سکا
اینٹ کا ٹکڑا نہ ان سے ہل سکا
اور دی پھر اور دی پھر اور دی
لیجیے سینکوں سے جھاڑو بن گئی
بولا بچوں سے پدر یہ راز ہے
میل جول آپس کا چارہ ساز ہے
ایک ہو کر تم بھی بس رہنا سدا
خلق پہ بھاری رہو گے یا خدا

غازی اس طرح بنا کرتے ہیں کام
اتفاق باہمی ہے اس کا نام

من ہر چوہان
آزاد ترجمہ
خلیق انجم اشرفی

پُراسرار نوکر

یہ ایک سچی کہانی ہے۔ بنگال کا ایک کالج۔ کالج کا ہوسٹل اور ہوسٹل میں ایک امیر طالب علم۔ یہ حضرت آئے تو تھے مصور بننے لیکن تھے پرلے درجے کے پھوہڑ۔ ہوسٹل میں ان کا کمرہ ہمیشہ گندا پڑا رہتا۔ چیزیں بے ترتیب، اِدھر اُدھر بکھری پڑی رہتیں۔ کتابوں کی جگہ پاجامہ، پاجامے کی جگہ صراحی، صراحی کی جگہ فاؤنٹین پین، ایسی حالت تھی ان کے کمرے کی!

یہ امیر اور کاہل طالب علم ایک دوپہر سو کر اُٹھے تو حیران رہ گئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ہر چیز ترتیب اور سلیقے سے رکھی ہوئی ہے پاجامے کی جگہ پاجامہ۔ کتابوں کی جگہ کتابیں۔ صراحی کی جگہ صراحی اور فاؤنٹین پین کی جگہ فاؤنٹین پین۔ یہ کیا ماجرا ہے؟ طالب علم نے حیرت سے سوچا۔ نظر دوڑائی تو دیکھا کہ کمرے میں جھاڑو بھی دی گئی ہے۔

دو چار دن بیتے اور پھر وہی بے ڈھنگی یاں۔ سارا کمرہ ایک بار پھر سے کباڑی کی دکان بن گیا۔ لیکن ایک دن پھر وہی کرشمہ۔ کوئی آکر جھاڑو دے گیا۔ سارا [illegible] ترتیب اور سلیقے سے لگا دیا۔ [illegible]

نے سوچا، ضرور یہ نوکر کا کام ہے۔ چُپکے سے یہ کام کر جاتا ہے۔ انعام پانے کی امید میں لیکن ہوسٹل کے نوکر کو جب ان حضرت نے انعام دینا چاہا تو نوکر انھیں حیرت سے دیکھنے لگا "کس بات کا یہ انعام ہے یہ بابوجی؟"

"کیوں؟" طالب علم بولے "جب ہم سو رہے ہوتے ہیں تب کیا تمھیں چپکے سے آکر یہ سب کچھ ٹھیک نہیں کر جاتے؟"

"نہیں تو! میں نے تو ایسا کبھی نہیں کیا۔"

"پھر کون کرتا ہے ہمارا کام؟"

"میں کیا جانوں؟" نوکر بولا اور انعام لیے بغیر چلا گیا۔ طالب علم صاحب اسے حیرت سے جاتا دیکھتے رہے۔

لیکن کوئی نہ کوئی تو تھا ہی جو آکر کمرے کو اس طرح سجا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی جن بھوت کا کام تو تھا نہیں کوئی انسان ہی تھا لیکن کون تھا وہ؟ طالب علم نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس سوال کا جواب پا کر رہے گا۔

[illegible] دوپہر کو [illegible] بیٹھ گئے گھنٹا

تھا کہ کہیں مصور ہے ہوں۔ لیکن اصل میں وہ اس پُراسرار کو کرے کا انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بھڑا ہوا دروازہ دھیرے سے تھوڑا سا کھلا اور ایک پرچھائیں اندر داخل ہوئی۔ بڑی آہستگی سے اس نے بے ترتیب پڑی چیزوں کو قرینے سے اِدھر اُدھر رکھنا شروع کر دیا۔ طالب علم صاحب اچھل کر بیٹھ گئے "کون ہو تم؟" انھوں نے گرج دار آواز میں پوچھا۔

پرچھائیں طالب علم کی طرف مڑی۔ جیسے ہی طالب نے اس پرچھائیں کو پہچانا وہ اس کے قدموں پہ گر پڑا۔ وہ صاحب کوئی اور نہیں اس کالج کے پرنسپل تھے۔

پرنسپل صاحب نے طالب علم کو کندھوں سے پکڑ کر اٹھا لیا اور بولے "تم یہاں مصور بننے آئے ہو۔ لیکن کیسے پھوہڑ پن اور بد سلیقگی سے رہتے ہو۔ بد سلیقگی کا فن سے کیا رشتہ، میں نے سوچا تمہیں۔ مصور بنا پاؤں یا نہیں کم سے کم تمہارا پھوہڑ پن تو دور کر دوں۔

بھلے گھوڑے کو ایک چابک اور بھلے آدمی کو ایک بات اور بات بھی کیسی جو عمل کے بعد کہی گئی ہو۔ دل سے نکلی بات اثر کیوں نہ کرتی۔ طالب علم صاحب نے بد سلیقگی اور پھوہڑ پن سے توبہ کر لی۔

ان پرنسپل صاحب کا نام آج ہندستان کے کونے کونے میں جانا جاتا ہے یہ کوئی اور نہیں ہندستان کے مشہور مصور نندلال بوس تھے۔ ★★

غلام اور شیر

مصنف
رونالڈ ریڈاوٹ
مترجم
مسعودہ حیات

بڑے پرانے زمانے کی بات ہے، روم کے لوگ اس وقت بڑے طاقت ور مانے جاتے تھے۔ وہ لوگوں کو غلام بنا کر رکھتے تھے۔ ان غلاموں میں سے ایک کا نام اینڈرا کلز تھا۔ اسے بازار سے خریدا گیا تھا اور اس کا مالک اسے پانی کے جہاز سے افریقہ میں کام کرنے کے لیے لے گیا تھا۔ اس کا آقا اس کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتا تھا۔ اینڈرا کلز اس کا سخت برتاؤ زیادہ دن تک برداشت نہ کر سکا مگر فرار ہونا آسان بات نہ تھی رات کو اس کے پاؤں میں بیڑیاں پہنا دی جاتی تھیں اور دن بھر ایک پہرے دار اس کی نگرانی کرتا تھا۔

آخر اسے ایک دن موقع ہاتھ آ ہی گیا اتفاق سے ایک دن اس کے پاس کوئی پہرے دار نہ تھا۔ وہ دیوار پر چڑھا اور بھاگ نکلا وہ ریگستان میں لگاتار بھاگتا رہا اس کے پاؤں ننگے تھے ایک چپل بھاگتے بھاگتے کہیں گر گیا تھا۔ اب رات ہو چکی تھی۔ چاند چمک رہا تھا اور چاندنی میں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا سایہ بھی اس کے ساتھ بھاگ رہا ہو۔ اگرچہ وہ ویران راستوں پر چل رہا تھا پھر بھی اسے دشمن کا خوف کھائے جاتا تھا۔ خوف کے مارے اس کا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ پاؤں سے خون بہہ رہا تھا۔ مگر وہ پھر بھی بھاگا چلا جاتا تھا اس کے دماغ میں اس وقت صرف رومی سپاہیوں کا خوف تھا۔ اس کی بہت ہی بری حالت تھی۔ وہ اب اتنا تھک گیا تھا کہ اس کے لیے اب ایک قدم بڑھانا بھی مشکل تھا۔ تھکان نے اسے ہر خوف سے آزاد کر دیا تھا اب وہ صرف آرام کرنا چاہتا تھا لیکن وہ آرام کرے تو کہاں کرے۔ آخر کار اسے ایک غار نظر آیا جس میں وہ رینگ کر داخل ہو گیا اور فوراً ہی لیٹ کر سو گیا۔

دوسرے دن کافی دن چڑھ گیا مگر اینڈرا کلز بیدار نہ ہوا وہ بے خبر سوتا رہا۔ آخرکار ایک زور دار گرج سنائی دی جس کی وجہ سے اینڈرا کلز اچانک بیدار ہو گیا۔ اس نے اوپر نظر کی تو کیا دیکھتا ہے کہ غار کے دروازے پر ایک بہت بڑا شیر بیٹھا ہوا ہے اس نے سوچا کہ اب وہ موت کے منہ میں آ گیا۔ آہ وہ ظالم آقا سے تو بچ نکلا لیکن اب شیر سے کیسے بچے؟

اینڈرا کلز کو یہ بات سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ شیر کے کچھار میں سو رہا تھا اور اب رات کے شکار سے شیر واپس لوٹ کر آیا ہے۔ لیکن

وہ شیر سے کیسے لڑ سکتا ہے جس کے پاس کوئی ہتھیار بھی تو نہیں نہ چاقو نہ لاٹھی۔ شاید اس کا آخری وقت آگیا ہے کیا وہ صرف ایک رات کے لیے آزاد ہوا تھا۔ کیا وہ اب مر جائے گا؟ وہ بے حس و حرکت اپنی جگہ بیٹھا رہا یہاں تک کہ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور انتظار کرنے لگا کہ شیر کب اس پر جھپٹتا ہے۔

خدا بڑا محافظ ہے۔ اینڈراکلز کا آخری وقت نہیں آیا تھا اس لیے شیر نے اس پر حملہ نہیں کیا۔ شیر دروازے پر پڑا درد سے چلاتا رہا۔ اینڈراکلز نے آنکھ کھول کر دیکھا تو شیر اپنے ایک پنجے کو اٹھا کر چاٹ رہا تھا اور اس سے خون بہہ بہہ کر ریت پر گر رہا تھا۔

اینڈراکلز نے قریب آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کے پنجے میں ایک بہت بڑا کانٹا چبھا ہوا ہے۔ وہ بڑا رحم دل آدمی تھا اس نے اپنا خوف دور کیا اس کے پنجے کو اپنے ہاتھ میں لیا اور دوسرے ہاتھ سے کانٹا کھینچ کر باہر پھینک دیا۔ شیر ایک بار پھر درد سے چلایا مگر جب کانٹا نکل گیا تو اس نے اینڈراکلز کے چہرے کو پیار سے چاٹنا شروع کر دیا۔ اینڈراکلز شیر کے پیار سے بہت خوش ہوا اور اس کا سر سہلا کر اس کی بہادری کی تعریف کی اور سب سے عجیب بات یہ ہوئی کہ شیر اور وہ ساتھ ساتھ رہنے لگے وہ ایک دوسرے کے بڑے گہرے دوست ہو گئے۔ یہاں تک کہ تین سال گزر گئے۔

اینڈراکلز نے سوچا کہ غلام رہنے سے تو شیر کے ساتھ رہنا بہتر ہے مگر آخر کب تک وہ شیر کے ساتھ رہے گا۔ وہ انسان ہے اور اسے انسانوں کے ساتھ ہی رہنا چاہیے اور آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اب وفادار شیر کو چھوڑ کر ایک دن پھر آدمیوں کی دنیا میں چلا جائے گا۔

لیکن اینڈراکلز بڑا بدقسمت تھا جیسے ہی وہ غار سے نکل کر بھاگا اسے رومی سپاہیوں نے پکڑ لیا۔ سپاہی اس کی پیشانی پر داغ دیکھ کر سمجھ گئے کہ یہ غلام ہے۔ روم میں غلامی کی نشانی کے لیے ان کی کھال کو داغ دیا جاتا تھا۔ یہ داغ عمر بھر قائم رہتا تھا۔

جو غلام بھاگ نکلتے تھے ان کی سزا بڑی سخت ہوتی تھی۔ سپاہی انھیں پکڑ کر روم بھیج دیتے تھے جہاں انھیں سرکس کی طرح جنگلی جانوروں سے لڑنا پڑتا تھا۔ بادشاہ اور دوسرے لوگ اس خطرناک سین کو بڑی دلچسپی سے دیکھتے۔ جنگلی جانور کو کئی دن تک فاقے سے رکھا جاتا تھا پھر اس بھوکے جانور کے سامنے غلام کو ایک معمولی سا بھالا دے کر چھوڑ دیا جاتا تھا تاکہ وہ کچھ دیر جانور سے لڑ سکے اگر غلام پہلے جانور کو مارنے میں کامیاب ہو جاتا تو پھر اسے دوسرے جانور سے لڑنا پڑتا تھا اور آخر کار پہلا یا دوسرا جانور اس کا کام تمام کر دیتا تھا۔

اینڈراکلز کو روم آئے ہوئے کئی دن گزر گئے اور آخر کار ایک دن وہ بھی آگیا جب اسے شیر سے لڑنے کے لیے احاطے میں چھوڑ دیا گیا۔ یہ احاطہ بڑی بڑی دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔ دیواروں کے پیچھے لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ بادشاہ اور اس کے دوستوں نے اپنے بیٹھنے کے لیے سب سے

اچھی جگہ مقرر کی تھی۔

جب اینڈرا کلز تنہا احاطہ میں کھڑا کر دیا گیا تو اس نے دیکھا کہ کچھ لوگ بھوکے شیر کو پنجرے سے نکال رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر اس نے اپنی ہمت کو یکجا کیا اور اپنے انجام کے لیے تیار ہو گیا۔ مگر خوف کی وجہ سے اس کے ہاتھ اتنے کانپ رہے تھے کہ وہ بھالا بھی نہ پکڑ سکا اور بھالا زمین پر گر گیا۔ لوگ ہنسنے اور شور مچانے لگے۔ بھوکا شیر گرجا اور غلام کی طرف جوں ہی دوڑا لوگ دیکھنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ مگر پھر اچانک ہی جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ تم جانتے ہو کیوں؟ اس لیے کہ شیر نے گرجنا اور دوڑنا بند کر دیا تھا اور آہستہ آہستہ اینڈرا کلز کی طرف آ رہا تھا۔ اینڈرا کلز شیر سے لڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ لیکن اس وقت بھی ایک عجیب واقعہ پیش آیا اور وہ یہ کہ اینڈرا کلز نے اپنا بھالا پھینک کر شیر کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ شیر نے بھی اینڈرا کلز کا چہرہ چاٹنا شروع کر دیا کتنی عجیب بات تھی یہ وہی شیر تھا جس کے ساتھ اینڈرا کلز تین سال تک رہا تھا۔ کسی نے اسے بھی زندہ پکڑ کر روم بھیج دیا تھا۔

دونوں دوست بڑے عجیب انداز میں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے۔ یہ سارا ماجرا دیکھ کر بادشاہ بہت حیران ہوا۔ اس نے فوراً اینڈرا کلز کو بلایا اور اس سے شیر کی دوستی کا راز پوچھا۔ اینڈرا کلز نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اینڈرا کلز کو نہ صرف آزاد کیا بلکہ اس کو روم کا باشندہ بھی بنا دیا۔ شیر کو بھی اینڈرا کلز کے ساتھ ہی رکھا گیا۔ جہاں جہاں وہ جاتا تھا شیر بھی ایک وفادار کتے کی طرح اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ سچ ہے کہ محبت اور ہمدردی ایسی چیز ہے جو خونخوار جانوروں کو بھی فرماں بردار بنا دیتی ہے۔

**

ناوک حمزہ پوری

شراب

نہایت بُری چیز ہے یہ شراب
کیا اس نے بہتوں کو خانہ خراب
خباثت کی ماں، جگ ہنسائی کی جڑ
ہے بے شک یہ ساری برائی کی جڑ
گنوا بیٹھتا ہے وہ بدبخت ہوش
اسے بھول کر بھی جو کرتا ہے نوش
خدا کی بھی اس شخص پر مار ہے
رسولِ خدا کی بھی پھٹکار ہے
بنائے اسے خود کہ بنوائے جو
پیئے خود کہ اوروں کو پلوائے جو
اٹھائے اسے خود کہ اٹھوائے جو
جو بیچے اسے خود کہ بکوائے جو
کرے خرچ اس پر جو شخص اپنا مال
خریدے جو، اس کے لیے ہے وبال

خدا را قریب اس کے مت جائیو
گزارش ہے ناوک کی اے بھائیو

اکبر رحمانی جلگانوی

رام اور رحیم

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ حسین لڑکے سیدھے سادے، شرمیلے اور نیک ہوتے ہیں۔ لیکن چندو کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ وہ خوبصورت اور تنومند ہونے کے ساتھ ساتھ آوارہ، غنڈہ اور بے ہودہ قسم کا لڑکا تھا۔ محلے کے لوگ اسے اچھی نگاہوں سے نہ دیکھتے تھے۔ شریف لوگ اسے دور سے دیکھتے ہی کترا کر نکل جاتے تھے۔ وہ کسی سے نہ ڈرتا تھا۔ ہاں وہ ڈرتا تھا تو لالہ گنپت سہائے سے کیونکہ اس کے پتاجی پر ان کے بہت احسانات تھے۔ انہی احسانات کی وجہ سے وہ لالہ گنپت سہائے کا بے حد احترام کرتا تھا اور ان کی بات کو کبھی نہ ٹالتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ چندو سے کبھی کسی کو شکایت ہوتی تو وہ سیدھا لالہ گنپت سہائے کے پاس پہنچ جاتا۔ لالہ جی چندو کو بلا بھیجتے اور جو کچھ وہ کہتے چندو سر نیچا کیے خاموشی سے سن لیا کرتا۔

محلے میں ہر سال رام لیلا دھوم دھام سے منائی جاتی تھی لالہ جی ہی اس کا انتظام کرتے تھے۔ اس سال بھی رام لیلا کے انتظام کی ذمے داریاں انہی کے سر آن پڑی تھیں۔ اس سال رام لیلا کھیلنے والوں کے سامنے ایک مسئلہ پریشانی کا باعث بنا ہوا تھا۔ ہمیشہ رام کا پارٹ ادا کرنے والا چندر شیکھر ایک حادثے میں اپنی ٹانگ گنوا بیٹھا تھا۔ اب اس کی جگہ کس کا انتخاب کیا جائے، یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ رام کا کردار کون ادا کرے، ایک معمہ بنا ہوا تھا۔ اچانک لالہ جی کو خیال آیا کہ چندو کو رام کا پارٹ دیا جا سکتا ہے۔ چندو خوبصورت بھی تھا اور تنومند بھی اور پھر وہ گانے کا شوقین بھی تھا۔ لالہ جی نے جب چندو کا نام پیش کیا تو چند ارکان نے دبی زبان سے اس کی مخالفت کی۔ محلے کے دوسرے لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ لالہ جی چندو کو رام بنا رہے ہیں تو وہ دل ہی دل میں ناراض ہوئے۔

ایک رات ماسٹر دینا ناتھ لالہ جی کے پاس آئے اور کہا۔ ”یہ آپ کیا ظلم کر رہے ہیں لالہ جی! آپ تو محلے کے بزرگ مانے جاتے ہیں۔ آپ کے ہاتھوں تو انصاف ہونا چاہیے، پھر یہ ناانصافی کیوں ہو رہی ہے؟“

لالہ جی ماسٹر صاحب کی بات سے اندازہ لگا چکے تھے کہ یہ بھی چندو کے رام بنائے جانے کے خلاف ہیں ماسٹر صاحب کی بوکھلاہٹ دیکھ کر نہایت ہی نرم لہجے میں لالہ جی نے کہا۔ ”مجھے امید نہیں تھی کہ آپ بھی ایسا ہی سوچیں گے اور کہیں گے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ استاد ہونے

کے ناطے آپ بھی میرے خیالات سے متفق ہوں گے"
ماسٹر جی چونک کر بولے "اجی کیا بات کر رہے ہیں آپ! ایک غلط لڑکے کو آپ شہ دیں اور میں اس سے اتفاق کروں! آپ ہی ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیے، کون شریف اور بھلا آدمی اپنی بہو بیٹی کو رام لیلا دیکھنے بھیجے گا؟ جب کوئی آئے گا ہی نہیں تو پھر آمدنی کیا خاک ہوگی! بس پھر سمجھیے کہ آئندہ سال سے رام لیلا ٹھپ!! ذرا سوچیے چندو کتنا بدمعاش لڑکا ہے۔ محلّے کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ ابھی پچھلے ہفتے ہی اس نے رحیم کے ساتھ چاقو بازی کی تھی۔"

لالہ جی نے ہنستے ہوئے کہا: بہت زیادہ ناراض ہیں آپ چندو سے۔ چاقو تو پیچھے سے آکر رحیم نے اُسے مارا تھا جب تک وہ بچاؤ کے لیے سنبھلے رحیم وہاں سے بھاگ چکا تھا اور آج تک اس کا پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ پھر سوچنے کی بات یہ بھی تو ہے کہ اگر چندو غنڈہ ہے تو کیا اسے ہمیشہ غنڈہ ہی بنے رہنے دیا جائے؟ کیا ہم لوگوں کا یہ انسانی فرض نہیں کہ اُسے ایک اچھا انسان بننے کا بھی موقع دیں۔ آپ تو خود معلّم ہیں۔ نہ جانے کتنے شرارتی بچوں سے آپ کا سابقہ پڑتا ہوگا۔ بُرے کو بُرا رہنے دینا تو سمجھداری کی بات نہیں۔

ماسٹر دینا ناتھ لالہ جی کی باتیں سن کر ناراض ہو گئے اور جاتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے.... جو کچھ بھی اچھا بُرا ہوگا اس کی ذمہ داری آپ پر ہوگی" ماسٹر جی کے ناراضگی سے چلے جانے سے لالہ جی پر کوئی اثر نہ ہوا۔

دوسرے دن صبح انھوں نے چندو کو بلوا بھیجا۔ وہ آیا تو لالہ جی نے کہا "دیکھو چندو، میں نے تمھیں رام کا پارٹ دلوایا ہے۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ تم کوئی ایسا کام نہیں کروگے جس سے مجھے نیچا دیکھنا پڑے۔ تم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ محلّے کے سب لوگ اس معاملے میں میرے خلاف ہو گئے ہیں لوگوں کی مخالفت کے باوجود بھی میں اپنے ارادے سے نہیں ہٹا ہوں۔"

لالہ جی کی بات سن کر چندو نے کہا "چاچا جی میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسا کوئی موقع نہیں آنے دوں گا جس سے آپ پر کوئی انگلی اٹھا سکے اگر آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں تو آپ بخوشی رام کا پارٹ کسی دوسرے کو دے سکتے ہیں۔" اُس کی صاف گوئی سے متاثر ہو کر لالہ جی نے اس کا کندھا پکڑ کر کہا۔ "نہیں بیٹے، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے تمھیں تمام حالات سے باخبر رکھنا ضروری سمجھا تھا۔"

چندو چلا گیا۔ جس دن رام لیلا شروع ہوئی اُس دن ہمیشہ کے مقابلے میں لوگوں کی تعداد ایک چوتھائی بھی نہیں تھی۔ چندو کے مخالفین اور ان کے ہمدردوں کی اجتماعی کوششوں سے تعداد کم ہوگئی تھی لیکن جیسے جیسے دن گزرنے لگے تماشائیوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ اسٹیج پر رام کے روپ میں چندو کی دل کو موہ لینے والی ایکٹنگ اور اسٹیج سے باہر لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک نے لوگوں کے خیالات کو بدل دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب لوگ زیادہ تعداد میں رام لیلا دیکھنے آرہے تھے۔

ایک دن رام لیلا ختم ہونے کے بعد جب چندو رام کا لباس اتارنے، وہ اپنے کپڑے پہننے کے لیے میک اپ روم میں گیا تو کافی تلاش کے باوجود بھی اُسے اپنے کپڑے نہیں ملے۔ شاید کسی نے مذاق کیا یا شرارتاً

گی اور یہ کہہ کر چندو رام ہی کے بھیس میں اپنے گھر روانہ ہوگیا۔ جب وہ اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا تو محلے کا بدنام لڑکا راجو بھی اس کے ساتھ تھا۔ رات کے ساڑھے ۱۱ بج رہے تھے۔ جب وہ اپنے گھر کی گلی میں مڑ کر نالے کی طرف بڑھنے لگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پل پر اندھیرے میں کوئی اوندھا پڑا ہوا کراہ رہا ہے۔ راجو نے پاس جاکر دیکھا تو چونک پڑا اور چندو کے پاس جاکر بولا۔ "ارے استاد یہ تو رحیم ہے۔ شاید کہیں سے مار کھا کر آیا ہے۔ مار اتنی پڑی ہے کہ اٹھ کر چل نہیں سکتا۔ خون میں لت پت پڑا ہے۔

رحیم کا نام سنتے ہی اُسے پچھلا واقعہ یاد آگیا اور اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اس کے چہرے سے انتقام کے جذبات عیاں تھے۔ راجو بھی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اُس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چندو کو صلاح دی۔ رحیم سے بدلہ لینے کا اس سے اچھا موقع پھر کبھی تمھیں نہیں ملے گا۔" راجو کی بات چندو کے دل میں اتر گئی۔ وہ چاہتا تھا کہ رحیم سے بدلہ لے کر دل میں اٹھی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرے، لیکن دوسرے ہی لمحے نہ جانے چندو کو کیا خیال آیا کہ وہ اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھنے لگا۔ راجو نے کہا "استاد کیا دیکھ رہے ہو۔ اپنا وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟" لیکن ایک لمحے کے لیے اپنے آپ کو دیکھنے کے بعد چندو کے خیالات اور جذبات میں تبدیلی آچکی تھی۔ انتقام کی آگ جو اس کے چہرے اور آنکھوں سے نمایاں ہو رہی تھیں آہستہ آہستہ اوجھل ہوگئی۔ اب اس کے چہرے سے سکون نمایاں تھا۔ وہ بار بار اپنے کو دیکھتا جا رہا تھا۔ چندو نے راجو سے کہا۔ "راجو اس وقت میں رام کے بھیس میں ہوں میں چاہے کتنا ہی بدنام اور برا انسان ہوں۔ مگر اس وقت رام کے نام اور کام کی لاج رکھوں گا۔" راجو کا ہاتھ پکڑے ہوئے وہ رحیم کے پاس گیا اُسے آہستہ سے ہلایا۔ بڑی مشکل سے وہ ہوش میں آیا۔ جب اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو رام کے بھیس میں ہونے کے باوجود اس نے چندو کو پہچان لیا تھا اس کے دل میں خیال آیا کہ اب چندو اپنا پچھلا بدلہ ضرور لے گا۔ اس لیے وہ اسی طرح کراہتا رہا اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "چندو مجھے نہ مارو ورنہ میں مر جاؤں گا۔ مجھے معاف کر دے۔ مجھ پر رحم کر۔ فرشتہ بن کر میری جان بخش دے" رحیم رونے لگا۔ چندو نے بلا کچھ کہے راجو کے سہارے اسے اپنے کندھوں پر اٹھایا اور ڈاکٹر ملک کے گھر کی طرف چل دیا۔

ڈاکٹر ملک اپنی ڈسپنسری کے اوپر والے مکان میں ہی رہتے تھے۔ رات زیادہ ہو چکی تھی۔ چندو نے ڈاکٹر ملک کو جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھے اور دروازہ کھولا۔ جب چندو نے انھیں سارا ماجرا سنایا تو وہ فوراً اپنے دواخانے میں آئے اور رحیم کی مرہم پٹی میں مصروف ہوگئے۔ چندو اور راجو دوسرے کمرے میں اپنے خون سے بھرے کپڑے اور جسم کو دھونے میں لگ گئے۔ ڈاکٹر ملک نے فوری طور پر انجکشن دیا۔

چندو دوڑ کر رام پیارے حلوائی کے یہاں سے دودھ لایا اور اپنے ہاتھوں سے رحیم کو پلایا۔ مرہم پٹی ہو جانے کے بعد چندو اور راجو اُسے گھر پہنچانے گئے۔ صبح ہوتے ہوتے چندو کی نیکی کے چرچے محلے والوں کی زبان پر [illegible]

کہانی

(انتی تونیت کی گجراتی کہانی کا آزاد ترجمہ)

ترجمہ : ایم مبین

ایک کسان کے چار بیٹے تھے۔ بڑے ہی سادے اور نیک۔ کام سے کبھی جی نہیں چراتے تھے۔ جو کام دیا جائے اسے محنت سے کرتے تھے۔ کسان ان سے بہت خوش تھا۔ سب کے سب کھیتوں میں کام کرتے تھے اس لیے فصل بھی اچھی ہوتی تھی۔ ان کی گزر بسر آرام سے ہو جاتی تھی۔ ان کو کسی قسم کی تکلیف نہیں تھی۔

دن گزرتے گئے۔ کسان کے چاروں بیٹے جوان ہو گئے۔ اب کسان کو ان کی شادی کی فکر ہوئی۔ وہ اپنے بیٹوں کے لیے لڑکیاں تلاش کرنے لگا۔ آخر اس نے چار لڑکیاں تلاش کیں اور ان سے اپنے بیٹوں کی شادیاں کر دیں۔

سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔ کچھ دن تک تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ مگر کچھ دنوں بعد کسان کے سامنے ایک بہت بڑا مسئلہ آیا۔ وہ یہ کہ اس کی چاروں بہوئیں کوئی کام نہیں کرتی تھیں۔ وہ دن بھر ایک دوسرے سے کام پر جھگڑتی رہتی تھیں۔ ایک کہتی تھی "میں نے وہ کام کیا اب میں یہ کام کیوں کروں۔ میں نے سارے کاموں کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے"

تو دوسری کہتی "میں نے وہ کام کل کیا تھا۔ اب آج کرنے والی نہیں"

کسان ان کو بہت سمجھاتا مگر ان میں کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بڑی مشکل سے جیسے تیسے دن بیت رہے تھے۔ اور کسان اس فکر میں تھا کہ کس طرح ان کو راہ راست پر لایا جائے اچانک اس کو ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے چار پائلی گیہوں منگوایا۔ اور ایک ایک پائلی گیہوں (تقریباً سات کلو) ایک ایک تھیلی میں ڈالا۔ اور چاروں بہوؤں کو بلایا پھر ان کو ایک ایک تھیلی دیتا ہوا بولا "یہ لے جاؤ۔ اور جو کرنا ہے وہ کر ڈالو" بہوئیں تھیلیاں لے کر چلی گئیں ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس گیہوں کا کیا کریں۔

سب سے بڑی بہو نے وہ سارے کا سارا گیہوں باہر پھینک دیا۔

دوسری نے اس کا آٹا پسوایا۔ اور اس کی روٹیاں پکوائیں اور سب کو کھلائیں۔

تیسری کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے گیہوں کو ایک محفوظ جگہ رکھ دیا۔ جہاں سے کوئی [illegible] سے

چرانے کے اور نہ ہی ان کو کیڑا لگنے دے۔

چوتھی بہو نے وہ گیہوں لیا اور اپنے شوہر کو دے دیا۔ اور اس گیہوں کو کھیت میں بونے کی ہدایت کر دی۔

اس کے شوہر نے وہ گیہوں کھیت میں بو دیا۔

جب وہ گیہوں تیار ہونے لگا۔ تو چوتھی بہو روز جا کر اس کی رکھوالی اور دیکھ ریکھ کرنے لگی۔ جب فصل پوری ہو گئی تو گیہوں کٹوایا گیا۔ اب وہ ایک پائلی گیہوں کئی تھیلوں کی شکل میں ان کے سامنے تھے۔

کسان کو یہ یاد تھا کہ اس نے اپنی بہوؤں کو گیہوں دیا ہے۔ ایک دن وہ پہلی بہو کے پاس گیا اور اس سے پوچھا "میں نے جو تمھیں گیہوں دیا تھا اس کا تم نے کیا کیا۔"

پہلی بہو بولی۔ "میں نے اسے پھینک دیا"

کسان بولا۔ "آج سے تم گھر میں صفائی ستھرائی کا کام کرو گی۔ گھر میں پڑا کچرا پھینکنا۔ برتن دھونا۔ صفائی۔ وغیرہ سارے کام تمھارے ذمے۔"

پھر وہ دوسری بہو کے پاس گیا۔ اور اس سے گیہوں کے بارے میں پوچھا۔

وہ بولی۔ "میں نے اس گیہوں کا آٹا پسوایا روٹیاں پکائیں اور سب کو کھلائیں۔"

یہ سن کر کسان بولا۔ "آج سے تم گھر کی رسوئی۔ کھانے پکانے کا کام کرو گی۔"

جب اس نے تیسری بہو سے گیہوں کے بارے میں سوال کیا تو بہو نے وہ گیہوں لا کر کسان کو دے دیا اور بولی "میں نے اسے ابھی تک سنبھال کر رکھا ہے۔"

یہ سن کر کسان بولا۔ "آج سے تمھارے ذمے گھر کی حفاظت۔ دھن دولت اور دوسری چیزوں کو سنبھال کر رکھنا ہے۔"

پھر وہ چوتھی بہو کے پاس گیا۔ اور اس سے گیہوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے کسان کو وہ گیہوں کے تھیلے دکھائے اور ساری بات بھی بتائی۔

یہ دیکھ کر کسان بہت خوش ہوا اور اس سے بولا "میں تمھارے اس کام سے بہت خوش ہوں.... آج سے تمھارے ذمے گھر کے کام کاج پر نگرانی رکھنا۔ اور ایسے کام کرنا جس سے گھر کی ترقی ہو۔ کھیت وغیرہ سے تعلق رکھنے والے۔"

اس طرح کسان نے اپنے گھر کے سارے کاموں کی تقسیم بہوؤں میں کر دی۔ اب وہ خوشی خوشی اپنے ذمے سونپے ہوئے کام کرنے لگیں۔ کسی کام کے لیے ایک دوسرے سے جھگڑا نہیں کرتیں۔ کیوں کہ ان کی فطرت اور عادت کے مطابق کام ملے تھے۔

جواب پرچہ عام معلومات ص ۳۷

(۱) مسز وجے لکشمی پنڈت

(۲) شہاب ثاقب کے زمین پر گرنے کو۔

(۳) بیا۔ (۴) مجروح سلطان پوری (۵) اتر پردیش

(۶) ہائیڈروجن (۷) برہما سماج۔

(۸) سید احمد شاہ بخاری

(۹) نیوزی لینڈ کے ولیم رچرڈس۔

(۱۰) جکارتا (انڈونیشیا) میں۔

★ زبان کی لغزش قدموں کی لغزش سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ (حضرت عثمان)

★ تہذیب و ادب سے وقار بڑھتا ہے

کتابوں کی باتیں

ناچ رہی گڑیا

ظفر گورکھپوری
پتا: ۴۰۳۔ ای ای پارٹ
چال۔ ہال روڈ، کرلا، بمبئی
قیمت: دو روپے پچاس پیسے

یہ بات مجھ سے بہتر طور پر آپ سب جانتے ہیں کہ آپ جیسے بچّوں کے لیے اچھی نظمیں اتفاق سے ہی مِل پاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرف توجہ ہی کم دی جاتی ہے۔ اور اگر کوئی دھیان دیتا بھی ہے تو وہ بچّوں کو قریب سے نہیں جانتا ہے یا اُسے ان کے لیے مناسب طور پر کہنا نہیں آتا ہے۔ ایک استاد کی حیثیت سے ظفر گورکھپوری صاحب خوب سمجھتے ہیں کہ بچّوں سے کس زبان میں بات کرنی چاہیے اور کیا بات کرنی چاہیے۔ ان کی ۲۸ نظمیں کتابی صورت میں "ناچ رہی گڑیا" کے نام سے ہمارے سامنے ہیں ان نظموں میں کچھ ایسی بھی ہیں جو نہایت آسان زبان میں ہیں اور جنھیں وہ بچّہ بھی پڑھ سکتا ہے جو ابھی تک اردو کی پہلی کتاب ہی ختم کر پایا ہے۔ جیسے ان کی پہلی نظم "ہوا سویرا" ہے۔ وہ یوں شروع ہوتی ہے۔

مرغی بولی کُٹ کُٹ کُٹ
بچّے بولے چُوں چُوں چُوں

اس کتاب کی آدھی نظمیں ایسی ضرور ہوں گی جس میں ابتدائی مدرسے کے بچّے آسانی سے پڑھ سکیں اور ایسی تو کوئی بھی نہ ملے گی جو ساتویں آٹھویں درجے والوں کے لیے دشوار ہو۔ انھوں نے اپنی نظموں میں بچّوں کی دنیا بسائی ہے یہاں ان چیزوں جانوروں اور لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ جن سے بچّوں کو دلچسپی ہو سکتی ہے اور ایسی باتیں کہی ہیں جنھیں بچّے پسند کرتے ہیں۔ پھر یہ سب کچھ اس بات کا خیال رکھ کر کہا ہے کہ وہ پڑھنے والے پر اچھّا اثر ڈالے اور اس انداز سے بھی کہا ہے کہ پڑھنے میں مزا آئے۔ ان کی ایک پیاری نظم "تماشہ" ہے۔ بالکل وہی تماشہ جو آپ میز مین میں دیکھتے ہیں۔ وہ شروع ہی اس طرح ہوتی ہے کہ:

بچو! آؤ تماشہ دیکھو
ایک پیسے میں دنیا دیکھو

اس نظم میں اپنے دیس کی مختلف جھانکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں اور اُسے پڑھ کر آپس کے میل ملاپ کا خیال بھی پکا ہوتا ہے۔

بہر حال اس کتاب کے بارے میں یہ بات اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ اس میں ہر بچّے کو اپنی پسند کی دو چار نظمیں ضرور مِل جائیں گی۔ کتاب صاف ستھری چھپی ہے۔ (عبداللہ بخش قادری)

تحفہ

ناظم سیوانی سہسرامی
پتا: ناظم پبلیکیشنز، سوامی پیٹھ
رہتاس (جہسرام)، بہار
قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے

اس کتاب کی حیثیت ایک درسی کتاب کی سی ہے۔

یعنی وہ کتاب جو عام طور پر درجے میں پڑھائی جاتی ہے۔ جس میں مختلف کہانیاں، قصے، پہیلیاں اور نظمیں ہوتی ہیں۔ لیکن ایک ایسی کتاب میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ اس میں جو کچھ رکھا جائے اس میں اونچ نیچ نہ ہو اور ایک خاص قابلیت رکھنے والا بچہ ان تمام چیزوں کا پورا پورا فائدہ اٹھا سکے۔ اس کتاب میں کچھ بے میل سا معاملہ ہے۔

"تحفہ" میں کچھ دوسری زبانوں سے ترجمے شامل کیے گئے ہیں۔ اور ناظم صاحب کی اپنی اچھی نظمیں بھی ہیں۔ ان ترجموں میں قصہ، کہانی، ڈراما سب کچھ ہے۔ ان کی پہلی نظم ایک حمد ہے۔ یعنی خدا کی تعریف میں ہے اور دوسری نعت ہے یعنی ہمارے نبی حضرت محمد صلعم کی شان میں۔ ایک نظم کا عنوان ہے 'ایسے کھیل کی ایسی تیسی'، جو سچ پوچھیے تو ہمیں پسند نہیں آیا اور نظم بھی اچھی نہیں لگی، ہاں ان کی نظم 'تاروں سے'، بے شک پڑھنے کے لائق ہے، آخری دو نظمیں غالب کون ہے اور 'اہلِ وطن سے' اپنی زبان اور اپنے بیان کے اعتبار سے بچوں کے بس کی نہیں معلوم ہوتیں۔ انھوں نے کچھ پہیلیاں بھی نظم کی ہیں۔ لیکن ان کی زبان بھی ایسی ہے کہ بچوں کو سمجھنے میں مشکل ہو۔ نظموں کے علاوہ جو مضامین ہیں یہ سب بھی ایسی ہی زبان میں ہیں جو بچوں کے لیے مناسب نہیں معلوم ہوتی ہے اگرچہ اس کتاب کے اوپر لکھا ہوا ہے کہ "بچوں کے لیے"، پھر بھی ایسا لگتا ہے کہ اس بات کا پورا خیال نہیں رکھا گیا۔ ہاں، اگر بچوں سے مراد ہائی اسکول کے طلبہ لیے جائیں تو دوسری بات ہے۔ پھر بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ سب ترجمے اپنے مقصد اور مطلب کے اعتبار سے بہت موزوں ہیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ان میں کوئی بے جا بات ہو۔ اس کتاب کی لکھائی باریک ہے اور چھپائی خراب۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ ثانوی مدرسے کے طلبہ ہی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

(عبداللہ ولی بخش قادری)

بقیہ رام اور رحیم صـ۳۹ سے

لالچی کو تو جیسے کھویا ہوا خزانہ مل گیا تھا وہ دوڑے دوڑے ماسٹر صاحب کے پاس پہنچے اور کہا۔ "کہیے ماسٹر جی اب ہمارے رام کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" "کون رام؟" ماسٹر صاحب نے پوچھا۔

"ارے وہی اپنا چندو،" ماسٹر صاحب کچھ جواب نہ دے سکے۔ اس دن کے بعد سے کبھی کسی نے نہیں سنا کر چندو نے کسی سے جھگڑا کیا یا چھیڑ چھاڑ کی۔

بقیہ صـ۲۳ مظہر الحق

رہائش ترک کر کے فرید پور گاؤں میں بنے ہوئے اپنے مکان "آشیانہ" میں رہنے لگے۔ اس زمانے میں انھیں کانگرس کی صدارت کا عہدہ پیش کیا گیا مگر اب وہ عملی سیاست سے علیٰحدہ ہو چکے تھے اس لیے انھوں نے یہ پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

۲- جنوری ۱۹۳۰ء کو فرید پور کے اسی آشیانے میں جوان کی آخری پناہ گاہ تھا ان کا انتقال ہو گیا۔ اگست ۱۹۶۱ء میں شری ایس۔ آر۔ آئینڈے کی کوششوں سے چھپرہ میں ایک مظہر الحق میموریل بورڈ قائم ہوا۔ اس بورڈ کے زیر انتظام ہر سال ۲۲۔ دسمبر کو مظہر الحق کی برسی منائی جاتی ہے جس میں ملک کے مشہور و معروف رہنماؤں کے علاوہ مشہور شعرائے کرام بھی تشریف لاتے ہیں۔

بقیہ صـ۴ زندگی کے دو رخ

ہوئے بولا "تو تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ بہت دنوں کی بات ہے، میں ہی آپ کے پاس حضرت مسیحؑ کے بچپن کی تصویر کے لیے ماڈل بن کر آیا تھا۔"

(انگریزی سے ترجمہ)

سلیمان ظفر

پرچہ عام معلومات

(اس پرچے کے ذریعے آپ اپنی معلومات کا امتحان بھی لے سکتے ہیں اور اس میں اضافہ بھی کر سکتے ہیں۔ جواب کے لیے صفحہ ۴۲ دیکھیے)

---

(۱) اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کا پہلا ہندوستانی صدر کون تھا۔

(۲) قدرت کے کس مظہر کو "تارہ ٹوٹنا" کہتے ہیں؟

(۳) کونسی چڑیا سب سے زیادہ خوبصورت اور حیرت انگیز گھونسلہ بناتی ہے؟

(۴) یہ مشہور شعر کس کا ہے ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

(۵) آبادی کے لحاظ سے ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کون سی ہے؟

(۶) اوپر اُٹھنے والے ربڑ کے غبارے میں کونسی گیس استعمال ہوتی ہے؟

(۷) رانا ڈے نے کس مذہب کی بنیاد ڈالی؟

(۸) اُردو کی مشہور کتاب "پطرس کے مضامین" کے خالق پطرس کا پورا نام کیا تھا؟

(۹) ۱۹۷۶ء کے کیلنڈر سال میں دو کرکٹ کے کھلاڑیوں نے ہزار رن پورے کیے: (۱) ہندستان کے سنیل گاوسکر (۲) یہ نام آپ بتلائیے۔

(۱۰) دنیا کی سب سے بڑی مسجد کہاں ہے؟

بچّوں کی کوششیں

بسم اللہ کی عظمت

حصّہ اوّل :-

ایک شخص ایک گانو کا رہنے والا تھا۔ وہ روزانہ شہر اپنی گھاس بیچنے کے لیے آیا کرتا تھا۔ شہر اور گانو کے درمیان ایک ندی تھی۔ اتفاق سے ایک دن وہ گھاس لا رہا تھا کہ اس نے ایک مولوی صاحب کو دیکھا کہ وہ وعظ فرما رہے ہیں اور اپنے وعظ میں بسم اللہ کی بڑی تعریف کر رہے ہیں۔ اس نے جب بہت ہی تعریف سنی تو وہ اس پر عمل کرنے لگا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس میں اس قدر اثر پیدا ہو گیا کہ وہ جب اس ندی پر آتا تو اس کے جانے کے لیے قدرتی طور پر پانی ہٹ جاتا اور وہ روزانہ اسی طرح اپنی گھاس شہر میں لے جا کر بیچتا اور اپنا پیٹ پالتا تھا۔ ایک دن وہی مولوی صاحب اس کو ندی کے کنارے ملے مولوی صاحب کو ندی کے پانی کو خشک ہوتا ہوا دیکھ کر بہت تعجب ہوا۔ اس گانو والے نے مولوی صاحب کو دیکھ کر سلام کیا۔ مولوی صاحب نے سلام کا جواب دیا اور اس سے اس ماجرے کو پوچھا۔ گانو والا مولوی صاحب کے اس سوال کو سن کر بہت حیران ہوا۔ اور جواب دیا کہ آپ ہی نے تو فلاں دن اپنے وعظ میں بسم اللہ کی تعریف کی تھی۔ میں بھی آپ کا وعظ سن رہا تھا۔ جب میں نے بہت ہی تعریف سنی تو میں نے اس پر عمل بھی کیا جس سے مجھ کو یہ مرتبہ حاصل ہوا۔

حصّہ دوم :-

ایک لڑکی نے جب کہ وہ بازار کو سودا لینے جا رہی تھی۔ آنحضرت صلعم کو وعظ فرماتے ہوئے سُنا جس میں آپ بسم اللہ کی تعریف بیان فرما رہے تھے اس لڑکی نے جب آپ سے تعریف سنی تو وہ پوشیدہ طور پر مسلمان ہو گئی۔ اور ہر وقت اور ہر کام میں بسم اللہ کا استعمال کرنے لگی۔ اس کا پورا خاندان چونکہ غیر مسلم تھا۔ اس لیے سب اس کے اس کلمہ پر متحیر رہتے تھے اور اس اسے منع کرتے تھے کہ وہ اس کلمہ کو نہ پڑھے۔ کیونکہ یہ محمدؐ کا کلمہ ہے۔ مگر وہ ہر کام کے شروع میں بسم اللہ ضرور پڑھتی تھی۔

آخر ایک دن اس قبیلے کے لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر لڑکی کو گھر سے بلا سبب نکالتے ہیں تو بدنامی اور اگر بے خطا مارتے ہیں تو بدنامی۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ اسے ایک انگوٹھی دی جائے اور اس کو کہا جائے کہ اس کو حفاظت سے رکھنا۔ ورنہ

قتل کردی جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور لڑکی نے بسم اللہ پڑھ کر وہ انگوٹھی رکھ لی۔ ایک دن اس کے باپ نے وہ انگوٹھی نکال کر دریا میں پھینک دی۔ اور دوسرے دن اس نے اس لڑکی سے انگوٹھی طلب کی۔ لڑکی انگوٹھی نہ پاکر بہت رنجیدہ ہوئی۔ مگر اس نے بسم اللہ کو نہ چھوڑا اور برابر پڑھتی رہی اس کے باپ نے کہا اگر کل تک تو نے انگوٹھی نہ دی تو قتل کردی جائے گی۔ لڑکی قتل کا نام سن کر بہت غمگین ہوئی۔ لیکن خدا کی قدرت دیکھیے کہ اس کا باپ مچھلیاں لایا اور بیٹی سے کہا کہ اسے بنا لڑکی نے ان مچھلیوں کو بسم اللہ کہہ کر بنانا شروع کیا۔ جب اس نے پہلی مچھلی بنائی تو اس کے پیٹ میں وہی انگوٹھی جو اس کا باپ دریا میں پھینک آیا تھا، نکلی۔ لڑکی انگوٹھی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اور اس کو اپنی جیب میں رکھ لیا۔ دوسرے دن جب لڑکی کے باپ نے اس سے انگوٹھی طلب کی تو لڑکی نے وہی انگوٹھی دیدی۔ باپ انگوٹھی کو دیکھ کر بہت متحیر ہوا۔ اور اس سے پوچھا کہ تیرے پاس یہ انگوٹھی کہاں سے آئی۔ میں تو اسے دریا میں پھینک آیا تھا۔ لڑکی نے باپ سے تمام واقعہ کہہ سنایا۔ اور کہا کہ یہ سب بسم اللہ کی برکت ہے۔ یہ سن کر اس لڑکی کا تمام قبیلہ مسلمان ہوگیا۔ تم نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی عظمت اور برکت اچھی طرح سمجھ لی ہوگی۔ لہٰذا تمھیں چاہیے کہ تم ہر کام کے شروع میں اس کو پڑھا کرو۔

عرفانہ بنت نور محمد

بچّوں کی کوششیں

اللہ کی ضمانت

کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ابن سعید نام کا ایک شخص رہتا تھا۔ ایک دن اسے تجارت کے لیے ہزار اشرفیوں کی ضرورت پڑی۔ مگر اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ پریشانی کے عالم میں ابن سعید ایک مالدار شخص کے پاس گیا اور بطور قرض ہزار اشرفیاں مانگیں۔ مالدار شخص نے کہا: "میں تمھیں قرض دینے کے لیے تیار ہوں۔ مگر اس کے لیے تمھیں کوئی گواہ لانا ہوگا۔" یہ سن کر ابن سعید نے کہا: "میں خدا کو بطور گواہ پیش کرتا ہوں۔" مالدار شخص نے کہا۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے۔ خدا ضامن کو بھی کو لے آیے"

ابن سعید نے جواب دیا "میرے شفیق! ضمانت کے لیے بھی خدا ہی کافی ہے۔"

مالدار شخص اس کا جواب سن کر بہت خوش ہوا اور کہا "تم نے بالکل سچ کہا۔ میں تمھیں خدا کی ضمانت پر ایک ہزار اشرفیاں قرض دیتا ہوں۔ ایک سال کی مدت تک میری رقم واپس کر دینا" ابن سعید نے اشرفیاں لے کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور تجارت کے لیے سمندر پار چلا گیا۔

ابن سعید کی خوش کلامی اور ایمانداری نے تجارت پر بہت اچھا اثر ڈالا۔ تجارت میں دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی ہونے لگی۔ اس

طرح چند ہی مہینوں میں ابن سعید امیر تاجروں میں گنا جانے لگا۔

ایک سال کی مدت پلک جھپکتے ہی گزر گئی۔ مقررہ وقت پر ابن سعید قرض واپس کرنے کی غرض سے ساحل پر آیا تاکہ کوئی جہاز مل جائے تو جلد از جلد قرض ادا کرکے اس قرض سے سبکدوش ہو جائے۔ مگر ساحل پر ایک بھی جہاز نہیں ملا۔ مجبوراً اس نے ایک لکڑی کے تختے کو تلاش کرکے اس میں ایک سوراخ کیا۔ اور اس کے اندر ہزار اشرفیاں اور ایک رقعہ مالدار شخص کے نام لکھ کر اس سوراخ کے اندر رکھ دیا۔ اور پھر اسے اچھی طرح سے بند کرکے سمندر کے قریب لایا اور کہا۔ "اے پروردگار! تجھے غیب کی خبر ہے تیری ہی ضمانت پر ہزار اشرفیاں قرض لی تھیں اور اب جبکہ قرض کی مدت ختم ہو رہی ہے۔ مجھے اس تک جانے کے لیے کوئی جہاز نہیں ملا۔ لہٰذا یہ رقم میں نے تیری ہی ضمانت پر لی تھی۔ اب تیری ہی امانت میں دیتا ہوں۔ یہ رقم تو اس شخص تک پہنچا دے۔" یہ کہہ کر ابن سعید نے اس لکڑی کے تختے کو سمندر میں بہا دیا اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد سمندر کی لہروں سے کھیلتا ہوا وہ تختہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

ادھر مال دار شخص مدت ختم ہو جانے پر اس امید میں ساحل پر آیا کہ شاید ابن سعید میرا قرض چکانے آیا ہو۔ اس کی نظریں جہاز سے اترنے والے ہر شخص پر پڑتیں مگر ابن سعید کو نہ دیکھ کر مایوس ہو جاتیں ——— اور پھر کچھ دیر کے بعد جب وہ مایوس ہو کر لوٹنے والا تھا اس کی نظر سمندر میں بہتے ہوئے لکڑی کے ایک بڑے تختے پر پڑی جو خود بخود کنارے آ لگا۔ وہ اسے جلانے کی غرض سے اٹھا کر گھر لے آیا گھر میں جب کلہاڑی سے دو ٹکڑے کیے تو ہزار اشرفیاں اور رقعہ نکل کر زمین پر بکھر گئے۔ مال دار شخص نے جب رقعہ پڑھا تو اس کی سمجھ میں ساری باتیں آ گئیں اور اس نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

پانچ سال کے بعد جب ابن سعید اپنے گھر واپس آیا تو یہ سوچ کر کہ شاید وہ لکڑی کا تختہ اس شخص تک نہ پہنچا ہو۔ ایک ہزار اشرفیاں لے کر اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا۔ "خدا کی قسم! میں تمھارا قرض ادا کرنے کے لیے مقررہ وقت پر نکلا۔ مگر افسوس جہاز وقت پر نہ مل سکا۔ اس کے لیے میں معافی چاہتا ہوں۔ یہ لیجیے ہزار اشرفیاں حاضر ہیں۔"

یہ سُن کر مال دار شخص نے کہا۔ "اے خدا کے نیک بندے! کیا تم نے برسوں پہلے ایک لکڑی کے تختے میں ہزار اشرفیاں اور ایک رقعہ میرے نام لکھ کر سمندر میں چھوڑا تھا؟"

ابن سعید نے کہا۔ "ہاں! جب مجھے وقت پر جہاز نہ ملا تو ایک لکڑی کے تختے میں سوراخ کرکے یہ دونوں چیزیں اللہ کی امانت اور حفاظت میں آپ کی خدمت میں روانہ کی تھیں۔"

مال دار شخص نے کہا۔ "تو سُن اے ابنِ سعید! مجھے میرا مال مل چکا ہے۔"

یہ سن کر ابنِ سعید کی پلکوں پر خوشی کے بے شمار تارے جھلملا اُٹھے!!

شمیم عالم مصطفیٰ

بچوں کی کتابیں

مذہب

کتاب	مصنف	قیمت
ارکانِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۱/۶۰
آں حضرتؐ	الیاس احمد مجیبی (اردو)	۰/۸۰
آں حضرت	الیاس مجیبی (ہندی)	۰/۶۰
پاک کہانیاں (دو حصوں میں)	مقبول احمد سیوہاروی	۳/۰۰
چار یار	الیاس احمد مجیبی	۲/۵۰
خلفائے اربعہؓ	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۳/۰۰
رسولِ پاکؐ	عبدالواحد سندھی	۲/۰
عقائدِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۰/۶۰
مسلمان بیبیاں	مولانا اعجاز الحق قدوسی	۱/۰۰
نبیوں کے قصے	خواجہ عبدالحیٔ فاروقی	۱/
ہمارے رسول	" " "	۲/۴۰
ہمارے نبی (اردو)	سید نواب علی رضوی	۱/۲۰
ہمارے نبی (ہندی)	سید نواب علی رضوی	۰/۴۰
سرکارِ دو عالم	محمد حسین حسان ندوی	۳/۰۰

معلومات

کتاب	مصنف	قیمت
آدمی کی کہانی	مشتاق احمد	۲/۰۰
انوکھا عجائب خانہ (چار حصے)	محمد حسین حسان ندوی	۲/۰۰
بجلی کی کہانی	علی احمد خاں	۰/۵۰
بڑودادا کی کہانی	محمد عبدالغفور	۰/۸۰
تاریخ ہند کی کہانیاں (اوّل)	خجستہ سلطان	۱/۰۰
" " " " (دوم)	ضیاء الرحمٰن	۱/۲۰
" " " " (سوم)	مشتاق احمد اعظمی	۱/۰
" " " " (چہارم)	" "	۱/۲۵
خبر رسانی کے طریقے	رفیعہ منظور الامین	۱/۰۰
دنیا کے بچے	محمد حسین حسان ندوی	۱/۲۵
دہلی	ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی	۲/۰۰

کتاب	مصنف	قیمت
رابندر ناتھ ٹیگور	صفدر حسین	۲/۹۰
سماجی زندگی (چار حصے)	احمد پٹیل و غلام ابرار	۴/۹۰
قدرت کے کرشمے	(مرتبہ) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۰/۸۰
سمندر کے کنارے	سلطانہ آصف فیضی	۱/۵۰
سمندر کے نیچے	" " "	۲/۵۰
میرانیس	محمد حسین حسان ندوی	۱/

کہانیاں، ڈرامے، ناول

کتاب	مصنف	قیمت
جن حسن عبدالرحمٰن (ناول) دو حصے		۵/۰۰
اس نے کیا کر نہ جانا (کہانیاں)	آصف مجیب	۰/۳۷
پریم کی جیت (ڈراما)	اسداللہ کاظمی	۰/۳۷
تانبیل خاں (کہانی)	محمد حسین حسان ندوی	۰/۵۰
ترکوں کی کہانیاں (کہانی)	مرتبہ مکتبہ جامعہ لیمٹڈ	۰/۵۵
تیس مار خاں کے کارنامے (ناول)	م۔ ندیم	۱/۵۰
تین اناڑی (ناول)	عصمت چغتائی	(زیر طبع)
چپاوت کا آدم خور شیر (سچی کہانی)	محمد معین	۰/۳۵
چھوٹی لالٹین	مشتاق احمد	۰/۳۵
چقماق کی ڈبیا	برکت علی فراق	۰/۴۰
خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا	کوثر بانو	۰/۴۰
سیدلا	پروفیسر محمد مجیب	۰/۵۰
چنبیلی	محمد حسین حسان ندوی	۰/۵۰
ستاروں کی سیر (ناول)	کرشن چندر	۲/۰۰
کوے دادا (سچی کہانی)	مجیب احمد خاں	۲/۰۰
لال مرغی (کہانی)	عبدالواحد سندھی	۰/۵۰
مزہ چکھائیں گے (")	مرتبہ: مکتبہ جامعہ لیمٹڈ	۰/۳۵
مزے دار پہیلیاں	(مرتبہ) محمد علی خاں	(زیر طبع)
ننھا ٹٹو (کہانی)	خورشید سلطان	۰/۳۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

Regd No. D(S)-097 MAY 1977

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دریا گنج دہلی 110002

پیامِ تعلیم

ماہنامہ

پیام تعلیم

نئی دہلی ۲۵

جلد ۱۴ شمارہ ۷

اڈیٹر

ولی شاہجہانپوری

معاون

صفیہ حسان

جولائی ۱۹۷۷ء

قیمت فی پرچہ —— ۷۰ پیسے
سالانہ چندہ —— سات روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

فہرست

چاند کا بچہ

حامد اللہ افسر

وہ دیکھو وہ نکلا چاند — امّاں تم نے دیکھا چاند
یہ بھی کیا بچہ ہے امّاں — چھوٹا سا مُنّا سا چاند
اتنا دُبلا، اتنا پتلا — کب ہوتا ہے ایسا چاند
امّاں اس دن جو نکلا تھا — وہ تھا گول بڑا سا چاند
بادل سے ہنس ہنس کر اس دن — کیسا کھیل رہا تھا چاند
چُھپ جاتا تھا نکل آتا تھا — کرتا تھا یہ تماشا چاند
اپنے بچّے کو بھیجا ہے — گھر میں بیٹھا ہوگا چاند
یہ بھی ایک دن بن جائے گا — اچھا گول بڑا سا چاند

اچھّا امّاں کل کیوں تم نے
مجھ کو کہا تھا میرا چاند

بچّوں سے باتیں

جون کے آخر تک تمام اسکولوں کے امتحان کے نتیجے یقیناً نکل آئے ہوں گے۔

کامیاب طلبہ اور طالبات ہماری مبارک باد قبول کریں۔ ہماری خواہش ہے کہ وہ اسی لگن اور محنت سے کامیابی کے زینے کی چوٹی تک پہنچ جائیں۔

جو کامیاب نہ ہو سکے، ان سے ہمیں ہمدردی ہے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ وہ بددل نہ ہوں۔ ناکامیاں ہی کامیابی کی راہ بتاتی ہیں۔ انھیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ ان کے فیل ہونے کے کیا کیا اسباب ہیں۔ اگر کھیل کود اور سیر و تفریح میں زیادہ دلچسپی نے پڑھائی سے دور رکھا ہو تو۔ اس شوق کی ایک حد مقرر کرنی چاہیے۔ انھیں بالکل ترک کر دینے کا مشورہ ہم ہرگز نہیں دیں گے۔ کھیل کود کو بھی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ اس سے صحت بنتی ہے اور دماغ کو آرام ملتا ہے۔

اگر ذہن کند اور حافظہ کمزور ہے تو اس کا علاج کرنا چاہیے۔ پڑھنے میں زیادہ وقت صرف کرنا چاہیے۔ جس مضمون میں کمزور ہوں اس پر زیادہ توجہ دینا چاہیے کہ اگلے سال پوزیشن حاصل کریں۔

اس شمارے میں رؤف انجم صاحب کی نظم "علم سے دنیا بھی ہے اور دین بھی" اچھی کوشش ہے۔ [illegible] ایک نصیحت بھی۔ آپ کو پسند آنی چاہیے۔

ہمیں یقین ہے کہ یہ شمارہ آپ کو ہر لحاظ سے پسند آئے گا۔ اظہار اثر صاحب کا مضمون "سائنس کیا ہے" اور مشتاق احمد صاحب کا "بجلی کا کرشمہ" محمد عرفان نجف علیمی کی "ایک تیز رفتار ٹرین" دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔

ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی نے "تاج محل" کی سیر جتنے اچھے ڈھنگ سے کرائی ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو پڑھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتنی معلومات اکٹھا کر دی ہیں انھوں نے اس مختصر سے تاریخی مضمون میں۔

مجاہد صاحب جامعہ کے مدرسۂ ثانوی میں تاریخ کے استاد تھے۔ آج کل جرمنی میں مقیم ہیں۔ ہم ان سے درخواست کریں گے کہ جرمنی سے بھی آپ لوگوں کا تعارف کرائیں۔

باقی مضامین نثر و نظم بھی آپ کو ضرور پسند آئیں گے۔ اس کا ہمیں یقین ہے۔

شفیع الدین نیّر نمبر کی کتابت ہو رہی ہے۔ ہم نے لکھا تھا کہ یہ خاص نمبر اگست میں آپ تک پہنچ سکے گا۔ انشاء اللہ اگست ہی میں یہ آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔ مگر شمارہ یہ اگست کا نہیں بلکہ ستمبر کا ہوگا۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، یہ نمبر خاصا ضخیم ہوگا۔ اور اس کی قیمت بھی زیادہ ہوگی۔ لیکن مستقل خریداروں

ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی

شاہ جہاں مغلیہ خاندان کا پانچواں بادشاہ تھا۔ جو "معمار بادشاہ" کے نام سے بھی مشہور ہے — شاہ جہاں کو نئے نئے شہر آباد کرنے اور بڑی بڑی خوبصورت عمارتیں بنوانے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے اپنے راج میں آگرہ، دہلی، لاہور اور کشمیر میں ایسی ایسی خوبصورت عمارتیں بنوائیں اور ایسے خوشنما باغ لگوائے کہ ان کو دیکھنے کے لیے آج بھی دور دور سے لوگ ہمارے ملک میں آتے ہیں، دیکھتے ہیں اور شاہ جہاں کی عمارتوں کو دیکھ کر سر دھنتے ہیں۔ ہم آج آپ کو آگرے کا تاج محل دکھانا چاہتے ہیں۔ جو شاہ جہاں نے اپنی چہیتی بیوی ارجمند بانو بیگم کی یاد میں بنوایا تھا۔

شاہ جہاں کی شادی ارجمند بانو بیگم سے ۱۶۱۲ء میں ہوئی تھی وہ نور جہاں کے بھائی آصف خاں کی بیٹی تھی۔ قدرت نے ارجمند کو صورت ہی نہیں، سیرت بھی اچھی دی تھی۔ وہ بہت پڑھی لکھی، سلیقہ والی اور وفادار عورت تھی۔ شاہ جہاں کو .... شروع ہی سے ارجمند بانو سے بڑا لگاؤ تھا۔ محل تو محل، جنگ کے میدان میں بھی شاہ جہاں اسے اپنے ساتھ رکھتا تھا اور حکومت کی پیچیدہ گتھیاں سلجھانے میں اس سے مشورہ بھی کرتا تھا ۱۶۲۷ء میں اپنے باپ جہانگیر کے مرنے کے بعد جب شاہ جہاں بادشاہ بنا تو اس نے اپنی بیوی ارجمند بانو بیگم کو "ممتاز محل" کا خطاب عطا کیا۔

ممتاز محل سے شاہ جہاں کے یہاں چودہ (۱۴) بچے پیدا ہوئے۔ ۱۶۲۹ء میں شاہ جہاں کو ایک باغی امیر کو سزا دینے کے لیے برہان پور کا سفر کرنا پڑا۔ ارجمند بانو بھی شاہ جہاں کے ساتھ تھی۔ اسی زمانے میں اس نے ایک بچی کو جنم دیا۔ مگر خود کچھ ایسی بیمار پڑی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ بادشاہ نے علاج کرانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ مگر ملکہ کی طبیعت ٹھیک نہ ہو سکی۔ کہتے ہیں کہ جب ملکہ کا آخری وقت آیا تو ممتاز محل نے بادشاہ سے دو باتوں کی فرمائش کی۔ ایک تو یہ کہ بادشاہ اس کے مرنے کے بعد دوبارہ شادی نہ کرے تاکہ وہ اس کی اولاد کی ٹھیک طرح سے دیکھ بھال کر سکے۔ دوسرے اس کی یاد میں ایک ایسا مقبرہ بنوائے جس کی نظیر دنیا میں نہ مل سکے۔

ارجمند بانو کی موت کا شاہ جہاں پر ایسا گہرا اثر پڑا کہ ہفتوں اور مہینوں وہ تنہائی میں ملکہ کو یاد کر کے رویا کرتا تھا۔

برہان پور کے ایک باغ میں عارضی طور پر دفن کردیا۔
لیکن خود ملکہ کی وصیت کو پورا کرنے کی ترکیب
سوچنے لگا۔ آخر چھ ماہ کے بعد ملکہ کی لاش کو
برہان پور سے آگرہ لایا گیا اور دریائے جمنا کے
کنارے ایک باغ میں دفن کردیا گیا اور بہت جلد
ہی وہاں وہ خوبصورت عمارت بننا شروع ہوگئی۔
جو بعد میں تاج محل کے نام سے دنیا میں مشہور ہوئی۔

شاہ جہاں نے تاج محل بنانے کا کام ۱۶۳۱ء
میں شروع کیا لیکن اس سے پہلے اس نے دور دور
کے ملکوں سے بڑے بڑے معماروں اور فن کاروں
کو تاج محل کا نقشہ بنانے کے لیے آگرہ طلب کیا۔
سیکڑوں نقشے بادشاہ کے سامنے پیش کیے گیے
لیکن ان میں سب سے اچھا نقشہ ترکی کے استاد
محمد عیسیٰ آفندی کا نکلا۔ شاہ جہاں کے حکم سے
اس نقشے کے مطابق لکڑی کا ایک چھوٹا سا نمونہ
تیار کیا گیا اور بادشاہ نے آفندی اور محمد شریف
سمرقندی کو اس نمونہ کے مطابق تاج محل بنانے پر
مقرر کردیا۔ ہندوستانی فن کاروں کے علاوہ شیراز
بلخ، بخارا، سمرقند ترکی اور عرب کے اور بھی بہت
سے کاریگر تاج محل کے بنانے میں مدد کر رہے
تھے ان کے علاوہ ہندوستانی کاریگروں اور مزدوروں،
سب کو ملاکر لگ بھگ بیس ہزار آدمی دنیا کی اس
خوبصورت عمارت کو جنم دینے میں لگے ہوئے رہتے۔
کہتے ہیں کوئی بیس سال تک یہ بیس ہزار آدمی
تاج محل کے بنانے میں مصروف رہے تب جاکر
یہ مقبرہ مکمل ہوا۔ ملک کے بڑے بڑے امیروں،
وزیروں، راجوں، مہاراجوں نے بادشاہ کی خدمت
میں پچی کاری کے لیے قیمتی پتھر نذر کے طور پر
پیش کیے۔ کسی نے سنگ مرمر کا انتظام کیا تو کسی
نے سرخ پتھر کی سلیں آگرہ بھجوادیں پھر بھی ان
تحفوں کو چھوڑ کر کروڑوں روپیہ اس زمانے کے
لحاظ سے اس عمارت پر خرچ ہوا۔

تاج محل کی عمارت دریائے جمنا کے جنوبی
کنارے ایک بہت بڑے باغ میں ہے۔ باغ کے
اردگرد ایک چاردیواری ہے اور اس میں داخل
ہونے کے لیے ۷۰ فٹ اونچا ایک دروازہ ہے
جو سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ صدر دروازے پر
رنگ برنگ کی پچی کاری ہے۔ اور اس کی محراب
پر قرآنی آیتوں کی لکھائی کچھ ایسے کمال سے کی
گئی ہے کہ ہر حرف جتنا بڑا نیچے سے نظر آتا ہے
اتنا ہی بڑا اسّی فٹ کی اونچائی پر بھی نظر آتا ہے۔

صدر دروازے سے نکلتے ہی نگاہ کے
سامنے طرح طرح کے ہرے بھرے درخت
نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی دو نہریں مقبرے تک
جاتی ہوئی نظر آتی ہیں جن میں فوارے لگے
ہوئے ہیں۔ صدر دروازے اور روضے کے بیچ
میں ایک حوض ہے جس میں نہایت صاف پانی
بھرا رہتا ہے اور رنگ برنگ کی مچھلیاں اس
میں تیرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس حوض میں بھی
ایک بڑا فوارہ اور چاروں طرف کونوں پر چھوٹے
چھوٹے فوارے ہیں۔ اس حوض سے تاج محل
تک پہنچنے کے لیے کوئی ۴۲۸ فٹ کا فاصلہ طے
کرنا پڑتا ہے۔ سامنے ہی سرخ پتھر کا ایک لمبا
چوڑا چبوترہ ہے۔ جو باغ کی سطح سے چار فٹ

اور جمنا کے کنارے سے کوئی ۸۲ فٹ اونچا ہے۔ اس چبوترے کے بیچ میں سنگ مرمر کا ۲۰۰ فٹ لمبا اور بیس فٹ اونچا ایک اور چبوترہ ہے۔ جس پر اصل روضہ بنا ہے۔

روضے کے بائیں اور دائیں طرف دو عمارتیں اور ہیں یعنی پچھم کی جانب مسجد تو پورب کی جانب اس کا جواب تسبیح خانہ جسے جماعت خانہ بھی کہتے ہیں۔ روضے کے چاروں طرف جو چار مینار ہیں ان کی موجودگی نے عمارت کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ یہ مینار کوئی ۱۶۲ فٹ اونچے ہیں اور ان پر چڑھنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہیں۔ روضے کے درمیان بڑے گنبد کے کلس کی چوٹی باغ کی سطح سے کوئی ۲۴۴ فٹ بلند ہے یعنی قطب مینار دہلی سے بھی پانچ فٹ زیادہ بلند ہے۔

آیئے اب روضے کے اندر چلیں۔ ذرا صدر دروازے پر لکھے ہوئے کتبوں پر نظر ڈالیے۔ یہ کتبے امانت خاں شیرازی کے لکھے ہوئے ہیں۔ روضے کے اندر آٹھ پہل، چوکور کمرے ہیں جن میں پچی کاری اور سنگ تراشی کے کمالات دکھائے گئے ہیں درمیانی کمرے میں جہاں ممتاز محل اور شاہ جہاں دفن ہیں سنگ مرمر کی جالیوں کا ایک آٹھ پہل کٹہرا ہے۔ یہاں جو سنگ مرمر کام میں لایا گیا ہے وہ بے حد نفیس اور قیمتی ہے۔ یہاں کی پچی کاری بس دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے ایک ایک پھول میں سینکڑوں قسم کے مختلف قیمتی اور خوش رنگ پتھروں کے جوڑ دیے گئے ہیں۔ اور خوبی یہ ہے کہ جوڑ کہیں معلوم نہیں دیتا۔ ملکہ اور بادشاہ کی قبروں پر خدا کے نام اور عربی عبارت لکھی ہوئی ہے

چھت کے اوپر ایک عظیم الشان خوبصورت گنبد ہے۔ گنبد پر بھی پچی کاری کی گئی ہے۔ چھت کے چاروں کونوں پر چار گنبد اور ہیں۔ آٹھ گلدستے بھی چھت پر لگائے گئے ہیں۔ گنبد کا کلس پیتل کا بنا ہوا ہے یہ کوئی ۳۰ فٹ لمبا ہے اور اس کا وزن ۳۲ من ہے۔

اگر آپ تاج محل دیکھنے جائیں تو آپ کو یہ دیکھ کر کسی قدر تعجب ہوگا کہ ملکہ کی قبر تو روضے کے بیچوں بیچ میں ہے مگر شاہ جہاں کی قبر ایک طرف کو ہٹ کر بنائی گئی ہے۔ اصل میں شاہ جہاں کا خیال تھا کہ وہ اپنے لیے تاج کے بالکل سامنے دریا کے دوسرے کنارے پر ایک اور شاندار روضہ بنوائے گا اور ان دونوں

رشید عارف

برسات

رم جھم رم جھم پانی برسے
بچو! باہر آؤ گھر سے
اپنا حال برا گرمی سے
ٹھنڈک پہنچے گی پانی سے
ناچیں، کودیں، دھوم مچائیں
بوندوں کا ہم لطف اٹھائیں
اپنے بدن کو ٹھنڈا کر لیں
اتنا ہم پانی میں بھیگیں
زور سے جب برسے گا پانی
پیاسوں کو ترسے کا پانی

مقبروں کو سنگ مرمر کا پل بنا کر آپس میں ملا دیا جائے گا تاکہ نیچے سے جمنا بہتی رہے اور لوگ ایک روضے سے دوسرے روضے تک آسانی سے جا سکیں اس مقصد کے لیے جمنا کے دوسرے کنارے پر بنیادیں بھی پڑ چکی تھیں۔ اس کے آثار اب بھی باقی ہیں۔ مگر اسی زمانے میں شاہ جہاں کے بیٹوں کے درمیان تاج و تخت کے لیے لڑائی چھڑ گئی اور اس میں آخر کار کامیابی اورنگ زیب کی ہوئی۔ اورنگ زیب نے باپ کو آگرہ کے قلعے میں نظر بند کر دیا۔ اور شاہ جہاں کا یہ خیال، کہ اسے ایک الگ مقبرے میں دفن کیا جائے پورا نہ ہو سکا۔ اس واقعے کے آٹھ سال بعد تک شاہ جہاں زندہ رہا اور جب ۱۶۶۶ء میں اس کا انتقال ہوا تو اورنگ زیب کی ہدایت کے مطابق اسے بھی روضہ تاج محل میں ممتاز محل کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔

کہتے ہیں جب شاہ جہاں آگرے کے قلعے میں نظر بند تھا تو اس نے ثمن برج میں ایک ایسا نگینہ لگوایا تھا جس میں تاج محل کا عکس صاف نظر آتا تھا۔ بوڑھا بادشاہ اپنی وفادار بیٹی جہاں آرا بیگم کے ساتھ اس نگینہ کے ذریعے تاج محل کو دیکھتا رہتا تھا۔ یہ نگینہ آج بھی اس مقام پر لگا ہوا ہے اگر آپ کبھی تاج محل دیکھنے جائیں تو آگرہ کے ثمن برج میں لگے ہوئے اس نگینے کو نہ بھولیے گا۔ ویسے بھی تاج محل کو چاہے آپ صبح کے دھندلکے میں دیکھیں یا پھر پورے سورج کی روشنی میں جھٹ پٹے کے وقت دیکھیں یا چاندنی رات میں یہ آپ کو ہمیشہ اور ہر حال میں دل کش نظر آئے گا اتنی بڑی عمارت ہوتے ہوئے بھی تاج محل میں وہ تناسب موجود ہے جو خوبصورتی کی جان ہے اس کو دیکھنے کے بعد انسان پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔

جولائی پرچہ عام معلومات

(۱) اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

(۲) ندی کا میٹھا پانی (۳) کوّے کے گھونسلے میں۔

(۴) عندلیب شادانی۔ (۵) اسلام آباد

(۶) ۲۲ جولائی ۱۹۶۹ء (۷) اورنگ آباد۔

(۸) رشید احمد صدیقی (۹) گز

(۱۰) (۱) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ،
(۲) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ،

★

اظہار اثر

سائنس کیا ہے؟

(سلسلے کے لیے دیکھیے فروری ۱۹۶۶ء کا شمارہ)

ایٹم کیا ہے؟

ہم پیچھے بتا چکے ہیں کہ مادّہ چھوٹے چھوٹے ذرّات سے ملکر بنا ہے جنھیں ایٹم کہا جاتا ہے۔ ایٹم کا تصوّر سب سے پہلے پانچویں صدی قبل مسیح کے ایک یونانی فلاسفر و سائنسداں دیماقرطیس کے ذہن میں آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کی ہر شے چھوٹے چھوٹے ذرّات سے ملکر بنتی ہے۔ اپنے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے دیماقرطیس نے کہا تھا کہ اگر ہم کسی بھی شے کو توڑتے چلے جائیں تو آخر میں ایک ایسا ذرّہ رہ جائے گا جو ناقابل تقسیم ہوگا۔

ایٹم دراصل یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "نہ تقسیم ہونے والا" یعنی جسے توڑا نہ جا سکے۔

یہاں تک تو دیماقرطیس کی بات درست تھی کہ دنیا کی ہر شے چھوٹے چھوٹے ذرّات یعنی ایٹموں سے مل کر بنی ہے لیکن جدید سائنسی تجربات اور معلومات کی روشنی میں اس کی یہ بات غلط ثابت ہو جاتی ہے کہ ایٹم کو توڑا نہیں جا سکتا کیونکہ آجکل جو ایٹم بم بنائے جاتے ہیں ان میں اسی ناقابل تقسیم "ذرّہ" کو توڑ کر ہی وہ توانائی حاصل کی جاتی ہے جو خوفناک تباہی کا باعث بنتی ہے۔

دیماقرطیس کا یہ بھی خیال تھا کہ ایٹم ٹھوس ہوتے ہیں اگرچہ یہ دونوں باتیں آج غلط ثابت ہو چکی ہیں پھر بھی دیماقرطیس کا یہ تصوّر اپنے زمانے سے اس قدر آگے کا تصوّر تھا کہ تقریباً دو ہزار سال بعد سولہویں صدی میں فرانس کے ایک سائنسداں پیری گاسندی نے بھی مادے کے بارے میں یہی نظریہ پیش کیا کہ مادہ بہت چھوٹے چھوٹے ذرّات سے ملکر بنا ہے۔ پیری کا بھی یہی خیال تھا کہ یہ ایٹم ٹھوس ہوتے ہیں اس نے اس نظریہ میں اپنے طور پر یہ اضافہ کیا کہ ان ایٹموں میں "ہُک" سے لگے رہتے ہیں جو ایک دوسرے کو جوڑے رکھنے کا سبب بنتے ہیں۔ بعد میں اس نے یہ بھی سوچا کہ شاید کوئی مقناطیسی قوت ان ایٹموں کو ایک دوسرے سے چپکائے رکھتی ہے۔

مشہور سائنسداں نیوٹن بھی پیری کے مقناطیسی

نظریہ سے متاثر ہوا۔ نیوٹن کا خیال بھی یہی تھا کہ مادہ میں ٹھوس اور گول ننھے ذرّات ہوتے ہیں جو کسی مقناطیسی قوت سے چپکے رہتے ہیں۔ نیوٹن کا ہی یہ بھی خیال تھا کہ روشنی بھی ننھے ننھے ذرّات سے مل کر بنتی ہے جب ہم شمع جلاتے ہیں تو روشنی کے یہ نہایت تیز رفتار ذرّات کرنوں کی صورت میں چاروں طرف بکھر جاتے ہیں۔ نیوٹن کا یہ نظریہ آج کے "کوانٹم" نظریہ سے بہت حد تک مماثلت رکھتا ہے۔ کیوں کہ روشنی واقعی "فوٹون" نام کے ذرّات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ لیکن فوٹون ایٹم نہیں ہوتا بلکہ فوٹون بیک وقت مادہ اور توانائی دونوں ہوتا ہے اور ایٹم کے مختلف جزوی ذرّات میں سے ایک ذرّہ ہوتا ہے۔

دراصل آج کا ایٹم ماضی کے ان تمام سائنسدانوں کے تصوّر سے مختلف ہے آج کا ایٹم ٹھوس اور ناقابلِ تقسیم نہیں بلکہ بذاتِ خود ایٹم کئی مختلف ذرّات کا مجموعہ ہے۔ ہم ایٹم کو تین مختلف قسم کے بنیادی ذرّات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) الیکٹرون:۔ الیکٹرون میں منفی (NEGATIVE) برقی اثر ہوتا ہے۔

(۲) پروٹون:۔ میں مثبت (POSITIVE) برقی ہوتی ہے۔

(۳) نیوٹرون:۔ نیوٹرون بالکل سادہ ہوتے ہیں۔ یعنی ان میں کسی قسم کا برقی اثر نہیں ہوتا

ایک ایٹم کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصّہ اس کا "مرکزہ" یا کھگر ہوتا ہے جسے انگریزی میں نیوکلس (NUCLEUS) کہا جاتا ہے۔ اسی لیے ایٹمی ہتھیاروں کو نیوکلر ہتھیار کہا جاتا ہے۔ ایٹم کے مرکزے میں نیوٹرون اور پروٹون ایک دوسرے سے جڑے رہتے ہیں۔

ایٹم کا دوسرا حصّہ اس کا "جسم" ہوتا ہے یہ جسم الیکٹرون کا مدار ہوتا ہے۔ مدار اس راستے کو کہتے ہیں جس پر الیکٹرون اپنے مرکزے کے گرد گھومتے ہیں۔ ہماری زمین ایک سال میں سورج کے گرد جس راستے پر پورا چکر کاٹتی ہے اس راستہ کو زمین کا مدار کہا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح الیکٹرون اپنے مرکزے کے گرد بیضوی مدار میں گھومتے رہتے ہیں۔

ایٹم اور اس کے ذرّات کو سمجھنے کے لیے کچھ اشکال دیکھیے۔

الیکٹرون منفی برق

الیکٹرون کا مدار

پروٹون مثبت برق

نیوٹرون سادہ

ہائیڈروجن عنصر کے پورے ایٹم کا ڈھانچہ

ایک الیکٹرون

ایٹم کا مرکز ایک نیوٹرون ایک پروٹون

ہیلیم عنصر کا ایٹم ۔ دو نیوٹرون دو پروٹون مرکزے میں اور دو الیکٹرون اپنے اپنے مدار پر

یورانیم عنصر کا ایٹم بانوے پروٹون ایک سو چھیالیس نیوٹرون مرکزہ میں اور بانوے الیکٹرون اپنے اپنے مداروں پر۔

ایک ایٹم کا سارا وزن اس کے مرکزے میں ہوتا ہے یعنی ایٹم کا مرکزہ اپنے پورے وجود کا ۹ر ۹۹ وزن رکھتا ہے۔ ایٹم کا زیادہ حصہ خلا ہوتا ہے کیونکہ پورے ایٹم کا حجم یا جسم اس کے گرد گھومنے والے الیکٹرونوں کے آخری مدار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہوتا ہے جب کہ اس کا مرکزہ درمیان میں بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ ایٹم کے مرکزے اور اس کے گرد گھومنے والے آخری الیکٹرون میں کتنا فاصلہ ہوتا ہے اس کا اندازہ آپ اس طرح کر سکتے ہیں کہ اگر ہم کسی طرح ایک ایٹم کے مرکزے کو ایک انچ بڑا کر دیں تو اس ایٹم کا آخری الیکٹرون تقریباً پندرہ میل کے فاصلے پر گردش کر رہا ہوگا۔

ایٹم اس قدر ننھا سا ذرہ ہوتا ہے کہ اسے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتور خوردبین سے بھی نہیں دیکھا جا سکتا البتہ سائنسداں آج کل الیکٹرانک خوردبین سے ایٹم کی تصویریں بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

ایٹم کی باریکی کا اندازہ ان چند مثالوں سے کیا جا سکتا ہے۔

چائے کے ایک چمچہ میں پچاس ہزار پدم ایٹم آ جاتے ہیں۔

پانی کے صرف ایک قطرے میں تین ہزار تین سو ارب ایٹم ہوتے ہیں۔

جب آپ ایک بار سانس لیتے ہیں تو تقریباً دو سو پچاس مہا سنکھ ایٹم آپ کے حلق سے گذر جاتے ہیں انسان کے ایک بال کا قطرہ ۲۵۰۰ ر ۰ انچ ہوتا ہے یعنی ایک انچ کا ڈھائی ہزارواں حصہ لیکن ایٹم اتنا مختصر ہوتا ہے کہ ایک بال کی موٹائی میں چھ لاکھ پچیس ہزار ایٹم آ جاتے ہیں۔ ان مثالوں سے آپ تصور کر سکتے ہیں کہ ایٹم کس قدر چھوٹا ہوتا ہے۔

ایٹم میں ان تین بنیادی ذرات کے علاوہ اور بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے جزدی ذرات ہوتے ہیں جن کو سائنسدانوں نے فرمیون، بوسون، میسون، نیوکلیون، ہائپرون، پوزیٹرون، نیوٹرینو، فوٹون وغیرہ وغیرہ نام دیے ہیں۔ ایک طرح سے یہ تمام جزدی ذرات

صغرا مہدی

حضرت علی کرم اللہ

اسلامی کیلنڈر میں ساتواں مہینہ رجب کا ہے۔ اور اس مہینے کی فضیلت یہ ہے کہ اس کی تیرہ تاریخ کو حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ پیدا ہوئے تھے۔ یہ تو آپ سبھی جانتے ہیں کہ علی، حضرت ابوطالب کے صاحبزادے اور ہمارے رسول جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے۔ حضرت ابوطالب اور ان کی بیوی فاطمہ بنت اسد دونوں نے آں حضرت کی پرورش بہت شفقت و محبت سے کی تھی اور دونوں دل و جان سے آں حضرت کو چاہتے تھے۔ اسی لیے جب ان کے یہاں حضرت علی پیدا ہوئے تو انھوں نے ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اپنے پیارے اور نیک سیرت بھتیجے محمدؐ کے سپرد کر دی۔ حضرت علی کی ذات میں جو خوبیاں تھیں۔ انھیں آں حضرتؐ کی تعلیم و تربیت نے جلا دی۔ اپ بچپن سے ہی نڈر، حق گو، رحمدل اور بہادر مشہور ہو گئے۔

جب آں حضرتؐ نے خدا کے حکم سے اپنے رسول ہونے اور دینِ حق کو پھیلانے کا دعویٰ کیا تو ان کی سچائی کا اقرار کرنے والے ان کے چچازاد بھائی اور شاگرد علی ابن ابوطالب ہی تھے جن کی عمر اس وقت صرف دس سال تھی۔ یہی نہیں جب اعلانِ رسالت کے بعد اہلِ مکہ آں حضرت کے دشمن ہو گئے اور ان کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچانے لگے تو حضرت علی برابر آں حضرت کا ساتھ دیتے رہے اور اس راہ میں جو بھی مشکل پیش آتی اس کو خندہ پیشانی سے اٹھا لیتے جس کی ایک مثال یہ ہے کہ جب آں حضرتؐ نے اپنے وطن والوں کے ظلم و ستم سے گھبرا کر خدا کے حکم کے بموجب مکہ سے مدینہ ہجرت کی تو حضرت علی کو اپنے بستر پر سلا دیا۔ جب آں حضرت کے دشمن آپؐ کو شہید کرنے کے ارادے سے آئے اور آپ کے بجائے علیؓ کو بستر پر دیکھا تو حیران رہ گئے بہت پوچھا کہ محمدؐ کہاں ہیں۔ طرح طرح کی دھمکیاں دیں۔ مگر علیؓ بے خوف ہو کر یہی کہتے رہے کیا تم نے محمدؐ کو میرے سپرد کیا تھا۔ علیؑ یہ بات نوعمری ہی میں سمجھ گئے تھے کہ موت ایک نہ ایک دن آنی ہے اور اگر وہ اسلام اور اسلام کے ہادی اور رہنما کی حمایت میں آئے تو کیا ہی اچھی بات ہے۔

علیؓ یہ سب صرف اس لیے نہیں کر رہے
تھے، کہ ان کو محمدؐ سے والہانہ عشق تھا بلکہ ان
کو یقین کامل تھا کہ محمدؐ سچے ہیں اور وہ جس دین
کی تعلیم دے رہے ہیں وہ سچا دین ہے۔

اسی لیے آںحضرتؐ علیؓ کو سب سے زیادہ
چاہتے تھے۔ ان کے بہت سے اقوال ہیں جن
کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حضرت علیؓ کو کس قدر
عزیز رکھتے تھے۔ اسی لیے آپؐ نے اپنی پیاری
اور چہیتی بیٹی حضرت فاطمہ کی شادی حضرت
علی سے کی۔

حضرت علی کی بہادری پورے عرب میں
مشہور تھی۔ آپ نے بہت سی جنگوں میں فتح
حاصل کی۔ مگر وہ سب لڑائیاں دین اسلام
کی حفاظت اور محمدؐ کی حمایت میں لڑی گئیں۔
لڑائی کے میدان میں بھی علی نے انصاف،
رحمدلی اور انسانیت کے علم کو بلند رکھا،
لڑائی کے میدان کے باہر تو آپ سرتا سر
عفو، رحم کی مثال تھے۔ کتنے ہی یتیم تھے،
جن کی سرپرستی علی کرتے تھے، کتنی بیوائیں تھیں
علی جن کے کھانے پینے کا انتظام کرتے۔ بیماروں
کی تیمارداری کرتے۔ محتاجوں کی مدد کرتے اور
خود نہایت عسرت اور تنگی کی زندگی بسر کرتے
یہاں تک کہ جب آپ خلیفہ بنائے گئے تب
بھی آپ کے طرز زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔
آپ نے اپنے دور خلافت میں اسلام کی سادہ
زندگی، مساوات، نیک کمائی کے لیے محنت
و مزدوری کی تعلیم کے نقش لوگوں کے دلوں
میں تازہ کر دیے۔ آپ نے مسلمانوں میں علم کا
شوق اور جستجو پیدا کی۔ اسلام کی روحانی اور
علمی خدمات بہت تندہی سے انجام دیں۔ مسلمانوں
میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا کیا۔ علم کی
عظمت کا سکہ لوگوں کے دلوں میں بٹھایا۔ کسی
انسان کی بڑائی کی سب سے صحیح پہچان یہ
ہے، کہ اس کے ساتھی اس کے بارے میں کیا
رائے رکھتے ہیں۔ حضرت عمر کا بہت مشہور قول
ہے۔ "اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔"

حضرت علی نے ایک خط میں اپنے سب سے
بڑے بیٹے حسن بن علی کو لکھا ہے "پیارے بیٹے
تم کبھی یہ پسند نہیں کرو گے۔ کہ کوئی تم پر ظلم
کرے، اس لیے تم کو ظلم سے بچنا چاہیے۔ تم کبھی
کسی پر ظلم نہ کرنا۔ یقیناً تم چاہتے ہو گے کہ لوگ تمھارے
ساتھ اچھی طرح پیش آئیں۔ اس لیے تمھاری یہ کوشش
ہونی چاہیے، کہ تم لوگوں کے ساتھ اچھی طرح
پیش آؤ۔ تمھارے پاس جو کچھ ہے وہ دوسروں
پر خرچ کرو گے۔"

حضرت علی کا کہنا تھا کہ "جو انسان اپنی کمزوریاں
پر نظر رکھتا ہے وہ دوسروں کی کمزوریوں کو آسانی
سے نظر انداز کر سکتا ہے۔"

آپ کہتے تھے کہ "اس طرح جیو کہ لوگ تمھاری
پناہ میں آنے کے خواہشمند ہوں اور جب مرو تو وہ تمھارے
لیے چیخ چیخ کر روئیں۔"

خود حضرت علی کی زندگی ان تعلیمات کا جیتا
جاگتا نمونہ تھی۔ بہرحال ۱۳۔ رجب کی تاریخ ہمیں
حضرت علی کی تعلیمات پر عمل کرنے کا پیام د[illegible]

مناجات

محبوب راہی

خدایا! تو ہے کارسازِ جہاں ہر ایک چیز میں تو عیاں اور نہاں
ہوا، برق، اشجار، آبِ رواں سبھی رات دن ہیں تیرے حمد خواں
یہ سورج، ستارے، قمر، کہکشاں تیرے نور سے سب ہیں جلوہ فشاں
تیرے حکم سے قافلے ہیں رواں وہاں سے یہاں اور یہاں سے وہاں
کیے تو نے تخلیق شمس و قمر بنائے ہیں تو نے زمیں آسماں
تیرے فضل کے سب ہیں امّیدوار کرم سے تیرے ہیں سبھی شادماں
جہاں جھک گیا ہوں کے سرخم ہوئے ہے وہ آستاں بس تیرا آستاں
حقیقت تو یہ ہے کہ تیرے سوا نہیں ہے کوئی دوسرا مہرباں
تیری دسترس سے پرے کچھ نہیں ہر ایک جزو و کل پر ہے تو حکمراں
اگر تو خفا ہے تو دنیا خفا جو تو مہرباں ہے جہاں مہرباں
ز فرشِ زمیں تا بہ عرشِ بریں تیری حمد میں سب ہیں رطب اللساں
جو ہر رنج و راحت سے ہے بے نیاز نہیں ہے سوا تیرے کوئی یہاں
تیری ذات ہی عالم الغیب ہے جو سب پر نہاں ہے وہ تجھ پر عیاں
زمینوں میں ہے آسمانوں میں ہے شب و روز تیرا ہی ذکر و بیاں
نہیں نیک و بد کا کوئی امتیاز تیرے فضل کا سب پہ ہے سائباں
اگر تیری لطف و عنایت رہے تو مل جائے ہم کو بھی باغِ جناں
اسے پھر بھلا مار سکتا ہے کون کہ جس زندگی کا ہے تو نگہباں

تیری بخششوں کا طلبگار ہے
خدایا تیرا راہیؔ خستہ جاں

بدرِ وفا شیدائی

کردار
جج
عدالت کے ملازمین
برہمن
چور
چند سپاہی

پہلا منظر

(عدالت کا ایک چھوٹا سا کمرہ جس میں ایک اونچی میز پر جج بیٹھا ہے۔ جج کے کمرے میں مقدمے کا فیصلہ سننے کے لیے کچھ لوگ بنچ پر بیٹھے ہیں۔ ملازمین اپنی سرکاری وردی پہنے ہوئے بہت سے کاغذات جج تک پہنچا رہے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد عدالت کا چپراسی ملزم برہمن کے حاضر ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ اس کے بعد چند سپاہی ہتھکڑی لگے ہوئے برہمن کو لے کر عدالت میں حاضر ہوتے ہیں۔ اور عدالت کی کارروائی شروع ہوتی ہے)

جج: (ملزم برہمن سے مخاطب ہوکر) برہمن! بنیے کے گھر کا قیمتی سامان چرانے کے الزام میں گاؤں والوں نے تمھیں رنگے ہاتھوں گرفتار کیا ہے۔ کیا تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟

برہمن: (ہاتھ جوڑ کر) حضور! میں بالکل بے گناہ ہوں۔ میں نے آج تک کبھی چوری جیسا ذلیل کام نہیں کیا، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میرے اوپر ہونے والے ظلم کو انصاف کی نظر سے دیکھا جائے۔

جج: عدالت میں انصاف ہی ہوتا ہے۔ یہاں بے گناہوں کو عزت کے ساتھ رہا کر دیا جاتا ہے، اور مجرموں کو سزائیں دی جاتی ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ تم کہاں تک صحیح کہہ رہے ہو اور کیا واقعی تم بے گناہ ہو۔ اچھے اپنی کہانی سناؤ!

برہمن: میری کہانی اس طرح شروع ہوتی ہے کہ میں اپنے بیمار لڑکے کو دیکھنے کلکتہ پیدل ہی گاؤں گاؤں ہوتا جا رہا تھا۔ پیدل جانے کی وجہ یہ تھی کہ میں بہت سارا روپیہ اپنے بیمار لڑکے کے علاج میں خرچ کر چکا تھا۔ اس وقت ریل کے کرایے تک کے پیسے میرے پاس نہیں تھے۔ جاتے جاتے رات ہوگئی۔

بڑی مشکلوں کے بعد اس رحم دل بنیے کے گھر میں
مجھے رات گزارنے کی اجازت مل گئی۔ رات کے
وقت میں نے ایک ایسے چور کو پکڑ لیا جو بنیے کے
گھر کا قیمتی سامان لے کر بھاگ رہا تھا۔ چور کو
جب میں نے پکڑ لیا تو اس نے کہا کہ تم مجھے چھوڑ دو
اس کے بدلے میں تمھیں چرایا ہوا آدھا مال دے
دوں گا۔ لیکن میرے ضمیر نے یہ کسی طرح گوارہ نہیں
کیا کہ میں اس محسن سے غداری کروں جس نے مجھے
رات گزارنے کے لیے اپنے گھر میں پناہ دی ہے۔
انکار کرنے پر چور نے کہا کہ تم مجھے چھوڑ دو، اس
لیے کہ میں خود یہاں کا سپاہی ہوں اور اگر تم نے
مجھے نہیں چھوڑا تو میں خود شور مچا کر لوگوں کو اکٹھا
کر لوں گا۔ اس کے بعد چوری کا الزام تم پر لگا دوں گا۔
تم مفت میں پھنس جاؤ گے۔ اور میں بچ جاؤں گا۔
میں اس پر بھی تیار نہ ہوا۔ آخر اس چور سپاہی
نے جو کہا تھا وہی کر دکھایا۔ یعنی شور مچا کر لوگوں
کو اکٹھا کیا۔ مجھ پر چوری کا الزام لگایا اور خود
صاف بچ گیا (روتے ہوئے) حضور ——!
میرا کہا ہوا ایک ایک لفظ بالکل سچ ہے اس
لیے مجھ پر انصاف کیجیے۔ وہ چور سپاہی بھی
اپنی صفائی میں کچھ کہنے کے لیے باہر کھڑا ہے،
اور اپنی باری کا انتظار کر رہا ہے۔
(برہمن چپ ہو جاتا ہے۔ لیکن عدالت میں
اب تک اس کی سسکیاں گونج رہی ہیں۔
مقدمے کا فیصلہ سننے والے باہر سے آئے
ہوئے لوگ بڑی بے چینی سے فیصلے کا انتظار
کر رہے ہیں۔ عدالت میں خاموشی چھائی ہوئی

ہر شخص کی نگاہ فاضل جج کے چہرے پر اٹھی
ہوئی ہے کہ دیکھیں کیا فیصلہ ہوتا ہے۔!)
جج: (کافی دیر سوچنے کے بعد کسی خاص نتیجے پر پہنچ کر
ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ) چپراسی ——!
چپراسی: جی حضور ——!
جج: اس سپاہی کو بھی حاضر کیا جائے۔
(چپراسی سپاہی کو لے کر حاضر ہوتا ہے جس پر
برہمن نے چوری کا الزام لگا کر اپنے کو بے گناہ
ثابت کرنا چاہا ہے)
جج: (گھڑی دیکھتے ہوئے) اب پندرہ منٹ
کی کھانے کی چھٹی ہونے والی ہے اس کے
بعد اس مقدمے کا فیصلہ ہوگا۔ پندرہ
منٹ کی اس چھٹی میں تم دونوں کو یعنی برہمن
اور سپاہی کو قریب کے ایک گاؤں سے لوٹے
میں بھرا ہوا چوری کا مال لانا ہے جسے چند
چور پکڑے جانے کے ڈر سے، چھوڑ کر بھاگ
گئے ہیں۔ ہمیں ابھی ابھی اس کی خبر ملی ہے
برہمن: اچھا حضور ! ہم دونوں اس لوٹے
کو آپ تک ابھی پہنچا دیں گے ہمیں اجازت
دیجیے۔
جج: ابھی نہیں ——! چھٹی ہونے کے پانچ منٹ
کے بعد چلے جانا جہاں وہ لوٹا رکھا ہے، وہ
جگہ ہمارا چپراسی تم دونوں کو بتا دے گا۔
(جج اٹھ کر چلا جاتا ہے اس کے بعد پردہ
گرتا ہے)

دوسرا منظر

ایک سنسان جگہ میں ایک بڑا سا لوٹا

بندھا ہوا پڑا ہے۔ برہمن اور سپاہی وہاں پر
کھڑے ہیں۔

سپاہی: (چاروں طرف دیکھ کر مطمئن ہوکر) کیوں
بے وقوف برہمن ——! تم تو مجھے جیل
بھجوانے کی فکر میں تھے نا۔

برہمن: (غصے سے کانپتے ہوئے) چپ رہ
ذلیل انسان ——!

سپاہی: (طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے)
بھئی ——! اس میں خفا ہونے کی کون سی
بات ہے۔ غلطی میری نہیں بلکہ تمھاری ہے۔
میں تم سے پہلے کہہ رہا تھا کہ جو مال میں نے
بنیے کے گھر سے چرایا ہے۔ اس میں آدھا
تم لے لو، لیکن مجھے چھوڑ دو۔ میں نے پھر
تم سے کہا کہ میں سپاہی بھی ہوں اس لیے مجھے
کوئی بھی چور نہیں سمجھے گا، بلکہ الٹا میں ہی تمھیں
چوری کے الزام میں پھنسا کر صاف بچ جاؤں گا۔
اور تم مفت میں جیل چلے جاؤ گے۔ اس پر
بھی تم نے مجھے نہیں چھوڑا تبھی مجبور ہوکر میں
نے تم پر چوری کا جھوٹا الزام عائد کیا ہے۔

برہمن: تم بے حد ذلیل اور کمینے ہو۔ تم سپاہی ہو۔
تمھارا فرض ہے کہ غیر قانونی حرکتوں کو روکو۔
لیکن تم خود ہی چوری کرتے ہو۔ اس سے بڑھ کر
ذلیل کام کیا ہو سکتا ہے!

سپاہی: زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ چلو
بورا اٹھاؤ اور عدالت میں چلو۔ یہاں باتیں
کرتے کرتے کافی دیر ہو گئی ہے۔ فیصلہ
ہونے کے بعد اطمینان سے جیل میں آرام کرنا۔

(چور سپاہی زور سے قہقہہ لگاتا ہے جسے سن کر
بے چارہ برہمن تلملا جاتا ہے۔ اس کے بعد
دونوں جلدی سے بورا اٹھا کر آگے بڑھتے
ہیں۔)

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا منظر

عدالت کے کمرے میں جج، مقدمے کا فیصلہ
سننے والے اور دوسرے تمام لوگ بڑی
بے چینی کے عالم میں برہمن اور سپاہی
کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ کب بورا لے کر
آئیں اور اس دلچسپ مقدمے کا فیصلہ ہو۔
کچھ ہی منٹوں کے بعد برہمن اور سپاہی بورا
لے کر عدالت کے کمرے میں داخل ہوتے
ہیں۔ ہر ایک کی نظر ان دونوں کی طرف
اٹھی ہوئی ہے۔ پھر سب لوگ جج کی طرف
دیکھنے لگتے ہیں کہ دیکھیں آگے کیا حکم اور
کون سا فیصلہ ہوتا ہے۔

جج: چپراسی!

چپراسی: (ادب سے سر جھکاتے ہوئے) فرمائیے
جناب!

جج: اس بندھے ہوئے بورے کو کھولو۔

(چپراسی بورے پر جھک کر اسے کھولنے
لگتا ہے جسے کافی کس کر باندھا گیا تھا۔
بڑی مشکلوں کے بعد جب بورا کھلتا ہے
تو عدالت میں بیٹھے تمام لوگ حیرت زدہ رہ
جاتے ہیں۔ اس میں سے عدالت کا ایک

بوڑھا چپراسی مسکراتا ہوا باہر نکلتا ہے۔
برہمن اور سپاہی بورے سے نکلتے ہوئے
چپراسی کو بڑی حیرت سے دیکھتے ہیں۔
بورے سے نکلا ہوا عدالت کا چپراسی کٹہرے
میں کھڑا ہو جاتا ہے اور جج اسے سوالیہ
نظروں سے دیکھتا ہے جیسے وہ اس کے
کچھ کہنے کا منتظر ہو۔)

چپراسی: (جج کی طرف دیکھ کر) حضور ـــ!
آپ کے کہنے کے مطابق دوسرے ملازموں
نے مجھے بورے میں بند کر دیا اور وہاں سے
ہٹ گئے اس کے بعد برہمن اور سپاہی
وہاں آئے۔ سپاہی برہمن پر طنز کرتے ہوئے
اور اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ
چوری میں نے کی لیکن میں سپاہی ہونے
کی وجہ سے بچ گیا اگر تم مجھے نہیں پکڑتے
اور میرا چوری کیا ہوا آدھا مال لے کر چھوڑ
دیتے تو آج تم جیل میں ہرگز بند نہیں ہوتے۔
سپاہی کے یہ کہنے پر برہمن غصے سے کانپنے
لگا۔ اس نے سپاہی سے کہا کہ تم بے حد ذلیل
اور کمینے انسان ہو۔ تم سپاہی ہو تمھارا
فرض ہے کہ تم غیر قانونی حرکتوں کو روکو،
مجرموں کو سزا دو، لیکن تم خود ہی غیر قانونی
کام کرتے ہو۔ چوری کرتے ہو اس سے بڑھ کر
ذلیل کام اور کیا ہو گا!

جج: (اپنی اسکیم کی کامیابی پر مسکراتے ہوئے)
چپراسی ـــ! میں نے تمھیں بورے
میں اسی لیے بند کرایا تھا کہ وہ آزادی
سے بات چیت کر سکیں گے اور مجھے مجرم
کا پتا چل جائے گا۔ میری اسکیم
کامیاب ثابت ہوئی۔ مجرم کا پتا چل گیا!

جج: (میز پر پڑے کاغذات پر کچھ دیر لکھنے
کے بعد) چور سپاہی کو جو کہ خود قانون
کا محافظ ہے۔ لیکن غیر قانونی حرکتیں کرتا ہے
دس سال قید بامشقت کی سزا دی جاتی
ہے اور بے گناہ برہمن کو عزت کے
ساتھ بری کیا جاتا ہے۔
(دو عدد سپاہی چور سپاہی کو باہر لے جاتے
ہیں اور عدالت کی کارروائی برخاست ہو
جاتی ہے)

کسی جنگل میں توتوں کا ایک جھنڈ رہا کرتا تھا۔ صبح سویرے یہ جھنڈ روزی کی تلاش میں نکلتا۔ سب توتے جہاں کہیں جاتے ایک ساتھ جاتے، آم، امرود، بیر اور دوسرے پھل ان کی غذا تھے۔ تمام دن باغوں میں گھوم گھام کر خوب کھا کر، خوب کھیل کر، یہ شام کو اپنے بسیروں پر واپس آتے۔

ان میں دو توتے بدّو اور دتّو تھے یہ چچازاد بھائی تھے۔ دونوں میں بہت دوستانہ تھا۔ دونوں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتے، لیکن بدّو بہادر اور نڈر تھا۔ اور دتّو بہت ڈرپوک، ایک بار ان کے جنگل میں چڑی مار آیا اس نے کسی طرح ان دونوں توتوں کو پکڑ لیا اور بازار میں بیچ دیا۔

احمد میاں (جنھوں نے یہ توتے خریدے تھے) پرندوں کے بڑے شوقین تھے۔ کبوتر، لال، بلبل وغیرہ سبھی انھوں نے پال رکھے تھے۔ ان سب کو وہ بہت آرام سے رکھتے تھے۔ یہ دونوں توتے انھیں بہت ہی پسند آئے۔ زمرد جیسے ہرے ہرے پر۔ لعل جیسی لال چونچ اور گول گول آنکھیں اور گلے میں ایک خوب صورت گنڈا پڑا ہوا۔ غرض ان توتوں کی ہر چیز انھیں پسند تھی دونوں کے لیے علاحدہ علاحدہ خوب صورت پنجرے بنوائے ان میں پانی اور کھانے کے لیے دو چھوٹی چھوٹی کٹوریاں رکھوائیں۔ ورزش کا بھی انتظام رکھا۔ ایک لوہے کی سلاخ لگائی گئی جسے پنجوں میں پکڑ کر توتے خوب چکر لگا سکتے اور الٹے لٹک سکتے تھے۔ دونوں کے پنجرے قریب قریب رکھے گئے تاکہ اگر طبیعت گھبرائے تو آپس میں باتیں کریں۔ کھانا [illegible] سے اچھا دیتے ان کا ارادہ تھا کہ ان توتوں کو خوب باتیں کرنا سکھائیں گے۔ باوجود ان سب چیزوں کے توتے خوش نہ تھے ان کے اڑنے کی جگہ تو تھی ہی نہیں۔ خوش کیسے رہتے۔

دتّو نے بدّو سے کہا "بھائی اب تو یہاں سے چھٹکارا ملنے کی کوئی صورت [illegible]

تو زندگی یونہی گزارنا پڑے گی۔" بدّو بولا۔
"میں تو سر مار کر ان تیلیوں کو توڑ ڈالوں گا یا
اپنی جان دے دوں گا۔" اور واقعی نہ وہ کچھ
کھاتا تھا نہ پیتا تھا بس اپنا سر تیلیوں پر مارتا رہتا
اس امید پر کہ ایک دن دو تیلیوں میں سے ایک
ضرور ٹوٹ جائے گی۔

دلّو نے سمجھایا "دیکھو بدّو اب یہاں رہنا
ہے تو پھر آرام سے رہو۔ اس طرح سر مارنے سے
فائدہ؟ لوہے کی تیلی تو ٹوٹنے سے رہی تم اپنی
جان سے جاؤ گے۔" بدّو نے تیزی سے کہا "یہاں
پنجرے میں پڑے پڑے مرنے سے تو یہی بہتر ہے
کہ سر پھوڑ کر مر جائیں، اور سچ پوچھو تو ہماری زندگی
تو اسی وقت ختم ہو چکی تھی، جب ہمیں چڑی مار نے
پکڑا تھا۔ جنگل میں ہم آزاد تھے۔ آزادی ہی ہماری
زندگی تھی۔ اس پنجرے میں مرنا جینا سب برابر ہے۔"
اس نے زور سے ٹکر مارتے ہوئے کہا۔ "سب
برابر ہے۔"

دلّو بولا "دیکھو بھائی بدّو میں پھر سمجھاتا
ہوں، کسی کا کچھ نہ بگڑے گا تم اپنی جان سے
جاؤ گے۔" یہ کہہ کر اس نے آنکھیں دوسری طرف
پھیر لیں اور بولا "میاں مٹھو حق اللہ، پاک ذات
اللہ۔ نبی جی بھیجو۔" دلّو نے یہ باتیں سیکھ لی تھیں
ان کے سیکھنے سے کھانا مانگنے میں بڑی
آسانی ہو گئی تھی۔ طوطے کی آواز سن کر احمد میاں
دوڑتے آئے اور آم کی قاش جو خود کھا رہے
تھے دلّو کے پنجرے میں ڈال دی۔ اُسے وہ
بڑے شوق سے کھانے لگا۔ احمد میاں نے بدّو کو
جو دیکھا تو اس کے سر میں کچھ چوٹ معلوم ہوئی تھی
آم کی قاش جو صبح کو انھوں نے اس کے پنجرے
میں ڈالی تھی۔ ویسی کی ویسی ہی رکھی تھی۔ احمد
میاں کو بدّو کا یہ دیوانہ پن بہت ناپسند تھا۔ وہ
اسے گھورتے ہوئے چلے گئے۔

کچھ دن بعد بدّو اسی طرح سر پٹک پٹک
کر مر گیا۔ اس نے آزادی کے پیچھے جان دے
دی۔ دلّو اپنے منہ میاں مٹھو بنتا۔ احمد میاں
کی خوشامد کرتا اور احمد میاں اسے طرح طرح کی
کھانے کی چیزیں دیتے وہ خوب موٹا ہو گیا۔

ان دونوں طوطوں میں سے تم کسے بہتر
سمجھتے ہو؟

بقیہ بچوں سے باتیں ص ۳ سے
لیے علاحدہ قیمت نہیں لی جائے گی۔ صحیح قیمت اگست
کے شمارے میں بتائی جا سکے گی اس لیے اس کے
غائب ہونے کے امکان زیادہ ہو سکتے ہیں جو حضرات
چاہتے ہیں کہ یہ شمارہ ان تک بہ حفاظت پہنچ جائے
وہ دو روپے کے ڈاک ٹکٹ یا منی آرڈر کے ذریعہ
اپنے پرچے محفوظ کرا لیں۔

پچھلے شمارے سے حیدرآباد کے مجید بیدار
ایک اچھی کہانی لے کر پیام تعلیم کی بزم میں شریک
ہوئے ہیں۔ ان کا خط آیا ہے کہ ان کے والد صاحب
کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہو گئے ہیں۔ انہوں
نے پیامی برادری سے درخواست کی ہے کہ ان
کے والد کی صحت یابی کے لیے دعا کریں۔
خدا اپنا فضل کرے اور مجید صاحب کے سر پر
بزرگوں کا سایہ برقرار رکھے۔ آمین۔

علم سے دنیا بھی ہے اور دین بھی

معروف انجم بارہ بنکی

ہاتھ میں اسکول کا بستہ لیے
ایک لڑکا جا رہا تھا مدرسے
کاہلی سستی شرارت سے تھا باز
راستے کے شور و غل سے بے نیاز
تھی نصیحت دھیان میں استاد کی
کاہلی کی بس اُسے تھی دھن لگی
وقت سے پہلے پہنچنے کا خیال
ہم سبق لڑکوں پہ ہنسنے کا خیال
روکتا اس کو تھا ایسے میں محال
اپنی دھن میں جا رہا تھا نونہال
راستے میں مل گیا شیطان ایک
دوست بن کر صورتِ انسان ایک
خوب مکاری سے پھسلایا اُسے
علم کے رستے سے بہکایا اُسے
خوب صورت ایک بہانا کر دیا
مر گیا ہے اِک نیتا دیش کا
اس لیے اسکول کی چھٹی ہے آج
دن ہے اپنا رات بھی اپنی ہے آج
آؤ کھیلیں مل کے اب میدان میں
خوب گھومیں کھیت میں کھلیان میں
چل دیا وہ طفل اس شیطان کے ساتھ
اپنی بدبختی کے سب ساماں کے ساتھ
اس قدر وہ کھیلنے میں محو تھا
دھیان ہی اُس کو نہ تھا اسکول کا
ہے کدھر بستہ، کتابیں ہیں کدھر
ہو گیا ہر شے سے بچّہ بے خبر
خوف کیا ماں باپ کا استاد کا
ساتھ میں انسان کے شیطان تھا
مٹ گئے تعلیم کے سب ولولے
پھر گیا بچے کا دل اسکول سے
بن گیا ہو کر بڑا وہ اک گنوار
کیونکہ تھا شیطان کاندھے پر سوار
علم سے جس طرح بے بہرہ ہوا
نہ تو دنیا کا رہا نہ دین کا
اے عزیزو! مکر سے شیطان کے
پُر ہیں اس دنیا کے سارے راستے
ہر قدم پر بچ کے چلنا چاہیے
مکر سے اس کے نکلنا چاہیے
علم کی تحصیل میں اے نونہال
کاہلی کا کچھ نہیں ہے احتمال
چاہتے ہو علم کا گر حصول
غیر کے اوپر بھروسہ ہے فضول
کھیلنے کے وقت پر کھیلو مگر
پڑھنے کے اوقات کی رکھو خبر

واقعہ بھی ہے یہ اک تلقین بھی
علم سے دنیا بھی ہے اور دین بھی

مشتاق احمد

بجلی کا کڑکا

شام کا وقت تھا۔ میں اور بدرالدین صاحب کمرے میں بیٹھے تھے۔ آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر میں گڑگڑاہٹ شروع ہوگئی۔ کوندا بھی ہونے لگا۔ بدرالدین صاحب ذرا کم زور دل کے آدمی ہیں۔ اس لگاتار گڑگڑاہٹ سے وہ کچھ پریشان ہونے لگے۔ ویسے بھی گھنگھور گھٹا کی وجہ سے اندھیرا برابر بڑھتا ہی جاتا تھا اور بادلوں کی گرج کے علاوہ ہر طرف سناٹا تھا۔ میں نے سوچا، انھیں باتوں میں لگالوں — دل بہل جائے گا۔ ان سے کہا۔

"ارے بھائی بدر صاحب آپ خوامخواہ گھبرا رہے ہیں۔ بادل کی گڑگڑاہٹ بھی کوئی ڈرنے کی چیز ہے؟ اصل میں آپ کو اس کی وجہ معلوم نہیں ہے۔ ورنہ کبھی پریشان نہ ہوتے دیکھیے میں آپ کو شروع سے سمجھاؤں۔ ہمارے سروں پر جو یہ بادل منڈلاتے رہتے ہیں ان میں سے اکثر بجلی سے بھرے ہوتے ہیں۔ بھاپ کے چھوٹے چھوٹے قطرے (جن سے بادل بنتا ہے) جب مل کر ایک بڑا قطرہ بنا لیتے ہیں تو ان کے ساتھ ساتھ بجلی کی طاقت بھی بڑھتی جاتی ہے مثلاً اگر آٹھ چھوٹے چھوٹے قطرے مل جائیں تو ان کا حجم بس دگنا ہو جائے گا مگر ان میں بجلی کی طاقت کوئی آٹھ گنی ہو گی اس طرح بادل کا ایک دل کا دل جو چھوٹے چھوٹے لاتعداد قطروں سے مل کر بنتا ہے یوں سمجھیے کہ بجلی کا ایک خزانہ ہوتا ہے جب یہ بادل ایک دوسرے بادل کے پاس سے ہو کر گزرتا ہے (جس میں ایک دوسری قسم کی بجلی بھری ہوتی ہے) تو ایک تیز لپک کے ساتھ ایک شعلہ خارج ہوتا ہے اسی کو ہم بجلی کہتے ہیں۔"

بدر صاحب کہنے لگے "آپ تو الٹا کہنے لگے۔ یہ بتائیے کہ یہ خوفناک گرج کیوں ہوتی ہے جس سے دل دہلنے لگتا ہے۔" میں نے کہا، "دیکھیے آپ نے پھر بات کاٹی آپ کی یہ عادت کبھی نہیں جائے گی۔ دیکھیے بجلی کبھی تو ایک بادل کے ٹکڑے میں سے دوسرے میں داخل ہوتی ہے۔ کبھی ایک بادل کے ٹکڑے سے نکل کر زمین میں جا سماتی ہے۔ یہ بجلی کا شعلہ اپنے راستے کی ہوا کو اتنا گرم کر دیتا ہے کہ وہ خوب پھیل جاتی ہے اس کے پھیلنے سے جو جگہ خالی ہوتی ہے۔ اس کو بھرنے کے لیے آس پاس کی ہوا بڑی تیزی سے دندناتی ہوئی

آتی ہے ہوا کے اس طرح ہجوم یا رَش (RUSH) کرنے سے یا تیز دوڑنے سے زبردست آواز پیدا ہوتی ہے اسی کو آپ کڑک کہہ لیجیے، گڑگڑاہٹ کہہ لیجیے یا گرج کہہ لیجیے:

"اس شعلے کا راستہ چھوٹا اور سیدھا ہوتا ہے تو بس دھیمی سی آواز سنائی دیتی ہے لمبا اور پیچ دار ہوتا ہے تو آواز کا ایک سلسلہ ہمارے کانوں میں پہنچتا ہے۔

"ہمارے ہندوستان میں بجلی کی گرج زیادہ سننے میں نہیں آتی پھر بھی سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ایک گھنٹے میں اوسطاً آٹھ سو بار دنیا میں کہیں نہ کہیں بجلی چمکتی رہتی ہے یوں تو طوفان میں ہر وقت بجلی گرنے کا خطرہ لگا رہتا ہے لیکن ہمیں آپ کو زیادہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ بجلی کے شعلوں کی لپک زمین تک ذرا کم ہی پہنچتی ہے اور بدھ صاحب! کبھی آپ نے اس پر بھی غور کیا کہ بجلی کی چمک ہمیں پہلے نظر آتی ہے اور گرج بعد میں سنائی دیتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بجلی کی رفتار ایک سکنڈ میں ۱۸۶۰۰۰ میل ہے اور ہوا کی کل ۱۱۰۰ فٹ فی سکنڈ۔ آپ گھڑی لے کر بیٹھیے اور بجلی کے چمکنے کے بعد سکنڈ گنتے رہیے اس سے آپ کو ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو جائے گا کہ بجلی چمکنے کے کتنے سکنڈ بعد آواز آپ کے کانوں تک پہنچتی ہے اور ہاں ایک بات اور معلوم ہوگی۔ بجلی کی چمک اور اس کی کڑک کے درمیان جو وقفہ ہے اگر وہ زیادہ ہوتا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ طوفان بھی ہم سے دور ہوتا جاتا ہے اگر کم ہوتا جاتا ہے تو پھر گویا طوفان ہماری طرف بڑھ رہا ہے بجلی کی چمک کبھی کبھی ہمیں بہت دور تک نظر آتی ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ صرف ہماری نظر کا دھوکا ہے مگر بہت سے سائنس دانوں نے مدتوں کے تجربوں کے بعد یہ بتایا ہے کہ یہ چمک سچ مچ ہی اتنی لمبی ہوتی ہے۔ جتنی ہمیں نظر آتی ہے کبھی کبھی بجلی کا شعلہ پانچ میل لمبا ہوتا ہے۔ ایک اوسط درجے کے بجلی کے شعلے میں بھی انتہائی طاقت ہوتی ہے۔ یوں سمجھیے کہ ایک ایسا شعلہ ایک ۵٫۶۰۰ وزنی ریل کو پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلا سکتا ہے

"۳۶۰۰۰ بجلی کے شعلے دنیا میں ہر گھنٹے کہیں نہ کہیں چمکتے رہتے ہیں ان کی قوت پندرہ لاکھ گھوڑوں کی قوت سے کہیں زیادہ ہے (وہ بھی اگر گھوڑے دن رات کام کرتے رہیں) طاقت اس طاقت سے زیادہ ہے جو آبشار نیاگرا سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ بجلی کا ایک میل لمبا شعلہ پیدا کرنے کے لیے ۱۰ لاکھ سے زیادہ بیٹریوں کی ضرورت ہوگی۔

بجلی کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم کی بجلی تو ایسی ہے کہ بہت تحقیقات کرنے پر بھی اس کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہ ہو سکا۔ سخت طوفان کی حالت میں جو شعلہ نظر آتا ہے اُسے کانٹے دار یا پیچ دار بجلی کہتے ہیں۔ یہ بجلی بظاہر زاویہ بار زاویہ بناتی ہوئی چلتی ہے۔ پرانے زمانے کے مصور یا آرٹسٹ اس کی شکل بالکل ایسی ہی بناتے تھے۔ مگر حقیقت میں

ایسی بجلی صرف ایک پیچ دار راستہ بناتی ہوئی چلتی ہے۔ بس جیسے کوئی دریا جس کی بہت سی شاخیں نکل رہی ہوں۔ بجلی کی ایک اور قسم ہے جسے چادر یا گرمی کی بجلی کہتے ہیں یہ بجلی بھی ایک طرح سے پیچ دار ہوتی ہے مگر یہ دور بہت دور کوئی پچاس میل تک، بارش کے طوفان میں جب چمکتی ہے تو اس کا عکس بادلوں پر پڑتا ہے۔ یہ بہت غنیمت ہے کہ سو میں کہیں ایک بجلی زمین تک پہنچ پاتی ہے۔ اس کا اثر درختوں یا بجلی کے تاروں کے ذریعہ زائل کر دیا جاتا ہے بہت سی عمارتیں بار بار بجلی کا نشانہ بن چکی ہیں۔ مگر ان پر ایک تار لگا ہوتا ہے بجلی اس تار کے ذریعہ زمین میں گھس جاتی ہے اور ان عمارتوں کو بالکل نقصان نہیں پہنچتا۔ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ بجلی ایک ہی چیز پر دوبارہ نہیں گرتی۔ مگر یہ بالکل بے بنیاد بات ہے تجربے اور مشاہدے سے معلوم ہوا ہے کہ ایک ہی چیز پر بار بار بجلی گری ہے۔"

بدر صاحب میری باتیں بہت غور سے سن رہے تھے کہنے لگے "بھائی آپ کی باتوں سے تو بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے، اچھا یہ تو بتایئے کہ آدمی اگر طوفان میں گھر جائے تو کیا کرے؟" میں نے کہا "طوفان میں درختوں کے نیچے کھڑا ہونا خطرے سے خالی نہیں۔ اکثر کسی درخت پر بجلی گری ہے اور اس کے نیچے کھڑے ہوئے لوگوں کی جانیں ضائع ہو گئی ہیں۔ مگر کھلے میدان یا کھیت میں ہونا بھی خطرناک ہے۔ خصوصاً جب دھات [illegible] ساتھ ہو مثلاً پھاوڑا یا لوہے کی بنی ہوئی ڈنڈی کی چھتری وغیرہ۔

بچاؤ کا سب سے اچھا طریقہ تو یہ ہے کہ آدمی زمین پر چت لیٹ جائے دھات کی بنی ہوئی چیزوں کو اپنے سے کم از کم تین سو فٹ دور رکھے، اس سے اچھا یہ ہے کہ کسی گھنی جھاڑی میں چھپ جائے۔ مگر یہ جھاڑی درخت سے کم سے کم سو گز کے فاصلے پر ہو۔ یہ بات آپ کو عجیب معلوم ہو گی کہ بجلی نے اب تک ریلوں کا مزاج نہیں پوچھا۔ ہاں اس کی زد میں جہاز آ چکے ہیں مگر ایسے واقعات بہت کم۔ گویا نہ ہونے کے برابر ہے۔ بجلی سے آپ کی طرح اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے مگر یہ بھی ہے کہ بچاؤ کے مناسب طریقوں کو نظر انداز بھی نہ کرنا چاہیے اگر آپ کی چارپائی پر تانبے کی رکابیاں رکھی ہیں اور آپ بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں یا میز پر چھری کانٹے رکھے ہیں تو خواہ مخواہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ایک سائنس داں کا قول ہے، کہ ان چھری کانٹوں کو بجلی نہیں کھینچ سکتی۔ اگر آپ کے نزدیک اس کا امکان ہے تو اس کا بھی امکان ہے کہ ایک مکھی اپنے پر مار کر کسی بڑے محل کو ہلا دے، ۔ مگر بعض لوگ اس وہم میں بھی مبتلا ہیں کہ جوتے کے تلے میں یا کوٹ پر ربر ہو یا سائیکل یا موٹر پر سوار ہوں تو بجلی کا خطرہ نہیں رہتا۔ ایک پروفیسر کہتے ہیں ، یہ تو ممکن ہے کہ پانی کے قطرے کے پڑنے سے آگ بجھ جائے لیکن ایسی ترکیبوں سے بچاؤ ناممکن ہے، ، اول تو بجلی کی رفتار اتنی تیز ہوتی ہے پھر اس میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ یہ معمولی چیزیں اس کے لیے رکاوٹ نہیں بن سکتیں۔

"اور سنیے بدر صاحب بجلی طرح طرح کی حرکتیں بھی کرتی ہے اب سے کوئی چالیس بیالیس سال پہلے فرانس میں عورتیں کھیت کاٹنے کی ایک مشین کے پاس کھڑی تھیں۔ ایک پر بجلی گری وہ بے چاری تو وہیں کی وہیں بھسم ہوگئی باقی دو کچھ زخمی ہوگئیں مگر ان کے کپڑے لوگ جلتے ہوتے تک غائب ہو گئے۔

پچھلی بڑی لڑائی ۱۹۱۴-۱۸ء سے پہلے ایک طوفانی رات میں ویلس (انگلستان) کے کسی مکان پر بجلی گری یہ چمنی کے راستے ہوتی ہوئی چولہے کے پاس آ پہنچی وہاں کچھ کوئلے پڑے تھے انھیں روشن کر کے غائب ہوگئی۔ چشائر (انگلستان) میں ایک مکان پر بجلی گری میز پہ ایک برش پڑا تھا اس کے ایک ایک بال کو الگ کر کے چلتی بنی۔ دیکھیں آپ نے بجلی کی ستم ظریفیاں۔ اس کی ان عجیب و غریب حرکتوں کی کوئی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ ایک طوفان میں کسی پیڑ کے نیچے چالیس بھیڑیں کھڑی تھیں درخت پر بجلی گری اور بیس بھیڑیں ہلاک ہوگئیں یہ بیس ایک ساتھ نہیں کھڑی تھیں بلکہ سارے گلے میں پھیلی ہوئی تھیں

بجلی ہمیشہ اس راستے کو اختیار کرتی ہے جہاں اسے کم سے کم مقابلہ کرنا پڑے۔ جب یہ چمکتی ہے تو ٹیڑھی ترچھی لکیر سی معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہوا میں جو سخت ذرے ہوتے ہیں وہ اس کے راستے میں حائل ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بعض خاص خاص درختوں پر بجلی نہیں گرتی۔ انجیر، شہتوت، ساگون وغیرہ لیکن ان میں سے ہر درخت پر بجلی گر چکی ہے۔ درخت جتنا اونچا ہوتا ہے اسی قدر اس پر بجلی گرنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ درختوں کے اس جھنڈ میں سب سے اونچے درخت پر ہی بجلی گرے۔

"جس درخت پر بجلی گرتی ہے وہ اکثر ایک دھماکے کی آواز کے ساتھ پھٹ جاتا ہے اس کی وجہ بھی سن لیجیے۔ درخت کے اندر کا رس اور پانی گرمی کی وجہ سے بھاپ بن جاتے ہیں۔ یہ بھاپ گیس کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اب اس کے پھیلنے کے لیے جگہ چاہیے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ درخت پھٹ پڑتا ہے۔"

بدر صاحب میری باتیں غور سے سن رہے تھے بادلوں کی گرج کا ڈر ان کے دل سے دور ہوگیا تھا۔ کہنے لگے "بھئی آج تو آپ نے بجلی کے بارے میں بہت اچھی باتیں بتائیں اب میں بجلی سے اتنا نہیں ڈروں گا۔" اب بجلی کا طوفان قریب قریب ختم ہوگیا تھا۔ باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی میں نے ایک پان کھایا پھر گھر کا دروازہ بند کیا۔ لوٹ کر آیا تو بدر صاحب خراٹے لے رہے تھے۔

مشرف عالم ذوقی آروی

محنت ہی سونا ہے

جیسے ہی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی۔ کسانوں نے اپنے بستر چھوڑ دیے۔ چڑیاں اپنے گھونسلوں سے نکل کر عالم نوخ کو جگانے کی حد درجہ کوشش کر رہی تھیں۔ مگر اِکّا دُکّا لوگ ہی اُٹھ رہے تھے۔ باقی سب سوئے ہوئے تھے۔ لیکن کسان کی بات ہی کچھ اور ہے۔

اذان کی آواز سنائی دیتے ہی وہ سمجھ جاتا ہے کہ صبح ہوگئی، اور وہ اسی وقت اپنا بستر چھوڑ دیتا ہے۔ اور اللہ کا نام لے ہاتھ میں کدال لیتا ہے اور کھیت کی طرف چل پڑتا ہے۔

وہ صرف اپنے لیے محنت نہیں کرتا ہے۔ بلکہ تمام انسانوں کے لیے محنت کرتا ہے۔ اس کے دل میں ہماری قدر ہے۔ ہمارے لیے محبت کا جذبہ ہے وہ ایک ہمدرد دل رکھتا ہے۔ اس کے دل میں حسد و رشک کے لیے جگہ نہیں ہوتی۔

میرا دل کسان کی زندگی کو دیکھ کر رشک کرنے لگتا ہے۔ میں سوچتا ہوں مجھے کسان بننا چاہیے۔ مگر میرے ذہن میں یک بارگی مزدور کا نقشہ ابھرتا ہے۔ مزدور، جو غم و اندوہ کی چادر اوڑھے دولت مندوں کی کھلکھلاہٹ کی چوٹ کھائے سماج کی دلچسپیوں سے مُنہ موڑے دنیا سے بے خبر ہانپتا کانپتا چلا جا رہا ہے۔ جس کا چہرہ گرد سے اَٹا ہوا ہے ؎

گرد چہرے پر پسینے میں جبیں ڈوبی ہوئی

میں سوچنے لگتا ہوں مزدور اور کسان بننے میں انسانی بھلائی تو ضرور ہوتی ہے، مگر کیا میں ویسی محنت کر سکتا ہوں جیسی کہ یہ لوگ کرتے ہیں؟ دل کے ایک گوشے سے آواز آتی ہے۔ "نہیں! تو کبھی اتنی محنت نہیں کر سکتا۔"

دل کی اس آواز سے میں پریشان ہو جاتا ہوں..... میں کچھ نہیں بن سکتا لعنت ہے مجھ پر۔ جب میں انسانی بھلائی نہیں کر سکتا تو پھر خدا نے مجھے پیدا ہی کیوں کیا۔

مگر میرے دل میں ایک بارگی ڈاکٹر کا نقشہ ابھرتا ہے۔ میں پھر سوچنے لگتا ہوں، ڈاکٹر بھی تو اپنی ساری زندگی انسانی بھلائی میں صرف کرتا ہے۔ تو کیا میں ڈاکٹر نہیں بن سکتا؟

"نہیں تو ڈاکٹر بھی نہیں بن سکتا کیوں کہ ڈاکٹر

بننا بہت مشکل ہے۔ ڈاکٹر بننے کے لیے بہت پڑھنا پڑتا ہے رات دن دماغ کھپانا پڑتا ہے۔ کیا تو کبھی اتنی محنت کر سکتا ہے؟" ذہن کے ایک گوشے سے آواز آئی

"اُف! ہر چیز میں محنت ہے۔ محنت کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔ گھر والے مجھے کاہل کہتے ہیں مگر میں آج سے کاہل نہیں رہوں گا۔ جب ہر چیز میں محنت چاہیے، تو پھر میں محنت کیوں نہ کروں! میں خوب پڑھوں گا تاکہ میں ڈاکٹر، کسان، اور مزدور بن سکوں اور اپنی زندگی انسانی بھلائی میں صرف کر سکوں۔"

میں اپنے کاہل پن چھوڑ کر اس خراب موسم میں بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میرے ذہن سے ایک بہت بڑا بوجھ اُتر گیا ہو۔

بقیہ سائنس کیا ہے صفحہ ۱ سے

ایٹم کے بنیادی ذرّات ہوتے ہیں۔ انھیں ایٹموں سے ملکر "سالمے" (MOLECULES) بنتے ہیں۔ سالمہ ایک یا مختلف عناصر کے ایٹموں سے ملکر بنتا ہے جیسے پانی کے سالمے میں دو ایٹم ہائیڈروجن کے ہوتے ہیں اور ایک ایٹم آکسیجن کا۔ اگر ہم پانی میں سے برقی رو گذاریں تو یہ سالمے ٹوٹ کر ہائیڈروجن اور آکسیجن گیسوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

★

مضطر داؤد نگری

ماں کی یاد میں

زندگی کے لیے ہر عیش و مسرت دے کر
ناتواں جسم کو شہراب سی طاقت دے کر
دلِ ناداں کو تمنائے شکایت دے کر
چھپ گئی ہائے کہاں دید کی حسرت دے کر

تھپکیاں دے کے کبھی مجھ کو سلایا تو نے
رات میں اُٹھ کے کبھی پانی پلایا تو نے
بارِ غم و رنج و الم ہائے اٹھایا تو نے
میری خاطر کبھی آرام نہ پایا تو نے

پیار سے آنکھوں میں جب تو نے لگایا کاجل
چھا گیا روئے گلستاں پہ جیسے سا بادل
میرے گریے نے تجھے کر دیا جب بے کل
لطف سے تو نے میرے سر پہ اڑھایا آنچل

زخم ہے ماں کی جدائی کا جگر میں ہمدم
بہتے رہتے ہیں مری آنکھوں سے آنسو ہر دم
ہے علاج اس کا نہ دنیا میں نہ کوئی مرہم
اس لیے وقت کی سہتا ہوں مصیبت پیہم

دستِ شفقت تھا کبھی ماں کا ہمارے سر پہ
گلشنِ قلب میں کھلتی تھی کلی شام و سحر
میری نظروں سے بہت دور ہیں وہ پھر بھی مگر
یادِ مادر میں تڑپتا ہوں برنگِ مضطر

محمد عرفان نجف علیمی

ایک تیز رفتار ٹرین

بچو! تم نے ریل گاڑی کو خوب اچھی طرح دیکھا ہو گا۔ اس پر سوار ہو کر گرمی کی چھٹیوں میں تفریح کرنے کے لیے اپنے دوستوں، عزیزوں اور رشتے داروں کے یہاں گئے ہوں گے۔ جب تم بالکل چھوٹے رہے ہو گے تو تم نے خود بھی ریل گاڑی بنائی ہو گی۔ اس پر سواری کی ہو گی۔ تم میں سے کوئی ڈرائیور بنا ہو گا۔ کوئی سوار۔ کسی نے ایک دوسرے سے ٹکٹ لے کر جمع کیے ہوں گے، اور کسی نے ٹکٹ بانٹے ہوں گے۔ کسی نے قلی کا کام کیا ہو گا۔ تمھیں میں سے کوئی بلا ٹکٹ سفر کرتا ہوا مسافر رہا ہو گا۔ اس کو گرفتار بھی کیا گیا ہو گا۔ غرض کہ تمھارا الگ ایک ریلوے اسٹیشن بنا ہو گا۔ اس محکمے کے الگ کام کرنے والے رہے ہوں گے۔ سارا انتظام الگ رہا ہو گا۔ لیکن یہ سب کچھ اتنی ہی دیر تک کے لیے جب تک ممی کو یہ پتا نہ چلا ہو کہ ان کا گھر ریلوے اسٹیشن بنا ہے۔ گاؤں کے بچے ریلوے کے ملازم ہیں اور گھر کا تمام سامان ریلوے کی ملکیت ہے۔ جیسے ہی ان کو معلوم ہوا ہو گا۔ انھوں نے چھاپہ مار کر ریلوے کے تمام ملازمین کو گرفتار کر لیا ہو گا۔ ریلوے کی ہر چیز پر اپنا قبضہ کر لیا ہو گا۔ اور ریلوے کے ملازمین و مسافروں کی خوب مرمت کی ہو گی اور جب تم میں سے کسی نے احتجاج کیا ہو گا تو اس کو یہ بھی دھمکی ملی ہو گی کہ اب اگر کسی نے بھی شور مچایا تو اسے اس وقت تک کے لیے نظر بند کر دیا جائے گا۔ جب تک کہ ڈیڈی دفتر سے واپس نہ آ جائیں۔

یہ تو تمھاری بنائی گئی ریل گاڑی کی باتیں تھیں۔ آج ہم تمھیں ایک ایسی ریل گاڑی کے بارے میں بتائیں گے جس کی رفتار آواز سے بھی زیادہ تیز ہو گی۔

موجودہ دور میں جاپان نے سب سے زیادہ تیز چلنے والی گاڑی ہنکاری ایکسپریس بنا ڈالی ہے جس کی رفتار ۱۰۶ کیلو میٹر فی گھنٹہ ہے۔ ہمارے عزیز ملک بھارت میں سب سے زیادہ تیز رفتار ٹرین "راجدھانی ایکسپریس" ہے۔ اس کی رفتار ۱۲۰ کیلو میٹر فی گھنٹہ ہے اب تم ہی اندازہ لگاؤ کہ ہنکاری ایکسپریس کتنی تیز چلتی ہو گی لیکن اتنی تیز رفتار ٹرین سے بھی جاپان والوں کو کوئی خوشی نہ ہوئی۔ وہ لوگ اس سے بھی زیادہ تیز چلنے والی ٹرین کی کھوج میں تھے۔ وہ اس کے لیے مستقل جدوجہد کرتے رہے۔ تجربات ہوتے رہے، بنتا اور بگڑتا رہا اور آخر کار ایک وہ دن آیا جب ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

کیونکہ جاپان کے ہی ایک پروفیسر نے ایک ایسی ٹرین ایجاد کی تھی جس کی رفتار آواز سے بھی زیادہ تیز تھی۔ اس ٹرین کی تیاری میں پندرہ سال کا وقت لگا۔ اس بیچ پروفیسر "کیوتو جواؤ جاوا" نے کئی بار تجربات کیے اور اس کا آخری تجربہ کامیاب ثابت ہوا۔ اس نے ٹرین کا نام "سپر سونک جیٹ ٹرین" رکھا۔ اس میں جیٹ انجن فٹ تھے۔ اس کی ظاہری شکل و صورت بالکل طیارے جیسی تھی۔ اس ٹرین کی لمبائی ۲۲۰،۲ کیلومیٹر تھی۔ اس میں تین راکٹ انجن بھی لگے ہوئے تھے۔ تقریباً ایک ہزار مسافروں کے بیٹھنے کا اس ٹرین میں انتظام تھا۔ اس ٹرین کی رفتار ۲،۴۳۰ کیلو میٹر فی گھنٹہ تھی۔

اب ٹرین تو بن کر تیار ہو گئی لیکن یہ فکر ہوئی کہ آخر یہ ٹرین چلے گی کس پٹری پر؟ کیونکہ ریل کی جو معمولی پٹریاں تھیں وہ اتنی تیز رفتار ٹرین کے لیے بے کار تھیں۔ مگر ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ جب جب انسان کو جن جن چیزوں کی ضرورت پڑی اس نے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ان چیزوں کی ایجاد کی۔ اس طرح جب ریل کی معمولی پٹریوں سے کام نہ چل سکا تو اس کے لیے اور ایک نئی ایجاد کی گئی۔ وہ ایجاد یہ تھی کہ تقریباً بیس بیس سٹر کی دوری پر اونچے اونچے کھمبے گاڑے گئے۔ اور کھمبوں کا اوپری سرا اندر کی طرف موڑ دیا گیا اور اس میں "بال بیرنگ" اور رولر فٹ کر دیے گئے اور انھیں رولروں کی مدد سے ریل آگے کی طرف پھسلتی چلی گئی۔ ٹرین کے بڑھتے ہی راکٹ انجن حرکت میں آ گئے اور اس طرح ٹرین آگے کی طرف بھاگتی چلی گئی۔ اس کی رفتار اتنی زیادہ تیز تھی کہ اچھے سے اچھا کیمرہ بھی اس کی فوٹو نہ لے سکا۔ ★★

سلیمان ظفر

پرچہ عام معلومات

(اس پرچے کے ذریعے آپ اپنی معلومات کا امتحان بھی لے سکتے ہیں اور اس میں اضافہ بھی کر سکتے ہیں۔ جواب کے لیے صفحہ ۱۷ دیکھیے)

---

(۱) رشید حسن خاں صاحب کے سلسلۂ مضامین "اردو ہے جس کا نام" کا یہ عنوان داغ دہلوی کے کس مشہور شعر کا ایک حصہ ہے؟

(۲) ندی کے میٹھے پانی اور سمندر کے کھارے پانی میں سے کون سا پانی جلد برف بنے گا؟

(۳) کوئل کس پرندے کے گھونسلے میں اپنے انڈے دیتی ہے؟

(۴) یہ مشہور شعر کس کا ہے ؎

جھوٹ ہے سب تاریخ ہمیشہ اپنے کو دہراتی ہے
اچھا میرا خواب جوانی تھوڑا سا دہرائے تو!

(۵) پاکستان کی راجدھانی کون سی ہے؟

(۶) کس تاریخ کو انسان نے پہلی مرتبہ چاند پر قدم رکھا؟

(۷) مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کہاں دفن ہیں؟

(۸) اردو کی مشہور کتاب "آشفتہ بیانی میری" کس کی لکھی ہوئی ہے؟

(۹) کرکٹ کے کھیل میں دو وکٹوں کے درمیان کتنا فاصلہ ہوتا ہے؟

(۱۰) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دو اور اصحابہ دفن ہیں۔ ان کے نام بتاؤ۔

ظریف اللہ خاں

بھوک

کسی جنگل کے ایک گھنے حصے میں ایک شیرنی اور ایک گائے رہتی تھی دونوں میں بڑی گہری دوستی تھی ——— اتنی گہری کہ جس کی مثال مشکل سے ملے۔ لیکن زیادہ گہری دوستی کبھی بڑی جلدی دشمنی میں بدل جاتی ہے اور اس طرح ایک دوست دوسرے دوست کا جانی دشمن بن جاتا ہے۔

شام کو جب گائے اور شیرنی جنگل سے اپنا پیٹ بھر بھرا کر واپس آتیں تو گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کیا کرتیں اور پھر ایک ساتھ آرام کرتیں۔ کچھ عرصے بعد دونوں کے یہاں ننھے ننھے بچوں نے جنم لیا شیرنی نے اپنے بچے کا نام "شامو" رکھا اور گائے نے اپنے بچے کا نام "رامو"۔ بچپن ہی سے رامو اور شامو بڑے ہی جگری دوست بن گئے اور دونوں میں بڑی گہری دوستی ہوگئی۔ دونوں ایک ساتھ دن بھر کھیلتے، کودتے، پھاندتے اور صرف دودھ پینے کے لیے اپنی اپنی ماؤں کے پاس جاتے۔ جب شیرنی اور گائے اپنی اپنی خوراک کی تلاش میں نکل جاتیں تو رامو اور شامو بھی ایک ساتھ جنگل میں کچھ دور تک سیر کو نکل جاتے۔ دونوں ایک دوسرے سے پل بھر کے لیے بھی جدا نہ ہوتے۔

کچھ عرصے کے بعد جب دونوں بڑے ہوئے تو یہ بھی اپنی اپنی خوراک خود تلاش کرنے لگے۔ خوراک کی تلاش میں دونوں جنگل کے ایک گھنے حصے میں دور تک چلے جاتے اور اپنی اپنی خوراک تلاش کر کے کھا لیتے اور شام کو پھر اپنی اپنی ماؤں کے پاس آرام کے لیے آجاتے۔ بہت دنوں تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ رامو اور شامو کی دوستی گہری ہوتی گئی۔

ایک دن جب شیرنی اور گائے اپنی اپنی خوراک کی تلاش میں گئیں تو گائے نے اپنا پیٹ جنگل کی ہری ہری سبزیوں اور پتیوں سے بھر لیا اور بے فکر ہو کر جگالی کرنے لگی۔ لیکن شیرنی کو اس دن کہیں بھی پیٹ بھرنے کے لیے شکار نہ ملا۔ شیرنی نے ہر طرف دور دور تک نظر دوڑائی مگر اسے کوئی بھی جانور نہ دکھائی دیا۔ بھوک کی وجہ سے اس کی حالت خراب ہونے لگی۔ جب اسے شکار ملنے کی کوئی امید باقی نہ رہی تو اس کی

نیت بدل گئی۔ اس نے گائے پر حملہ کر دیا اور اپنی پیٹ کی آگ بجھانے کے بعد گھر کی طرف چل دی۔

شام کو جب رامو اور شامو گھر لوٹے تو رامو کو اپنی ماں دکھائی نہ دی۔ اس نے شیرنی سے پوچھا میری ماں کہاں رہ گئی ہے کیا وہ کہیں رک گئی ہے؟ رامو کے سوال پر شیرنی نے جھوٹ بولا اور کہا کہ "مجھے کیا معلوم وہ ابھی آتی ہی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہیں رک گئی ہو۔"

ہر کسی کو اپنی ماں سے پیار ہوتا ہے۔ رامو بڑی بے صبری سے اپنی ماں کا انتظار کرنے لگا۔ انتظار کرتے کرتے آدھی رات ہوگئی اور جب رامو کو اپنی ماں کے آنے کی کوئی امید باقی نہ رہی تو وہ اپنی ماں کی تلاش میں نکل پڑا۔ شامو سے یہ نہ دیکھا گیا کہ اس کا دوست اکیلا ہی جنگل میں جائے۔

اس نے رامو سے کہا کہ "میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں"، لیکن رامو نے اسے منع کر دیا اور اپنی ماں کی حفاظت کے لیے وہیں رہنے کو کہا۔ شامو مان تو گیا لیکن وہ بہت ہی بے چین ہو رہا تھا۔

رامو رات گئے تک ماں کو جنگل میں ڈھونڈتا رہا اور ادھر رامو اس کا بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔ جب بہت رات گزر گئی اور رامو نہ آیا تو شامو نے اپنی ماں سے پوچھا کہ "ماں سچ سچ بتاؤ رامو کی ماں کہاں رہ گئی؟" شیرنی کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا کہ رامو تو ماں کی تلاش میں گیا ہے۔ پھر کیوں نہ میں اپنے

بیٹے کو سچ سچ بتا دوں۔ چناں چہ اصل بات اس نے شامو کو بتا دی۔ شامو کو یہ بات بری لگی اور اسے بہت غصہ آیا۔ غصے میں اس نے اپنی ماں کو زخمی کر ڈالا۔ بعد میں جب رامو گھر لوٹا تو اس نے دیکھا کہ شامو کی ماں زخمی حالت میں پڑی ہے۔

اس نے شامو سے پوچھا کہ "دوست تم نے یہ سب کیوں کیا۔؟"

شامو نے کہا "اس نے جیسا کیا تھا اس کو اس کا ویسا ہی پھل مل گیا۔ یعنی اس نے تمھاری ماں کا خون کیا اور میں نے اسے......" رامو کے دل کو کچھ تسلی ہوئی اور وہ اپنے دوست کی وفاداری پر بے حد خوش ہوا۔ لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ آگے اس کا کیا حشر ہوگا۔ اس واقعے کے بعد دونوں دوست پھر ایک ساتھ مل کر رہنے لگے مگر پھر کچھ دن بعد رامو کا بھی وہی حشر ہوا جو اس کی ماں کا ہوا تھا یعنی بھوک کی وجہ سے تنگ آ کر شامو نے اپنی پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے رامو کو مار ڈالا۔

ہمیں اس کہانی سے یہ سبق ملتا ہے کہ دوستی کے لیے عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوستی دوسروں پر بھروسہ کرنے کو کہتی ہے۔ اور بھروسہ کسی ایسے پر نہیں کیا جا سکتا جس کی فطرت ہی نقصان پہنچانا ہو۔

★ سچی لگن اور محنت ہی آپ کی ترقی کا راز معلوم کر لیتی ہے۔

سید ماجد علی

بانس دُنیا میں کئی ملکوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔ چین، جاپان، برما، انڈونیشیا، بھارت، جزائر مڈغاسکر، غرب الہند، جنوبی امریکہ اور بنگلہ دیش وغیرہ میں بانس بکثرت پایا جاتا ہے۔ بانس بہت کام کی چیز ہے اور اس سے لکڑیاں، ٹٹیاں، چٹائیاں اور کاغذ وغیرہ لاتعداد چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ آئیے آج ہم آپ کو بانس کے بارے میں مزید دلچسپ اور عجیب و غریب باتیں بتائیں۔

بہت پرانے زمانے میں چین میں (جبکہ وہاں شہنشاہیت کا دور تھا) نہایت سنگین جرم کرنے والوں کو پھانسی یا دوسری سزاؤں کے بدلے میں "بانس کے پودے" سے سزا دے کر ختم کر دیا جاتا تھا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ "بانس کا پودا" کس طرح ایک انسان کو ختم کر سکتا ہے۔ مگر اس میں حیرت و تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ بانس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ننھا سا پودا ایک ہی رات میں کئی انچ تک بڑھ جاتا ہے۔ چین میں جب کسی مجرم کو موت کی سزا دی جاتی تھی تو اسے بانس کے ایسے ننھے سے پودے کے اوپر اوندھا لٹا دیا جاتا تھا جس نے ابھی زمین سے اپنا سر باہر نکالا ہو۔ بانس کی وہ ننھی سی سوئی نما کونپل اس کی ناف میں چبھنے لگتی اور زمین میں چاروں طرف موٹی موٹی لوہے کی کیلیں گاڑ کر اس کے جسم کو ان سے اس طرح باندھ دیا جاتا کہ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی حرکت نہ کر سکے۔ اس طرح تمام رات وہاں بندھے رہنے سے بانس کا پودا بڑھتا رہتا اور اس کے پیٹ میں گھستا رہتا اور دن نکلتے نکلتے بانس کی تیز نوک پیٹ کو چیرتی ہوئی دوسری طرف نکل آتی اور مجرم کیفر کردار کو پہنچ جاتا۔

سزا دینے کا یہ ایک ایسا طریقہ تھا جس کا نام سنتے ہی مجرموں کے ہوش اڑ جایا کرتے تھے۔ اور وہ اس کے بدلے پھانسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈالنا زیادہ پسند کرتے تھے۔

زمانہ قدیم میں جب کے لوگ وحشیوں کی طرح رہتے تھے اور لوہے کی کسی بھی چیز کی ایجاد نہیں ہوئی تھی بانس کو جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے تھے اس زمانے کے جنگجو لوگ بانس کے سرے کو نوک دار بنا لیتے۔ اور اس طرح یہ بانس ایک تیز نیزے کی طرح بن جاتا تھا

آج کے جدید دور میں بھی بانس ایک اہم اور کارآمد نباتات ہے۔ اس سے سینکڑوں چیزیں تیار کی جاتی ہیں۔ جو انسانی زندگی کے لیے بے حد کارآمد ہیں۔ مثلاً بانس سے سیڑھیاں، بلیاں، چٹائیاں، بانسریاں، چارپائیاں، میزیں، چپّل، کرسیاں، حقہ، گلدان، ٹوپیاں، ایش ٹرے، چھڑیاں، لاٹھیاں، مکانات اور ان کی چھتیں، ٹٹیاں، ٹوکریاں اور کاغذ وغیرہ بہت سی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔

چینی کسان بانس سے بنی ہوئی ٹوپیاں پہن کر تیز بارش میں بھی کھیتوں میں کام کر لیتے ہیں۔ برما کے لوگ بانس کی رنگ برنگی چھڑیوں سے بنی ہوئی چھتریاں استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ چین اور جاپان کے لوگ فیشن کے طور پر بانس کے خوبصورت رنگین پنکھے ہاتھ میں پکڑتے ہیں

اسی لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دورِ جدید میں بانس عام نباتات میں سب سے زیادہ کارآمد نباتات ہے؟

Regd. No D(S)-097

JULY 1977

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025

... مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ... دریا گنج دہلی 110002

پیامِ تعلیم

ماہنامہ

پیام تعلیم

نئی دلی ۲۵

جلد ۱۴ شمارہ ۸

اڈیٹر

ولی شاہجہانپوری

معاون

صفیہ حسان

اگست ۱۹۷۷ء

قیمت فی پرچہ :- ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ :- سات روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے بال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دلی ۲۵ سے شائع کیا

فہرست

پیامِ تعلیم
محبوب راہی

اسکول جانے کا زمانہ

منزلِ مقصود پانے کے زمانے آگئے
دوستو اسکول جانے کے زمانے آگئے

ہو گئیں لو ختم یارو چلچلاتی گرمیاں — ہم نے، تم نے، خوب جی بھر کر منائیں چھٹیاں
رات دن احباب میں کرتے رہے خوش گپیاں — اب بغل میں داب کر اپنی کتابیں، کاپیاں
پھر وہی پڑھنے پڑھانے کے زمانے آگئے — دوستو اسکول......

بعد مدت کے ملیں گے یار پھر بچھڑے ہوئے — کچھ پرانے دوست ہوں گے اور کچھ ساتھی نئے
دیر تک بیتی ہوئی باتوں کے ہوں گے تذکرے — اور پھر ہر بات میں وہ قہقہوں پر قہقہے
ہر گھڑی ہنسنے ہنسانے کے زمانے آگئے — دوستو اسکول......

کھیلنے کے پھر وہی میدان ہوں گے اور ہم — ولولوں کے پھر وہی طوفان ہوں گے اور ہم
زندگی کے پھر وہی سامان ہوں گے اور ہم — پھر دلوں میں نت نئے ارمان ہوں گے اور ہم
پھر وہی دھومیں مچانے کے زمانے آگئے — دوستو اسکول......

تھی پڑھائی پر توجہ جن کی کم پچھلے برس — سہہ چکے ہیں جو کہ ناکامی کا غم پچھلے برس
کر چکے ہیں اپنے اوپر جو ستم پچھلے برس — بارہا سمجھا چکے تھے جن کو ہم پچھلے برس
اب انھیں کچھ کر دکھانے کے زمانے آگئے — دوستو اسکول......

دوستو یہ وقت ہی کچھ کر گزر جانے کا ہے — آگ میں تعلیم کی تپ کر نکھر جانے کا ہے
زیورِ علم و لیاقت سے سنور جانے کا ہے — یہ زمانہ تو زمیں سے چاند پر جانے کا ہے
راستہ اپنا بنانے کے زمانے آگئے — دوستو اسکول......

پھر وہی جغرافیہ، تاریخ، انگلش اور ہم — پھر وہی تختی کتابیں پھر وہی کاغذ قلم
پھر یہ سائنس کے ہوں گے وہی پھر دم بدم — پھر ریاضی اور الجبرا کے ہوں گے پیچ و خم
ذہن پھر اپنا کھپانے کے زمانے آگئے — دوستو اسکول......

کامیابی کی ڈگر پر اب تو چلنا ہے ہمیں — گرنے والوں سے سبق پا کر سنبھلنا ہے ہمیں
علم اور تہذیب کے سانچوں میں ڈھلنا ہے ہمیں — اب تو غفلت کے گھروندوں سے نکلنا ہے ہمیں
جاگنے کے اور جگانے کے زمانے آگئے
دوستو اسکول جانے کے زمانے آگئے

بچوں سے باتیں

لیجیے چھٹیاں ختم ہوگئیں۔ اسکول کھل گئے اور دو مہینے آرام کے بعد ایک مرتبہ پھر کتابوں اور کاپیوں سے دوستی گانٹھنے کا موقع مل گیا۔

آپ میں سے بہت سے نئے اور اونچے درجوں میں پہنچ گئے ہوں گے۔ نئے نئے مضامین سے سابقہ پڑے گا۔ اور ہمیں یقین ہے کہ اگلی منزل کی طرف آپ کے قدم اسی احتیاط اور تیزی کے ساتھ اٹھیں گے جس طرح اب تک اٹھتے آئے ہیں۔

اگست کا یہ مہینا، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، ہماری آزادی کا مہینا ہے۔ اب سے تیس سال قبل ۱۹۴۷ء میں اسی مہینے کی پندرہ تاریخ کو ہم نے غیر ملکی حکومت کو ملک بدر کرکے لال قلعہ پر آزاد ہندستان کا قومی جھنڈا لہرایا تھا۔ اس دن سے آج تک یہ رسم بڑی شان و شوکت کے ساتھ منائی جاتی ہے اور ملک کا وزیر اعظم قومی جھنڈا لہرانے کے بعد لال قلعہ سے قوم کے نام اپنا پیغام نشر کرتا ہے۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں لوگ اس رسم کو دیکھنے اور تقریر کو سننے کے لیے لال قلعہ کے سامنے میدان میں جمع ہوتے ہیں۔

مقامی طور پر ہر جگہ یہ تقریب منائی جاتی ہے سرکاری دفتروں کے علاوہ آپ کے اسکولوں میں بھی جھنڈا لہرانے کی رسم ادا کی جائے گی۔

آپ کے اساتذہ آپ کو اس دن کی اہمیت بتائیں گے اور آپ کو آپ کے فرائض یاد دلائیں گے۔ جن میں سب سے بڑا فرض یہی ہوگا کہ آپ جی لگا کر پڑھیں اور اپنے ملک اور قوم کے لیے اچھے شہری بنیں۔

اعلان کے مطابق ہمارا اگلا شمارہ محمد شفیع الدین نیّر نمبر ہوگا۔ اس بے مثل شمارے کی ضخامت اور قیمت زیادہ ہوگی۔ مگر مستقل خریداران پیام تعلیم سے اس کی علاحدہ کوئی قیمت نہیں ہوگی۔ جو لوگ اگست اور ستمبر کے مہینے میں خریداری قبول کریں گے، انھیں بھی یہ خاص نمبر بلا کسی قیمت کے دیا جائے گا۔

ہاں، ہمارا تجربہ ہے کہ ایسے خاص نمبر عام طور پر راستے میں غائب ہو جایا کرتے ہیں اس لیے ہمارا مشورہ ہے کہ آپ سے رجسٹری کے ذریعے منگائیں۔ اس کے لیے پرانے خریداروں کو دو روپے اور نئے خریداروں کو سات کی بجائے نو روپے کا منی آرڈر جلد بھیجنے ہوں گے۔

جن خریداروں کے چندے ختم ہوگئے ہیں انھیں بھی ہمارا مشورہ ہے کہ اگست کے مہینے میں سات یا نو روپے بھیج دیں۔ اگر تجدید چندہ نہ ہوئی یا اس سلسلے میں ہمیں کوئی واضح اطلاع نہ ملی تو ہم مجبور ہوں گے کہ نیّر نمبر وی۔ پی۔ بھیجیں۔

محمد امین

ابوالہول کا خواب

(شمالی افریقہ اور مصر کی سرزمین سے)

ایک نوجوان شکاری جو اعلیٰ اور شریف گھرانے کا تھا ایک دن صحرائے اعظم کی ریت پر گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ یہ ہزاروں سال پہلے کی بات ہے لیکن اس وقت بھی مصر کے بادشاہ شیوپ کا مقبرہ، جسے عظیم اہرام کہتے ہیں، کافی پرانا ہو چکا تھا۔

کسی کو یاد بھی نہ تھا کہ چٹان کی بنی دیو نما شکل 'ابوالہول'، کتنے دنوں سے شاہی مقبرے کی دیکھ بھال کے لیے ریت میں ایک طرف اَڈی پڑی تھی۔ طوفان کے تھپیڑوں نے اس پر ریت ہی ریت پاٹ دی تھی یہاں تک کہ شکل قریب قریب ڈھک گئی تھی، صرف اس کے شیر جیسے جسم کی پیٹھ اور اس کا انسان نما بھاری سر اور چہرہ ابھی دکھائی دیتا تھا جو کہ ریت کی تہوں سے باہر نکلا ہوا تھا۔

نوجوان شکاری، جس نے ابوالہول کا عجیب و غریب خواب دیکھا تھا، اس کا نام تھا تھُمس تھا۔ یہ نام مصر کے ایک قدیم دیوتا کے نام سے ملتا تھا۔ اس قدیم دیوتا کا نام، یعنی اصلی نام 'تھا تھُم' تھا اور یہ چاند کا دیوتا تھا۔ تھا تھمس کا حُسن بھی چاند کے حسن سے ملتا تھا۔ 'تھا تھم' جادو کی کتابوں کا بھی خدا سمجھا جاتا تھا۔ اسی کی طرح تھا تھمس بھی اپنی عقل اور فراست کا کوئی جواب نہیں رکھتا تھا۔

اس زمانے میں مصر میں سبھی لوگ تھا تھمس کے مدّاح تھے۔ اس کی قدر کرتے اور اسے ماننے بھی بہت تھے بڑے گھرانوں میں یہ مشہور تھا کہ ملک کا اگلا بادشاہ وہی ہوگا۔ بوڑھا بادشاہ 'امن ہاتپ'، ابھی صحت مند تھا لیکن اپنا وارث مقرر کرنے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی۔ تھا تھمس بھی چاہتا تھا کہ اگلا بادشاہ اسی کو چنا جائے۔ اگرچہ جوانوں کی کمی نہیں تھی اور بہادری میں بھی وہ ایک سے بڑھ کر ایک تھے اور بادشاہ بننے کا ارمان ان میں سے کئی ایک کو تھا۔

لیکن تھا تھمس کی بہادری کی کچھ اور ہی بات تھی۔ جنگ و جدل میں کوئی اس سے جیت نہیں سکتا تھا جب وہ شکار کھیلنے نکلتا تو ہوشیار سے ہوشیار غزال (ہرن) بھی اس کے تیز گھوڑے سے بچ کر آگے نہیں نکل سکتا تھا۔ ریگستان میں شکار کھیلنا اس کا محبوب مشغلہ تھا اور کمال کی بات یہ کہ شکار کھیلنے بھی وہ اکثر تنہا ہی جاتا، یہاں تک کہ کسی غلام کو بھی ساتھ نہ لیتا۔

ایسے ہی تنہا شکار کھیلنے کے دوران تھا تھمس نے ابوالہول کا عجیب وغریب خواب دیکھا تھا۔ ایک دن دھوپ تیز تھی۔ سورج کی تیز کرنوں سے ریگستان تپ رہا تھا۔ یہاں تک کہ یہ جواں مرد شکاری بھی تپش اور آنچ سے پریشان ہو اٹھا۔

اپنے گھوڑے کو بھگاتا ہوا جب تھا تھمس عظیم اہرام کے قریب پہنچا تو وہاں بھی اسے کسی درخت کا سایہ نہیں ملا۔ گرمی سے اس کا سر چکرا رہا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے اسے سکون مل جائے۔ لیکن درخت کہیں دور دور تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سورج کی تمازت سے جب ریت بھن رہی ہو اور فضا میں اس قدر خشکی ہو تو بھلا درخت تو درخت کوئی معمولی سا پودا بھی کیسے اُگ سکتا تھا۔

اتنے میں یک بیک نوجوان سوار نے دیکھا کہ عظیم پتھر کے بنے ابوالہول کا سایہ ایک طرف زمین پر پڑ رہا ہے۔

"یہاں ہم تھوڑی دیر آرام کر سکتے ہیں"، نوجوان نے زور سے آواز نکال کر کہا تاکہ اس کا گھوڑا بھی سمجھ جائے۔ قریب پہنچ کر اس نے گھوڑے کو لگام دی اور روکا۔ اور پھر اس نے ابوالہول کے سایے میں اپنی سفید چادر پھیلا دی۔ جیسے ہی وہ لیٹا تو چٹان کی بنی دیوپیکر شکل کے متعلق بہت سی باتیں اور قصے کہانیاں اسے یاد آنے لگیں۔ اُسے خیال آیا کہ جب وہ بچہ تھا اور پہلی بار ابوالہول کی کہانی کسی نے سنائی تھی تو وہ اسے بہت اچھی لگی تھی۔ وہ کہانی یونان کی تھی .... یونان ایسا ملک تھا جو بحر روم سے آگے دوسری طرف کہیں دور واقع تھا۔

قدیم زمانے میں جب کہ یونان کے دیوتا زمین پر چلتے پھرتے تھے تو ان دنوں ابوالہول دراصل ایک دیو یا بھاری بھرکم جانور تھا۔ لوگ اس سے بہت خائف رہتے تھے۔ کہیں اس کا ذکر آتا تو ڈر کر بہت چپکے سے اس کا نام لیتے تھے۔

یونانیوں کا کہنا تھا کہ ابوالہول کا جسم شیر کے مانند تھا۔ پنجے بھی شیر جیسے تھے اور اس کی دم بھی۔ اس کے پر چڑیا کے پر سے ملتے جلتے تھے، سر عورت کے سر جیسا تھا۔ اس دیوہیکل جانور کا کام یہ تھا کہ تھیبس شہر کی حفاظت کرے۔ ایک اونچی سی پہاڑی سے وہ سب پر نگاہ رکھتا۔ ادھر آنے والوں کو وہ اکثر روک دیتا اور چیخ چیخ کر ان سے سوال کرتا:

"اس پہیلی کو بوجھو ورنہ شہر میں تم داخل نہیں ہو سکتے۔"

اسی قسم کی ایک کہانی تھا تھمس کو یاد آئی۔

"وہ کون سا جانور ہے جو صبح کو اپنے چار پنجوں پر چلتا ہے؟ دوپہر کو دو پنجوں پر؟ اور رات میں تین پنجوں (پیروں) پر؟"

تھا تھمس کانپ اٹھا جب اسے یہ خیال آیا کہ جتنے مسافر صحیح جواب نہیں دے پاتے ہوں گے ان میں سے بہتوں کو اس جانور نے مار دیا ہوگا لیکن واقعی یہ بھی کمال ہے کہ اوئی ڈی پس کتنا بہادر تھا۔ یہ وہی ہیرو تھا جو ننگی تلوار ہاتھ میں لے کر نکلا تھا اور اس نے یہ پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اپنے وطن کی سرزمین کو ابوالہول سے پاک کرے گا۔ تھا تھمس کو یاد آیا

اُسکی جب کہ وہ لڑکا ہی تھا اور راوئی ڈی پس کا نام سنتا تھا تو اُسے کتنی خوشی ہوتی تھی اور وہ باربار تالیاں بجاتا تھا۔

او ئی ڈی پس، نے چیخ کر جواب دیا تھا کہ "اے ابوالہول! اس جانور کو انسان کہتے ہیں۔ اپنی زندگی کی صبح میں جب کہ وہ بچہ ہوتا ہے تو وہ اپنے چاروں پنجوں پر رینگتا ہوا چلتا ہے۔ جب دوپہر ہوتی ہے یعنی وہ بڑا ہوتا ہے تو اپنے دونوں پیر پر چلتا ہے۔ شام کے وقت یعنی بڑھاپے میں سہارے کے لیے اس کا ڈنڈا اس کے تیسرے پیر کا کام دیتا ہے۔"

یہ جواب سن کر ابوالہول چکرا گیا اور حیران ہوا کہ اب کیا کرے۔ بہادر راوئی ڈی پس کی چمکیلی تلوار سے وہ اتنا ڈرا کہ جان بچانے کے لیے پہاڑی سے اتر کر تیزی سے بھاگا۔ جلدی میں وہ چٹانوں سے ٹکرا گیا اور وہیں اسی وقت مر گیا۔ اس طرح تھیبس شہر کو اس سے نجات ملی۔

لیکن اس کا اتنا رعب تھا کہ مرنے کے بعد بھی بحر روم کے چاروں طرف کے ملکوں کے لوگ اس کی کہانیاں سناتے تھے۔ سبھی لوگ یہ کہتے تھے کہ اس سے خوفناک سنتری آج تک نہیں ہوا۔ بہت سے لوگ تو اس کی پرستش کرتے تھے اور اپنی حفاظت کے لیے اس کو یاد کرتے تھے۔ پتھر سے ابوالہول کی شکل بناتے تھے۔ اسی کی دیکھا دیکھی مصر اور یونان کے قدیم مقبروں کے نزدیک ابوالہول کا ایک بت بنایا جاتا تھا تاکہ کوئی بلا، مقبرے کے قریب نہ آئے اور چور ڈاکو بھی دور ہی دور رہیں۔ اس طرح مقبرے کے اندر جو خزانے ہوتے ان کی حفاظت ہوتی اور دوسری دنیا میں پہنچ کر خزانے کے مالک کو اطمینان رہتا اور اس کی روح کو سکون ملتا۔

اب ابوالہول کا سخت چہرہ دیکھ کر تھاتمس کو یہ سب قصے یاد آئے۔

"عظیم ابوالہول" اس نے چیخ کر کہا۔ "مجھے بھی تم اپنی حفظ و امان میں لے لو اور میری قسمت کے محافظ بن جاؤ جیسے کہ شیوپ کے عظیم اہرام کے تم محافظ ہو۔ میرے اوپر بھی تم مہربان ہو جاؤ۔ بادشاہ امین ہوتپ کے دماغ میں تم میرا نام ڈال دو تاکہ وہ مجھے اپنا جانشین بنالے اور اس کے انتقال کرنے کے بعد میں ہی مصر کا فرمانروا بن جاؤں"

لیکن پتھر کے بنے بت کے منہ سے کوئی آواز نہیں آئی۔

اتنے میں جوان شہزادے کو یاد آیا کہ وہ زمانہ گیا جب کہ ابوالہول انسانوں سے باتیں کرتا تھا۔ اسی وقت وہ ریت پر لیٹ گیا اور فوراً ہی اسے نیند آگئی۔

تھاتمس پھر کیسے جاگا؟ کیا وہ واقعی اندر بیٹھا تھا؟ دماغ پر زور ڈالنے سے اسے یاد آیا کہ اس نے شاید کوئی خواب دیکھا تھا کہ پتھر کے بنے دیو کا چہرہ اس کی طرف مڑ گیا ہے اور اس کے منہ سے آواز آرہی ہے:

"مصر کے شہزادے تھاتمس! مجھے بتاؤ کون اس سرزمین کا بادشاہ بننا چاہتا ہے۔ غور سے سنو میری طاقت میں ابھی کوئی کمی نہیں آئی ہے اگرچہ مجھے انسانوں نے بھلا دیا ہے۔ ریت کو

دیکھو کس طرح اس کے ذرّوں نے میرے شیر نما جسم
کو ڈھک دیا ہے کیا کسی کو یاد ہے کہ میری طاقت خوفناک سے
خوفناک جانور سے کم نہیں تھی۔ اس وقت صرف
میرا سر دکھائی دیتا ہے اور اتفاق کی بات یہ کہ
دیکھنے میں وہ ایک کمزور انسان کا سر معلوم ہوتا ہے۔"

"تم تھا تمس وعدہ کرو کہ میرے جسم سے ساری
ریت ہٹا دو گے اور مجھے باہر نکلنے میں مدد کرو گے
تاکہ میری پوری اور اصلی شکل سب کو دکھائی دے
پھر مصر تمہارا ہوگا اور تمہیں اس پر حکومت کرو گے۔
شمال سے جنوب، مشرق سے مغرب، ہر طرف تمہارا
ہی طوطی بولے گا۔ تمہارے دور میں خوش حالی
بڑھے گی اور ہر طرف سے دولت اور خوشی کھنچ
کھنچ کر تمہاری سلطنت میں آئے گی لیکن دیکھو
ریت کو پہلے ہٹانا ہے تاکہ میری شان دوبالا ہو
جائے اور میں سب کو پھر دکھائی دینے
لگ جاؤں۔"

شہزادہ جب اٹھا اور اٹھ کر گھر کی طرف لوٹا
تو اس کے کانوں میں ابوالہول کے الفاظ گونج رہے
تھے۔ اس نے سوچا کہ اس نے خواب دیکھا ہے
اور ابوالہول سے پکا وعدہ کر لیا ہے۔ لیکن اسے
شک بھی پیدا ہوا کہ جو کچھ کہ اس نے دیکھا تھا کیا
یہ سب خواب ہی خواب تھا یا اس کی کچھ حقیقت
بھی تھی۔

گھر جا کر وہ جلد ہی لوٹ آیا اور جلدی جلدی ابوالہول
کے چاروں طرف سے ریت کو ہٹانا شروع کر دیا۔
ریت کے ٹیلے تہ بہ تہ بیٹھے ہوئے تھے ان سب کو
ہٹانا اور صاف کرنا تنہا اس کے بس کا نہ تھا۔ اس
نے اپنے غلاموں کو بلایا جو کافی دنوں تک ریت
صاف کرتے رہے۔ چٹان کے بنے دیو کا قد بہت
لمبا تھا۔ اتنا لمبا جتنا کہ اوپر نیچے تیس لمبے آدمیوں کا
قد۔ اس لیے کافی دن تک محنت کرنے کے بعد ریت
کے ٹیلے ہٹے۔

آخرکار اس کا سارا جسم ریت سے باہر نکل آیا۔
شیر کی دم کے کنارے سے لے کر پیر کے پنجوں کے
ناخن تک۔ اب ہر شخص اسے صاف دیکھ سکتا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ابوالہول نے اپنا وعدہ
پورا کیا؟ سب عالموں کا کہنا ہے کہ وقت گزرنے
کے بعد تھا تمس مصر کا بادشاہ بنا۔ اس نے حکومت
کا انتظام اچھی طرح چلایا۔ اس کی رعایا خوش رہی۔
کھانے پینے کی کوئی کمی نہیں ہوئی۔ گویا یہ ابوالہول
کے خواب کی سچی تعبیر تھی۔

تھا تمس کی آرزو اور تمنا پوری ہوئی لیکن
اگر تھا تمس وہ خواب نہ دیکھتا۔ تب بھی کیا یہی سب
کچھ ہوتا؟ اس کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ بھلا
ہم میں سے کون ہے جو اس کے متعلق پورے
وثوق سے کہہ سکتا ہے!

ان دنوں مصر کے اس ابوالہول کے پنجوں
کے درمیان ایک چھوٹا سا مندر بنا ہوا ہے۔ اس مندر
کے اندر ایک پتھر کا ستون ہے جس پر یہ کہانی
کھدی ہوئی ہے بالکل ویسے ہی جیسے کہ اوپر
آپ کو بتائی جا چکی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
موجودہ دور کے مصریوں کے لیے کبھی یہ ایک
وارننگ ہے۔ یہ کہانی ان کو بار بار یاد دلاتی
ہے کہ اگر ریت کے ذرے تنگ کریں تو ان کو

باقی صـ پر

شعیب حسین صدیقی

یک نہ شد دو شد

ایسے چھوٹے چھوٹے جملوں کو محاورہ کہا جاتا ہے، جو طے کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ یعنی انھیں کوئی گھڑ نہیں سکتا اور جو بات چیت میں بولے جاتے ہیں۔ محاورے اگر صحیح موقعے پر بولے جائیں تو گفتگو میں وزن اور دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے مضمون یا کہانی میں موقع محل کے لحاظ سے کہیں کہیں شعر لکھ دیے جاتے ہیں ــــــ ان محاوروں کی کوئی نہ کوئی وجہ بھی ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ کس طرح شروع ہوئے، کیسے ایجاد ہوئے۔ اسے وجہ تسمیہ کہتے ہیں۔

ایک محاورہ ہے "یک نہ شُد دو شُد"۔ اس کے معنیٰ ہوئے ایک تو تھا ہی دوسرا بھی ہو گیا۔ یا۔ ایک نہ ہوا دو ہو گئے۔ اس محاورے کی شروعات سنیے!

کسی زمانے میں ایک جادوگرنی رہتی تھی۔ اسے ایک ایسا منتر آتا تھا جس کے پڑھنے سے مُردہ اپنی قبر سے باہر آجاتا تھا اور خود اپنا کفن پیش کر دیتا تھا۔ وہ جادوگرنی، مردے سے کفن لے لیتی اس کے بعد وہ دوسرا منتر پڑھتی جس سے مُردہ پھر اپنی اسی قبر میں واپس چلا جاتا۔ وہ بوڑھی جادوگرنی آئے دن یہی کیا کرتی اور اِس طرح حاصل کیے ہوئے کفن کو بیچ کر اپنی زندگی کی گاڑی کو کھینچتی۔ بڑھیا کا ایک بہت پکا اور گہرا دوست بھی تھا جو اُس کے اِس کرتوت کو جانتا تھا۔ وہ بڑھیا کی ہر وقت خدمت اور خوشامد میں لگا رہتا۔ وہ چاہتا تھا کہ بڑھیا اس سے خوش ہو کر اسے بھی وہ جادو بتا دے جس کے زور سے وہ مردے کو قبر سے باہر نکال لیتی ہے اور مردہ اپنا کفن اُسے پیش کر دیتا ہے۔ مگر بڑھیا بہت ہوشیار اور بڑی چالاک تھی۔ وہ اپنا منتر کسی طرح بتانے کو تیار نہ ہوتی۔ لیکن اس کا دوست بھی بہت ہمت والا، مستقل مزاج اور ارادے کا پکا تھا۔ وہ ثابت قدمی سے برابر اس کی خدمت کرتا رہا۔ آخرکار اس کی ہمت، اس کی دُھن اور لگاتار کوشش رنگ لا کر رہی!

ایک دن کیا ہوا کہ بڑھیا کی حالت ایک دم اچانک خراب ہو گئی اور اُسے یقین ہو گیا کہ اب وہ نہیں بچ سکتی۔ اس نے بڑی حسرت اور افسوس کے ساتھ اپنے دوست کی طرف دیکھا اور کہا۔ "بوڑھے لوگ بڑے سیانے، تجربہ کار اور سمجھدار ہوتے ہیں۔ تم جو ہر وقت میرے پیچھے لگے رہتے تھے اور ہر دم میری خدمت اور دیکھ بھال

کرتے تھے، اس کی وجہ میں خوب جانتی تھی۔ سمجھتی تھی کہ تم میرا منتر جاننا چاہتے ہو جسے میں نے ایک زمانے تک تم سے بلکہ سب سے ہی چھپائے رکھا۔ مگر اب جبکہ میں مر رہی ہوں وہ منتر اپنی قبر میں لے کر جانا نہیں چاہتی اور تم کو بتلائے دیتی ہوں۔ مگر دیکھو! میری ایک بات یاد رکھنا یہ منتر کسی دوسرے کو کبھی نہ بتانا۔ بڑھیا نے منتر تو بتا دیا مگر اسی دم اس کی طبیعت اور زیادہ بگڑ گئی۔ آخر اس کا انتقال ہو گیا۔ اور کچھ دیر بعد اس کا کفن دفن بھی ہو گیا۔

اب بڑھیا کے دوست نے اچھی طرح وہ منتر یاد کیا اور خوب اچھی طرح اپنا اطمینان کر کے منتر کو آزمانے کے لیے قبرستان پہنچا۔ اس نے ایک قبر پر وہ منتر پڑھا۔ منتر پڑھتے ہی قبر سے مردہ باہر آگیا اور اس نے اپنا کفن اسے دے دیا۔

بڑھیا نے اپنے دوست کو منتر کا ایک حصّہ تو بتا دیا تھا، لیکن دوسرا حصّہ بتانا یا تو وہ بھول گئی تھی یا جان بوجھ کر نہیں بتایا تھا۔ بڑھیا کو مُردے کو واپس قبر میں بھیجنے کا منتر بھی آتا تھا یہ منتر اس کے دوست کو معلوم نہ ہو سکا تھا۔ اب بڑی مشکل آپڑی۔ مردہ واپس اپنی قبر میں کس طرح جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مردہ اس آدمی کے ساتھ سایے کی طرح رہنے لگا۔ وہ آدمی بہت گھبرایا، پریشان ہو گیا۔ آخر بڑے سوچ بچار کے بعد اس مشکل کو حل کرنے کی ایک ترکیب اس کی سمجھ میں آگئی اور وہ یہ کہ بڑھیا کی قبر پہ یہ منتر پڑھ کر اسے قبر سے باہر نکالا جائے اور پھر اس سے [illegible] پوچھا جائے جس سے اس مردے کو واپس اس کی قبر میں پہنچایا جا سکے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ خوشی سے اچھل پڑا اور بھاگ کر بڑھیا کی قبر پہ پہنچا۔ اس نے جلدی جلدی منتر پڑھا۔ منتر پڑھتے ہی بڑھیا بھی اپنی قبر سے باہر آگئی اور اپنا کفن اسے دے دیا۔ اب اس آدمی نے بڑھیا سے دوسرا منتر پوچھا جسے پڑھ کر وہ مردے کو واپس قبر میں بھیج دیتی تھی۔ اس آدمی نے بڑھیا سے بار بار سوال کیے، خوشامدیں اور منتیں کیں، مگر بڑھیا خاموش ہی رہی [illegible] وہ بولتی بھی کیسے، کیوں کہ وہ مر چکی تھی۔

اب بڑھیا کا سایہ بھی اس آدمی کے ساتھ ہو لیا پہلے تو صرف ایک مردہ پیچھا کر رہا تھا اب دو مُردہ سائے اس کے ساتھ ہو گئے۔ یہ عجیب و غریب منظر دیکھ کر بڑھیا کا دوست ایک دم بول اٹھا۔ ”یک نہ شد دو شد“!

بقیہ ابوالہول ص ۔۔ سے

بتا دیا جائے تاکہ ابوالہول کا بُت پوری طرح سب کو دکھائی دے۔ اگر وہ خیال رکھیں گے تو ان کے ملک میں امن و امان رہے گا اور ان کے وطن کی سرزمین پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ ★★

بقیہ فٹ بال کا جادوگر ص۱۸ سے

بعض وجوہ پر پیلے کو یہ پیش کش قبول کرنا پڑی۔ تم اسی سے اندازہ کر سکتے ہو کہ وہ اور اس کا فن لوگوں کو کتنے عزیز ہیں اور کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی ★★

جنگ چھڑی ہو سرحد پر یا کہیں لگی ہو آگ
پورا ہوا ارمان کسی کا یا سو جائیں بھاگ
میری بین جدا ہے سب سے، میرا جدا ہے راگ
میری دُنیا کھیل تماشا، میں ہوں مُنّا پیارا
سب کے دل کی راحت ہوں میں سب کی آنکھ کا تارا

میں رُوؤں تو مجھ کو گھر کے سارے لوگ منائیں
میں سوؤں تو میرے سپنوں میں پریاں آجائیں
میں جاگوں تو مجھ کو امّی اپنے گلے لگائیں
میں گاؤں تو گائے جیسے یہ عالم ہی سارا
سب کے دل کی راحت ہوں میں سب کی آنکھ کا تارا

دُنیا کے سارے بچّوں کا یکساں ہے افسانا
میرے ہی جیسا ہے سب کی فطرت کا پیمانا
ملتی جُلتی سی عادت ہے، رُونا ہو یا گانا
میری منزل پیار، محبت، میرا سپنا نیارا
سب کے دل کی راحت ہوں میں سب کی آنکھ کا تارا

میری دُنیا جنگ نہیں ہے، کیسی ہاتھا پائی ؟
ہندو کوئی ہو یا مسلم، سکھ ہو یا عیسائی !
میری نظر میں سب یکساں ہیں، سب ہیں میرے بھائی
میرے جیسے بچّوں کا مذہب ہے بھائی چارا
سب کے دل کی راحت ہوں میں، سب کی آنکھ کا تارا

★

اظہار اثر

سائنس کیا ہے؟

(سلسلے کے لیے دیکھیے جولائی ۱۹۷۷ء)

توانائی کیا ہے؟

توانائی (ENERGY) کا مطلب ہے "قوتِ عمل" یعنی وہ قوت جو آپ کسی کام میں استعمال کرتے ہیں توانائی کہلاتی ہے۔

توانائی مختلف اقسام کی ہوتی ہیں جو مناسب ذریعوں سے ایک سے دوسری قسم میں تبدیل کی جا سکتی ہیں۔ مادہ کی تعریف کرتے ہوئے ہم نے بتایا تھا کہ مادّہ کوئی ایک یا مسلسل شے نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے ذرّات کا مجموعہ ہے۔ ہمارے روزمرّہ کے تجربات سے توانائی بھی ہمیں ایک مسلسل عمل نظر آتا ہے لیکن اگر ہم گہرائی سے توانائی کا مطالعہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ توانائی بھی مادّہ کی طرح مسلسل شے نہیں بلکہ توانائی چھوٹی چھوٹی "اکائیاں" (یونٹ) ہوتے ہیں۔

توانائی کا سب سے چھوٹا یونٹ "کوانٹم" کہلاتا ہے۔ جو دراصل فوٹون ذرّہ کا دوسرا نام ہے لیکن کوانٹم اتنی چھوٹی اکائی ہوتی ہے کہ ہم ایٹم کی طرح اس کو دیکھ نہیں سکتے۔ کروڑوں ایٹم مل کر جب مادہ کا کوئی حجم ہمارے سامنے آتا ہے تو ہم اس کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح کروڑوں کوانٹم مل کر جب مسلسل ہمارے سامنے آتے ہیں تو ہم اس توانائی کو روشنی اور حرارت کی شکل میں دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔

توانائی کو ہم دو بنیادی قسموں میں بانٹ سکتے ہیں۔

۱۔ وقوعی توانائی (POTENTIAL ENERGY)

۲۔ حرکی توانائی (KINETIC ENERGY)

مادّے کے کسی مقام پر "وقوع" کو وقوعی توانائی کہا جاتا ہے۔ مثلاً اگر ایک پتھر کسی پہاڑ کی چوٹی پر رکھا ہے جو لڑھک بھی سکتا ہے تو اس پتھر میں اس وقت وقوعی توانائی ہے۔ یا اسپرنگ میں جو توانائی ہوتی ہے وہ وقوعی توانائی کہلاتی ہے۔

حرکی توانائی کسی چیز کی حرکت سے پیدا ہوتی ہے۔ حرکی توانائی اس بات پر منحصر ہے کہ کوئی شے کتنے حجم کی ہے اور کس رفتار سے حرکت کر رہی ہے۔ جتنا بڑا حجم ہوگا اور جتنی رفتار تیز ہوگی اسی قدر توانائی زیادہ ہوگی۔

توانائی کی ان دو اقسام کو بھی ہم چھ مختلف قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ برقی توانائی (ELECTRICAL ENERGY)

برقی توانائی سے اس زمانے میں کون شخص ہے جو واقف نہ ہو۔ بجلی کے پنکھوں اور قمقموں وغیرہ میں یہی برقی توانائی استعمال ہوتی ہے۔ برقی رو ایک مقررہ مقدار میں مقررہ قوت کے ساتھ جب تار میں دوڑتی ہے، اس کو برقی توانائی کہا جاتا ہے۔ برقی توانائی کو "واٹ فی گھنٹہ"، یا کلو واٹ فی گھنٹہ کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے۔ ایک واٹ فی گھنٹہ برقی توانائی 860 حراروں (CALORIES) کے برابر ہوتی ہے۔

۲۔ حرارت یعنی HEAT۔ THERMAL ENERGY ۱-۲ اس توانائی کی شکلیں مختلف ہیں مثلاً ہر جسم میں کچھ نہ کچھ حرارت ہوتی ہے۔ اس کا درجہ حرارت ہم سینٹی گریڈ یا فارن ہائٹ کے پیمانوں سے ناپتے ہیں۔ ہسپتالوں میں درجہ حرارت ناپنے کے تھرمامیٹر اس کی عام مثال ہیں۔ حرارت کی سب سے چھوٹی اکائی "حرارہ" کہلاتی ہے۔ ایک گرام پانی کا ایک سینٹی گریڈ درجہ حرارت بڑھانے میں جتنی حرارت صرف ہوتی ہے اس کو اکائی مان کر سائنسدانوں نے "حرارہ" کا نام دیا ہے۔ حرارت کی دو خصوصیات بہت اہم ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ ضروری نہیں کہ اگر مادہ کی مقدار زیادہ ہے تو اس میں حرارت بھی زیادہ ہوگی اور کم مقدار ہے تو کم ہوگی۔ بلکہ کم مقدار مادہ میں بڑی مقدار کے مادہ سے بہت زیادہ حرارت بھی ہو سکتی ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حرارت ہمیشہ زیادہ درجہ حرارت سے کم درجہ حرارت کی طرف منتقل ہوتی ہے جس طرح پانی کی ایک ٹنکی بلندی پر رکھی ہو اور اس کا تعلق کم نیچے رکھی ٹنکی سے ملا دیں تو پانی ہمیشہ نیچے والی ٹنکی کی طرف بہے گا خواہ نیچے والی ٹنکی اوپر والی ٹنکی سے بڑی ہو۔ اس کا مطلب ہوا اگر کسی بڑے جسم کا درجہ حرارت کم ہے اور کسی چھوٹی چیز کا درجہ حرارت بہت زیادہ ہے تو حرارت اس چھوٹی چیز سے بڑی چیز میں منتقل ہوگی۔

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ حرارت، گرمی یا توانائی کی مقدار کو کہا جاتا ہے۔ حرارہ اس حرارت کی مقدار ناپنے کی اکائی ہوتا ہے اور درجۂ حرارت، حرارت کی کمی بیشی ناپنے کو کہا جاتا ہے۔

اس فرق کو آپ اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ فرض کیجیے دس گرام وزنی کسی شے کا درجہ حرارت ایک سو سینٹی گریڈ ہے اور اسی قسم کی دس کلو وزنی کسی شے کا درجہ حرارت پچاس سینٹی گریڈ ہے۔ اب اگر ان دونوں چیزوں کی حرارت کو ہم "حراروں" سے ناپیں گے تو دس کلو وزنی شے میں حرارت کی مقدار زیادہ ہوگی جب کہ درجہ حرارت کم ہے۔ لیکن اس کے باوجود حرارت دس گرام والی شے سے دس کلو والی شے میں منتقل ہوگی کیوں کہ چھوٹی شے کا درجہ حرارت زیادہ ہے۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ حرارت کی مقدار اور درجہ حرارت دو قطعی الگ الگ چیزیں ہیں۔

۳۔ کیمیاوی توانائی (CHEMICAL ENERGY) مادہ کے ہر سالمے میں توانائی کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ کیمیاوی ردعمل سے سالموں سے آزاد کی گئی توانائی کیمیاوی توانائی کہلاتی ہے۔ جیسے کاربن اور آکسیجن مل کر کاربن ڈائکسائڈ بناتے ہیں اور اس ردِ عمل سے حرارت خارج ہوتی ہے جو کیمیاوی توانائی ہے۔

۴۔ جوہری توانائی (ATOMIC ENERGY)

جسے ایٹمی یا نیوکلر توانائی بھی کہا جاتا ہے ایٹموں کے مرکزے توڑ کر یا دو ایٹموں کے مرکزے جوڑ کر حاصل کی جانے والی توانائی ایٹمی توانائی کہلاتی ہے مثلاً ایٹم بم میں یورانیم کے ایٹم کا مرکزہ توڑ کر توانائی حاصل کی جاتی ہے اور ہائیڈروجن بم میں ہائیڈروجن عنصر کے دو مرکزے جوڑ کر ہیلیم عنصر بنا کر توانائی حاصل کی جاتی ہے۔

۵۔ شعاعی توانائی (RADIANT ENERGY)

برقی مقناطیسی لہروں یا شعاؤں کی صورت میں خارج ہونے والی توانائی شعاعی توانائی کہلاتی ہے جیسے روشنی، ایکس رے وغیرہ

۶۔ مشینی توانائی (MECHANICAL ENERGY)

حرارت یا برقی توانائی استعمال کر کے جب ہم مشین چلاتے ہیں۔ اس مشین سے حاصل کردہ توانائی مشینی توانائی کہلاتی ہے۔

(مختلف توانائیوں کا ایک دوسرے میں تبدیل ہونے کا نقشہ)
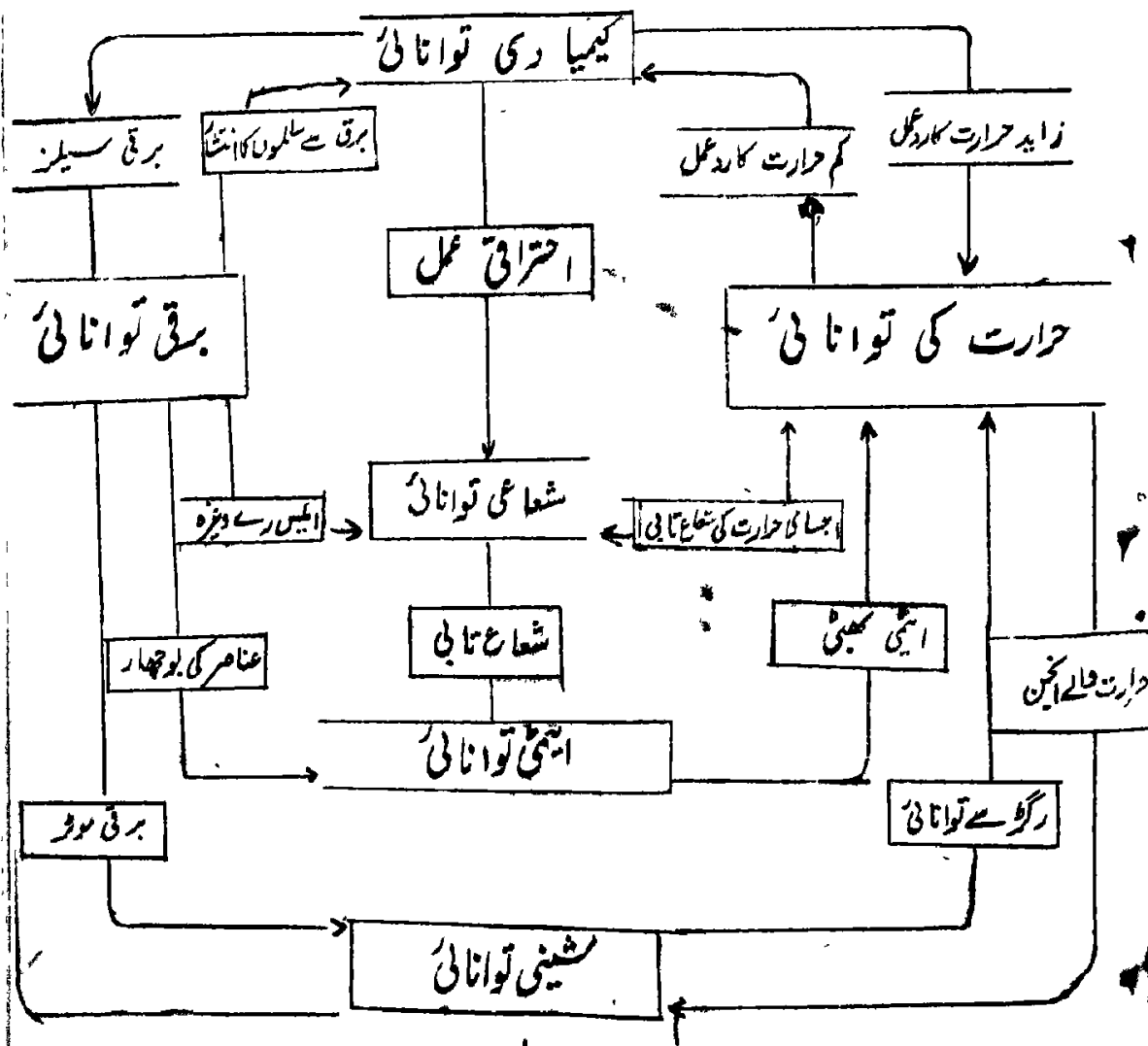
جب آپ گیند اچھالتے ہیں تو اس میں آپ اپنے جسم کی مشینی توانائی استعمال کرتے ہیں۔

یہ تمام توانائیاں ایک قسم سے دوسری قسم میں تبدیل کی جا سکتی ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جا سکتی ہیں۔

(مختلف توانائیوں کا ایک دوسرے میں تبدیل ہونے کا نقشہ صفحہ ۱ پر دیکھیے)

توانائی کے بارے میں یہ پوری تفصیل بڑی حد تک ٹیکنیکل ہے۔ آسان طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں روزمرہ کے اپنے کاموں اور اپنی چیزوں کی طرف توجہ دینی ہوگی مثلاً:

۱۔ چولھے میں آگ جلا کر جب ہم کھانا پکاتے ہیں تو حرارت کی توانائی استعمال کرتے ہیں۔

۲۔ بجلی کے بلب میں برقی توانائی کو شعاعی توانائی میں بدل کر استعمال کرتے ہیں۔

۳۔ ہیٹر میں برقی توانائی کو ہم حرارت میں تبدیل کر کے کمرہ گرم کرتے ہیں۔

۴۔ سورج، حرارت اور شعاعی توانائی کی شکل میں ہمیں اپنی توانائی دیتا ہے

۵۔ جب انسان اپنے جسم کو حرکت دیتا ہے تو وہ اپنے جسم کی مشینی توانائی استعمال کرتا ہے۔

۶۔ ہم لوگ جو غذا کھاتے ہیں معدہ میں جا کر اس میں کیمیاوی ردِ عمل شروع ہو جاتا ہے غذا سے حاصل کردہ اس توانائی سے ہماری زندگی قائم رہتی ہے اور جسم کا تمام سسٹم کام کرتا ہے یہی توانائی ہمارے جسم کا درجہ حرارت قائم رکھتی ہے۔

۷۔ جب کوئی شخص بولتا ہے اور آپ اس کی آواز سنتے ہیں تو آواز کی لہروں کی شکل میں توانائی آپ پر اثر انداز ہوتی ہے۔

۸۔ موٹر میں پٹرول اور انجنوں میں کوئلہ استعمال کر کے بھی ہم حرارت کی توانائی استعمال کرتے ہیں جو کیمیاوی ردِ عمل سے ہمیں ملتی ہے۔

۹۔ بیٹریوں میں کیمیاوی ردِ عمل سے حاصل کردہ توانائی ہم برقی توانائی کی شکل میں استعمال کرتے ہیں یہ تمام توانائیاں ایک شے سے دوسری شے میں منتقل کی جا سکتی ہیں اور ان کو ایک توانائی سے دوسری توانائی میں بدلا جا سکتا ہے مثلاً حرارت کی توانائی ایک جسم سے دوسرے جسم میں خود بخود منتقل ہو جاتی اس کا تجربہ آپ کو روزانہ ہوتا ہے۔ چولھے پر رکھی ہوئی چائے کی کیتلی میں پانی اسی لیے گرم ہوتا ہے کہ لکڑی جلنے سے ہونے والی حرارت کیتلی کے ذریعے کیتلی کے پانی میں منتقل ہو رہی ہے۔

اسی حرارت سے ہم بھاپ بنا کر ریلوے انجن چلاتے ہیں یا ٹربائن (چرخ) چلا کر حرارت کو برقی توانائی میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ توانائی استعمال کیے بغیر کوئی کام نہیں کیا جا سکتا، نہ کوئی چیز حرکت میں آ سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات میں کوئی چیز ساکت نہیں جو چیزیں ہمیں ساکت نظر آتی ہیں وہ بھی ساکت نہیں۔ مثلاً زمین ہمارے لیے ساکت ہے حالانکہ زمین بیک وقت چار حرکتیں کر رہی ہے نمبر ایک وہ اپنی کیلی پر لٹو کی طرح گھوم رہی ہے جس سے دن رات بنتے ہیں۔

باقی صفحہ ۲۷ پر

جہاں آرا بیگم چودھری
ترجمہ
سید محمد شمیم

یہ قصہ اس زمانے کا ہے جب تاج محل
کی بنیاد بھی نہ پڑی تھی۔ شاہ جہاں بادشاہ آگرے
کے شاہی قلعے میں رہتے تھے۔ قلعے کے اندر محلوں
میں بیگمات رہتی تھیں۔ سکھیاں اور باندیاں
رہتی تھیں اور ان لوگوں کے ہنسی مذاق اور
گانے بجانے سے قلعے کے اندر چاروں طرف
چہل پہل رہتی تھی۔

سہ پہر ختم ہو رہی تھی اور قلعے کے باہر
روشن چوکی کی خوش گوار آواز آ رہی تھی۔ شاہزادی
جہاں آرا اور روشن آرا استاد کے پاس بیٹھی فارسی
پڑھ رہی تھیں۔ جہاں آرا کی طبیعت تو پڑھنے
میں بہت لگتی تھی۔ پر روشن آرا چنچل تھی
اس کے لیے مسلسل کچھ دیر تک ایک ہی جگہ
بیٹھے رہنا مشکل تھا۔ مولوی صاحب پڑھاتے
پڑھاتے اونگھ رہے تھے۔ روشن آرا نے
جیسے ہی ان کی آنکھیں بند ہوتے دیکھیں،
بھاگ کھڑی ہوئی۔ اور پانچ محل پار ہو کر مچھلی
محل پہنچ گئی۔ وہاں شیشے جیسے شفاف نیلے پانی
میں سرخ سبز، زرد اور بہت خوب صورت
رنگوں کی، دل لبھانے والی مچھلیاں تھیں۔
کھانا کھاتے وقت شاہزادی نے ریشمی پاجامے
کے کمر بند میں ایک روٹی چپکے سے رکھ لی تھی۔
اس وقت اسی کے ننھے ننھے ٹکڑے بنا کر مچھلیوں
کو کھلانے لگی۔

روشن آرا کو گڈے گڑیا، کھلونے، پالکی
ڈولی کے کھیل بھی پسند تھے لیکن ان سبھوں سے
زیادہ اسے دلچسپی تھی گلہری کے پیچھے دوڑنے
سے، باغ میں تتلیاں پکڑنے سے۔ چڑیوں
کے ساتھ شور مچانے سے۔ اور ان کو پکڑنے
کی کوشش کرنے سے ان باتوں سے اس کو بہت
خوشی ہوتی تھی۔ ان کھیلوں میں اس کی
سہیلی لمبی چوٹی والی ستارہ تھی۔ یہ ایک
ایرانی باندی کی لڑکی تھی۔

روشن آرا مچھلیوں سے کھیل ہی رہی تھی
کہ ستارہ دوڑی دوڑی آئی اور خبر دی کہ قلعے
کے اندر بیگم سلطانہ کی جو چھوٹی سی مسجد

ہے اس کے پیچھے ایک انار کے درخت کے نیچے ایک تیتر نے انڈے دیے تھے۔ ایک انڈے سے بچہ بھی نکلا تھا۔ اس بچے کو کسی نے مار بھی ڈالا۔

شاہزادی نے کہا "ہائے! اس کو کس نے مار ڈالا ہے"

ستارہ نے کہا "کیا جانیں شاہزادی! بلّی یا نیولے نے مارا ہوگا۔ آج ایک نیولے کو باغ میں دیکھا تھا تو چلو انڈوں کو وہاں سے ہٹا دیں ورنہ نیولا سب کو کھا جائے گا"

جھاڑی میں پانچ انڈے ملے۔ لیکن ان انڈوں کو دوپٹہ میں رکھ کر سب کی نظر بچا کر چلنا آسان کام نہ تھا۔ روشن آرا کو بہت فکر ہوئی انڈے شاہزادی کے ہاتھ میں گرم اور بھاری معلوم ہوتے تھے زندہ بچوں کی ہلکی ہلکی حرکت بھی چھلکوں کے باہر معلوم ہوتی تھی۔ شاہزادی خوشی سے اچھل پڑی۔

"اری ستارہ دیکھ! ان میں بچے بھی ہیں دیکھ یہ ہل رہے ہیں"

ستارہ نے کہا "شاہزادی لاسیے ان انڈوں کو پیٹ سے لگا کر اس پایے کے پیچھے آنکھیں موند کر سو رہتے ہیں آپ جلدی کوئی جگہ ٹھیک کر آئیے ان انڈوں کو کسی پٹارے میں گرم رکھنا ہوگا۔ ورنہ بچے نہیں نکلیں گے"

ستارہ کو یہ باتیں شاہزادی سے زیادہ معلوم تھیں شاہزادی ایک پٹارے کی تلاش میں چلی۔ لیکن اس وقت تمام محلوں میں بیگمات چوٹی باندھنے اور سنورنے میں مشغول تھیں کہیں بھی چپکے چپکے جانا ممکن نہ تھا۔

مسلمان بادشاہ اس زمانے میں ہندو رانیوں سے شادی کرتے تھے روشن آرا کی دادی جودھا بائی بھی ہندو رانی تھی۔ وہ روشن آرا کو بہت پیار کرتی تھی۔ اس کی سب خواہشیں پوری کرتی تھی۔

. . . .

پھر یہ تیتر کے انڈے ان کے پاس کیسے لے جاتی! یہ تو ناممکن تھا۔ جب کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی تو شاہزادی مغموم واپس جانے لگی۔ اسی وقت اس نے دیکھا کہ بادشاہ شام کے غسل کے لیے شیش محل جا رہے ہیں۔ فوراً روشن آرا کو ایک بات سوجھی۔ ستارہ کو لے کر جوں ہی محل میں بادشاہ کے خاص لباس کے کمرے میں پہنچی۔ وہاں ایک طرف بادشاہ کا لباس رکھنے کے لیے ایک صندوق رکھا ہوا تھا۔ صندوق صندل کی لکڑی کا تھا اس پر سونے کے تاروں سے پھول پتیاں بنی ہوئی تھیں۔ دونوں نے بڑی محنت سے صندوق کے ڈھکنے کو کھولا اس میں سے ایک ایک کر کے ریشم کمخواب کارچوبی اور زری کے کام کیے ہوئے کپڑوں کو ایک طرف کر کے ۔۔۔ اور اس میں سے ایک بہت قیمتی اونی شال کو کھینچ ۔۔۔ چڑیوں کے لیے ایک گدّا بنایا اور اس پر بہت احتیاط سے انڈوں کو رکھ دیا پھر صندوق بند کر کے باہر چلی گئیں۔

رات کے وقت روشن آرا کو نیند نہ آتی تھی۔ ایک میٹھی سی بے قراری سی تھی۔ بس ادھر ادھر کروٹ بدل رہی تھی ستارہ بھی قریب ہی سوئی

ہوئی صبح کا انتظار کر رہی تھی آخر بہت دیر کے
بعد دونوں کو نیند آ گئی۔

علی الصباح موتی مسجد کے مؤذن کی آواز
سے ستارہ کی نیند ٹوٹ گئی۔ رات کی تاریکی
بھی اچھی طرح غائب نہیں ہوئی تھی۔ جمنا کے
کنارے شیشم کے درختوں پر سبز پتوں کے اندر چڑیوں
نے ذرا چہچہانا شروع کیا تھا۔ اسی وقت ستارہ
نے شاہزادی کے پاؤں پکڑ کر اس کو جگایا اور
چپکے چپکے کہا "شہزادی اٹھو۔ چلو دیکھیں
بچے اب نکل آئے ہوں گے۔"

روشن آرا جلدی سے اٹھ بیٹھی اور کہا
"لیکن جائے گی کیسے؟ بادشاہ تو ابھی سوئے
ہوئے ہوں گے؟ اور اس کمرے میں جانے کا
راستہ تو ان کے سونے کے کمرے سے ہو کر
گیا ہے۔"

"یہی تو جانے کا وقت ہے چلو چپکے چپکے
پنجوں کے بل چلیں بادشاہ اٹھ جائیں گے تو
کیسے جاؤ گی؟ پھر وہاں بہت سے لوگ پہنچ
جائیں گے،" ستارہ نے کہا۔

دونوں لڑکیاں بہت ہوشیاری سے کمرے
سے نکل کر چپکے چپکے جوہی محل پہنچیں۔ بادشاہ
کی خوابگاہ کا حبشی پہرے دار ننگی تلوار رکھے
دیوار سے پیٹھ لگائے سو رہا تھا۔ بڑی ہوشیاری
سے دونوں لڑکیاں کمرے میں جا کر صندوق
سے کان لگا کر سننے لگیں ایسا معلوم ہوا جیسے اندر
چیں چیں کی آواز آ رہی ہو جیسے بچے نکل آئے
ہوں۔ پھر کیا تھا دونوں نے مجبوری کا طاقت لگا کر
کسی طرح ڈھکنے کھولا تھا لیکن ٹھیک اسی وقت
بادشاہ نے کروٹ بدلی۔ یہ دونوں سمجھیں کہ
بادشاہ جاگ اٹھے۔ جھپاک سے ڈھکنے کو
چھوڑا اپنی جان لے کر بھاگیں اور سیدھے اپنے
کمرے میں آ کر دھپ سے اپنے بستروں پر
سو رہیں۔ اس وقت ان کے سینے میں دل اس طرح
دھک دھک کر رہا تھا جیسے ہتھوڑا چل رہا
ہو۔ ادھر ڈھکنے کی آواز سے بادشاہ کی نیند
ٹوٹ گئی فوراً صندوق کے پاس آئے اور اسے
اٹھا کر دیکھا انھیں یقین نہ آتا تھا کہ وہ جاگ
رہے ہیں یا خواب دیکھ رہے ہیں۔ انھوں
نے آنکھیں مل کر پھر دیکھا خواب نہیں تھا بلکہ
سچ مچ ان کی کشمیری قیمتی شال پر چند
ننھے ننھے تیتر کے بچے شاید بھوک
سے چلا رہے تھے۔

چیں چیں چیں - چک چک چک

**

راج نرائن راز

فٹ بال کا جادوگر

بہت بڑا میدان تھا۔ دولاکھ تماشائی جمع تھے۔ بڑی ہلچل تھی۔ پھر یکایک خاموشی چھا گئی۔ میدان میں کھڑے دس افراد نے اپنی قمیصیں اتاریں اور باری باری ایک شخص کو دیں۔ پھر ہر ایک نے اُسے گلے لگایا۔ ان میں سے بعض یوں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے جیسے کوئی بچھڑ رہا ہو۔

پھر اُس شخص نے اپنی قمیص اتاری۔ دس نمبر کی یہ قمیص وہ پچھلے دس برسوں سے پہنتا چلا آ رہا تھا۔ وہ قمیص ہاتھوں میں لیے میدان کے گرد دوڑنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے آنسو بھی پونچھتا جا رہا تھا۔ پھر وہ رکا۔ سبھی آوازیں رک گئیں۔ اس نے وہ قمیص کالی رنگت والے ایک بچے کو دے دی۔ لوگ کہہ رہے تھے "دکانا وکا وکا" یہ برازیل کی زبان کے لفظ ہیں۔ اِن کا مطلب ہے "نہ جاؤ تم نہ جاؤ"
یہ جانے والا کون تھا؟ وہ دنیا کا سب سے بڑا کھلاڑی پیلے تھا۔ مقام تھا: ریو ڈی جنیرو۔ موقع تھا: برازیل اور یوگوسلاویہ کے درمیان فٹ بال میچ
برازیل اور دنیا کا سب سے بڑا فٹ بال کھلاڑی پیلے فٹ بال کے عالمی مقابلوں پر سے رٹائر ہو رہا تھا۔ یہ اس کا آخری کھیل تھا۔

بہر حال یہ بات ماضی کی ہے۔ پیلے آج بھی فٹ بال کھیلتا ہے۔ یہ بات الگ کہ وہ عالمی مقابلوں میں نہیں کھیلتا۔

پیلے سنٹوس (برازیل) کے پاس واقع ایک چھوٹے سے قصبے میں ۲۳۔ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو ایک معمولی خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کے والد فٹ بال کے بڑے اچھے کھلاڑی تھے۔

پیلے چھ برس کی عمر میں فٹ بال کھیلنے لگا تھا۔ برازیل کے دوسرے عام بچوں کی طرح وہ بھی بہت دنوں تک اپنے قصبے کی سڑکوں اور گلیوں میں گیند کو ٹھوکریں مارتا اور کھیلتا پھرا۔ پھر وہ میدان میں کھیلنے لگا۔

پیلے غریب خاندان میں پیدا ہوا۔ یہاں تک کہ فٹ بال کے جوتے خریدنے کے لیے بھی اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ پیلے کے گھر سے ذرا دور ریلوے لائن تھی۔ مونگ پھلی سے لدی جب مال گاڑی گزرتی تو اس سے مونگ پھلی کے دانے گرتے رہتے۔ پیلے مونگ پھلیاں اٹھا لاتا۔ جب کچھ مونگ پھلیاں جمع ہو جاتیں تو وہ انھیں بیچ آتا۔ اس طرح مونگ پھلیاں بیچ کر اس نے کچھ

جمع کر لیے۔ اسی رقم سے وہ فٹ بال کے بوٹ خرید لایا۔
تیرہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ بہت اچھا
کھلاڑی بن گیا۔ وہ ہمیشہ اپنے سے بڑے بچوں کے
ساتھ کھیلتا۔ اس کا کھیل دیکھ کر اس کے والد کے
ایک دوست اور فٹ بال کے پرانے کھلاڑی نے
برازیل کے مشہور فٹ بال کلب سنٹوس کو ایک خط
بھیجا اور کہا کہ پیلے کو سنٹوس کلب میں شامل کر لیں۔
سنٹوس کلب نے پیلے کا کھیل دیکھنے کے لیے اپنا
آدمی بھیجا۔ نتیجہ اچھا نکلا اور پیلے پیشہ ور کھلاڑی
کی حیثیت سے سنٹوس کلب میں کھیلنے لگا۔ اس وقت
وہ ۱۳ سال کا تھا۔

سولہ سال کی عمر میں وہ پہلی بار برازیل کی ٹیم میں
منتخب ہوا۔ میچ [illegible] سے تھا۔ سترہ سال کی عمر
میں پہلی بار برازیل کی طرف سے عالمی کپ ٹورنامنٹ
میں کھیلا۔ اس ٹورنامنٹ میں اس نے ویلس کے
خلاف ایک، فرانس کے خلاف تین اور سویڈن
کے خلاف دو گول کیے۔ بس اس کی دھاک
دنیا بھر میں جم گئی۔

اور اب پیلے کے پاس پیسہ بھی خوب ہے۔
سارے ذریعوں سے کل ملا کر اس کی آمدنی چکرا دینے
والی رقم میں بدل جاتی ہے۔ پیلے کو برازیل کے لیے
بڑا قیمتی سمجھا جاتا ہے۔

حد تو یہ ہے کہ برازیل میں قومی جائداد کا قانون
پیلے پر بھی لاگو ہوتا تھا۔ اس قانون کے مطابق وہ
کسی دوسرے ملک یا غیر ملکی کلب کے لیے فٹ بال
نہیں کھیل سکتا تھا۔ اس کے قیمتی ہونے کا اندازہ
ایک اور بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ وہ جتنا
وقت کھیل کے میدان میں صرف کرتا، اس سے
زیادہ وقت اسے ڈاکٹری جانچ کے لیے
ڈاکٹر کی میز پر گزارنا پڑتا تھا۔ اس کا پوری طرح
صحت مند ہونا اس کے کلب اور اس کے ملک
کے لیے کتنا ضروری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ
۱۹۶۶ء میں انگلینڈ میں عالمی کپ ٹورنامنٹ میں
کھیلنے گیا تو اس کی ٹانگوں کا سولہ لاکھ روپے کا
بیمہ کیا گیا۔ ایک میچ میں بائیں پیر پر ہلکی سی چوٹ
آنے پر اسے بیمہ کمپنی نے ایک لاکھ روپیہ دیا تھا۔
پیلے نے صرف پیسہ ہی نہیں کمایا۔ اس کا نام دنیا
کے سب سے زیادہ عزت یافتہ کھلاڑیوں میں گنا
جاتا ہے۔ برازیل میں اسے ملک کا سب سے بڑا
اعزاز مل چکا ہے۔ یہی نہیں، اسے یوگوسلاویہ اور
فرانس جیسے ملکوں سے بھی اعزاز مل چکا ہے۔

آج کے زمانے میں ملکی اعزاز کی ایک پہچان ہے،
ڈاک ٹکٹ۔ لیکن کسی شخص کے اعزاز میں ڈاک ٹکٹ
اس کی زندگی میں جاری ہوئے ہوں، ایسا کم ہوتا
ہے۔ پیلے دنیا کا اکیلا ایسا فٹ بال کھلاڑی ہے،
جس کے اعزاز میں ۱۹۷۰ء میں برازیل کے محکمۂ
ڈاک نے ٹکٹ جاری کیے۔ ان ٹکٹوں میں
اسے ہزارواں گول کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔

ملکی اعزاز دینے کا ایک طریقہ اور بھی ہے۔
سڑکوں، پارکوں عمارتوں وغیرہ کے نام ملک کے
اہم اور تاریخی حیثیت رکھنے والے اشخاص کے ناموں
پر رکھے جاتے ہیں۔ جیسے دلّی میں بہادر شاہ ظفر
مارگ، سبھاش پارک، اشوکا ہوٹل، نہرو
ہاؤس، ڈاکٹر ذاکر حسین مارگ ہیں۔ بالکل اسی

کے ناموں پر بھی، سڑکوں وغیرہ کے نام ہوتے
تھیا۔ تان سین مارگ وغیرہ۔

لیکن کھلاڑیوں کے ناموں پر سڑکوں وغیرہ
کے نام ہوں، ایسا کم ہوتا ہے۔ اور غیر ملکوں میں
ایسا ہو تو اس کی ایک اور ہی شان ہے: جیسے پیلے
کے نام پر میکسیکو سٹی میں ایک سڑک راجا پیلے کی
سڑک کہلاتی ہے۔

برازیل میں اور برازیل سے باہر پیلے بڑا
مقبول ہے۔ پیار سے لوگ کئی ناموں سے
بلاتے ہیں جیسے کالا موتی، کالا جادوگر، کالا چیتا،
لاجواب کھلاڑی۔ جنوبی امریکی خدا، اور نہ جانے
کیا کیا کہتے ہیں۔ برازیل میں لوگ اسے "اوری"
کہتے ہیں۔ یہ ہسپانوی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے
معنی ہیں راجا۔

پیلے کی مقبولیت کی ایک اور مثال لیں۔
میکسیکو میں عالمی کپ کا فائنل ہو رہا تھا ادھر
ریفری نے میچ کے ختم ہونے کی سیٹی بجائی، ادھر
پیلے کے چاہنے والوں کا ایک ریلا آیا سب کے
سب میدان میں تھے۔ سبھی پیلے پر لپک جھپٹ
رہے تھے۔ پتا ہے؛ اس کھینچا تانی کا نتیجہ کیا
نکلا۔ اس کے سارے کپڑے پھٹ گئے۔ اس
کے جسم پر کوئی کپڑا اتنا نہ رہا۔ لیکن لوگ اسے
اپنے کاندھوں پر اٹھائے اٹھائے میدان
میں گھوم رہے تھے۔

پیلے کتنا مقبول ہے اس کا اندازہ اسے
ملنے والے تحائف سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ تحفے
نقد رقم، گھر، مکان اور سونے اور چاندی
کے بنے تاج ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں اسے چار پونڈ وزن
کا سونے کا فٹ بال تحفے میں دیا گیا تھا۔ ۱۹۷۰ء
میں میکسیکو کے امریکہ کلب نے اسے ایک تاج دیا
تھا۔ سونے چاندی کے بنے اس تاج کی قیمت
۱۴ ہزار ڈالر یعنی لگ بھگ ایک لاکھ روپے تھی۔ اس
طرح اور بھی کئی تحفے پیلے کو ملے ہیں۔

پیلے کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے
بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ سڑک پر اپنی کار کھڑی
نہیں کر سکتا۔ گرجا گھر نہیں جا سکتا۔ چاہنے والے
اسے ایسا گھیرتے ہیں کہ اس کے لیے آگے بڑھنے،
پیچھے ہٹنے یا دائیں بائیں مڑنے کو کوئی راستہ
نہیں رہتا۔

خیر تو پیلے ریٹائر ہو گیا تھا۔ اسے میدان میں
اتارنے کی کوشش بہت دنوں جاری رہی۔ بھاری
رقم کی پیش کش واقعی سر چکرا دینے والی تھی۔
نیویارک کی کاسموس فٹ بال کلب نے پیلے کو
اور آئرلینڈ کے کھلاڑی جارج بسیٹ کو دس دس لاکھ
ڈالر کی رقم کی پیشکش کی تھی۔ جارج بسیٹ نے پیشکش
قبول کرلی۔ پیلے نے نرمی سے انکار کر دیا۔ جواب دیا
کہ سوچ کر بتائے گا۔ اس پر کاسموس نے معاوضے
کی رقم دس لاکھ سے بڑھا کر ۴۵ لاکھ ڈالر کر دی اور
جب پیلے اس پر بھی راضی نہ ہوا، تو اس کلب نے
ساٹھ لاکھ ڈالر کی پیش کش کی اور تین برس کلب
کے لیے کھیلنے کی شرط لگائی۔ شاید کل ساٹھ
میچ کھیلنے کی۔ گویا معاوضہ ایک میچ کے لیے
ایک لاکھ ڈالر ٹھہرا۔ ہے نا حیرت انگیز رقم۔

باقی ص۹ پر

رؤف انجم

میٹھا زہر

ایک کچھوے[۱] کی سانپ سے پہچان ہوگئی — پہلے تو بول چال تھی، پھر دوستی بڑھی
یہ میل کچھوے کے مگر ہوش کھو گیا — اپنے وجود پر اُسے کچھ ناز ہو گیا
سوچا یہ دل میں کوئی تو چکر چلایئے — داماد ین کے سانپ کو الّو بنایئے
منڈھے چڑھے یہ بیل تو اپنا بھی نام ہو — اب کچھوے کی نسل بھی عالی مقام ہو
پہنچا یہ خوب سوچ کے خدمت میں سانپ کی — ہیبت تھی دل میں سانپ کی اور فکر آپ کی
ہمت سے کام لے کے کہی بات صاف صاف — "منھ چھوٹا اور بات بڑی ہے خطا معاف
اس اپنی دوستی کو مثالی بنایئے — کچھ اس غریب کی بھی تو عزت بڑھایئے
فرزندی میں قبول جو کرلیں مجھے جناب — کہلاؤں زندگی میں بہر طور کامیاب
دختر کو آنجناب کی رکھوں گا شان سے — تاروں کا ہار پیش کروں آسمان سے"
تھا سانپ ذی شعور، طرح دار، ہوشمند — دل توڑنا کسی کا بھی اس کو نہ تھا پسند
ہنس کر کہا کہ "ٹھیک ہے، پر ایک بات ہے — بارش کے دن ہیں اور مرا تنگ ہات ہے
تجھ کو بھی آج بیاہ رچانے کا لطف کیا — شادی کے واسطے ابھی موسم ہے بے مزا
دن گرمیوں کے آئیں تو خوشیاں منائیو — اپریل یا مئی میں یہ شادی رچائیو"

ہم ناک بھوں کسی کی غرض پر چڑھائیں کیوں
مرتا ہو جو شکر سے اسے وِش[۲] پلائیں کیوں

۱؎ سرولا ۔ ۲ ۔ زہر

شہیر امام

رانی، جو گھڑیال بن گئی

(ایک لوک کہانی)

بہت زمانہ گزرا، کہیں ایک راجا رہتا تھا۔ اسے کسی چیز کی کمی نہ تھی، سوائے اس کے کہ اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اسی غم میں گھلا جاتا تھا۔ ملکہ اور اس کی رعایا بھی اداس رہتے۔ راجا دن رات اسی فکر میں غلطاں رہتا اور وہ برابر خدا سے یہ دعا کرتا کہ وہ اسے ایک بیٹا عطا کرے۔

آخر خدا نے راجا کی دعا قبول کر لی اور رانی نے ایک لڑکے کو جنم دیا۔ راجا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ جب وہ اپنے لڑکے کو دیکھنے گیا تو اس نے رانی سے کہا "میرے بیٹے کو دیکھنے بہت سے لوگ آئیں گے۔ اس لیے بہتر ہو تاکہ تم ندی میں نہلا کر اُسے عمدہ کپڑے پہنا دیتیں۔"

رانی بچے کو لے کر ندی پر گئی۔ جب وہ اسے نہلا رہی تھی تو بدقسمتی سے وہ بچہ اس کے ہاتھ سے پھسل کر ندی میں گر گیا اور ایک مچھلی اسے نگل گئی۔ رانی اس صدمے کو برداشت نہ کر سکی۔ اس کی زندگی میں جیسے اندھیرا چھا گیا۔ وہ بہت دیر تک روئی اور جب اپنے محل کی طرف لوٹنے لگی تو اس کے پاؤں لڑکھڑا گئے، وہ گر پڑی۔ اس کا چہرہ چھل گیا اور اس سے خون رسنے لگا۔

گھر پہنچ کر جب اس نے پوری کہانی راجا کو سنائی تو وہ غصّے سے لال پیلا ہو گیا۔ اس نے جب رانی کے چہرے پر خون کا دھبّہ دیکھا تو اسے شبہ ہوا کہ رانی اس کے بیٹے کو کھا گئی ہے۔ اسے اس قدر طیش آیا کہ اس نے رانی کو اسی وقت دریا میں پھینک دیا۔

وہ مچھلی جو کچھ دیر پہلے شہزادے کو نگل گئی تھی، ایک ماہی گیر کے ہاتھوں پکڑی گئی۔ جب مچھیرا اپنے گھر واپس آیا تو اس نے اپنی بیوی سے کہا "دیکھو آج کتنی بڑی مچھلی لایا ہوں۔" لیکن جیسے ہی وہ مچھلی کو کاٹنے لگا، مچھلی قہقہہ لگانے لگی۔ دونوں میاں بیوی حیران و پریشان ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

اس کے بعد جب مچھیرے نے انتہائی ہوشیاری سے مچھلی کے پیٹ کو چیرا تو اس میں سے ایک خوبصورت لڑکا نکلا جو ابھی تک زندہ تھا۔ وہ دونوں بہت خوش ہوئے کیوں کہ خود ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔

آخر یہ بات راجا کے کان تک بھی پہنچی۔ اس نے سوچا شاید رانی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ بچہ

اس کے ہاتھ سے پھسل کر ندی میں گر گیا اور مچھلی نے
اسے نگل لیا۔ اس لیے وہ بہت سا سونا، چاندی
لے کر مچھیرے کے گھر گیا۔ اس نے اپنے بیٹے کی
کہانی اسے بتائی۔ مچھیرے اور اس کی بیوی کو
راجا پر بہت ترس آیا اور انھوں نے بچّہ راجا
کے حوالے کر دیا اور وہ راجا کو دوبارہ خوش
دیکھ کر بہت مسرور ہوئے۔ انھیں بھی اس احساس
سے فخر محسوس ہوا کہ ان کا گود لیا ہوا بیٹا جس سے
وہ خود بہت پیار کرنے لگے تھے، ایک دن راجا
بنے گا۔

راجا اپنے بیٹے کو محل میں لایا۔ وہ بہت
خوش تھا، لیکن رانی کے ساتھ اپنی ناانصافی کو یاد
کر کے وہ اداس ہو جاتا۔ راجا کو بعد میں پتا چلا کہ رانی
نے گھڑیال کی شکل اختیار کر لی ہے۔ رانی گھڑیال
کو اس بات پر سخت غصّہ تھا کہ بغیر کسی وجہ کے اسے
سزا دی گئی۔ اسی لیے گھڑیال شاید آج بھی انسان
کا دشمن ہے اور جو شخص بھی اس کے نزدیک جاتا
ہے اسے وہ نگل جاتا ہے۔

شہزادہ بڑا ہو کر راجا بنا تو اس نے جو پہلا حکم
دیا وہ یہ تھا کہ کوئی شخص نہ دریا میں گھڑیال کو مار سکتا
ہے اور نہ اس کا شکار کر سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ
اسی وقت سے اس رانی کے احترام میں، جس نے
بلا وجہ اپنی جان کھوئی، اس جنگل کے اندرونی حصّے
کی چھوٹی سی ندی میں نہ تو کوئی گھڑیال کو جان
سے مارتا ہے اور نہ اس کا شکار کرتا ہے۔

★

جناب مفتوں کوٹوی

پندرہ اگست

(سب مل کے مسکراؤ کہ ہے پندرہ اگست)

خوشیوں کے گیت گاؤ کہ ہے پندرہ اگست
سب مل کے مسکراؤ کہ ہے پندرہ اگست
ہر سمت قہقہے ہیں چراغاں ہے ہر طرف
تم خود بھی جگمگاؤ کہ ہے پندرہ اگست
ہر گوشۂ وطن کو نکھارو، سنوار دو
مہکاؤ، لہلہاؤ کہ ہے پندرہ اگست
رکھو نہ صرف خندۂ گل ہی نگاہ میں
کانٹوں کو بھی ہنساؤ کہ ہے پندرہ اگست
روحیں امان و امن کی پیاسی ہیں آج بھی
پیاس ان کی اب بجھاؤ کہ ہے پندرہ اگست
شمعِ خلوص و انس کی مدھم ہے روشنی
لَو اور کچھ بڑھاؤ کہ ہے پندرہ اگست
یہ عہد تم کرو کہ فسادات پھر نہ ہوں
ہاں آگ یہ بجھاؤ کہ ہے پندرہ اگست
اونچا رہے شرافت و اخلاق کا علَم
پرچم بلند اٹھاؤ کہ ہے پندرہ اگست

اہلِ وطن کے دل میں بھرو رنگ پیار کا
مفتوں قلم اٹھاؤ کہ ہے پندرہ اگست

حبیب الرحمٰن حیرت

ٹماٹر کی کہانی اس کی زبانی

پہلے زمانے میں لوگ کچی سبزیاں اور پھل زیادہ کھاتے تھے۔ کچی سبزیاں اور پھل صحت کے لیے زیادہ مفید ہوتے ہیں۔ مسالوں اور زیادہ پکانے سے سبزیوں اور پھلوں کی قوت دینے کی طاقت کم ہو جاتی ہے سبزیوں اور پھلوں کو زیادہ پکانے سے ان میں صحت خراب کرنے والے نقص بھی پیدا ہو جاتے ہیں کیوں کہ ان کے وٹامن جل جاتے ہیں۔

وٹامن کی کافی مقدار حاصل کرنے کے لیے ہمیں کچی سبزیاں استعمال کرنی چاہییں۔ ایسی سبزیوں میں چقندر، گاجر، مولی، ٹماٹر، پیاز، خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ ان سب میں ٹماٹر سب سے اچھی سبزی ہے۔ یہ پھل بھی ہے اور سبزی بھی۔

آیئے آج ہم آپ کو ٹماٹر کی کہانی اُسی کی زبانی سناتے ہیں۔

"میں شروع میں جنوبی امریکہ میں خودرو پودے کی شکل میں اُگتا تھا۔ مگر لوگ مجھ کو کھاتے نہیں تھے۔ بعض لوگ تو مجھ کو زہریلا پودا سمجھتے تھے۔ بعد میں لوگ میری اچھائیوں کو سمجھ کر مجھے سبزی اور ترکاری کے روپ میں استعمال کرنے لگے اور مجھے "سونے کا سیب" کہنے لگے۔ کیوں کہ میں اتنا ہی خوبصورت خوش مزہ اور چمکیلا تھا۔

انگلینڈ میں میری کاشت سترھویں صدی میں شروع ہوئی۔ اس وقت مجھے "لو ایپل" (Love Apple) کہتے تھے اور مجھے گلدانوں میں پھول کی حیثیت سے لگایا جاتا تھا۔ اب مجھے دنیا کے ہر ملک میں اُگایا جاتا ہے۔ میں سردی اور گرمی دونوں موسموں میں اُگتا ہوں۔ میری ترکاری بنتی ہے۔ اس کے علاوہ میرے رس سے مختلف قسم کے ساس اور چٹنیاں بنتی ہیں۔ بعض ملکوں میں میرا حلوہ بھی بہت پسند کیا جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق میں دنیا میں ہر سال کم سے کم تین کروڑ ٹن استعمال کیا جاتا ہوں۔ حقیقتاً میری جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ ڈاکٹر میرے استعمال پر بہت زور دیتے ہیں کیوں کہ مجھ میں نمک اور معدنیات کی بڑی مقدار رہتی ہے جو خون کو صاف اور تازہ رکھتے ہیں اور اُسے بگڑنے سے روکتے ہیں اور خارش ہونے نہیں دیتے۔ پھر مجھ میں فاسفورس اور فولاد بھی ہوتا ہے ایسے امراض میں مجھے بہت استعمال کرتے ہیں جو وٹامن سی کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مہنگائی کے اس زمانے میں جب درمیانہ طبقہ کے لوگوں کو انڈا، دودھ، مچھلی، اور مکھن ملنا دشوار ہوتا ہے تو وہ لوگ مجھے استعمال کرتے ہیں۔

باقی صفحہ ۳۰ پر

خضر برنی

سندر گڑھ کا ایک راجا تھا، سیدھا سادہ اور نیک، سب لوگ اس کی عزّت کرتے تھے، اس راجا کو بچے، بوڑھے، جوان سب ہی دادا کہہ کر پکارتے ، اور تھے بھی سچ مچ وہ بوڑھے اور عقل مند۔ وہ سدا ہی اپنے محل سے باغ تک اور گانو سے بازار تک پیدل سفر کرتے۔ جو بھی راستے میں ملتا ، اسے خود ہی سلام کرنے کی کوشش کرتے۔ کسی کو سلام کرنے کا پہلے موقع نہ دیتے۔ رعایا، نوکر، چاکر اور خاندان کے دوسرے لوگ ، ان سے کہتے " دادا راجا آپ رعایا کو اور چھوٹے بچوّں کو سلام کرتے ہیں، یہ بات تو کسی راجا کو زیب نہیں دیتی ، رعایا کے لوگ آپ کے پیر چھونا چاہتے ہیں تو آپ منع کر دیتے ہیں۔ رعایا تو آپ کو اوتار کی طرح مانتی ہے۔ اگر آپ انھیں برابری کا موقع دیں گے تو وہ بغاوت بھی کر سکتے ہیں، بدتمیزی کو اپنا سکتے ہیں ؛؛

وہ کہتے" خدا نے انسانوں کو برابری کا درجہ دیا ہے۔ بڑائی چھوٹائی تو اعمال کی بات ہے۔ جس کے اعمال اچھے ہوئے وہ " بزرگ ،، بن گیا اور جس کے اعمال اچھے نہیں وہ نیچ بن گیا ، ڈاکو بن گیا ، برا آدمی بن گیا ؛؛

راجا گنیش رام کا ایک ہی لڑکا تھا جس کا نام اشوک تھا جب وہ ۱۴ برس کا ہوا تو ایک دن وہ اشوک کو ایک سرکس میں لے گئے۔ یہ سرکس بہت بڑا تھا۔ ہاتھی، اونٹ، گھوڑے۔ شیر، گیدڑ، چڑیاں ، ہنس کا جوڑا، بھیڑ بکریاں اور بندر سب ہی اس میں موجود تھے۔ سب نے اپنے اپنے کرتب دکھائے۔ اشوک نے پہلی بار ایسا تماشا دیکھا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جانور بھی سلام اور رام رام کے لیے ہاتھ اٹھا سکتے ہیں۔

شیر کے ساتھ بکری بھی کھیل سکتی ہے۔ بندر توپ چلا سکتا ہے اور ہر جانور، انسان کے اشاروں پر چل سکتا ہے، مگر پیار سے، پریم سے ، کیوں کہ انھیں ہر وقت مارا نہیں جاتا۔ اشوک کو بڑا اچنبھا ہوا، اور اس نے دل میں سوچا۔ پتاجی ٹھیک ہی کرتے ہیں۔ پیار محبّت سے سب کا دل جیتنے کے لیے وہ ہر بڑے چھوٹے کو نمستے ، رام رام اور سلام سکھاتے ہیں۔ سب کی عزّت کرتے ہیں سب کو پیار سے بہلاتے ہیں۔ تب ہی تو سب کے دلوں میں ان کے نظریات کے چراغ جل رہے ہیں۔ راجا کا کوئی مخالف نہیں۔ جب کسی گانو کے دو فرقوں میں ، دو ٹولوں میں اَن بن ہوتی ہے ، تو راجا کو

ہاں اسی لیے بلوایا جاتا ہے کہ ان کا من بڑی
توں اور پاپ سے دھلا ہوا ہے، صاف ہے،
ہ ناجائز طور پر کسی کی طرفداری نہیں کرتے وہ تو
سب کی بھلائی چاہتے ہیں۔ وہ سب کی ترقی کی بات
سوچتے ہیں، اشوک کے دل میں اپنے والد کا احترام
بڑھ گیا۔ اب اس نے بھی یہ بات گانٹھ میں باندھ لی
اور جب محل سے باہر نکلتا، سب کو ہاتھ جوڑ کر
رام رام اور سلام کرتا۔ کسی کو کبھی موقع نہ دیتا کہ
وہ اشوک کو پہلے رام رام کرے۔ جب خاندان
کے لوگوں نے اور نوکر چاکر، اور سپاہی پیادوں
نے اشوک کے ایسے خیالات دیکھے تو سب نے
ہی اس کی دیکھا دیکھی اس اچھے چلن کو اپنا لیا اور
ساری کی ساری جنتا ایک دوسرے سے پیار و
محبت کے ساتھ پیش آنے لگی، پنچایت میں جتنے مقدمے
اور لڑائی جھگڑوں کی باتیں تھیں ختم ہونے لگیں
اور دھیرے دھیرے تمام ریاست میں راجا صاحب
اور اشوک کو لوگ دیوتا کے روپ میں دیکھنے لگے۔
بچو! تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اگر انسان
کا اپنا عمل بھی ٹھیک ہو تو برائی اور نفرت دور
بھاگ جاتی ہے۔ انسان کا جسم لہو ترجل کی
مانند ہو جاتا ہے۔ نیکی امر ہے اور بدی، شور کھا
بن کر جنگل میں بھٹک جاتی ہے۔ نیکی کرموں
کے ذریعے دوسرے انسان کا من جیت لیتی
ہے۔

★★

★ اچھے عمل سے زندگی بنتی ہے اور
محنت سے علم و ہنر۔

نوگل بھارتی

میرے ارادے

میں ہوں اس گلستاں کا ننھا سا پودا، شجر بن کے دنیا کی خدمت کروں گا
میری چھاؤں میں لوگ بیٹھیں گے آکر، میں دل کھول کر ان کا سواگت کروں گا
بزرگوں کی عزت، بڑوں کا ادب، ننھے بچوں سے دل سے محبت کروں گا
جو نفرت کا برتاؤ مجھ سے کریں گے، میں ان سے بھی پیار اور الفت کروں گا
میں نفرت کی دیوار کو توڑ دوں گا، میں ہر دل پہ نقشِ وفا چھوڑ دوں گا
محبت سے پیش آئے بھائی سے بھائی، میں دور اس جہاں سے جہالت کروں گا
بزرگوں سے میں نے یہ اکثر سنا ہے کہ فردوس ہے ماں کے قدموں کے نیچے
میں توفیق سے بڑھ کے ماں باپ کی اپنے خدمت کروں گا، اطاعت کروں گا
ہو نازاں کوئی جاہ و حشمت پہ اپنی، مجھے ناز ہے اپنی بے مائیگی پر
کرم سے ملے گا جو مولا سے اپنے، اسی پر میں صبر و قناعت کروں گا
اسی میں ملے گا سکون و مسرت، اسی میں میں پاؤں گا سامانِ راحت
نہ اس سے زیادہ کی چاہت کروں گا، نہ اس سے زیادہ کی حسرت کروں گا
برائی کی راہوں سے ہے پیار جن کو میں سائے سے بھی ان کے بچ کے رہوں گا
برے لوگ دنیا میں جتنے ہیں نوگل خدا کی قسم ان سے نفرت کروں گا

بقیہ سائنس کی کہانی صک۲ سے

نمبر دو سورج کے گرد چکر کاٹ رہی ہے جس سے موسم بنتے ہیں۔

نمبر تین سورج کی کشش میں سورج کے ساتھ کہکشاں کے مرکزِ کشش کے گرد گھوم رہی ہے۔

نمبر چار پوری کہکشاں کے ساتھ حرکت کر رہی ہے۔

اسی بحث کو دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھیے۔

ابھی ہم بتلا چکے ہیں کہ دنیا کی ہر شے مادے سے بنی ہے اور مادہ ایٹموں یا سالموں سے مل کر بنا ہے۔ یہ سالمے ہر وقت گردش میں رہتے ہیں خود ایٹم کی ساخت میں اس کا ایک حصہ الیکٹرون ہمیشہ گردش میں رہتا ہے مرکزہ میں بھی ہمیشہ ایک ارتعاش رہتا ہے۔ اس لئے کائنات کی کوئی شے ساکت نہیں بلکہ حرکت میں رہتی ہے اس لیے دوسرے لفظوں میں حرکت کا نام توانائی ہے۔

آدھی ملاقات

جون ۱۹۷۷ء کا پیام تعلیم خلاف توقع کافی دیر سے وصول ہوا۔ ٹائیٹل بہت جاذب نظر ہے۔ اس پرچے میں صفحات کی کمی کھٹکی پھر بھی پرچہ جاندار ہے۔ نظموں میں "بچوں کی دعا" بہت پسند آئی۔ مضامین میں زرّافہ، شتر مرغ بہت معلوماتی مضامین ہیں۔ پرچہ عام معلومات کافی معلوماتی ہے۔

کہانیوں میں "چڑی مار اور توتا" نیلا پرندہ اور سچی پیاس بہت اچھی کہانیاں ہیں کئی ماہ سے آپ نے تصویروں کا سلسلہ پھر بند کر دیا ہے۔ بچوں کے پرچے میں تصویریں ضرور ہونی چاہییں براۓ مہربانی تصویروں کے بغیر پرچے کو پھیکا پھیکا نہ کیجیے۔ پہلے آپ نے جوبلی نمبر کا اعلان کیا تھا۔ شاید آپ نے اس کا ارادہ ترک کر کے تیتر نمبر نکالنے کا اعلان کیا ہے۔

"بچوں سے باتیں" میں اس کا جواب دینے کی کوشش کیجیے گا۔

مجھے امید ہے کہ اگست کا شمارہ یعنی تیتر نمبر آفسٹ پر نکلا ہوا، تصویروں سے سجا ہوا اور رنگین ہوگا۔ خدا کرے ایسا ہی ہو میں آپ کو ایک رائے دے رہا ہوں کہ آپ پیام تعلیم کی قیمت میں اضافہ کر کے پیام تعلیم کو خوبصورت اور رنگین بنا کر شائع کیجیے۔ امید ہے اس حقیر رائے کی طرف نظر عنایت ہوگی۔

مسعود ظہیر نقوی

مؤدبانہ گزارش ہے کہ ماہ جون بابت پیام تعلیم کا تازہ شمارہ پیوست ہوا۔ حسب معمول ورق گردانی کرتے ہوئے مہر مدولوی صاحب کی وفات کی خبر سے دل کو بہت ملال ہوا۔ مرحوم مہر صاحب اُردو کے خاموش خادم تھے۔ آپ کہنہ مشق شاعر ہونے کے باوجود آخری دم تک بچوں کے لیے لکھتے رہے۔ مہر صاحب کو اُردو کے ساتھ فراخی پر بھی عبور حاصل تھا۔ سیاسی داؤں پیچ سے نابلد ہونے کی وجہ سے اپنے ہم عصروں میں بھی وہ اپنا مقام بنا سکے۔ نہ جانے آپ نے کتنے ہی نوآموز قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کی۔

نوگل بھارتی

ہنسو اور ہنساؤ

رحیم: میرے دادا کی عمر اس وقت سو برس ہے۔
کریم: ارے تو کون سی زیادہ عمر ہو گئی۔ اگر میری دادی زندہ ہوتیں تو ان کی عمر ایک سو پچاس کی ہوتی۔
ڈاکٹر: لیجیے یہ دوا تین مرتبہ آنکھ میں ڈال لیجیے گا۔
مریض: بہت بہتر۔ مگر کھانے سے پہلے یا کھانے کے بعد؟

(عادل کھلگانوی)

بچّوں کی کوشش

بے ایمانی کا نتیجہ

بہت پرانی بات ہے ایران کے کسی شہر میں دو آدمی تھے جن کا نام ذکی اور احمد تھا۔ ذکی بے ایمان اور چالاک تھا لیکن احمد ایمان دار اور سیدھا سادا تھا۔ دونوں میں دوستی بھی تھی۔

ایک دن دونوں دوست کہیں جا رہے تھے راستے میں انھیں ایک سونے کے سکّوں کی تھیلی پڑی ہوئی ملی۔ دونوں نے اُسے ایک سنسان جگہ ایک بہت پرانے پیڑ کے نیچے گاڑ دیا اور یہ طے کرکے اپنے اپنے گھر چلے گئے کہ پھر کبھی جب ضرورت ہوگی تو اسے نکال کر آدھا آدھا بانٹ لیا جائے گا۔

پھر تھوڑی ہی دیر میں ذکی آیا اور وہ اشرفیوں کی تھیلی نکال کر اپنے گھر لے گیا۔ اور وعدہ کرنے کے باوجود احمد کو کچھ نہ دیا۔

اب ایک دن احمد کو بھی کچھ روپیوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ ذکی کے پاس آیا اور بولا کہ آؤ چل کر وہاں سے وہ تھیلی نکالی جائے اور روپے بانٹ لیے جائیں۔ ذکی نے بڑی خوشی سے جواب دیا کہ ہاں چلو۔ مجھے بھی پیسوں کی ضرورت ہے۔ وہ دونوں وہاں گئے۔ گڑھا کھودا تو معلوم ہوا کہ تھیلی غائب ہے۔ یہ دیکھتے ہی ذکی نے الٹا احمد کا گریبان پکڑ لیا اور ڈانٹ کے کہا "تم ہی سارا روپیہ لے گئے اور پھر میرے گھر آئے تھے کہ چلو وہاں سے روپے لے آئیں ..... تم چور ہو میں تمھیں قاضی کے پاس لے جاؤں گا۔"

پھر دونوں شہر کے قاضی کے پاس پہنچے۔ قاضی نے ان کی باتیں سنیں اور کہا "کل شام کو اُسی پیڑ کے نیچے فیصلہ ہوگا۔"

ذکی نے گھر آکر اپنے باپ حامد کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ پیڑ کے تنے میں بنی ہوئی کھوہ میں بیٹھ جائے اور جب قاضی آکر کھڑا ہو جائے تو وہ اس کھوہ میں سے کہے کہ وہ ایک جن کا درخت ہے اور بولنے کی طاقت رکھتا ہے۔ پھر یہ کہے کہ میں دیکھ رہا تھا کہ اشرفیوں کی تھیلی احمد لے گیا ہے۔

دوسری شام کو قاضی کچھ نوکروں کو لے کر وہاں پہنچا جہاں پر انھوں نے وہ تھیلی گاڑی تھی۔ احمد اور ذکی وہاں پہلے ہی سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ قاضی وہاں پہنچ کر کھڑے ہی ہوئے تھے کہ درخت سے آواز آئی کہ "میں ایک جن کا پیڑ ہوں۔ آپ لوگ حیران نہ ہوں۔ میں بولنے کی طاقت رکھتا ہوں۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ وہ تھیلی ذکی نہیں لے گیا بلکہ احمد لے گیا ہے۔" اتنا کہہ کر پیڑ خاموش ہو گیا۔ قاضی پہلے تو حیران ہوا۔ لیکن فوراً ہی صحیح بات جان گیا اور اپنے نوکروں سے کہا "ہم اس پیڑ کی سچائی کا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ اس لیے تم لکڑیاں جمع کرکے اس پیڑ کے چاروں طرف جمع کر دو۔ جلدی کرو... "

نوکروں نے پہلے حیرت سے قاضی کی طرف دیکھا اور پھر اپنے کام میں لگ گئے.... تھوڑی دیر میں قاضی نے یہ کہتے ہوئے لکڑیوں میں آگ لگا دی کہ اگر یہ پیڑ سچّا ہے تو نہیں جلے گا۔ اور اگر جھوٹ بول رہا ہے

توجل کر خاک ہو جائے گا۔

تھوڑی ہی دیر میں پیڑ جلنے لگا اور پیڑ سے 'مدد... مدد..... مدد کی آوازآنی شروع ہو گئی ذکی دوڑ کر گیا اور اپنے جلے ہوئے باپ کو نکال لایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے قاضی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

ذکی نے قاضی کے قدموں پر سر رکھ دیا اور کہا "حضور، میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ میری بے ایمانی سے میرا باپ بھی مارا گیا...... حضور.... مجھے امید ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں گے۔"

قاضی نے ذکی کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ جاؤ..... میں نے تمہیں معاف کیا.... لیکن اب ایسی حرکت نہ کرنا۔ ذکی نے آدھے روپے احمد کو دے دیے...... احمد نے دیکھا وہ رو رہا تھا۔ اس نے ذکی کو گلے لگا لیا اور کہا کہ بھائی ایسی غلطی انسان سے ہو ہی جاتی ہے۔ چلو گھر چلو۔

★★

بقیہ صہ ۲۴ سے ٹماٹر کی کہانی اس کی زبانی

میرا اور سیب کا ایک سا فائدہ ہے۔ ماہروں کا خیال ہے کہ ایک سیر دودھ کے بجائے میرا چند اونس عرق کافی ہے۔ سنگترے کا رس نہ ملے تو میرا رس لیجیے۔ اگر آپ مجھے ہفتے میں سیر ڈیڑھ سیر استعمال کریں تو جسم کی معدنی اور حیاتینی کمی پوری ہوتی رہے گی میرے استعمال سے دانت اچھے رہتے ہیں اور جسم صحت مند رہتا ہے" غرض غریب بھائیوں کا میں سیب ہوں اور میری خواہش ہے کہ وہ مجھے استعمال کر کے چاق و چوبند رہیں۔"

★★

بڑھے چلو

ابراہیم اختر

علم و ہنر کا نے کے سہارا بڑھے چلو
ہوگا جہاں میں نام تمہارا بڑھے چلو

رستہ اگر کٹھن ہے تو ہمت سے کام لو
بڑھتے رہو عزیزو! تھکن کا نہ نام لو

منزل کی آرزو میں خدارا بڑھے چلو
ہوگا جہاں میں نام تمہارا بڑھے چلو

وہ پیچھے رہ گئے ہیں جو مشکل سے ڈر گئے
ہمت جواں تھی جن کی وہ ہی بے خطر گئے

بہتا رہے گا وقت کا دھارا بڑھے چلو
ہوگا جہاں میں نام تمہارا بڑھے چلو

منزل کا نام خود ہی بڑھائے گا حوصلہ
آخر نہ ڈگمگائے ارادوں کا قافلہ

خود شوق راہبر ہے تمہارا بڑھے چلو
ہوگا جہاں میں نام تمہارا بڑھے چلو

کتابوں کی باتیں

خوشحال زیدی

مرتبہ: منیر المحوی صدیقی
ناشر: معیار ادب بکڈپو، بھوپال
قیمت: چھ روپے

" بالک باغ " علامہ محوی صدیقی کی چند منظومات کا مجموعہ ہے۔ ان نظموں میں بچّوں کے ادب کی تمام دلچسپیاں موجود ہیں۔ ان نظموں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کو نہ صرف بچّوں اور بچّوں کے ادب سے دلچسپی تھی۔ بلکہ انھوں نے بچّوں، بچّوں کی نفسیات، عادت اطوار دلچسپیوں، ان کی پسند ناپسند کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس کے لیے ہی انھوں نے اتنی خوبصورت، دلچسپ، نصیحت آمیز، چھوٹی چھوٹی اور مزیدار نظمیں لکھیں جو کہ نہایت آسان اور عام فہم زبان میں ہیں محوی صدیقی بچّوں کے مزاج، بچّوں کی رغبت اور نفرت کے جذبوں سے آگاہ ہیں۔ " بالک باغ " کی نظموں میں محوی نے جن موضوعات پر طبع آزمائی کی اور اسلوب اپنایا ہے، وہ بچّوں کے لیے نہایت دلکشی کا حامل ہے۔ بچّوں کے ادب کی یہ خاص خوبی ہے کہ اس کی زبان نہایت آسان ہو، بچے کی اپنی زبان ہو۔ بچّے کی روزمرّہ زندگی میں مستعمل الفاظ ہوں۔ طرز ادا اور اسلوب بیان ایسا ہو کہ بچّے خوشی خوشی ان نظموں کو پڑھیں۔ ان میں دلچسپی لیں ان کو پڑھ کر مسرت محسوس کریں۔ محوی صاحب کی ان منظومات میں یہ خوبیاں موجود ہیں۔

نظم " چاند کو دیکھ کر " میں بچّہ اپنی ماں سے پوچھتا ہے۔

یہ جو آسماں پہ آتا
سرِ شام جگمگاتا
چمک اپنی ہے دکھاتا
مرے دل کو ہے لبھاتا
مجھے دور سے بلاتا
یہ ہے کس کا چاند اماں

بچّوں کے ادب کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس کی بنیاد علم اور اخلاق پر ہو اور اس کے مقاصد اچھی تعلیم اور تربیت پر مبنی ہوں جو کہ بچوں کی فطری صلاحیت کو پیدا کر سکیں۔ " بالک باغ " کی ابتدائی نظمیں خدا کی تعریف، اس کی نعمتوں اور مہربانیوں کے تذکروں پر مشتمل ہیں جن سے بچّے خدا اور اس کی عظمت کو پہچانیں۔ ان نظموں کو پڑھنے سے بچے خدا کے قریب آتے ہیں۔

محوی صاحب کی بیشتر نظموں کی بنیاد علم اور اخلاق پر ہے، عید کی خوشی ہو یا بقرعید، ماں باپ کی محبّت ہو، یا ماں باپ کے احسان،

ہر جگہ علم و اخلاق کا درس موجود ہے۔

بالک باغ میں ایسی دلچسپ نظمیں بھی موجود ہیں جن سے بچوں کو صحت، صفائی، تفریح، ورزش وغیرہ کے بارے میں مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ گلی ڈنڈا، اسکول کی چھٹی، برسات کی سیر، گلی ڈنڈے کا کھیل وغیرہ ایسی ہی نظمیں ہیں۔

بچوں کی سیرت میں مذہبی عقائد بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ محوی صدیقی نے "ہمارے سچے نبی" ہمارے نبی کے کام، وغیرہ نظموں کے کے ذریعے بچوں کے ذہن پر ہمارے نبی اور خدا اس کے جاہ و جلال اور نعمتوں کا نقش بٹھانے کی کوشش کی ہے۔ بچوں میں کیا؟ کیوں؟ اور کیسے....؟ جیسے سوالات کی عادت ہوتی ہے۔ ایسی نظمیں، پہیلیاں اور کہانیاں وہ بڑی دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ گھڑی کی کہانی۔ گلاب کا پھول، عقل کیا چیز ہے؟ چڑیاں وغیرہ ایسی ہی نظمیں ہیں۔

مختصر یہ بچوں کے ادب کی جملہ خصوصیات "بالک باغ" کی نظموں میں موجود ہیں —— سہیل المحوی صدیقی صاحب نے علامہ محوی صدیقی کی ان منظومات کے مجموعہ کو شائع کرکے بچوں کے ادب میں ایک گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ یہ مجموعہ اترپردیش اردو اکادمی کی مالی معاونت سے شائع کیا گیا ہے۔

خوشحال زیدی

بچوں کی کتابیں

مذہب

کتاب	مصنف	قیمت
ارکانِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۱/۶۰
آں حضرتؐ	الیاس احمد مجیبی (اردو)	۰/۸۰
آں حضرت	الیاس مجیبی (ہندی)	[illegible]/۶۰
پاک کہانیاں (دو حصوں میں)	مقبول احمد سیوہاروی	۳/۰۰
چار یار	الیاس احمد مجیبی	۲/۵۰
خلفائے اربعہؓ	خواجہ عبد الحئی فاروقی	۳/۰۰
رسولِ پاکؐ	عبد الواحد سندھی	۲/۰
عقائدِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۰/۶۰
مسلمان بیبیاں	مولانا اعجاز الحق قدوسی	۱/۰
نبیوں کے قصے	خواجہ عبد الحئی فاروقی	۱/۲۵
ہمارے رسول	" "	۲/۴۰
ہمارے نبی (اردو)	سید نواب علی رضوی	۱/۲۰
ہمارے نبی (ہندی)	سید نواب علی رضوی	۰/۴۰
سرکارِ دو عالم	محمد حسین حسان ندوی	۲/۰۰

معلومات

کتاب	مصنف	قیمت
آدمی کی کہانی	مشتاق احمد	۲/۰۰
انوکھا عجائب خانہ (چار حصے)	محمد حسین حسان ندوی	۲/۰۰
جادو کے کھیل	اطہر پرویز	۰/۶۰
بجلی کی کہانی	علی احمد خاں	۰/۵۰
پڑدادا کی کہانی	محمد عبد الغفور	۰/۸۰
تاریخِ ہند کی کہانیاں (اول)	خجستہ سلطان	۱/۰
" " " " (دوم)	ضیاء الرحمٰن	۱/۲۰
" " " " (سوم)	مشتاق احمد اعظمی	۱/۰۰
" " " " (چہارم)	" " "	۱/۲۵
خبر رسانی کے طریقے	رفیعہ منظور الامین	۱/۰۰
دنیا کے بچے	محمد حسین حسان ندوی	۱/۲۵
دہلی	ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی	۲/۰۰

کتاب	مصنف	قیمت
رابندر ناتھ ٹیگور	صفدر حسین	۲/۹۰
سماجی زندگی (چار حصے)	احمد پٹیل و غلام ابرار	۲/۹۰
قدرت کے کرشمے	(مرتبہ) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۰/۸۰
سمندر کے کنارے	سلطانہ آصف فیضی	۱/۵
سمندر کے نیچے	" " "	۲/۵
بیرانیس	محمد حسین حسان ندوی	۲/-
چچا غالب (مرتبہ)	" "	۲/-

کہانیاں، ڈرامے، ناول

کتاب	مصنف	قیمت
جن حسن عبد الرحمٰن (ناول) دو حصے		۵/۰۰
اس نے کیا کرد جانا (کہانیاں)	آصف مجیب	۰/۳۷
پریم کی جیت (ڈراما)	اسد اللہ کاظمی	۰/۳۷
تانبیل خاں (کہانی)	محمد حسین حسان ندوی	۰/۵۰
ترکوں کی کہانیاں (کہانی)	مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۰/۵۵
تیس مار خاں کے کارنامے (ناول)	م۔ ندیم	۱/۵۰
تین اناڑی (ناول)	عصمت چغتائی	(زیرِ طبع)
چمپاوت کا آدم خور شیر (سچی کہانی)	محمد معین	۰/۳۵
جھلی لالٹین	مشتاق احمد	۰/۳۵
چقماق کی ڈبیا	برکت علی فراق	۰/۴۰
خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا	کوثر بانو	۰/۴۰
شیدا	پروفیسر محمد مجیب	۰/۵
چنبیلی	محمد حسین حسان ندوی	۰/۵۰
ستاروں کی سیر (ناول)	کرشن چندر	۲/۰۰
کوسنے دادا (سچی کہانی)	مجیب احمد خاں	۲/۰۰
لال مرغی (کہانی)	عبد الواحد سندھی	۰/۵۰
مزہ چکھائیں گے (ڈراما)	مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۰/۳۵
مزے دار پہیلیاں	(مرتبہ) محمود علی خاں	(زیرِ طبع)
ننھا ٹٹو (کہانی)	خورشید سلطان	۰/۳۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

پیامِ تعلیم

مترصاحب مہر دمال کھول - حیدر آباد دکن میں ۷- ۱۹۶۹

مترصاحب ۱۹۶۹ء

مترصاحب ڈیرہ دون میں علالت کے زمانے میں ۲۸ ۷

مترصاحب ۲۸ نومبر ۱۹۷۶ء

ماہنامہ **پیامِ تعلیم** نیر نمبر

نئی دلی نمبر ۲۵

جلد ۱۴ ——— شمارہ ۹

اڈیٹر
ولی شاہجہان پوری

معاون
صفیہ حسان

ستمبر ۱۹۷۷ء

[...]ت فی پرچہ ۷۰ پیسے
[...]لانہ چندہ سات روپے
[...]ی شمارے کی قیمت پانچ روپے

فہرست

پرنٹر پبلشر سید احمد دلی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دلی ۲۵ سے شائع کیا۔

ایک ملک — ایک قوم

ایک ہسپتال میں —

ڈاکٹر ڈورائے سوامی کو یہ توقع نہ تھی کہ وہ اتنا لمبا عرصہ دہلی میں رہیں گے۔ مگر ان پندرہ برسوں میں ان کو بہت سے دوست مل گئے ہیں۔ وہ دل وجان سے کام کرتے رہے ہیں اور ان کی زندگی ثمرآور حد تک مصروف رہی ہے — ان کے ساتھ کام کرنے والے ڈاکٹروں میں ذہین اور روشن دماغ مرد اور عورتیں ہیں جو گھروں میں مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ وہ دور و نزدیک کئی مقامات سے آئے ہیں۔ مگر ہسپتال میں وہ صرف ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ اور وہ ہے شفقت کی زبان — شفقت کوئی حد بندی نہیں مانتی۔

حد بندیاں نکمے آدمیوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہیں، ان کو دور کرنے میں مدد کیجیے

"بچّوں کا ادب" اقسامِ ادب کی اب ایک مخصوص اصطلاح بن گئی ہے۔ یورپی زبانوں میں اس ادب کی تعلیمی، نفسیاتی اور معاشرتی اعتبار سے خاصی اہمیت تسلیم کی جاتی ہے۔ اُردو بولنے والا بچّہ اس لحاظ سے قدرے بدنصیب رہا ہے اس لیے کہ ہماری سماج نہ صرف "نرغالب" رہی ہے بلکہ "بالغ غالب" بھی ہے۔ وہ تو خدا بھلا کرے مولوی اسمٰعیل میرٹھی کا کہ انھوں نے وقت کی ضرورت کو پہچانا اور "حقِ طفلاں" کو کما حقہٗ پہلی بار ادا کرنے کی کوشش کی۔

شفیع الدین نیّر صاحب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ ابتدا سے انھوں نے اپنی زندگی بچّوں اور بچّوں کے ادب کے لیے وقف کی اور مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی قائم کردہ روایت کو آگے بڑھایا اس طرح کہ آج وہ "بچوں کے شاعر" کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ بچّوں کے لیے ان کے کلام میں ہمیشہ ایک اخلاقی پیام ہوتا ہے جسے وہ بچّوں ہی کی زبان میں اور محاکات میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں ایک قسم کی درجہ بندی ملتی ہے اس طرح کہ ہر عمر کا بچّہ اپنی اپنی استعداد اور مذاق کے مطابق انتخاب کرسکتا ہے۔ ان نظموں میں یاد ہو جانے کی بھی خوبی پائی جاتی ہے۔ اس لیے کوئی شبہ نہیں کہ نیّر صاحب موجودہ دور کے "بچوں کے" سب سے جانے پہچانے شاعر ہیں۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ مکتبہ جامعہ کی جانب سے "پیامِ تعلیم" کا خاص نمبر اس زمانے کے سب سے بڑے "تعلیمی شاعر" کے لیے نکالا جارہا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تمام بچّے میری طرح اس کا گرم جوشی کے ساتھ خیرمقدم کریں گے۔

مسعود حسین

جامعہ ملیہ اسلامیہ
۲۸ اگست ۱۹۷۷ء

ناقابلِ فراموش

جب کبھی میں کسی ناقابلِ فراموش شخصیت کا خاکہ ریڈرز ڈائجسٹ میں دیکھتا ہوں تو مجھے وہ مرد اور وہ عورتیں یاد آتی ہیں جن سے میں متاثر ہوا ہوں۔ مجھے اپنی دادی جان یاد آتی ہیں جنھوں نے مجھے پرارتھنا کی تعلیم دی اور بڑے بڑے گروؤں کی کہانیاں سنائیں۔ مذہبی تعلیمات سے مجھے جذباتی مسرت تو حاصل ہوتی رہی، لیکن ہائی اسکول تک پہنچتے پہنچتے مذہب سے کچھ دور سا ہوتا گیا۔ میرے بزرگ گرفتہ دار، اُن کے رفقا اور کچھ مقدس ہستیاں ایسی تھیں جو صداقت، جرأت، اور صبر و استقلال کی تعلیم دیتی تھیں۔ اُن میں سے ایک بزرگ ایسے بھی تھے جنھوں نے مجھے مراقبے کی بھی تعلیم دی۔ لیکن میں گھبرا گیا۔ پھر میرے کچھ دوست بھی تھے جن کا میں مداح تھا۔ وہ یا تو اچھے کھلاڑی نکلے، یا فحش مذاق کرنے والے۔ ان سے بھی میرا جی ہٹ گیا۔ صرف ایک شخصیت میری نگاہ میں باقی رہی۔ وہ جناب شفیع الدین صاحب نیّرؔ کی ہے "بچوں کا تحفہ" وغیرہ نامی اُن کی بے شمار منظوم کتابوں کے ذریعے اردو بولنے والی تین نسلیں تو اُن کے نام سے خوب واقف ہوں گی۔ مجھے بھی اس بات کا فخر حاصل ہے کہ میں ان کا پہلا اور چند برسوں تک واحد شاگرد موڈرن اسکول میں رہا ہوں۔ چار سال کی مختصر مدت میں انھوں نے مجھے اُردو گرامر اور ادب سے روشناس کرایا۔ مزید برآں مجھے اسلام سے بھی روشناس کرایا۔ میرے مذہبی تعصبات دور کرائے۔ اُن کی ذاتی شخصیت میرے لیے اس بات کی بھی رہنما ثابت ہوئی کہ پیسہ پیدا کرنا ہی کوئی کام نہیں ہے بلکہ ضمیر کی راہ پر چلنا کام ہے۔ اور یہ کہ ایک شخص اپنے ہم عصروں میں قابلِ احترام جبھی ہوتا ہے جب کہ وہ اصول شکنی سے انکار کرے۔ وہ ایک پختہ کار قوم پرست ہیں۔ پیسے کو انھوں نے کوئی مقام نہیں بخشا۔ انھوں نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ حب الوطنی، سیاست دانوں ہی کی اجارہ داری نہیں ہے۔ اس کے لیے میں اپنا ووٹ اس ناقابلِ فراموش کردار کو دیتا ہوں جس سے میری ملاقات ہوئی اور وہ ہیں جناب مولوی شفیع الدین نیّرؔ۔

(خوشونت سنگھ)
ایڈیٹر السٹریٹڈ ویکلی ۸؍اکتوبر ۱۹۷۷ء

بچوں سے باتیں

لیجیے، محمد شفیع الدین نیر نمبر حاضر ہے۔
مگر ٹھہریے، پہلے ہماری طرف سے عید کی مبارک باد قبول کیجیے۔ یہ شمارہ آپ کو عید الفطر سے تقریباً ایک ہفتہ پہلے مل جائے گا۔ اسے ہماری طرف سے عید کا تحفہ سمجھیے۔

اس نمبر کے صفحات میں نیر صاحب کے ساتھیوں، شاگردوں، ادیبوں اور شاعروں نے جس طرح موصوف کی زندگی کے ہر شعبے پر اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں ان سے آپ موصوف سے متعلق اتنا کچھ جان جائیں گے کہ مزید جاننے کے لیے شاید کچھ باقی نہ رہے۔ اس لیے نیر صاحب کے بارے میں جو کچھ بھی ہم لکھیں گے وہ تکرار ہوگی ان ہی مضامین کی جو آپ ان صفحات میں پڑھیں گے۔

نیر صاحب کی شخصیت، ان کی پچاس سال سے زیادہ عرصے کی ادبی خدمات، بچوں اور بڑوں کے لیے ان کی لاتعداد کہانیوں اور نظموں سے آپ اور آپ کے اکثر بزرگوں نے لطف لیا ہوگا اور بہت کچھ سیکھا بھی ہوگا۔ اس لیے یہاں ہم اپنے اور نیر صاحب کے ذاتی تعلقات اور پیام تعلیم کے ساتھ نیر صاحب کی وابستگی پر تھوڑی سی روشنی ڈالنے پر ہی اکتفا کریں گے۔

پیام تعلیم کا اجرا ۱۹۲۶ء میں ہوا۔ پہلے یہ مہینے میں دو بار نکلتا تھا۔ اس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تعلیمی سرگرمیوں کا ذکر ہوتا تھا۔ کچھ ہی دن بعد یہ بچوں کے لیے [illegible] کی بات [illegible]۔ لگ بھگ اسی زمانے میں نیر صاحب کی نظر عنایت پیام تعلیم پر پڑی اور خدا کا شکر ہے کہ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ خدا کرے یہ تعلق تا دیر قائم رہے۔

نیر صاحب ۱۹۴۵ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ ہوئے۔ راقم ۱۹۵۰ء میں مکتبہ جامعہ آیا۔ تقریباً اسی وقت سے نیر صاحب سے ملاقات کا سلسلہ قائم ہے۔ ابتدا میں یہ علیک سلیک تک محدود رہا۔ پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔ الحمد للہ کہ یہ سلسلہ آج بھی اسی خلوص اور یگانگت کے ساتھ قائم ہے۔ بلکہ پیام تعلیم کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد ملاقاتوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔

عید بقرعید میں گھر پر تشریف لانا، علالت کی خبر سن کر عیادت کے لیے آنا، نیر صاحب کا وہ معمول ہے جس میں فرق نہیں آنے دیتے۔ اس عمل میں تصنع کو قطعی دخل نہیں۔ مکتبہ جامعہ پابندی کے ساتھ پہنچتے ہیں کم از کم ایک بار ضرور تشریف لا کر فرداً فرداً ہر ایک سے سلام دعا کے بعد خیریت و خیر عافیت پوچھنے میں سبقت فرماتے ہیں۔
پیام تعلیم سے اتنے اور مخلصانہ تعلقات کے پیش نظر جامعہ کے جنرل منیجر شاہد علی خاں صاحب نے طے کیا کہ نیر صاحب کی ادبی اور علمی خدمات کا اعتراف رسالے کے ایک خصوصی نمبر کے ذریعے کیا جائے۔ اس فیصلے کے [illegible] حضرات سے رجوع کیا گیا اور خدا کا شکر ہے کہ توقع سے

کہیں زیادہ مضامین موصول ہو گئے، یہ نیّر صاحب کی ہمہ گیر مقبولیت کی واضح دلیل ہے۔

مضامین کی کثرت اور وقت کی قلت کے سبب مسودے کئی کاتبوں کے سپرد کیے گئے۔ ان میں سے ایک صاحب بہار کے تھے جو کچھ دن کے لیے وطن گئے یہ کہہ کر کہ جولائی کے آخر تک کتابت مکمل کر کے لے آئیں گے مگر شومیٔ قسمت کہ اس سال بہار میں بارش اور سیلاب نے وہ قیامت ڈھائی کہ بیچارے وہاں سے نکل ہی نہ سکے اور جب تک وہاں رہے ذہنی طور پر اتنے پریشان رہے کہ کوئی کام نہ ہو سکا۔

پرچے میں تاخیر کسی صورت مناسب نہیں تھی۔ مجبور ہو کر انھیں مضامین پر اکتفا کرنا پڑا جن کی کتابت مقامی طور پر ہو سکی۔ نتیجہ یہ کہ بہت سے مضامین جنھیں ہم خاص طور سے دینا چاہتے تھے، رہ گئے۔ اس کا ہمیں سخت افسوس ہے اور اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ اکتوبر کے شمارے کو اکتوبر کا ضمیمہ بنا کر پیش کیا جائے۔

کچھ عرصے سے میری صحت اور دفتری مصروفیت کے باعث اس نمبر کی اشاعت میں تاخیر ناگزیر ہو جاتی اگر ہمارے پرانے رفیق جناب ریحان احمد عباسی (سابق مدیر کتاب نما) ہماری ہمت نہ بڑھاتے۔ سچ پوچھیے تو یہ نمبر ریحان صاحب کی دل چسپی اور تعاون سے ہی اعلان کے مطابق شائع ہو سکا ہے، اس لیے اس کی ترتیب دینے میں جو خوبیاں پائیں اس کے لیے ریحان صاحب کا شکریہ ادا کیجیے جو خامیاں ہوں اس کی ذمہ داری بہرحال راقم پر ہی پڑنی چاہیے اور راقم اس کے لیے تیار ہے اس نمبر کے سلسلے میں ہم آپ کی رائے جاننے کے خواہش مند ہیں۔

اعترافِ حق

میں جناب محمد شفیع الدین صاحب نیّر کو کوئی تیس برس سے جانتا ہوں۔ اور مجھے فخر ہے کہ جامعہ ملیہ میں وہ پانچ سال سے بھی زیادہ میرے رفیقِ کار رہ چکے ہیں۔ اُن میں بچوں کے ذہن کو سمجھنے اور اُن سے محبت کرنے کی وہ صفت ہے جو پیدائشی معلّم کا جوہر ہوتی ہے۔ نیز ذوقِ ادب اور ذوقِ جمال کی سمت بچوں کی رہنمائی کے لیے جس صلاحیت کی ضرورت ہے وہ اُن میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ بچوں کے لیے جو نظمیں انھوں نے لکھی ہیں، وہ ایک پیش رو کی حیثیت سے اُن کا نہایت ہی بیش قیمت کارنامہ ہے۔ انھوں نے وہ میدان سر کیا ہے جسے سر کرنے کی بہت ہی کم اصحاب نے جرأت کی ہے۔ یہ نظمیں ایک قرن سے بچوں میں مقبول ہیں۔ اُن کی نظموں نے تعلیم کے خشک کام کو خوش گوار بنا دیا ہے۔ یہ اُن بچوں میں بھی ادبی دلچسپی پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں جو دوسرے مضمونوں کی طرح مادری زبان کی تحصیل کو غیر دل چسپ سمجھتے تھے۔

نیّر صاحب کی نظموں کا دائرۂ اشاعت اردو بولنے والوں میں بہت وسیع ہے۔ اور جن جن تعلیمی محکموں اور کمیٹیوں میں یہ پیش ہوئی ہیں، انھوں نے انھیں منظور کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ نظمیں اگر زیادہ سے زیادہ بچوں کے ہاتھوں میں پہنچ سکیں تو یہ ایک بہت بڑی خدمت ہو گی۔ میں نے نیّر صاحب کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنی کتابوں کو دیوناگری خط میں بھی شائع کریں۔۔۔

۱۳ مارچ ۱۹۶۹ء

ڈاکٹر ذاکر حسین

محمد شفیع الدین نیرؔ

(نیرؔ صاحب کی پہلی تعلیمی نظم جو پہلی بار ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی)

اٹھو بیٹا آنکھیں کھولو
اتنا سونا ٹھیک نہیں ہے
صبح ہوئی ہے وقت سہانا
سورج نکلا تارے بھاگے
ڈالی ڈالی چڑیاں چہکیں
پھول کھلے خوش رنگ رسیلے
جوہی اور چنبیلی مہکی
سورج ابھی ابھی نکلا ہے
پتوں پر ہیں اوس کے قطرے
سرخی مشرق پر چھائی ہے
بنیا، پنساری، حلوائی
ہل اور بیل کسان بھی لے کر
کاری گر بھی کام پہ آیا
دنیا دن بھر کام کرے گی
تم بھی پہلے کھانا کھاؤ

بستر چھوڑو، لو منہ دھولو
وقت کا کھونا ٹھیک نہیں ہے
گاؤ خدا کی حمد کا گانا
دنیا والے سارے جاگے
کیاری کیاری کلیاں مہکیں
سرخ سفید اور نیلے پیلے
چڑیا الگ اکیلی چہکی
ٹھنڈا وقت ہے سرد ہوا ہے
صاف اور ستھرے ہو کے چلیے
اچھی خاصی بہار آئی ہے
سب نے اپنی دکان لگائی
جا پہنچا اپنی کھیتی
آ کر اپنا کام جمایا
رات کو پھر آرام کرے گی
پھر بستہ لو مکتب جاؤ

کام میں جو اس آن نہیں ہیں
نیرؔ وہ انسان نہیں ہیں

محمد شفیع الدین نیّر

میاں مٹھو

(نیّر صاحب کی پہلی کہانی جو پہلی بار ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی)

دہلی کے پاس جمنا کے کنارے نیم کا ایک پرانا درخت تھا۔ اس درختوں پر توتوں نے بہت سے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ سب توتے آپس میں مل جل کر رہتے اور ایک دوسرے کے دُکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے۔

ان کا دستور تھا کہ صبح ہوتے ہی گھونسلوں سے نکل جاتے، جنگل کے پھل کھاتے اور اپنا پیٹ بھر کر شام کو واپس آجاتے۔ کسی پاس کے گولر، برگد یا پیپل کے درخت پر ان کے جھنڈ کے جھنڈ بیٹھ جاتے مزے سے ان درختوں کے پھل کھاتے اور ٹیں ٹیں کر کے اتنا شور مچاتے کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی۔ بس ایسا معلوم ہوتا کہ مل جل کر جشن منا رہے ہیں۔ ہر طرف بے فکری ہے ہر توتا دل سے اس جشن میں شریک ہے، کوئی ٹیں ٹیں کر کے راگ الاپ رہا ہے کوئی دوسرے جانوروں کی بولیوں کی نقل کر رہا ہے۔ کوئی کسی نئے سنائے فقرے کی رَٹ لگا رہا ہے۔ کوئی ٹہنی سے اُڑ کر دوسری ٹہنی پر جا رہا ہے۔ کچھ توتے درخت کی نرم نرم اور نازک نازک ٹہنیوں اور شاخوں پر جھولا جھول رہے ہیں۔ کچھ قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ کچھ آپس میں ہنسی مذاق کر کے اپنا دل بہلا رہے ہیں

ان کا کھانا بھی سنیے۔ گولروں، پیپل کی پیپلیاں ہوں، یا نیم کی نبولیاں، سب کچھ شوق سے مزے لے کر کھا جاتے۔ سچ تو ہے کہ اتنا کھاتے نہ تھے جتنا کہ کتر کتر کر گراتے تھے۔ کوئی کچھ کہنے سننے والا بھی نہ تھا۔ یہ جاتے ہی ایسے درختوں پر تھے جن کی رکھوالی کوئی نہیں کرتا۔ جنگل کے درخت گویا خدائی دسترخوان تھے۔ جو خاص ان کے لیے بچھائے گئے تھے۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔ جتنا جی چاہے کھاؤ جتنا جی چاہے کُتر کُتر کر گراؤ۔ نہ کمان کے تیر کا ڈر نہ غلیل کے غلے کا خوف، نہ بندوق کی گولی کا اندیشہ، صبح سے شام تک جتنا چاہتے مزے سے کھاتے۔ اور شام کو خوش خوش اپنے گھونسلے میں بسیرا کرنے کے لیے چلے آتے۔ ان کے بچوں کا پیٹ بھی اسی طرح بھرتا جب تک یہ چھوٹے

رہتے ان کا کھانا ماں باپ لاتے۔ جب اس قابل ہوتے کہ آپ اُڑ سکیں تو ماں باپ پَر نے چُگنے اور روزی تلاش کرنے کے لیے اُن کو آزاد چھوڑ دیتے۔ مگر اس سے پہلے وہ ان کو یہ بات ضرور سمجھاتے۔

"یہاں آس پاس بیسیوں باغ ہیں۔ ان باغوں میں پھلوں کے ہزاروں درخت ہیں۔ کہیں آم کی بہار ہے، کہیں امرود اور ناشپاتی کی، کہیں انار اور سنتروں کی قطاریں دیکھنے والوں کا دل لُبھاتی ہیں تو کہیں اَنار اور فالسے اپنی طرف بلاتے ہیں۔ ان پھلوں کے مزے کا کیا کہنا۔ ان باغوں کو انسان بڑی محنت سے لگاتے ہیں۔"

بچے پوچھتے "ان باغوں کو وہ کس طرح لگاتے ہیں؟"

وہ جواب دیتے۔ "ان باغوں کو لگانے میں پہلے زمین تیار کرتے ہیں، ہل چلاتے ہیں، پتھر کنکر نکالتے ہیں، زمین کو برابر کرتے ہیں، بیج بوتے ہیں۔ کیاریاں بناتے ہیں۔ پود لگاتے ہیں، پانی دیتے ہیں۔ ان پودوں اور درختوں کو مہینوں سینچتے ہیں۔ گرمی سردی سے ان کو بچاتے ہیں۔ اولے پالے سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ غرض لگاتار خون پسینہ ایک کرتے ہیں جب کہیں ان باغوں کی بہار دیکھتے ہیں۔ پھر وہ مالک ہیں۔ ان کے پھلوں کو کھائیں یا بیچ کھوچ کر فائدہ اٹھائیں۔

انسان یہ بات پسند نہیں کرتے کہ کوئی جانور یا پرندہ ان کو کھائے یا خراب کرے۔ وہ ان باغوں کی رکھوالی بڑی ہوشیاری سے کرتے ہیں۔ باغ کے چاروں طرف مینڈ بناتے ہیں۔ کانٹے دار جھاڑیاں لگاتے ہیں تار کھچواتے ہیں۔ کوئی کئی مالی دیکھ بھال کے لیے نوکر رکھتے ہیں۔

ان مالیوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ پیڑوں پودوں پھولوں اور پھلوں کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔ کسی جانور کو باغ میں نہ آنے دیں۔ کسی پرندے کو کوئی پھل نہ کھانے دیں۔ ان کے پاس غُلیل یا گوپھن رہتی ہے۔ اس میں غلّہ رکھکر اس طرح مارتے ہیں کہ اگر کسی پرندے کے لگ جائے تو اسی وقت وہ گر کر ٹھیں ہو جاتا ہے۔ پرند باغ میں آکر پھل کھانے لگیں تو ایسا کرنے کو انسان چوری اور ایسے پرندوں کو چور سمجھتے ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو یہ چوری ہی اس چوری کی سزا میں وہ [illegible] کی جان تک لینے میں کچھ ہرج نہیں سمجھتے۔ بچو! ان باغوں میں نہ جانا۔ ان کا کوئی پھل چوری چھپے نہ کھانا۔ جو کچھ خدا نے دے رکھا ہے اسی پر شکر کرنا۔ لالچ میں آکر اپنی جان نہ دینا۔ ہمارے لیے یہ جنگلی پھل بہت کافی ہیں ہمیں اپنی نیت بگاڑنے اور چوری کرنے کی ضرورت نہیں۔"

بچے اپنے ماں باپ کی باتیں بڑے غور سے سنتے اور خوشی خوشی یاد رکھتے۔ وہ باغوں میں چوری کے ارادے سے بھول کر بھی نہ جاتے جنگلی پھلوں پر گزران کرتے اور خوش رہتے۔ نہ کوئی انھیں مارتا، نہ دکھ دیتا۔ دن رات آرام اور خوشی میں گزرتے۔ ایک مدّت تک ان سب کا یہی طریقہ رہا۔

ایک بار کیا ہوا کسی اور جگہ کے توتوں کا ایک جوڑا اس درخت پر آیا۔ اس درخت کے توتوں نے ان مہمانوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔ اور خوشی خوشی انھیں بھی اس درخت پر رہنے کی جگہ دے دی۔ یہ جوڑا بھی ان سب کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگا۔ ان کے ساتھ ایک بچّہ بھی تھا۔ اس کا نام انھوں نے میاں مٹھو رکھا تھا۔ انھوں نے اپنے اس بچّہ کو بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا۔ ماں باپ دونوں اسے اپنی آنکھوں کا

اُجالا سمجھتے ... کا یہ اثر ہوا کہ یہ بچّہ بہت ضدّی ہوگیا۔ ماں باپ کسی کو کہتے تو نہ مانتا۔ جن باتوں سے وہ روکتے، جان جان کے وہی کرتا۔ جب یہ بڑا ہوگیا تو اس درخت کے دوسرے توتوں کی دیکھا دیکھی انھوں نے بھی میاں مٹھو کو یہی باتیں بتائیں۔ اوّل تو ضدّی دوسرے بے پرواہ۔ وہی کہاوت تھی کہ ایک تو کریلا کڑوا اوپر سے نیم چڑھا۔ اس نے ماں باپ کی یہ باتیں بے دھیانی سے سُنیں اور پھر ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے اڑا دیں۔

ایک دن میاں مٹھو کے ماں باپ دونوں کے دونوں پیٹ بھرنے کے لیے کہیں گئے ہوئے تھے۔ شامت جو آئی تو آپ کے دل میں کسی باغ میں جاکر پھل کھانے کا شوق پیدا ہوا۔ یہ ایک دوست کے پاس گئے اور کہا "چلو یار! آج تو کسی باغ میں چلیں اور اچھے اچھے پھل کھائیں "۔

اسے اپنے ماں باپ کی نصیحت یاد تھی۔ اس نے میاں مٹھو کی بات نہ مانی۔ اس نے کہا "میرے ماں باپ نے ان باغوں میں جانے سے روکا ہے۔ جنگل کے پھلوں سے ہمارا پیٹ بھر جاتا ہے۔ پھر کسی باغ میں جاکر پرائے پھل کیوں کھائیں۔ میرے ماں باپ نے مجھے سمجھایا ہے کہ وہ انسان کے باغ ہیں۔ انسان نے اتنی محنت کرکے لگایا ہے۔ ہم اگر بے پوچھے گچھے وہاں جاکر پھل کھائیں گے تو چور کہلائیں گے۔ اور جانتے ہو چوری کی کیا سزا ملے گی؟ یا تو غلیل یا گو پھیے کے غلّے سے کوئی بازو کھو کر آئیں یا شاید ایسا ہو کہ گر کر وہیں ڈھیر ہو جائیں۔ بھئی! میں تو تمھارے ساتھ چل نہیں سکتا۔ تم بھی نہ جاؤ۔ جو کچھ خدا نے دیا ہے کھاؤ پیو۔ خوش رہو۔ دوسروں کی چیز کو نہ تکو۔ چوری کا خیال چھوڑ دو۔ اچھے اچھے اور مزے کے پھل کھانے کا ایسا ہی شوق ہے تو ذرا صبر کرو۔ بڑے ہو جاؤ تو ہمّت کرکے نئے نئے جنگلوں کی سیر کرنا اور اچھے اچھے پھل کھانا"۔

اس بچّے نے میاں مٹھو کو اس ارادے سے روکنے کی بہت کوشش کی، مگر لالچ کا جو بھوت میاں مٹھو پر سوار تھا وہ کسی طرح نہ اُترا۔

اس درخت پر میاں مٹھو کا ایک دوست اور بھی تھا وہ بہت بھولا بھالا اور سیدھا سادا تھا۔ وہ دن بھر پیڑ ہی پر کھیلتا رہتا۔ ماں باپ کو اس کی طرف سے کچھ کھٹکا نہ تھا۔ اس لیے انھوں نے یہ باتیں اس کو ابھی تک نہیں بتائی تھیں۔ وہ کبھی کبھی میاں مٹھو کے ساتھ کھیل لیا کرتا تھا۔ میاں مٹھو اس کے پاس بھی گئے اور کہنے لگے "یار آج تو کہیں سیر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کب تک اس ایک ہی پیڑ پر پڑے رہیں۔ دن بھی اچھا ہے کالی کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ چلو کسی باغ کی سیر کو چلیں۔ گھڑی دو گھڑی دل بہلا کر چلے آئیں گے۔ میٹھے میٹھے پھل پیٹ بھر بھر کر کھائیں گے۔ ابّا اور امّاں کو ہمارے جانے کی خبر بھی نہ ہوگی۔ لو بس اب دیر نہ کرو۔ اُٹھ کھڑے ہو"

میاں مٹھو کی باتوں میں آکر وہ بچّہ چلنے کو تیار ہوگیا۔ دونوں اُڑتے اڑاتے پیڑوں پر بیٹھتے بٹھاتے کھیلتے کھاتے، نرم نرم ٹہنیوں پر جھولا جھولتے ایک بڑے سے باغ میں پہنچے۔

اس باغ کو دیکھتے ہی ان کا دل باغ باغ ہوگیا۔ ہری ہری گھاس کے تختے۔ پھولوں کی پیاری پیاری کیاریاں رنگ رنگ کے پھول۔ خوب صورت خوب صورت

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

ڈاکٹر حسینی پریمی

ایک انٹرویو

ایک دن مکتبہ جامعہ میں خبر سنی کہ ماہ نامہ "پیامِ تعلیم" کا شفیع الدین نیرّ نمبر شائع ہوگا۔ چند دن بعد مولوی شفیع الدین نیرّ صاحب مجھ سے ملنے آئے، انھوں نے خیریت اور خوشی کے ساتھ اسی خبر کو سنایا اور بتایا کہ ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی اور پروفیسر عبداللہ ولی بخش قادری نے مضامین لکھنے کا وعدہ کرلیا ہے۔ میں نے مبارک باد پیش کی اور خاموشی سے گفتگو سنتا رہا۔ آخر نیرّ صاحب نے دریافت فرمایا: آپ نے ماہنامہ "صبحِ امید" بمبئی میں بچوں کے ادب پر ایک مقالہ لکھا تھا۔ اس میں میرا بھی تذکرہ تھا۔ وہ مضمون اس خصوصی نمبر کے لیے دے دیجیے۔ میں نے کہا نیرّ صاحب! وہ تو پرانا مضمون ہے اس میں کافی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس کا کیا کیجیے گا۔ نیرّ صاحب نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا اور مجھے محسوس ہوا کہ بچوں کے شاعر کا معصوم ذہن الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے فوراً کہا۔ نیرّ صاحب! آپ کو معلوم نہیں، شاہد علی خاں صاحب نے انٹرویو مرتب کرنے کی خدمت میرے سپرد کردی ہے۔ نیرّ صاحب کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ خوشی کے لہجے میں بولے۔ تو پھر کوئی تاریخ مقرر کرلیں۔ میں نے کہا۔ ایک ہفتے میں سوال نامہ مرتب کرکے حاضرِ خدمت ہوں گا۔ آپ اپنی تصانیف اور ضروری یادداشتیں یکجا کرلیجیے۔ مختصر یہ کہ ۲ فروری ۱۹۷۷ء اور دس بجے دن کا وقت طے ہوگیا۔

میں اپنی زندگی میں کبھی میکانکی طور پر کام کرنے کا عادی نہیں رہا۔ آزادانہ موڈ ہمیشہ غالب رہا۔ چنانچہ میں ۱۱ بجے نیرّ صاحب کے یہاں پہنچ سکا۔ فضا میں خنکی اور رنگین دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ نیرّ صاحب اپنے ڈرائنگ روم کے باہر منتظر تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بڑے تپاک سے ملے۔ یہ اُن کا عام رویّہ ہے۔ ڈرائنگ روم میں تخت اور میز پر کتب و رسائل اور ضروری کاغذات ترتیب سے رکھے تھے۔ مضامین کے تراشوں، اسناد کے فائل اور مسوّدات کی

جلد بندی دیکھ کر کون حسنِ اہتمام کی داد نہ دے گا۔

نیر صاحب ... ڈرائنگ روم کی ادبی فضا، میز پر چائے ... سگریٹ، فواکہات سے معمور تشتریاں۔ دل نے کہا، ایک خصوصی نمبر کا یہ کرشمہ ہے کاش ''پیام تعلیم'' کے مستقل خصوصی نمبر اس طرح نکلتے ہیں! بہر حال، دعوتِ کام و دہن کے بعد نیر صاحب کی شاعرانہ شخصیت اور زندگی کے نقوش قلم بند کرنے میں ۳ ۱/۲ گھنٹے صرف ہوئے پُر تکلف لنچ کے بعد سوال نامہ کی روشنی میں مرتب جوابات لے کر رخصت ہوا۔ ماحصل نذر قارئین ہے۔

میرے پہلے سوال کے جواب میں نیر صاحب نے اپنا نام شفیع الدین اور اپنے والد کا نام حکیم الدین بتایا وہ تعلیم سے قطعی بے بہرہ تھے۔ ۷ برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اسکول رجسٹر میں تاریخ پیدائش ۸ر اگست ۱۹۰۴ء درج ہے۔ لیکن بعض معتبر رشتہ داروں کے بیان اور خصوصاً مولانا حفیظ اللہ صاحب، استاد دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تحریر کے مطابق صحیح تاریخ پیدائش ۱۹۰۳ء قرار پاتی ہے۔

نیر صاحب کا وطن ... اتروی ضلع علی گڑھ ہے۔ اس قصبے کے محلہ ... گوپان میں ان کا جنم ہوا۔ روایت ہے کہ مورثِ اعلیٰ کالستھ تھے۔ اس خاندان میں موہن لال کھڈ ... کا نام کافی مشہور ہے۔ بعد میں کسی بزرگ نے مذہب اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس ضمن میں ایک رشتہ دار کی تحریر ملتی ہے۔ لیکن کوئی سرکاری دستاویز محفوظ نہیں۔

ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں جواباً معلوم ہوا کہ مدرسہ مصباح الاسلام میں گلزار دبستاں اور گلستاں کے پانچ باب پڑھے۔ سکندرہ راؤ ضلع علی گڑھ میں ان کے رشتہ دار حافظ احمد علی جامع مسجد، بسم اللہ میں امام تھے۔ اس زمانے میں ان کے یہاں قیام رہا۔ ۹۔۱۰ برس کی عمر میں کتابت کا فن سیکھا۔

سوال نامہ میرے سامنے تھا مجھے زیادہ بولنے کی ضرورت نہ تھی مگر نیر صاحب کو تفصیل کے ساتھ جوابات سے مطمئن کرنا اور کبھی سوال در سوال کے تحت وضاحت کی ضرورت پڑتی تھی اس لیے مجھے اندیشہ رہتا تھا، مبادا انھیں تکان ہو جائے چنانچہ اُن سے آرام کی درخواست کرتا مگر نیر صاحب توانائی کے ساتھ جواب دیتے رہے اور کہتے رہے مجھے تو آپ کی تکان اور زحمت کا خیال ہے۔ غرض کام کرنے کا مستقل موڈ بنا رہا۔

وطن کی داستان ختم ہونے پر میں نے استفسار کیا، آپ نے وطن اور عزیزوں کو چھوڑ کر دہلی میں کیوں اور کب سکونت اختیار کی؟

انھوں نے صوفے پر زرا آگے کو کھسکتے ہوئے بتایا۔ وطن میں ذریعۂ معاش ناپید تھا۔ کبھی سکندرہ راؤ کبھی علی گڑھ میں رشتہ داروں کے یہاں وقت گزاری سے تنگ آ کر والدہ نے دہلی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ۳۰ر اپریل ۱۹۱۵ء کو ماں بیٹے ۴ بجے شام کو دہلی پہنچ گئے۔ حافظ باقر علی خوش نویس کے یہاں قیام کیا۔ روزی کمانے کے لیے اخبار بیچنے کا کام شروع کر دیا اس طرح پانچ مہینے گزر گئے۔ منشی عبدالغنی خطاط سے کتابت کی اصلاح کا فیض بھی جاری رہا۔ خریداروں کو اخبار پہنچانے

کے باعث بعض اہلِ علم سے واقفیت ہوگئی۔ چنانچہ سید احمد امام جامع مسجد دہلی نے اپنے یہاں قیام کی اجازت دے دی۔ محلہ چوڑی والان میں اینگلو عربک اسکول کی شاخ قائم تھی۔ وہاں اپریل ۱۹۱۷ء میں پانچویں جماعت میں داخلہ کرا دیا۔ اس کے بعد اصغر علی صاحب اور مولوی فضل الدین صاحب کے یہاں قیام رہا۔ میں نے فوراً سوال کر دیا۔ نیر صاحب! امام جامع مسجد تو آپ کے محسن تھے۔ وہاں سے ترکِ قیام کی نوبت کیوں آئی؟ کہیں ڈپٹی نذیر احمد کی واردات تو . . . . . . ! نیر صاحب کھلکھلا کر ہنس پڑے اور کہنے لگے۔ ارے سیفی صاحب! غمِ روزگار سے فرصت ہی کہاں تھی۔ بات صرف یہ تھی کہ میری عمر بڑھ رہی تھی۔ امام صاحب کے یہاں پردے کی سخت پابندی تھی اس لیے انھوں نے شفقت سے مجھے سمجھایا اور دوسری جگہ قیام کا انتظام کر دیا۔ دوسرے یہ کہ اب اسکول بھی بدل گیا۔ اینگلو عربک اسکول کی شاخ کوچہ چیلان میں داخلہ ہو گیا تھا۔ چھٹی جماعت سے آٹھویں جماعت تک اس اسکول میں تعلیم پائی۔ سالانہ امتحان میں اوّل آنے پر دو برس کے لیے چھ روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا۔ نویں اور دسویں جماعت کی تعلیم، آزاد قومی درس گاہ کوچہ بلاقی بیگم میں ہوئی۔ دسویں جماعت میں اوّل مقام پایا۔

میں نے سوال کیا۔ آپ کا تعلق ابھی تک مذہبی اکابر سے رہا ہے۔ اربابِ جامعہ ملیہ سے کب اور کیوں کر ربط قائم ہوا؟ — انھوں نے جواباً بتایا کہ جامعہ ملیہ، لال ڈگی علی گڑھ میں جامعہ کے ابتدائی کلاس میں ۱۹۲۲ء میں داخلہ لے لیا تھا۔ یہ ڈاکٹر محمد عالم کا دور تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین سید نور اللہ، سید محمد، مولانا شرف الدین، مولانا عبدالحئی، مولانا محمد علی جوہر وغیرہ اساتذہ میں شامل تھے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر عبدالعلیم، حامد علی خاں، کرشنا نائر ہم جماعت تھے۔

میں نے سوال کیا۔ علی گڑھ سے جامعہ ملیہ کو دہلی منتقل کر دیا گیا تھا۔ آپ نے اعلا تعلیم کس طرح حاصل کی اور روزگار کی کیا صورت نکلی؟

انھوں نے جواب دیا کہ ۱۹۲۳ء میں دہلی آ کر ٹیوشن کے ذریعے اخراجات کو پورا کیا گیا پھر مولانا محمد علی کے اخبار "ہمدرد" میں ایک ماہ کے لیے انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے کا کام مل گیا۔ اسی ادارے میں مولانا عارف ہسوی پوری، سید محمد جعفری، اور ڈاکٹر سعید احمد بریلوی بھی شامل تھے۔ کانگریس روزنامہ میں بھی انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے کا کام مل گیا تھا۔ مولانا قطب الدین اور عباس حسین قادری اسی ادارے سے منسلک تھے۔ ۱۹۲۳ء ہی میں پنجاب سے منشی اور ادیب ماہر کے امتحانات پاس کیے۔ اور اوّل مقام پایا۔ ۱۹۲۴ء میں پنجاب سے میٹرک (انگریزی زبان) میں پاس کیا۔ اور ۱۹۲۵ء میں ادیب کامل کے امتحان میں اوّل مقام حاصل کیا۔ ۱۹۲۶ء میں انٹرمیڈیٹ (انگریزی زبان) میں پاس کیا۔

آپ کی اطمینان بخش اقتصادی زندگی کا

آغاز کب سے ہوا؟ "جولائی ۱۹۲۶ء میں ماڈرن
اسکول دریا گنج میں اردو ٹیچر کی حیثیت سے ایک
سو پچیس (۱۲۵) روپے ماہانہ پر تقرر ہو گیا۔ ۱۹۴۵ء
تک یہ ملازمت قائم رہی۔"

میں نے استفسار کیا، آپ نے ماڈرن
اسکول کی بہتر ملازمت کو چھوڑ کر جامعہ ملیہ کی
خدمت کیوں قبول کر لی؟

انھوں نے بتایا کہ مدرسہ ثانوی جامعہ
میں پروفیسر وقار عظیم اردو پڑھاتے تھے اُن کے
پاکستان جانے پر جگہ خالی ہوئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین
کے بلاوے پر ۱۳ جنوری ۱۹۴۵ء کو جامعہ آنا
پڑا۔ ۶۵ روپے ماہانہ تنخواہ قبول کر لی۔ یہاں
بھی اعلا تعلیم کی لگن جاری رہی۔ پنجاب یونیورسٹی
سے ۱۹۵۱ء میں بی۔ اے کا امتحان (انگریزی)
اور ۱۹۵۲ء میں فارسی اور تاریخ میں پاس کیا۔
۱۹۵۴ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے
فرسٹ ڈویژن میں ایم۔ اے (اردو) پاس کیا۔
۱۹۵۶ء میں جامعہ کالج میں اردو لکچرر کی حیثیت سے
تقرر ہو گیا۔ ۱۹۶۹ء میں جامعہ کی خدمات سے سبکدوشی
حاصل کی۔

میرے ایک سوال کے مختلف جزوں کے جواب
میں نیّر صاحب نے بتایا کہ اساتذہ میں ان کے
ذہن پر سب سے گہرا نقش اصغر علی صاحب کا رہا
ہے۔ خواجہ حسن نظامی کا اخبار "رعیت" روزنامہ
کے مطالعے نے مضمون نگاری پر اکسایا۔ پہلا
مضمون سودیشی تحریک پر لکھا۔ اس کے بعد مسلسل
سیاسی اور اخلاقی مضامین لکھے گئے جو ماہنامہ
کامیاب دہلی، نظام المشائخ دہلی، سعید نامہ اور
طبیب نسواں میں شائع ہوتے رہے۔

اب پھر چاء کا دور چلا اور میں نے طمانیت
کے عالم میں سگار کو ایش ٹرے میں رکھتے
ہوئے استفسار کیا، نیّر صاحب! آپ کی زندگی
کی راہیں کٹھن ہیں مگر آپ کا عزم تسخیر قابلِ اعتراف
ہے۔ اور کامیاب زندگی مبارکباد کے لائق ہے ——
دراصل آپ کی شاعرانہ شخصیت بچوں کی امانت
ہے۔ یہ فرمایئے۔ اس شاعری کی تحریک کیوں کر
پیدا ہوئی؟

نیّر صاحب نے جواباً بتایا کہ ماڈرن اسکول
میں جیون ناتھ در کی زندگی نے بچوں کے ادب کی
طرف مائل کیا، خصوصاً مس ینگ کی رجائی زندگی
نے متاثر کیا۔ اسی ماحول میں بچوں کی شاعری کا آغاز
ہوا۔ مس ینگ بچوں کی شاعری کی قدر دان تھیں۔
وہ چھوٹے بچوں کے ساتھ انگریزی کی نظمیں ایکشن
کے ساتھ گاتی تھیں اور کبھی اردو نظمیں اور لوریاں
دل کش انداز میں پیش کرتی تھیں۔ بچوں کی دنیا
میں ایک نئی امنگ پیدا ہو جاتی تھی۔ تمام بچے
ان کے گرویدہ تھے۔ اسی زمانے میں فیاض حسین
جامعی بچوں کا رسالہ "ہونہار" نکالتے تھے۔ اس کے
پہلے شمارے میں پہلی نظم "صبح" شائع ہوئی۔ اس کے
بعد یہ سلسلہ جاری رہا۔ "پیام تعلیم" دہلی، پھول
لاہور، پریم لاہور، غنچہ بجنور، سعادت لاہور، رتن
جموں میں تخلیقات شائع ہوتی رہیں۔ پہلی کتاب
یعنی "بچوں کا تحفہ" (حصہ اوّل و دوم) اکتوبر
۱۹۴۴ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ ۱۹۷۲ء میں

حصہ اول کا سولھواں اڈیشن اور حصہ دوم کا ساتواں اڈیشن منظر عام پر آیا۔ پہلی کہانی "میاں مٹھو" کتابی شکل میں بچوں تک پہنچی۔ افسر میرٹھی، محوی لکھنوی، حفیظ جالندھری اور تلوک چند محروم سے خصوصی تعلقات رہے۔

ازدواجی زندگی:

پہلی شادی ۱۹۲۵ء میں حافظ احمد علی امام جامع مسجد سکندرہ راؤ کی صاحبزادی زبیدہ خاتون سے ہوئی۔ دسمبر ۱۹۳۲ء میں ان کی دائمی مفارقت ہوگئی۔ اولاد بھی زندہ نہیں رہی دوسری شادی ڈاکٹر سعید احمد بریلوی کی صاحبزادی صالحہ خاتون سے ۱۹۳۳ء میں ہوئی۔ اولاد میں ۴ لڑکے اور ۴ لڑکیاں ہیں۔

چند خیالات:

بعض سوالات کے ضمن میں معلوم ہوا کہ نیر صاحب نے سماجی کارکن کی حیثیت سے بھی قوم وملک کی خدمت کی ہے۔ آزادی ہند کی تحریک میں دل چسپی لی بعض مواقع پر طلبہ اور نوجوان گروپ کی نمائندگی بھی کی مگر ۱۹۲۶ء سے عملی اور نظری سیاست سے علاحدگی اختیار کرلی۔ وہ انسان اور انسان میں کسی فرق کو پسند نہیں کرتے، ان کے تعلقات ہر طبقے سے رہے ہیں۔ خوش ونت سنگھ اڈیٹر السٹریٹیڈ ویکلی سے شفقت آمیز رابطہ رہا ہے۔ ان کے دو صاحبزادے ان کے زیر تعلیم رہے ہیں۔

ان کا بیان ہے کہ "بچوں کا تحفہ" ان کی ادبی زندگی کے بیشتر تجربوں پر مبنی ہے وہ اردو رسم الخط کی تبدیلی کے حامی نہیں۔ اردو کی جانب سرد مہری کے رویہ سے انھیں مایوسی ہے۔ آزادی ہند کے بعد ان کی کتابوں کی فروخت کم ہوگئی ہے۔

غیر مطبوعہ:۔

کافی چیزیں مسودات میں محفوظ ہیں۔ مثلاً آئینۂ کشمیر، آئینۂ تندرستی، باپو کی یاد، لوریاں حسنِ غالب، دِلّی کے ادب وشاعر یہ تمام چیزیں اشاعت کے لیے وقت کی منتظر ہیں۔

معمولات:

۱۱، ۱۲ بجے رات تک مطالعہ کرنا نیر صاحب کی عادت میں داخل رہا ہے۔

میانہ قد بھاری جسم پر علی گڑھ کٹ پاجامہ، کرتا اور شیروانی پسندیدہ لباس رہا ہے جاڑوں میں اوورکوٹ کا استعمال بھی کرتے ہیں کلین شیوڈ گول چہرہ، سر پر چھوٹے انگریزی بال۔ باریک فریم کی عینک سے چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی چمک نکلتی ہے۔

میں نے نیر صاحب سے آخری دو سوال کیے:

۱۔ اب آپ کی عزیز ترین تمنا کیا ہے؟

۲۔ آپ نے اپنی رفیقۂ حیات کے مستقبل کی کیا ضمانت کی ہے؟

پہلے سوال کے جواب میں موصوف نے فرمایا:

عزیز ترین تمنا یہ ہے کہ زندگی میں کسی پر کسی طرح

بھی بوجھ نہ ہوں۔

دوسرے سوال کے جواب میں انھوں نے اپنی رفیقۂ حیات بیگم صالحہ خاتون صاحبہ کو انٹرویو میں شمولیت کی دعوت دی۔ اور کہنے لگے اس سوال کا جواب آپ ان سے خود معلوم کر لیجیے۔ قدرے تامّل کے بعد میں نے موصوفہ سے دریافت کیا، نیرؔ صاحب نے اپنی اولاد کی اعلا تعلیم کا انتظام کیا۔ اب سب برسرِ کار ہیں۔ لیکن انھوں نے آپ کے اقتصادی تحفّظ کے لیے کیا قدم اٹھایا ہے؟

محترمہ نے اعتماد کے ساتھ فرمایا۔ جامعہ میں جب کم تنخواہیں تھیں، ہم لوگوں نے خوشی سے بسر کی اب بھی سب کچھ میرا ہی ہے۔ مجھے اپنی زندگی سے زیادہ ان کی صحت کا خیال رہتا ہے۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے پر مکمل اعتماد ہے۔ مجھے مستقبل کی کوئی فکر نہیں۔

میں نے بچّوں کے شاعر اور ان کی بیگم کا شکریہ ادا کیا۔ اور انٹرویو کے اشارات لے کر واپس آگیا۔

★ ★ ★

(صہ ۳۸ کا بقیہ)

آنکھ جو ان بچّوں نے کھولی　　مرغی کٹ کٹ کٹ بولی
ایک ہی دو، ان کے تھے ابھی وہ　　خوب مزے کرتے تھے سبھی وہ
پانی پیتے دانہ کھاتے　　دوڑ کے جاتے دوڑ کے آتے

ایک دو نظموں کی بات نہیں، دو چار کہانیوں کی بات نہیں، نیرؔ صاحب نے تو نہ جانے کتنا لکھا ہے اور کتنے بچّوں، بڑوں بلکہ بوڑھوں نے بھی اُن کو پڑھا ہے۔ ہمارے یہاں شاعروں کی کمی ہے، نہ لکھنے والوں کی، مگر ان میں سے کتنے ہیں جنھوں نے کئی نسلوں کی ذہنی تربیت میں حصّہ لیا ہو۔ ان کو لکھنا پڑھنا اور سوچنا سکھایا ہو۔ ایسے کئی ایک پڑھے لکھے لوگوں سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں جنھوں نے بچپن میں نیرؔ صاحب کی کتابیں پڑھی تھیں اور آج بھی خود بہت اچھا لکھنے والوں میں شمار ہونے کے باوجود، وہ اُن کی کتابیں دلچسپی سے پڑھتے اور اُن کی تعریف کرتے نظر آتے ہیں۔ ہمارے کتنے لکھنے والے ہیں جن کو یہ بات نصیب ہے؟

اُن کی تخلیقات کا بڑا مقصد، بچّوں کی ذہنی تربیت اور انھیں اخلاقی تقاضوں سے آگاہ کرنا ہے۔ انھیں علم سیکھنے، صاف ستھری زبان لکھنے اور اچھے شہری بننے کا شوق دلانا ہے، جس میں انھیں غیر معمولی کامیابی ہوئی ہے۔

نیرؔ صاحب کی کئی کتابیں جو چھوٹی چھوٹی ضرور ہیں، مگر بہت ساری ہیں۔ سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں چھپی ہیں اور چھپتی رہی ہیں۔ نہ جانے کتنے بچّوں اور بچیوں نے انھیں کورس کے طور پر پڑھا ہے اور کتنوں نے اُن کو پڑھ کر اور سمجھ کر اپنے کورس کی کتابوں کو بہتر طور پر سمجھا ہے اور اس طرح انھیں اُردو لکھنے پڑھنے کا سلیقہ آیا ہے۔

بچّوں کو اُردو پڑھانے اور ان میں سادہ سلیس اور صحیح اُردو لکھنے کا شوق پیدا کرنے کے لیے پچھلے پچاس برس میں جو کام نیرؔ صاحب نے کیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ بچّوں کے ادب میں اضافہ ہمارے دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی کوششوں سے بھی ہوا ہے اور ہوتا رہا ہے، لیکن اسی ایک کام کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دینے کا شرف ہمارے اس دور کے شاید ہی کسی دوسرے شاعر یا ادیب کو حاصل ہو۔ ■■

عبداللہ ولی بخش قادری

نیّر صاحب نے کہانی سنائی

ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ اُس میں صاف ستھرا فرش بچھا ہوا ہے۔ ایک طرف بالکل بیچ میں ایک چھوٹی سی میز رکھی ہے اور ایک کرسی۔ چند بچے وہاں تمیز سے بالکل خاموش بیٹھے ہیں جیسے کسی کا انتظار کر رہے ہوں۔ اتنے میں اُن کی امی جان اور ابا میاں کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ بھی ان کے پاس آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک بچہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوتا ہے اور سامنے دیکھتے ہوئے بالکل صاف لہجے میں کہتا ہے کہ میں آج کے جلسے کی صدارت کے لیے ابا میاں کا نام پیش کرتا ہوں۔" اس کا جملہ ختم ہوتے ہی ایک بچی کھڑی ہوتی ہے اور بڑے اطمینان سے اپنی دھیمی آواز میں کہتی ہے کہ میں اس تجویز کی تائید کرتی ہوں"۔ اور جھٹ سے اپنی جگہ پر بیٹھ جاتی ہے۔ کمرے میں ایک آواز سی اٹھتی ہے کہ ہم سب تائید کرتے ہیں" اور تالیاں بجتی ہیں۔ ابا میاں اپنی جگہ سے اٹھتے ہیں اور کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ سب اُن کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ ایک خاص محبت کے انداز میں سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کچھ پچھلے جلسے کی باتیں کرتے ہیں اور پھر اپنی ایک نئی کہانی سنانے کا اعلان کرتے ہیں۔ ایک بار پھر اس چھوٹے سے کمرے میں تالیوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔

ایسے جلسے اس گھر میں عام طور پر ہر مہینے ہوا کرتے۔ کبھی ابا میاں سے کہانی سننے کو ملتی اور کبھی کوئی نظم۔ کہانی یا نظم سننے کے بعد یہ ضروری ہوتا کہ بچے اس بارے میں اپنی رائے دیں۔ لہٰذا اپنی اپنی پسند اور سمجھ کے مطابق سب اپنی اپنی بات کہتے۔ اچھی خاصی بحث چھڑتی۔ لیکن ہمیشہ ہنسی خوشی کے ساتھ جلسہ ہوا کرتا۔ ان جلسوں میں بچوں کو بھی لطیفے سنانے، مضمون پڑھنے اور نظم خوانی کا موقع ملتا۔ اسی طرح یہ سلسلہ برسوں جاری رہا۔ اور ابا میاں برابر اپنی نئی نئی نظمیں اور کہانیاں سناتے رہے۔

برسیں ہوئیں کہ ان خاندانی جلسوں کا سلسلہ بند ہو چکا ہے۔ اس وقت کے بچے اب بڑے ہو گئے

ہیں بلکہ اب خود بچوں والے ہو رہے ہیں۔ لیکن بابا میاں کی نظمیں اور کہانیاں سیکڑوں اور لاکھوں بچے بڑے شوق سے پڑھ چکے ہیں اور آئندہ پڑھیں گے۔ آج وہ بچوں کے محبوب شاعر اور ادیب کی حیثیت سے ساری اُردو دنیا میں مشہور ہیں۔ وہ ہیں ہمارے جناب محمد شفیع الدین صاحب نیّر۔

نیّر صاحب نے بچوں کے لیے اتنا بہت سا اور اتنا اچھا کام کیا ہے کہ اس وقت اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے پچاس سال پڑھنے پڑھانے میں گزارے اور ایک اچھے استاد کی نظر اور ایک سمجھ دار باپ کے دل کے ساتھ، بچوں کے لیے سیکڑوں نظمیں اور کہانیاں لکھیں۔ انھوں نے پورے طور پر اپنے آپ کو بچوں کی خدمت کے لیے وقف کر ڈالا ان کی نظموں کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ بچوں کے شاعر کی حیثیت سے اُن کا درجہ مسلّم ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ جب کوئی شخص اپنی کسی خوبی کی وجہ سے بہت زیادہ شہرت پا جاتا ہے تو اس کی دوسری خوبیوں کی طرف عام طور سے دھیان نہیں دیا جاتا ہے۔ یا ان پر بہت کم نظر پڑتی ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ نیّر صاحب کے ساتھ ہے۔ گویا کہ "بچوں کے شاعر" نے بچوں کے ادیب کی طرف سے آڑ سی کر رکھی ہے اور اکثر ہم اُن کی ادیب والی حیثیت کو بھول ہی جاتے ہیں لیکن اس سلسلے میں اگر ان کی خدمت کو دیکھا جائے تو وہ بھی نہایت قدر کے قابل ہے۔

نیّر صاحب کی کہانیوں کی تعداد بہت کافی ہے انھوں نے اپنی کہانیوں کو بچوں کی عمر کے لحاظ سے اب چار سلسلوں میں بانٹ دیا ہے تاکہ اپنی اپنی قابلیت کے اعتبار سے بچے ان کہانیوں کو پڑھیں۔ ان کی کہانیوں کا پہلا سلسلہ چھ سات برس کے ننھے منے بچوں کے لیے ہے۔ اس میں یہ چھ کتابیں شامل ہیں۔ (۱) گلگلے کی دَوڑ (۲) میں گھر جاؤں تو کیسے (۳) مکھن کا ڈبّہ (۴) ڈھول کا پول (۵) آٹے کا پتلا (۶) ہوشیار حسن سان سب کہانیوں کی زبان بھی آسان ہے۔ لفظوں اور جملوں کو بار بار دہرایا گیا ہے تاکہ زبان سیکھنے میں مدد ملے۔ ان کہانیوں میں ایسی باتیں ہیں کہ بچوں کو پڑھنے میں مزا آئے اور کوئی بات سننے کو ملے جس سے وہ کچھ سیکھ سکیں۔ یہ کہانیاں انگریزی زبان سے لی گئی ہیں۔ نیّر صاحب کی کہانیوں کے دوسرے سلسلے میں دیو پریوں کی آٹھ کہانیاں شامل ہیں۔ یہ سات آٹھ برس کے بچوں کے لیے ہیں۔ ان کے نام ہیں (۱) تارا کا ڈنڈا (۲) انار راجا (۳) بطخ شہزادی (۴) ریڈیو کا بھوت (۵) بونے کا ہنڈولا (۶) پری کی چھڑی (۷) پرستان کی سیر (۸) بونے کا انصاف۔ یہ کہانیاں انگریزی کہانیوں کے طرز پر لکھی گئی ہیں۔ ہر کہانی کی زبان پچھلی کہانی سے کسی قدر مشکل ہوتی گئی ہے۔ ان کہانیوں کی زبان آسان اور بیان کا انداز دلچسپ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ دیو پریوں کی کہانیاں ایک خیالی دنیا آباد کرتی ہیں۔ نیّر صاحب نے اپنی ان کہانیوں میں بھی اس بات کا پورا خیال رکھا ہے کہ بچوں کے دل کے اندر بے جا ڈر نہ پیدا ہو اور غلط باتیں نہ بیٹھنے پائیں۔ وہ خواہ پرند اور چرند کا ذکر کریں یا دیو اور پری کا لیکن چاہتے یہی ہیں کہ بچے کا ذہن کھلے اور ترقی پا جائے۔ نیّر صاحب کی

کہانیوں کا تیسرا سلسلہ آٹھ سے گیارہ برس کے بچّوں کے لیے ہے۔ اس میں یہ آٹھ کہانیاں ہیں: (۱) چلبن چُنن (۲) منی کا پرستان (۳) ٹلّو میاں (۴) انوکھی چھڑی۔ (۵) میاں مٹھو (۶) طلسمی مینا (۷) کھلّو میاں (۸) یادگار انگوٹھی۔ ان کہانیوں کا جھکاؤ سبق سکھانے کی طرف ہے، لیکن سب کی سب بڑی مزے دار ہیں اور بچّوں کی آپس کی بات چیت کے انداز میں لکھی گئی ہیں۔ نیّر صاحب کی کہانیوں کا چوتھا سلسلہ گیارہ سے چودہ برس کے بچّوں کے لیے ہے۔ اس میں بھی انھوں نے آٹھ کتابوں کو رکھا ہے۔ جن کے نام ہیں: (۱) چنگو منگو (۲) پیسے کا صابن (۳) گھر کا آئینہ (۴) عید کے کھلونے (۵) باپ کی ناؤ (۶) مزدور کا بیٹا (۷) شیر خاں کے معرکے۔ (۸) غالب کی کہانی۔" یہ سب کتابیں بڑے بچّوں کی زبان اور ان کے مذاق کو پیش کرتی ہیں۔ گھر کا آئینہ تو اپنے اندر تین چھوٹے چھوٹے اخلاقی افسانے رکھتا ہے۔ "شیر خاں کے معرکے" کئی قصوں کو اپنے اندر سموئے ہے اور عید میں بھی تین کہانیاں ہیں۔ نیّر صاحب کی کتاب غالب کی کہانی' تو ایک کارنامہ کہلانے کی مستحق ہے اردو شاعروں میں غالب کی برابر کسی کو آج تک شہرت اور مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔ اُن کی وفات کو ۱۹۶۹ء میں ۱۰۰ سال ہو گئے۔ اس موقع اُن کی سو سالہ برسی کی تقریب منائی گئی۔ ان کی یاد میں جلسے ہوئے کتابیں چھاپی گئیں۔ اور بچّوں کے سامنے غالب کی زندگی کو پیش کرنے کا کام نیّر صاحب کے ہاتھوں پورا ہوا۔ اس کتاب کے پڑھنے سے آپ کو غالب کی زندگی کے حالات معلوم ہوں گے۔ اور اُن کی بڑائی کا پتا چلے گا۔ غالب کے بارے میں بڑوں کے لیے بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن بچّوں کے لیے غالب کی کہانی جیسی کوئی اور کتاب نظر نہیں آتی ہے۔

مختصر بات یہ ہے کہ "منگلگلے کی دوڑ" سے لے کر غالب کی کہانی تک نیّر صاحب نے اُردو پڑھنا شروع کرنے والے چھوٹے بچّوں سے لے کر اردو ادب کی طرف قدم بڑھانے والے بڑے بچّوں تک سب کے لیے قلم اٹھایا ہے۔ انھوں نے ہر عمر کے بچّے کی زبان کی قابلیت، مزاج کی کیفیت اور زندگی کی ضرورت کو سامنے رکھا ہے۔ انھیں زبان بھی سکھائی ہے، ان کا اخلاق بھی سنوارا ہے۔ اور اُن کا دل بھی بہلایا ہے۔ اُن کی کہانیوں کی ہر ایک کتاب بار بار چھپتی رہتی ہے۔ اور ہر بار کافی تعداد میں چھپتی ہے۔ شاید ہی اس وقت اُردو میں اور کسی کی اتنی کہانیاں اور اس قدر مقبول ہوں۔ اُن کی نظموں کا حال تو کہانیوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ پھر بھی نیّر صاحب میں نہ غرور ہے نہ اکڑ بلکہ ان کی طبیعت میں انکساری ہے۔ وہ اپنے چھوٹوں سے بھی بڑی عزت اور محبت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بڑی تکلیفیں جھیلی ہیں۔ وہ اپنے بچپن میں بالکل بے سہارا ہو گئے تھے لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ اپنی کوشش سے اپنی روزی کمائی اور اپنی تعلیم بڑھائی۔ اب خدا نے انھیں اپنی محنت کا پھل دیا ہے۔ اُن کے سب بچوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے اور اچھی اچھی عادتوں کے مالک ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اُن کے بچوں کی زندگی بنانے میں اُن کا

(باقی صفحہ ۲۴ پر)

مسعود حیات

تو ہے بچوں کی دنیا میں یوں ضو فگن
شعر بن کر چمکتی ہے اک اک کرن
ہیں منور ترے نور سے جان و تن
تو کہ ہے نیّرِ آسمانِ وطن
تجھ سے روشن ہے بچوں کی ہر انجمن

نونہالوں کی خاطر اٹھایا قلم
آج بھی تیرے ہاتھوں میں ہے یہ قلم
اور میدان میں بڑھ رہے ہیں قدم
تو کہ ہے نیّرِ آسمانِ وطن
تجھ سے روشن ہے بچوں کی ہر انجمن

طالب علم پڑھتے ہیں نظمیں تری
ایک اک حرف ہے ذہن کی رہبری
سب کو منزل دکھاتی ہے یہ شاعری
تو کہ ہے نیّرِ آسمانِ وطن
تجھ سے روشن ہے بچوں کی ہر انجمن

تو نے لکھا ہے سرو و سمن کے لیے
تیرے نغمے ہیں گنگ و جمن کے لیے
تیرا ایثار دشت و دمن کے لیے
تو کہ ہے نیّرِ آسمانِ وطن
تجھ سے روشن ہے بچوں کی ہر انجمن

تیری نظموں میں نکہت ہے گلزار کی
تیرے گیتوں میں رنگت ہے تیوہار کی
تیری باتوں میں عظمت ہے افکار کی
تو کہ ہے نیّرِ آسمانِ وطن
تجھ سے روشن ہے بچوں کی ہر انجمن

تیرے ماتھے پہ روشن وفا کا نشاں
تو ہر اک حال میں ہند کا قدرداں
کتنا مخلص ہے تو کس قدر مہرباں
تو کہ ہے نیّرِ آسمانِ وطن
تجھ سے روشن ہے بچوں کی ہر انجمن

تو یونہی عمر بھر جگمگاتا رہے
ذرے ذرے کو سورج بناتا رہے
بھولے بھٹکوں کو رستہ دکھاتا رہے
تو کہ ہے نیّرِ آسمانِ وطن
تجھ سے روشن ہے بچوں کی ہر انجمن

ڈاکٹر قمر رئیس

ہمارا معلمِ اوّل

اُردو میں اچھا یا بُرا، بچوں کا ادب کم نہیں ہے۔ لیکن بچوں کے ادیب بہت کم ہیں۔ یعنی ایسے ادیب جنھوں نے اپنی زندگی اور صلاحیتوں کا بڑا حصّہ بچوں کے لیے سنجیدہ اور صحت مند ادب کی تخلیق میں صرف کیا ہو۔ جو ہر عمر کے بچوں کی نفسیات، ان کے ماحول، ان کے جذباتی تقاضوں اور ذہنی ضرورتوں سے ماہرانہ واقفیت رکھتے ہوں۔ یہ مہارت یونہی حاصل نہیں ہوتی، بلکہ طبعی میلان، مسلسل غور و فکر اور پیہم ریاضت کا ثمرہ ہوتی ہے۔ بچوں کا ادیب، عمر کے ہر دور میں، کم سن بچوں کی سی زندگی بسر کرتا ہے، وہ بدلتی ہوئی زندگی میں، بچوں کے بدلتے ہوئے مذاق، ان کی دلچسپیوں، اور ضرورتوں کا عرفان حاصل کرتا ہے اور مستقلاً اس بات کا اندازہ کرتا رہتا ہے کہ بچوں کو علم و آگہی کی صورت میں جو کچھ دیا جائے، وہ ان کی عمر کے مخصوص تقاضوں اور زندگی کی ضرورتوں، دونوں سے مطابقت رکھتا ہو۔ گذشتہ نصف صدی میں جب علم و آگہی کے وسائل اور اس کا سرمایہ حیرتناک تیزی سے بڑھ رہا ہے اور مختلف عمر اور پیڑھی کے بچوں کے درمیان سوجھ بوجھ کا فرق بھی بڑھتا جا رہا ہے، تو اس صورت حال میں بچوں کے ادیب کا کام کچھ اور دشوار ہوگیا ہے۔ ابتدائی درجوں میں زبان و ادب کی تدریس کے لیے بھی جو کتابیں لکھی جاتی ہیں، وہ چند سال کے بعد ناقص ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس اُنیسویں صدی کے آخر میں مولانا محمد حسین آزاد اور اسمٰعیل میرٹھی نے بچوں کے لیے جو درسی اور غیر درسی کتابیں لکھی تھیں، وہ کم و بیش نصف صدی تک سکۂ رائج کی طرح چلتی رہیں۔ لیکن آج تیز رفتاری سے بدلتی ہوئی بچوں کی نفسیات، ذہنیت اور زبان کے تقاضوں کو نظرانداز کرکے کوئی ادیب بچوں کے ادب کا حق ادا نہیں کرسکتا۔

اُردو کا جو ادیب کمال و ہُنر کی اس بلندی کو پاسکا ہے، وہ شفیع الدین نیرؔ ہیں۔ گذشتہ نصف صدی میں انھوں نے بچوں کے لیے جو کچھ لکھا وہ اُردو کے بعض دوسرے شاعروں یا ادیبوں کی طرح تفننِ طبع کے طور پر نہیں بلکہ اس کام کو ایک مقدس قومی اور انسانی فریضہ خیال کرکے۔ ان کا تعلق جس قومی، تعلیمی ادارے سے رہا ہے، اس کی اعلیٰ قدروں اور آدرشوں نے بھی ہمیشہ انھیں اس کام کو بہتر سے بہتر طور پر انجام دینے کا حوصلہ بخشا ہے۔ ان کی تصانیف نے اُردو جاننے

والی کم و بیش چار نسلوں کی ذہنی تربیت میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۵۶ء میں جب علی گڑھ میں ایک بزرگ نے نیر صاحب سے میرا تعارف کرایا تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ میں نے انھیں بتایا کہ کن ابتدائی درجوں میں، میں نے ان کی کون کون سی کتابیں پڑھیں اور وہ اشعار بھی سُنائے جو مجھے یاد تھے اور آج بھی اسی طرح حافظے میں محفوظ ہیں۔ مثال کے طور پر:—

آؤ گھیرا ایک بنالیں — اپنے اپنے ہاتھ ملالیں
سینہ تان کھڑے ہو جائیں — اوپر کو گردن بھی اٹھائیں
ایڑی سے ایڑی کو ملاکر — پیر کے پنجوں کو پھیلاکر
اپنے اپنے پانوٓ اٹھائیں — چلتے جائیں چکر کھائیں

سچ تو یہ ہے کہ اُردو کے جس شاعر سے میں پہلی بار متعارف ہوا اور جس کا کلام میں نے مطبوعہ کتاب میں پڑھا اور یاد کیا، وہ نیر صاحب ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دوسری جنگِ عظیم شروع ہوگئی تھی۔ میں پرائمری اسکول میں اول جماعت کا طالب علم تھا جب ایک رنگین خوبصورت اور چمکدار ٹائیٹل والی کتاب "بچوں کا تحفہ" پڑھنے کو ملی۔ ایک نظم "کھیل کا گیت" (جس کے چند اشعار اوپر نقل ہوئے ہیں) ہمارے محترم لیکن نہایت سخت استاد ماسٹر سری رام نے سب بچوں کو یاد کرائی۔ اتفاق سے وہ نظم مجھے سب سے پہلے اور پوری صحت کے ساتھ یاد ہوگئی۔ یہ اسی نظم کا فیض تھا کہ مجھے زندگی کا پہلا اعزاز ملا۔ یعنی میں اپنی جماعت کا مانیٹر بنادیا گیا۔ کھیل کے گھنٹے میں، میں یہ نظم لہک لہک کر پڑھتا۔ دوسرے تمام بچے بھی ہم آواز ہو کر گاتے۔ اور ہر شعر کی ہدایت کے مطابق عمل کرتے۔

اس کے بعد نیر صاحب کی دوسری کتابیں پڑھیں۔ اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ گذشتہ پچاس سال کی مدت میں نیر صاحب کی تصانیف نے میری طرح لاکھوں بچوں کو کس طرح متاثر کیا ہوگا۔ ان کے ذہن کی لوحِ سادہ پر اپنی مادری زبان کی شیرینی، شعری آہنگ، قوافی اور حُسنِ ادا کے کیسے دل کش نقش بنے ہوں گے۔ ان کی تحریروں میں ملک و قوم سے محبت، انسانیت کا درد اور اخلاق و تہذیب سکھانے والے جو نکتے چھپے ہوئے ہیں، انھوں نے غیر شعوری طور پر ہماری تربیت میں کتنا اہم حصہ لیا ہوگا۔ اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل اس لیے ہے کہ سنِ بلوغ کو پہنچ کر جب ہم کسی صاحبِ فکر ادیب سے متاثر ہوتے ہیں، تو ہماری قوتِ تمیز اس اثر پذیری کی شناخت بھی کر لیتی ہے، خواہ ہم اس کا اعتراف نہ کریں۔ لیکن عہدِ طفولیت میں ہم، قصہ کہانیوں، لفظی مرقعوں اور نظموں سے جو اخذ و قبول کرتے ہیں، وہ غیر شعوری ہوتا ہے۔ اس غذا سے ہمارے ذہن و تخیل کو نشو و نما کی جو قوت حاصل ہوتی ہے، وہ کم و بیش اسی جسمانی توانائی کی طرح ہوتی ہے جو کھانے پینے، دوڑنے اور کھیلنے سے حاصل ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بڑے ہو کر ہم اپنے بچپن کے ادیبوں کی صحیح قدر و قیمت کو سمجھنے اور اس کا اندازہ لگانے سے قاصر رہتے ہیں۔

نیر صاحب نے جب لکھنا شروع کیا، اُس وقت اور اس کے مدتوں بعد تک، لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے اردو میں جو لٹریچر دستیاب ہوتا تھا، اس کا بڑا حصہ فرسودہ خیالات، ضعیف الاعتقادی اور احیا پرستی کے جذبات سے معمور تھا۔ نیر صاحب نے ابتدا

ہی سے اپنی تحریروں میں عقلیت، روشن خیالی اور انسان دوستی کا ایک ایسا روشن نقطۂ نگاہ سامنے رکھا، جو سائنسی عہد کے شعور و احساس سے آنکھیں ملا سکتا ہے۔ سات آٹھ سال یا دس گیارہ سال کی عمر کے بچوں کے لیے انھوں نے جو بے شمار کہانیاں لکھی ہیں، ان میں یا تو بچوں کے عام مشاہدے اور ماحول سے تعلق رکھنے والے لطیف مزاحیہ واقعات سے کام لیا ہے یا پھر داستانی رنگ میں دیو پری جیسے فوق الفطری کرداروں سے دل چسپ فضا تخلیق کی ہے۔ لیکن ان تمام کہانیوں کا مقصد ایک ایسے انسان (بچے) کی تربیت ہے، جو سائنسی ترقیوں کے یُگ میں سانس لے رہا ہے اور قدرت کی پُراسرار طاقتوں کو مسخّر کر کے اپنی زندگی کو پُرآسائش بنا رہا ہے۔ مثال کے طور پر جب کھلّو میاں اپنے کھلنڈرے پن کے ہاتھوں جھیل میں ڈوب کر ایک بادشاہ کے زرنگار محل میں پہنچتے ہیں اور بادشاہ جلّاد کو حکم دیتا ہے کہ ان کا سر تن سے جدا کر دیا جائے تو کم سن شہزادی فوراً بیچ میں آ کر جلّاد کو روکتی اور کہتی ہے۔

" یہ بہت باہمت اور بہادر ہے۔ یہ کسی خطرے کو خاطر میں نہیں لاتا۔ کیسی ہی چوٹ لگے، پروا تک نہیں کرتا۔ مجھے یہ کسی انسان کا لڑکا معلوم ہوا۔ انسان اس دنیا میں سب سے بازی لے گیا ہے۔ اس نے آگ، پانی، ہوا، بھاپ، بجلی سب کو اپنے بس میں کر لیا ہے۔ وہ بڑے بڑے کام کر سکتا ہے ... کیا عجب ہے کہ اس کی مدد سے شہزادی جہاب کے دشمن سرطان دیو کو زیر کیا جائے "

کھلّو میاں کو آزاد کر دیا جاتا ہے اور کہانی میں واقعی ان کی تدبیروں سے شہزادی جہاب کو سرطان دیو سے نجات مل جاتی ہے۔ اس طرح کی کہانیاں صرف انسان کی تب و طاقت کا رزمیہ نہیں ہیں وہ زندگی اور انسانیت سے محبت کا خاموش درس بھی دیتی ہیں اور بچوں کی ذہنی اور عملی قوتوں کو انسان کی فلاح کے لیے بڑے کاموں پر اکساتی ہیں۔ وطن پرستی، مساوات اور مذہبی رواداری کے علاوہ یہ وصف بھی نیر صاحب کی تحریروں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ اپنی کتاب "اسلامی نظمیں" میں انھوں نے اسلام کا جو تصور دیا ہے اور مسلمان بچے کے مثالی کردار کو جس طرح ابھارا ہے اس میں بھی ان ہی اوصاف پر زور دیا گیا ہے۔ ایک نظم کے یہ دو بند دیکھیے۔

ہم مسلمان ہیں مذہب ہے ہمارا اسلام
ہم میں کچھ فرق نہیں، شاہ کوئی ہو کہ گدا
سب برابر ہیں غلام اس میں ہوں یا ہوں آقا
ہم میں اللہ کے نزدیک فقط ہے وہ بڑا
جو ہر اک بات میں اللہ سے ڈرتا ہو سوا
ہم مسلمان ہیں مذہب ہے ہمارا اسلام

کسی انسان کو بھی دکھ میں اگر پاتے ہیں
چوٹ لگتی ہے وہ دل میں کہ تڑپ جاتے ہیں
اپنا سکھ چھوڑ کے ہم سکھ اسے پہنچاتے ہیں
بے غرض سب کی مدد کرتے ہیں کام آتے ہیں
ہم مسلمان ہیں مذہب ہے ہمارا اسلام

اس مجموعے کے دیباچے میں نیر صاحب نے لکھا ہے کہ انھوں نے ان نظموں میں مندرجہ ذیل امور پیش نظر رکھے ہیں۔

الف۔ زبان سادہ اور عام فہم ہو۔ ایسی سادہ اور

عام فہم کہ بچے اور اَن پڑھ عوام اچھی طرح سمجھ سکیں۔

ب۔ خیالات بھی سیدھے سادے ہوں۔ سچی باتیں بیان کی جائیں۔ مبالغے سے پرہیز رکھا جائے۔

ج۔ بحریں مترنم ہوں۔

د۔ ان نظموں میں اسلام کی جستہ جستہ تعلیم، جیسی کہ واقعی وہ ہے، بیان کی جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ اوّل الذکر تینوں خصوصیات ان کی تمام نظموں میں بدرجہ اتم ملتی ہیں۔ ان نظموں میں تخیل کی ندرت اور نزاکت یا دوسرے شعری محاسن تلاش کرنا بے سود ہوگا۔ لیکن ان میں سادگی، صداقت خلوص اور حسنِ ادا کے وہ عناصر ضرور ملتے ہیں جن کے بغیر کوئی بات بچوں کے دلوں میں بیٹھ نہیں سکتی۔

نیر صاحب نے بچوں کے لیے جو ادب تخلیق کیا ہے، وہ اتنا متنوع ہے کہ ایک مختصر مضمون میں اس کے تمام پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ لیکن یہاں ان کی تصنیف "غالب کی کہانی" کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ کتاب اس درجہ مقبول ہوئی کہ گذشتہ آٹھ سال کی مدت میں اس کے سات اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کی خوبیاں، اس کے عام فہم اور دل نشین طرزِ بیان اور مواد کی ہنرمندانہ ترتیب میں پوشیدہ ہیں۔ اس میں غالب کی شخصیت اور ایک شاعر اور نثر نگار کی حیثیت سے ان کے کارناموں کو اس عہد کی زندہ تہذیب کے سیاق و سباق میں ابھارا گیا ہے۔ جگہ جگہ مثالوں کے ساتھ غالب کی شاعری اور نثر کے محاسن کو اس سہولت اور دلچسپی سے ذہن نشین کرایا گیا ہے کہ اگر کوئی طالب علم صرف یہی ایک کتاب پوری توجہ سے پڑھ لے تو وہ اُردو شعر و ادب کا مزاج داں ہو سکتا ہے۔ صرف یہی نہیں نیر صاحب کی دوسری کتابیں بھی اردو شعر و ادب کا مذاق پیدا کرنے میں ممد و معاون ہوتی ہیں۔

نیر صاحب اُردو کے ان عظیم محسنوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے نام و نمود اور اعزاز و اکرام سے بے نیاز ہو کر، ساری زندگی خاموشی سے اس زبان کی خدمت انجام دی ہے۔ آج اُردو کا کوئی ادیب ایسا نہیں ہے جس کی کتابیں نیر صاحب کی تصانیف سے زیادہ تعداد میں پڑھی گئی ہوں۔ کاش ہم اور ہمارے ادارے نیر صاحب کی زندگی میں ہی ان کی بے مثل خدمات کا اعتراف کر سکیں۔

★ •

محمد جمال پاشا

محمد شفیع الدین نیرؔ ایم اے

جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، ہم نے منشی پریم چند بی اے اور کرشن چندر ایم اے سے کہیں پہلے محمد شفیع الدین نیرؔ ایم اے کو پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ سچ پوچھیے تو اردو پڑھنا ہم نے نیرؔ صاحب سے ہی سیکھی۔ بغدادی قاعدہ اور مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی پہلی ریڈر کے بعد ہم نیرؔ صاحب کی نظمیں اور کہانیاں باوازِ بلند ہجّے کر کے، اٹک اٹک کر، گا کے، چلّا کے پڑھتے تھے۔ تختی کو پنڈول سے پوتتے میں، جھوم جھوم کر ان کی نظمیں پڑھتے۔ ہمارے بستے میں ان کی نئی کتاب یا بچوں کا کوئی تازہ رسالہ ہوتا جس میں، ان کی کوئی نئی کہانی یا نظم ہوتی، جس کا نہ صرف بے چینی سے انتظار رہتا بلکہ اس پر بھائی بہنوں میں چھینا جھپٹی ہوتی۔ ایک بار جب ڈاکیہ آیا تو "بونے کا بٹوا" ہمارے ہاتھ لگا۔ سب دوڑے۔ ہم بنگلے کے احاطے کے سب سے اونچے املی کے درخت پر لنگور کی طرح چڑھ گئے۔ جب تک کتاب ختم نہ ہو گئی، زمین اور آسمان کے درمیان مطالعے میں مصروف رہے۔

سر محمد سلیمان ہمارے رشتے میں نانا تھے، دہلی میں چیف انجینیر تھے۔ پارلیمنٹ ہاؤس تیار کرنے کے سلسلے میں ان کے نام کی تختی، اُس کے پھاٹک پر نصب ہم نے اپنے بچپن میں دیکھی تھی، بلکہ انھوں نے دکھائی تھی۔ ان کے یہاں شادی میں گئے۔ ہم لوگ بہت چھوٹے تھے۔ اتنے چھوٹے کہ اسکول جانے کا ناخوشگوار سلسلہ تک شروع نہ ہوا تھا۔ سلیمان نانا انجینیر کم اور مولوی صاحب زیادہ تھے۔ بچوں سے بڑا پیار کرتے تھے۔ وہ ہم سب کو دہلی گھمانے نکلے۔ جامعہ بھی لے گئے۔ ایک نہایت خوبصورت اور جاذبِ نظر صاحب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے:۔

"دیکھو بچو! یہ ہیں بچوں کے سب سے بڑے ادیب شفیع الدین نیرؔ!" وہ آگے بڑھے۔ بڑے تپاک سے نیرؔ صاحب سے ملے۔ ہم بچوں نے فوراً نیرؔ صاحب کو گھیر لیا اور ان کی اچھی خاصی پریس کانفرنس کر ڈالی۔ نیرؔ صاحب نے ہمارے گال تھپتھپائے۔ بڑی شفقت سے ہمارے اشتیاق سوالات کے جواب دیے۔ یہ تھا دو بڑے ادیبوں کا پہلا بھرت ملاپ۔ ایک اپنی انتہا پر تھا دوسرا کی ابتدا کے فی الحال کوئی آثار نہ تھے۔

اس کے بعد برسوں یک طرفہ کارروائی جاری رہی۔ یعنی ہم نیرؔ صاحب کو پڑھتے رہے۔ اسی طرح کئی دہائیاں بیت گئیں۔ ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ زینے چڑھتے ہانپتے [illegible] صاحب غریب خانہ انوری میں چلے آ رہے ہیں۔ روئی میں رکھے [illegible] ہو چکے تھے، مگر اب بھی ہمت میں جوانوں سے کہیں آگے تھے۔ پھر تو جب بھی لکھنؤ تشریف لائے غریب خانے کو ضرور رونق بخشی۔ دہلی کسی کانفرنس میں جانا ہوا۔ نیرؔ صاحب ہر طرف ہم دونوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ آخر جب تقریر کے لیے ہم ڈائس پر گئے تو نہ صرف انھوں نے کھڑے ہو کر داد دی، بلکہ ہماری کرسی پر

آکر بیٹھ گئے۔ جیسے ہی ہم لوٹے وہ ہم دونوں کو پکڑ کر ایک چائے خانے میں لے گئے۔ بڑی محبت سے ہمارے بہلانے، درجن بھر پیٹ بھرے ادیبوں کو ناشتہ کرایا اور جامعہ آنے پر اصرار کیا۔

بچوں کے بڑے ادیب، ہمارا تجربہ ہے کہ پاکٹ اڈیشن ہوتے ہیں۔ حامد اللہ افسر اور اطہر پرویز کی طرح نیر صاحب بھی پستہ قد ہیں۔ وہ بچوں کے سب سے بڑے ادیب ہی نہیں، بلکہ خود بھی بہت بڑا بچہ ہیں۔ یہ آپ کو ہمیشہ "نونہال بے بی" کی طرح ہشاش بشاش، تر و تازہ نظر آئیں گے۔

اُردو میں بڑے سے بڑا ادیب جو ہو سکتا ہے، ہم اُس سے یا وہ ہم سے مل چکا ہے۔ بڑا ادیب اُسے کہتے ہیں جس کا مُنھ ٹیڑھا رہے۔ خیر بڑا ادیب عام طور پر ریاکار بھی بڑا ہوتا ہے۔ مگر نیر صاحب جیسا معصوم، شریف، نیک، وضعدار، جنتی، اللہ میاں کی گائے مجھے کبھی ملا نہیں۔ بے حد بھولے بھالے، پیارے پیارے، بڑے گرم جوش، انتہائی پُر تپاک۔ جب بھی نیر صاحب سے ملاقات ہوئی، بے اختیار یہی دل چاہا کہ وہ کہا کریں اور ہم سُنا کریں۔

نیر صاحب جتنے بڑے انسان ہیں، اُتنے ہی بڑے ادیب بھی ہیں۔ اُردو میں بدقسمتی سے طنز و مزاح کی طرح بچوں کے ادب کا بھی کوئی ناقد پیدا نہیں ہوا ہے۔ دو چار سرسری کتابوں اور دس پانچ روا روی میں لکھے گئے پھسپھسے تنقیدی مقالوں کے کچھ نہیں ملتا۔ پھر عملی تنقید کا کیا سوال؟ ان کو پڑھ کر ہنسی آتی ہے کہ فاضل نقاد طنز و مزاح یا بچوں کے ادب کا کوئی علم نہیں رکھتے، اہم ادیبوں اور ان کے کارناموں سے لاعلم ہیں۔ اُردو کے موجودہ ڈاکٹروں سے ان کی تنہا ۔۔۔ اُمید رکھنا ایک بے جا مطالبہ ہوگا۔ ناقد غریب کو بھی بنائے یا طنز و مزاح، بچوں کے ادب کو سمجھنے اور کھنگالنے کا جھول پالے۔

نیر صاحب نے دنیا کے دوسرے بچوں کے بڑے ادیبوں کی طرح بچوں کی ذہنی نفسیات سمجھنے اور تعلیمی صلاحیت بڑھانے کا اپنی نظموں اور کہانیوں میں بڑا لحاظ رکھا ہے۔ قصہ سُنانے میں بچوں کے دماغ کو نئے الفاظ، معلومات سے مالا مال کرنے، الفاظ کے جادو جگانے میں جو اجتہاد کیا ہے، وہ بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔ بچہ چاہے کورس کی کتاب پڑھے یا "ڈھول کا بول" — "کٹکلے کی دوڑ"۔ "مکھن کا ڈبہ"۔ "آٹے کا پتلا"۔ "میں گھر جاؤں تو کیسے" یا "ہوشیار حسن"۔ اُس کے علم میں برابر اضافہ ہوگا۔ ان کی یہی وہ خوبی ہے جس پر علامہ اقبال، منشی پریم چند، بابائے اُردو، ذاکر صاحب اور سیدین مرحوم تک نے ان کی پیٹھ ٹھونکی تھی۔

شفیع الدین نیر بچوں کے نظیر اکبر آبادی ہیں "بچوں کا کھلونا"۔ "مُنّی کے گیت"۔ "وطنی نظمیں"۔ "ہماری زندگی"۔ "اسلامی نظمیں"۔ "ہماری نعت"۔ اور "اخلاقی نظمیں" پڑھ پڑھ کر نہ جانے کتنے بچے اچھے شہری، مفید انسان اور بڑے بڑے شاعر بن چکے ہیں۔ وطن اور مذہب سے محبت اور اخلاق کو انھوں نے انہی نظموں سے اپنایا ہے۔

ممکن نہیں کہ "تارا کا ڈنڈا"۔ "انار راجا"۔ "بطخ شہزادی"۔ "ریڈیو کا بھوت"۔ "بونے کا بٹوا"۔ "پری کی چھڑی"۔ "پرستان کی سیر"۔ یا "بوتے کا انصاف" کسی سات، آٹھ سال کے بچے کو مل جائے اور وہ اسے بلا ختم کیے دم لے — یہی لحاظ انھوں نے اپنی

(باقی ص ۲۹ پر)

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

بچوں کا تحفہ اور شفیع الدین نیر

آج جب ہم تعلیمی نظام پر نظر ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے جیسے تمام تعلیمی نظام صرف بڑوں کے لیے ہے بچوں کے لیے جو بھی لٹریچر ہے وہ ناکافی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے بنیادوں کو نظر انداز کر دیا اور اوپر کی منزل کو مکان کی بنیاد سمجھ لیا ہے۔ جہاں یہ سچ ہے کہ بچوں کی پہلی مکتب ماں کی آغوش ہوتی ہے، وہاں یہ بھی درست ہے کہ اس کے بچپن کے سب سے عزیز دوست وہ رسالے اور کتابیں ہوتی ہیں جن میں رنگ برنگی تصویریں، ذہنی ورزشیں، دل چسپ سبق آموز نظمیں اور کہانیاں ہوتی ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں بچپن میں "غنچہ" (بجنور) کا خریدار تھا۔ جس دن رسالہ آنے والا ہوتا، صبح سے بے چینی سے انتظار ہوتا۔ اس کی لذت اب بھی یاد آتی ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی کی کتابیں، جو ابتدائی کلاسوں کی تعلیم کا جزو تھیں، ان کی کہانیاں کوئی کس طرح بھلا سکتا ہے۔ ان کہانیوں کے ذریعے ہم نے اخلاقی قدروں کو پہچانا۔ مذہب کی عظمت کا احساس پیدا ہوا۔ زندگی اور اس کے نہ ٹوٹنے والے رشتے کا یقین پیدا ہوا۔ اس زمانے میں دو کتابوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ ایک تو حفیظ جالندھری کی کتاب "پھول مالا" اور دوسری شفیع الدین نیر کی کتاب "بچوں کا تحفہ" یہ تحفہ کتنی نسلوں تک پہنچا اور کس کس نے اس کو اپنی زندگی کے لیے مشعلِ راہ بنایا، ایک چراغ سے کتنے چراغ جل اُٹھے، شاید وزارتِ تعلیم کے اربابِ حل و عقد بھی ایسے اعداد و شمار جمع کرنے سے عاجز رہیں۔ میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ اس کتاب نے میری زندگی میں عجیب و غریب طریقے سے رہنمائی کی ہے۔ سب سے پہلے مجھے اس کے سرورق نے متاثر کیا۔ جس پر کچھ بچوں کی تصویریں ہیں۔ یہ بچے اپنے لباس سے پہچانے جا سکتے ہیں کہ ان کا کس مذہب سے تعلق ہے۔ یہ بچے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اس جھنڈے کے نیچے کھڑے ہیں۔ جس پر بچوں کا تحفہ لکھا ہے۔ اس کے پس منظر میں مسجد، مندر، گردوارہ اور کلیسا کے بلند مینار نظر آ رہے ہیں۔ ان سب میناروں کی بلندی میں یہ رمز بھی پوشیدہ ہے کہ بے شک خالقِ کائنات سب سے بلند و برتر ہے"۔ بچوں کا اجتماع دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ بچے مذہبی منافرت کی دیواروں کو توڑ کر ایک منزل پر پہنچنے کا عہد کر رہے ہیں۔ زندگی کا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ہم بڑے ہو کر بچوں کے اس عہد کی پاسداری

نہ کر سکے۔ بہر نوع یہ تاثرات تھے۔ جن کا نقش بچپن ہی میں اس کتاب کو پڑھ کر پیدا ہوا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اسکول میں جب یہ مضمون لکھنے کو دیا گیا کہ خدا کی سب سے بڑی نعمت کیا ہے؟ تو میں نے ماں باپ کی ذات کو سب سے بڑی نعمت کہا تھا۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ خدا نے اپنی صفاتِ جمال کا جس کو سب سے بڑا مظہر بنایا ہے وہ ماں باپ ہی کی ذات ہے مگر اس وقت نیرّ صاحب کی نظم 'حمد' کے یہ شعر گونج رہے تھے۔

جس نے ہمیں ماں باپ دیے ہیں ٭ ہم پہ ہزار احسان کیے ہیں
ماں کو بخشی ہماری محبت ٭ باپ کے دل میں ڈالی شفقت

ایک دو سال قبل کی بات ہے کہ میرا چھوٹا بچہ ٹیپو سلطان، علی الصبح جب اٹھتا تو مجھے اپنی امی کو اور بھائی بہنوں کو بستر پر جا کر یہ شعر پڑھ کر جگاتا

اٹھو بیٹا آنکھیں کھولو　　بستر چھوڑو، لو منھ دھولو
اتنا سونا ٹھیک نہیں ہے　　وقت کا کھونا ٹھیک نہیں ہے

اس کی اس آواز کو جب پہلی مرتبہ سنا تو اٹھنے کی بجائے ماضی کے ان حسین خوابوں میں کھو گیا جب بچوں کا تحفہ ہاتھوں میں لے کر، لہک لہک کر اس گانے کو جھوم جھوم کر پڑھا کرتا تھا اور ہر شعر پر اس کا عمل ادا کرنے کی کوشش بھی کرتا جس کا ذکر شاعر نے اپنی نظم میں کیا ہے۔

آپ ذرا اندازہ کیجیے کہ جو کتاب دل و دماغ پر اس قدر حاوی رہی ہو جب اس کے مصنف سے ملاقات ہوئی ہوگی تو کیا کیا نہ اپنی قسمت پر ناز کیا ہوگا۔ نیرّ صاحب کو پہلی مرتبہ بدایوں میں اپنے پھوپھا صاحب قبلہ کے گھر پر دیکھا تھا۔ دروازے کی اوٹ سے ان کو دیکھا۔ پھر سامنے آئے مگر بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی اگرچہ بعد کو دیر تک سوچتے رہے کہ وہ تو بچوں کے شاعر ہیں اگر وہ بڑوں سے بات نہ کریں تو ٹھیک ہے مگر ہمارا شاعر ہم سے باتیں نہ کرے تو یہ ظلم ہے معلوم نہیں کہ ذہن میں کتنے سوال تھے جو ہم ان سے کرنا چاہتے تھے۔ پوچھنا چاہتے تھے۔ کہ آپ یہ نظمیں کیسے لکھ لیتے ہیں؟ کیا آپ ہم پر بھی نظم لکھ سکتے ہیں؟ بچوں کے تحفہ کی تصویریں بھی کیا آپ نے خود ہی بنائی ہیں؟ کتاب کے پہلے صفحہ پر جو بچوں کی تصویریں ہیں اس میں وہ بچہ جو ترکی ٹوپی اوڑھے اور علی گڑھ وضع کا پاجامہ اور شیروانی پہنے ہوئے ہے کیا وہ لڑکا ظہور وارڈ (مسلم یونیورسٹی اسکول کا بچوں کا سیکشن جہاں میں خود پڑھا کرتا تھا) کا پڑھنے والا ہے؟ مگر کوئی سوال بھی نہ کر سکے مگر خوش تھے کہ ہم بچوں کے شاعر کو دیکھ کر آرہے ہیں۔ اس کے بعد کب کب ملاقات ہوئی مجھے یاد نہیں انسانی ذہن کا یہ بھی عجیب معمہ ہے۔ لڑکپن کے بہت سے واقعات یاد رہ جاتے ہیں مگر بڑی عمر کے واقعات فراموش ہو جاتے ہیں۔ نیرّ صاحب سے وہ ملاقات ضرور یاد ہے جب میں ایم اے کا امتحان دے رہا تھا۔ تو علی گڑھ میں نیرّ صاحب سے ملاقات ہوئی بلکہ ملاقاتیں ہوئیں۔

دل ہم سب کا شاد رہے گا
یہ دن ہم کو یاد رہے گا　　(نیرّ)

آج جب نیرّ صاحب کی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں اور ان کی تصانیف کا جائزہ لیتا ہوں تو سمجھ میں آجاتا ہے کہ نیرّ صاحب نے اپنی زندگی کے لیے معلمی کا پیشہ کیوں اختیار کیا، وہ جانتے تھے کہ تمام پیشوں اور منصبوں میں معلم ہی زندگی کا بہترین رہنما ہو سکتا ہے

ایمان اور یقین کی جو چنگاری استاد پیدا کر سکتا ہے وہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں ہے۔ "سکندر کی اسکندری" کا زمانہ محدود ہے اور استاد کی معلمی کا زمانہ لامحدود۔ ذاکر صاحب نے درست کہا ہے "ان میں (نیر صاحب) بچوں کے ذہن کو سمجھنے اور محبت کرنے کی وہ صفت ہے جو پیدائشی معلم کا جوہر ہوتی ہے۔" استاد کس کس طرح سے بچوں کے ذہن کے گوشوں میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے اور اس کے ذریعے وہ زندگی کی صالح اور جمالیاتی قدروں کی طرف رہنمائی کرتا ہے، یہ عمل اتنا لاشعوری طور پر ہوتا ہے کہ خود دل کو بھی اس کی خبر نہیں ہوتی۔ نیر صاحب اس رمز سے آگاہ ہیں۔ انھوں نے اپنی معلمی کے پیشے سے بچوں کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور شاعرانہ منصب سے انھوں نے جمالیاتی قدروں کو عام کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے زندگی کے ابتدائی عہد کی رہنمائی کا ذمہ لیا جن کو کل قوم کی تعمیر میں حصہ لینا ہے۔ اس خدمت کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ شاید بچوں پر نظمیں لکھنے کا اثر ہے کہ بڑھاپے کی سنجیدگی اور بردباری کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی میں بچوں کی سی معصومیت ہے۔ کاش کوئی ان کی نظموں کا اس حیثیت سے مطالعہ کرے کہ بچوں کو جن باتوں کی تعلیم دی ہے، زندگی کو جس طرح گزارنے کا سلیقہ سکھایا ہے وہ سب ان کی زندگی میں کس طرح دبے پاؤں آکر شامل ہو گئی ہیں۔

آج جب کہ بچوں کے ادب کا موضوع مدرسوں سے نکل، یونی ورسٹیوں کے ریسرچ کا موضوع بن چکا ہے، اس ضرورت کو محسوس کیا جا رہا ہے کہ چوں کہ بچے مستقبل کے امین ہیں اس لیے ان کی نفسیات اور ادب کی طرف خاص توجہ ہونا چاہیے۔ لطف یہ ہے کہ جس بات کا آج ہم کو احساس ہو رہا ہے، اس ضرورت کو آج سے نصف صدی قبل نیر صاحب نے سمجھ لیا تھا۔ تعلیم کے نظریاتی انداز سے ہٹ کر اس کے عملی پہلو کی طرف نیر صاحب قدم بڑھا چکے تھے۔ ذاکر صاحب کے الفاظ میں،

"انھوں نے وہ میدان سَر کیا ہے، جسے سَر کرنے کی بہت ہی کم اصحاب نے جرأت کی ہے۔"

اس فقرے میں اپنی اس دعا کو بھی شامل کرنا چاہتا ہوں کہ نیر صاحب اس وقت تک زندہ رہیں جب تک یہ مرحلۂ شوق طے نہ ہو جائے اور اللہ کرے مرحلۂ شوق کبھی طے نہ ہو۔

(صفحہ ۲ کا بقیہ)

باتصویر کہانیوں کی کتابوں کے تیسرے، چوتھے سیٹ میں بھی رکھا ہے۔ گیارہ سے چودہ برس تک کے بچوں کے لیے یہ سیٹ نہیں، مٹھائی کے ڈبے ہیں۔

نیر صاحب نے بچوں کے لیے "مرزا غالب" کو بھی پیش کیا۔ مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ بچوں کا مرزا سے ایسا تعارف ہو کہ وہ بڑے ہو کر غالب کے پیچھے پڑ جائیں۔

نیر صاحب کے قصے اور نظمیں ہمارے بچوں کے ادب کی تاریخ کا ایک تابناک باب ہیں۔ نیر صاحب نہ صرف باشعور بلکہ فرض شناس استاد ہیں، انھوں نے اپنے اس فرض کو پورا کر کے ہمارے ادب کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ شخصیت اور ادب کی یہ فرشتگی اُن کے بخشوانے اور تاریخ ادب میں ان کا نام محفوظ رکھنے کے لیے ضرورت سے کہیں زیادہ ہے۔ مگر اُن کو جنت میں بھجوانے کی ہمیں کوئی جلدی نہیں۔ وہ سلامت رہیں برس تا برس۔ ★

رشید الوحیدی

میرے محسن

مجھ پر بچپن کی رنگینیوں وادی سے جب ذرا سر نکالا تو سر پر طرح طرح کے اولے برسنے لگے۔ چیزوں میں حصہ کم لگنے لگا۔ چھوٹے بھائی بہنوں کی فوج (وارد) آپڑی۔ لوگوں کی توجہ اور محبت میں کمی آگئی۔ پر بھائی یہ سب تو اولے تھے۔ کچھ ہم نے برداشت کر لیے کچھ برس کر پگھل گئے مشکل اس وقت ہوئی جب ان اولوں میں ایک گولا مجھ پر پڑا۔ یعنی ابا مرحوم کا حکم امی جان کو ملا (خدا میری اماں کو تا دیر سلامت رکھے، میں ان کی خدمت کرکے جنت کماتا رہوں) "اب رشید کو پڑھنے بٹھاؤ۔ بڑا ہو گیا ہے"۔ پڑھائی کے نام سے روح کانپتی تھی۔ بچپن ہی میں پڑھنے والوں اور اسکول جانے والے لڑکوں کا محلے میں اور خود اپنے گھر میں حال دیکھ چکا تھا۔ ابا کا یہ حکم سن کر میں نے بغاوت کا دل میں ارادہ کرکے اماں سے کہہ دیا "سب کچھ منظور۔ میں پڑھوں گا نہیں چاہے مار ڈالیں"۔ امی نے اس وقت تو سنی ان سنی کر دی۔ مگر دوسرے وقت باتوں باتوں میں کھیل کھیل میں کچھ پڑھنے پڑھانے کا کام شروع کر دیا۔ چھ ماہ اسی طرح کام چلتا رہا۔ اماں کھیل کھیل میں پڑھاتی رہیں اگر بیچ میں مجھے احساس بھی ہو جاتا کہ پڑھائی ہو رہی ہے فوراً کھڑا ہو جاتا اور سیدھے باہر کی جانب ایک دو تین۔ "اچھا امی آپ پڑھا رہی ہیں!!"

ابھی کچھ مہینے بعد ایک دن اماں مرحوم باہر سے آئے تو میں نے غور سے دیکھا ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی میرے منہ سے اس کتاب کا نام نکل گیا "بانگِ درا" بچو، یہ لفظ منہ سے نکلنا تھا کہ دوسرا گولا بلکہ یوں کہو کہ ایک بم چھوٹا۔ "واہ بیٹے تم تو پڑھنے لگے۔ اب تمھیں اسکول میں نام لکھانا ہوگا"۔ میرے پیروں تلے زمین سرک گئی۔ کاش اماں نے کھیل کھیل میں دھوکا دے کر مجھے اس قابل نہ بنایا ہوتا کہ میں کتاب کا نام پڑھ سکوں، تو کاہے کو آخر یہ دن دیکھتا۔ بہرحال اب فوراً میں نے دو ارادے کر لیے ایک تو اسکول نہیں جاؤں گا اور دوسرا یہ کہ پڑھنے کے چکر میں نہیں پڑوں گا۔ میری اس ضد اور بدشوقی کا ابا مرحوم کو پتا چل گیا انھوں نے سمجھ لیا کہ مجھے زبردستی پڑھنے کی طرف نہیں لگایا جا سکتا بلکہ کوئی ایسی ترکیب چلنی چاہیے جس سے مجھے شوق پیدا ہو جائے۔

ایک رات جب وہ اور ہم سونے کے لیے لیٹے تو اچانک انھوں نے ایک کہانی سنانی شروع کی۔ کہانی ایسی مزیدار، چٹ پٹی اور دل کو موہ لینے والی تھی کہ میں اور دوسرے بچے اس میں کھو گئے۔ مگر اچانک یہ کیا ہوا۔ ابا چپ ہو گئے۔ میں نے بے چین ہو کر خوشامد شروع کی۔ میرے ابا۔ ابا جان اور سنائیے۔ پوری کہانی سنائیے۔ میرا اصرار اور ان کا انکار بڑھتا ہی گیا اور جب انھوں نے دیکھا کہ لوہا خوب

گرما ہے تو دی ایک ، چوٹے ہتھوڑے کی دبا کر۔ [illegible] ہے کہانی کی کتاب۔ تم خود پڑھ لو۔" "پڑھ لو" [illegible] ایک لمحے کو ٹھٹھکا مگر کہانی کے شوق نے "بڑا بھائی" کا ایک خوف دل سے دور کر دیا تھا۔ میں نے کتاب ہاتھ میں لے کر سب سے پہلے ایسے عظیم کہانی کار، بلکہ بچوں کے جادوگر مصنف اور شاعر کا نام دیکھا جس نے نہ صرف اپنی کہانی سے دل موہ لیا تھا، بلکہ تعلیم کا شوق دل میں پیدا کر دیا تھا۔ اور وہ نام شفیع الدین نیر کا تھا۔ تو بچو یہ تھا پہلا موقع زندگی کا کہ اس ڈرامائی طور پر اپنے محبوب شاعر اور بچوں کے محسن جناب شفیع الدین نیر کا نام سنا اور ان کی کہانی اور نظم دیکھی، سنی اور پڑھی۔

مجھ جیسے سیکڑوں بلکہ ہزاروں لوگ ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر ایسے ملیں گے جنھوں نے کم از کم اردو زبان نیر صاحب کی کہانیوں اور نظموں سے سیکھی ہے۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ عرصے تک میں یہی سمجھتا رہا کہ شاید اردو میں کہانی اور نظمیں لکھنے والا نیر صاحب کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔

بچپن میں دماغ قسم قسم کی الجھنوں سے طرح طرح کی باتوں سے پاک و صاف ہوتا ہے۔ اس وقت جو بات سنی یا پڑھی جاتی ہے، پوری طرح دماغ میں جم جاتی ہے پھر زندگی بھر انسان اسی کے اثر کو محسوس کرتا ہے۔ اور ذہن بچپن میں موم کی طرح ہوتا ہے، جیسا نقش اس وقت ذہن میں بٹھا دیا جاتا ہے، وہ ہمیشہ کے لیے چھپ جاتا ہے ایسا ہی سمجھیے وطن سے محبت، بہن بھائیوں کا خیال، صفائی، لڑائی جھگڑے، جھوٹ، گندگی سے نفرت وغیرہ اس قسم کی تمام اچھی اچھی باتیں آج تک جو دل و دماغ میں بیٹھی ہوئی ہیں، وہ بچپن میں نیر صاحب کی کتابوں کا دین ہیں، کیونکہ ان کی نظم صرف نظم اور ان کی کہانی صرف کہانی نہ تھی۔ وہ کہانیاں اور نظمیں اپنی تمام دلچسپیوں اور خوبیوں کے ساتھ اپنے اندر اس قسم کے تمام سبق بھی رکھتی تھیں۔

بچو! تم میں سے جس نے نیر صاحب کی تحریر پڑھی ہوگی، نیر صاحب سے اسے ایسی محبت ہوگی، جیسے اپنے ہم عمر کسی دوست سے ہوتی ہے۔ میرے دل کا بھی یہی حال تھا۔ میں نے جب تک انھیں دیکھا نہیں تھا، اپنے برابر کا ایک لڑکا سمجھتا تھا جو دوستوں کو کہانیاں اور نظمیں سناتا ہو اور جب میں پہلی بار دہلی آیا تو جامع مسجد، لال قلعہ، قطب مینار سے زیادہ جامعہ ملیہ دیکھنے کا شوق تھا اور جامعہ آکر سب سے زیادہ اور بہت جلد جس چیز کو دیکھ لینے کی تمنا تھی وہ تھی اپنا محبوب پیام تعلیم کا دفتر۔ اس کے ایڈیٹر حسین حسان صاحب (جو اب خدا کو پیارے ہو چکے ہیں) اور اپنے محبوب فن کار شفیع الدین نیر (خدا ان کو تا دیر سلامت رکھے)۔ دوستوں نے میرے اس شوق کو جلد ہی محسوس کر لیا اور سب سے پہلے مجھے نیر صاحب کی خدمت میں پہنچا دیا۔

ایک ادھیڑ عمر کے دوہرے بدن کے حضرت نے بہلا مسکرا کر استقبال کیا۔ وعلیکم السلام کہہ کر کرسی پیش کر دی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ، آنکھوں سے خوشی ظاہر، بات وہ ہم سے اس طرح کر رہے تھے جیسے ہم بچے نہ ہوں، بہت بڑے آدمی ہوں۔ نیر صاحب کی یہ بات لاکھ روپے کی ہے کہ وہ بچوں کو بھی اپنے دل میں بڑی عزت اور حیثیت دیتے ہیں اور اس طرح گفتگو فرماتے ہیں کہ بچے میں اسی وقت اپنی بڑائی کا احساس ہونے لگتا ہے اور آئندہ بھی کچھ بن جانے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وہ

بات ہے کہ ایک بار مل کر اُن سے بڑا پیار، بڑی اُنسیت
اور محبت ہو جاتی ہے اور تب پتا چلتا ہے کہ وہ اپنی
بڑائی اور زیادہ عمر کے باوجود بچّوں کے دوست ہیں۔
یہی نہیں حیرت تو اس وقت ہوتی ہے، جب وہ اپنی
تحریروں کے بارے میں اپنے پڑھنے والے بچّوں کی
رائے معلوم کرتے ہیں۔ رائے کی قدر کرتے ہیں۔ اور یہ
قدر دانی وہ تکلفاً نہیں کرتے بلکہ اس طرح خاموشی سے
بچّوں کی باتیں سُنتے ہیں جیسے وہ کچھ سیکھ رہے ہوں۔
بڑائی، غرور اور اپنی عظمت کا احساس تک نہیں ہوتا۔
قسمت نے چند سالوں کے بعد مجھے وہ خوشگوار موقع دیا
کہ میں کالج کے بی اے کے سالوں میں ان کا شاگرد بن
کر حاضر ہوا اور اس وقت اندازہ ہوا کہ وہ بچّوں کے
ادیب سے زیادہ ایک بہترین، قابل اور مخلص استاد
بھی ہیں۔ ان کی علمی بلندی، بچوں کے ادب سے بہت
آگے، اُردو کے بڑے سے بڑے ادیبوں سے گزر، فارسی
کے عظیم شعرا کے کلام کو چھو رہی ہے۔ اُردو ادب کا حصۂ
نظم نیر صاحب ہمیں پڑھاتے تھے۔ غالبؔ، اقبالؔ، میرؔ،
جگرؔ، اصغرؔ، غرض اُردو کے جدید و قدیم کا کوئی شاعر جب
وہ ہمیں پڑھاتے تو اس کے کلام کی روح اپنے دل و
دماغ سے ہمارے دل و دماغ میں اتار دیتے اور ایسی
تشریح فرماتے کہ مزا ہی آجاتا اور حیرت اس وقت
ہوتی جب ہر اردو شاعر کے ہر شعر کی، ایک مثال فارسی
شاعر کے شعر سے پیش کرتے۔ اُن سے ہر شاگرد کو محبت
اور خود انھیں ہر شاگرد سے ہمدردی تھی۔ ان کا گھر ہر
ایک کے لیے کھُلا ہوا تھا جب ہمیں کلاس میں سیری
نہ ہوتی تو گھر پر دھاوا بولتے اور نیر صاحب پوری
طرح متوجہ ہو کر ہماری مشکل آسان کرتے، چائے پلاتے
اور کوئی نہ کوئی نظم یا کہانی کی کتاب تحفہ دیتے کتنے اچھے
ہیں نیر صاحب۔ ہم تو ان کے شاگرد ہیں، ان کی عزت تو
ذاکر صاحب مرحوم مجیب صاحب۔ ڈاکٹر عابد صاحب اور
ملک کے ہر بڑے کی نگاہ میں رہی ہے۔ سب نے انھیں عزت
کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ان کے کام کی قدر کی ہے۔

آخر عمر میں ذاکر صاحب مرحوم نے انھیں غالبؔ کی
شاعری اور ان کی حیات پر ایک کتاب لکھنے کی دعوت دی
جسے نیر صاحب نے نہایت دل چسپ، عام فہم اور آسان
طرز میں نہایت مکمل صورت میں پیش کر دیا۔ نہ صرف ذاکر
صاحب نے بلکہ ملک کے گوشے گوشے سے اہلِ علم اور صاحبِ
قلم ادیبوں نے پسند فرمایا۔

بچّو! تمھارے پیام تعلیم نے نیر صاحب کی سالہا سال
کی خدمات کا صحیح اعتراف اور قدر دانی، نیر نمبر نکال کر
کی ہے اور سچ پوچھو تو یہ پیام تعلیم پر اُن کا حق تھا جسے
ہمارے محترم ایڈیٹر صاحب اور محترم شاہد صاحب نے
محسوس فرمایا اور یہ نمبر تمہارے سامنے ہے۔ اب میں اپنی
کہانی ختم کر دوں تاکہ تم اس باغ میں اور دوسرے پھولوں
کی خوشبو سے لطف اندوز ہو سکو۔ ●●

(۱۹ کا بقیہ)

کہانیوں نے اپنا اثر دکھایا ہے اور اُن کی کہانیوں
میں اُن کی طبیعت کا رنگ جھلک اُٹھا ہے۔ ان کی
کہانیاں یقیناً اپنے پڑھنے والوں کے اطوار سنوارنے
میں مددگار ثابت ہوں گی۔ میں نے آپ کو نیر صاحب
کی کہانیوں کی کچھ کہانی سنائی۔ اب اُن ہی کے الفاظ
دُہراتا ہوں۔

"چاند میں بیٹھی تارا رانی
اے لو بچّو! ختم کہانی"

مولوی محمد شفیع الدین نیر

جسٹس قدیرالدین احمد
(پاکستان)

مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر میرے استاد ہیں برسوں تک میرے چھوٹے بھائی حمیدالدین احمد اور میں، ان کے شاگرد اور ان کے زیر اثر رہے ہیں۔ اب کبھی یہ خیال آتا ہے کہ نرالی استادی اور شاگردی تھی کہ جب انھوں نے ہم کو پڑھانا شروع کیا تو وہ میٹرک کے طالب علم تھے اور ہم دونوں تھوڑے ہی عرصے پڑھ کر چھٹی جماعت میں داخل ہو گئے تھے وہ اردو اور فارسی کے بڑے بڑے امتحان دیتے رہے اور ہم اسکول کے نصاب کے چکر ہی میں رہے اگر وہ بڑے بڑے امتحان نہ دیتے تو بھی ہم کو ان کی شاگردی منظور تھی۔ شاگردی کا یہ سلسلہ ان کے میٹریکولیشن اور ہماری چھٹی جماعت کے بعد بھی برسوں تک جاری رہا۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ استاد بھی تھے، دوست بھی تھے، اور ساتھی بھی تھے۔ پڑھانے کا ان کو ایسا ڈھب آتا تھا کہ جو مضمون کوئی دوسرا مہینوں میں پڑھائے، اس کو وہ ہفتوں میں پڑھا دیتے تھے میں تو ان کے پڑھانے کے طرز سے اس کا قائل ہو گیا ہوں کہ عالم ہونا اور بات ہے اور استاد ہونا دوسری چیز ہے۔

ان سے میرا اور میری بیوی بچوں کا اب تک، دلی تعلق قائم ہے۔ مدتوں بعد وہ ایک دفعہ پاکستان آئے۔ اس زمانے میں میری بیوی کو فارسی پڑھنے کا شوق تھا۔ چنانچہ نیر صاحب نے ایک یا ڈیڑھ ماہ میں ان کو فارسی اتنی پڑھا دی کہ اس زبان سے جو الجھن پیدا ہوئی تھی وہ دور ہو گئی ایک دفعہ اور تشریف لائے تو میری لڑکی کو اردو پڑھائی۔ ان کا پڑھانا اس قسم کا تھا کہ شاگرد کو مضمون سے دلچسپی پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ وہ بچوں کو بھی پڑھا سکتے تھے اور بڑوں کو بھی طالب علم پر بوجھ نہیں پڑتا تھا۔

میرے بھائی پر اور مجھ پر ان کی لیاقت کا ہمیشہ بڑا رعب رہا ہے کیونکہ ہم دونوں محنتی طالب علم تھے اور ان لوگوں سے بہت متاثر ہوتے تھے جو اپنے وقت میں اچھے طالب علم رہے ہوں۔ نیر صاحب غیر معمولی قابلیت کے طالب علم تھے ہمیشہ امتحانات میں اول آتے اور اس کے ساتھ تقریر اور تحریر کی قابلیت کی وجہ سے جہاں جاتے وہاں شہرت حاصل کرتے سب سے پہلے ہم نے ان کو ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء میں دیکھا تھا۔ اس زمانے میں آصف علی صاحب نے اینگلو عربک اسکول کے مقابلے میں قومی درسگاہ قائم کی تھی۔ وہ وقت تحریک عدم تعاون یعنی Non-Cooperation کا تھا۔ نیر صاحب بھی اس تحریک کی وجہ سے تعلیم چھوڑ چکے تھے اس لیے قومی درسگاہ میں بطور طالب علم داخل ہو گئے یہ درسگاہ سب سے پہلے ایک بہت بڑے مکان میں قائم کی گئی تھی جو میرے جد امجد نواب احمد صاحب بشیرالدین کی رہائش گاہ تھی اب شاید اس میں ہمدرد دواخانے کا دفتر ہے۔ میرے جد امجد نے اپنے اہل خانہ کی

رہائش کو اوپر کی منزل کے دو کمروں میں منتقل کر کے سارا وسیع مکان درسگاہ کے استعمال کے لیے مفت دے دیا تھا یہ ان کی خدا ترسی اور فراخ دلی تھی وہ تو ایک درویش صفت مسلمان تھے، مگر تعلیم کا یہ ایک ناکامیاب تجربہ تھا۔ آصف علی صاحب نے اپنے اثر سے اور درس گاہ کو مشہور کرنے کے لیے گاندھی جی، مولانا محمد علی اور دوسرے لیڈروں کو بلا کر درس گاہ میں جلسہ کیا اور درس گاہ کی طرف سے ایک طالب علم سے تقریر کرائی۔ وہ طالب علم نیر صاحب تھے درس گاہ ہمارے گھر میں تھی اس لیے میرے بھائی اور میں بھی وہاں چوتھی جماعت میں داخل ہو گئے تھے۔ ہم پر نیر صاحب کی ہمت، ان کی تقریر کی روانی اور ایسے موقع پر ان کو اس اعزاز کے ملنے سے ایسا رعب پڑا کہ اب تک دل سے نہیں نکلا۔

ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہ طالب علم ہمارا استاد اور دوست بنے گا غالباً ۱۹۲۳ء سے انھوں نے ہم کو ہمارے گھر پر پڑھانا شروع کیا۔ وجہ یہ تھی کہ ان کو وقت نکال کر اپنے لیے ذریعۂ معاش پیدا کرنا پڑتا تھا۔ کتابی لیاقت اور چیز ہے اور معاش کی سہولتیں کچھ اور بات ہیں۔ پڑھانے میں ان کا جو وقت جاتا تھا، اس سے ان کی پڑھائی میں ضرور حرج ہوتا ہوگا۔ مگر وہ خود اچھے طالب علم تھے اور چاہتے تھے کہ جن سے ان کا واسطہ پڑے وہ بھی قابل قدر طالب علم ہوں۔ شوق پیدا کرنے کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ انھوں نے ہمارے لیے یہ نکالا کہ ہم سے "جمعیت اصلاح الطلباء" قائم کرائی۔ اس کا دستور بنا ہر ممبر کا فرض تھا کہ مثالی زندگی پیش کرے عہدے داروں کے انتخابات ہوا کرتے تھے۔ تقریریں ہوتی تھیں اور سالانہ جلسے ہوا کرتے تھے۔ نیر صاحب کے لیے ہماری والدہ صاحبہ نے ایک شاندار گاؤن بنوا دیا تھا اس کو پہن کر وہ کرسی صدارت پر بیٹھا کرتے تھے۔ سالانہ جلسوں میں بہت سے مہمان بلائے جاتے تھے۔ تاکہ جلسے کی رونق ہو اور مقررین کی اچھی مشق ہو جائے۔ ہم سے امید کی جاتی تھی کہ ایسی تقریر کی جائے کہ اپنے اور پرائے واہ واہ کریں۔ یہ تو سب کچھ ہوا۔ ہمارے ساتھیوں کو وہ جمعیت اب تک یاد ہے۔ ہم کو بھی تقریر کرنے کی اتنی عادت ہو گئی کہ نہ ٹانگیں کانپیں اور نہ زبان لڑکھڑائے اور نہ تقریر کو رٹنا پڑے۔ مگر ایک عیب بھی پیدا ہو گیا۔

وہ عیب یہ ہوا کہ ہر کام پوری محنت سے کرو۔ کام کی نوعیت سے محنت کا تعلق نہ رہا۔ یہ عقیدہ ہو گیا کہ محنت کبھی ضائع نہیں جاتی۔ نیر صاحب کے کردار کا یہ ایک بڑا نمایاں پہلو ہے اور وہ اس شوق کو اپنے شاگردوں کے دل میں بٹھا دیتے ہیں۔ شاید یہ شوق اور عقیدہ غلط بھی نہیں ہے کیونکہ اب نیر صاحب ہندستان اور پاکستان کے ان مشاہیر میں سے ہیں جو بچوں کی تعلیم کے ماہر مانے جاتے ہیں۔ ان کی نظمیں بچے شوق سے پڑھتے ہیں اور ان کے کلام میں جو ترنم ہے اس سے بچوں کو زبان اور بیان کی ہم آہنگی کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے اور لطف بھی حاصل ہوتا ہے۔ ان کی پچاس سال کی محنت سارے ملک کے بچوں کے لیے ایک تحفہ ہے۔ اور خود ان کی شہرت عزت اور دلی اطمینان کا ذریعہ ہے۔

صفحہ ۴۲ کا بقیہ

سیدھا جو راستہ ہے اُس پر ہمیں چلائے
اپنے خدا سے نیرؔ ہو یہ التجا کریں گے

نیر صاحب کے بارے میں اگر لکھا جائے تو اپنے طرز کی ایک الگ داستانِ امیر حمزہ تیار ہو جائے مگر بات پھر بھی پوری نہ ہو پائے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

بچّوں کے شاعر نیّر صاحب

Child is The Father of man

انگریزی زبان کا یہ مقولہ حقیقتاً عجیب ہے، اتنا ہی پُر معنی اور فکر انگیز بھی ہے اور اس میں نوع انسانی کے ارتقا کا راز مضمر ہے۔

بچہ اپنی تھوڑی سی عمر اور چھوٹے سے وجود کے لحاظ سے جتنا کمزور اور کچّا ہوتا ہے اتنا ہی وہ اپنے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کے اعتبار سے پُر قوت اور اپنی معصوم و متجسس فطرت کے لحاظ سے اچھا اور سچّا ہوتا ہے۔

دوسرے جانداروں کے بچّوں کو ایک فطری زندگی گزارنے کے لیے جو کچھ سمجھنا اور سیکھنا ہوتا ہے، وہ اُن کا قدرتی ماحول اور ان کی جبلت انھیں سکھا دیتی ہے۔ مگر انسان کے بچے کو اپنے معاشرتی ماحول میں زندہ رہنے کے لیے ہر بات کا سلیقہ اور ہر کام کا طریقہ سیکھنا ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کی فطرت میں بلا کی خواہش اور غیر معمولی تجسّس کا جذبہ چھُپا ہوتا ہے۔ وہ ایک ایک بات سیکھنا اور ایک ایک چیز کی نقل کر کے اُسے تجربے کا جُز بنا لینا چاہتا ہے۔ اس کی اپنی دنیا بہت چھوٹی ہوتی ہے، مگر وہ اپنے سے بڑی دُنیا کی تسخیر پہ ہمیشہ آمادہ رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کا دل چاند کو چھو لینے کے لیے مچل اُٹھتا ہے۔ وہ رنگین تتلیوں کو پکڑنا چاہتا ہے۔ بولتی چہکتی چڑیوں کو شوق سے دیکھتا ہے۔ چاند ستاروں سے پیار کرتا ہے۔ مٹّی کے گھروندے بناتا ہے اور پریوں کی کہانیاں سُنتا ہے۔ ہر چیز اس کے لیے اجنبی اور انوکھی ہوتی ہے مگر جلد از جلد وہ اس سے اجنبیت کا رشتہ توڑ کر اُسے اپنانے اور اپنا بنا لینے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کوشش میں اُسے "نقل سے عقل تک" پہنچنے کے لیے، تعلیم اور تربیت کی بہت سی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور اس کے لیے اپنی متجسس فطرت کے ساتھ وہ خارجی وسائل سے بھی موقعے اور ماحول کے مطابق مدد لیتا ہے۔ ایک مہذّب معاشرے میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ بچّوں کی جسمانی نشو و نما کے ساتھ اُن کی ذہنی ترقی اور اخلاقی تربیت کے لیے بھی معقول سطح پر ضروری وسائل مہیا کیے جائیں۔ اس کے لیے کچھ اچھے اچھے کھیل کھلونوں کے ساتھ ایسی کتابوں کی موجودگی بھی ضروری ہے جنھیں وہ شوق سے پڑھ سکیں، جن کے ورقے الٹ پلٹ کر وہ اچھی اچھی تصویریں دیکھ سکیں۔ ان میں لکھی باتوں، دلچسپ چھوٹی چھوٹی کہانیوں اور ننھے منّے گیت نما نظموں کو سُن سکیں۔ دوسروں کو سُنا سکیں اور اس پر خوش ہو سکیں۔

بد قسمتی سے ہمارے یہاں ایسے اداروں کی بھی کمی ہے

اور ایسے دلچسپ تربیتی وسائل کی بھی جو عام بچوں
تک پہنچ سکیں اور ان کے وسیلے سے وہ شوق، دلچسپی
اور سہولت کے ساتھ اپنی تعلیم وتربیت کی ابتدائی مگر
نہایت اہم منزل طے کر سکیں۔ اس کے لیے صرف کھلونے
کافی نہیں، ایسی کتابیں بھی ضروری ہیں، جنھیں تھوڑے
سے سمجھ دار بچے کھلونوں کی طرح پیار کر سکیں اور خوشنما
چیزوں کی طرح ان سے لگاؤ پیدا کر سکیں۔

کتابوں کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ انسان کی
بہترین دوست ہیں اور انھیں ایک اچھے ساتھی کی طرح
رکھنا چاہیے۔ مگر کتاب سے محبت اور اپنائیت کا گہرا
رشتہ اُسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب ہم انھیں بچپن میں
اپنا دوست بنانا سیکھ جائیں۔ جو لوگ اپنی چھوٹی عمر میں
کتاب سے محبت کرنا نہیں سیکھ سکتے، وہ شاید پھر اپنی
پوری زندگی میں، بغیر کسی مجبوری کے، کتاب سے دلچسپی
پیدا نہیں کر سکتے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ بچپن میں ایسی کتابوں سے
دلچسپی لی جا سکتی ہے جو چھوٹے چھوٹے کھلونوں اور
دلکش چیزوں کی طرح اچھی لگیں۔ اور اس سے بھی زیادہ
یہ کہ وہ بچوں سے اُن کی زبان میں باتیں کر سکیں اور ان کتابوں میں اُن
کو کہانیاں، نظمیں، لوریاں، چٹکلے وغیرہ سنانے میں وہ
انداز اختیار کیا جائے کہ وہ یہ سمجھیں کہ وہ خود آپس میں
بات کر رہے ہیں، کچھ کہہ رہے ہیں، کچھ سُن رہے ہیں۔ بچوں
کی اپنی زبان اور اپنا خاص لہجہ ہوتا ہے۔ وہ اس زبان
کو اپنے ماں باپ، بھائی بہن، ہم جولیوں اور دوستوں
سے سیکھتے ہیں اور خود اپنے انداز سے اسے بولتے ہیں۔
کتاب کے اسٹیج پر بھی ان سے انھیں کی زبان میں بات
ہونی چاہیے، نہیں تو ان کے اور کتابوں کے درمیان
اپنائیت کا رشتہ پیدا نہ ہو سکے گا۔

بڑے ہو کر بچوں سے باتیں کی جا سکتی ہیں اور سمجھ
کرتے ہیں، لیکن بچوں کے لیے لکھنا آسان نہیں۔ اسی
لیے بچوں کے واسطے لکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔
اور ایسے افراد کی تعداد تو اور بھی کم ہے جو پوری زندگی
بچوں کے لیے سوچتے، سمجھتے اور لکھتے رہے۔ اس اعتبار
سے نیر صاحب اُردو زبان وادب کی تاریخ میں ایک
منفرد شخصیت کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ نیر
صاحب نے بچوں کے لیے لکھا، اس پر اتنا تعجب نہیں
ہوتا، جتنا اس پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ برابر بچوں کے
لیے لکھتے رہے اور اس محدود ادبی دائرے میں انھوں نے
قوس قزح کی سی وسعت اور رنگا رنگی پیدا کی۔
انھوں نے اردو والوں کی کم سے کم تین نسلوں کی زبان
سکھائی ہے اور اُن کی ذہنی تربیت میں حصّہ لیا ہے۔
وہ بچوں کے مزاج داں اور اُن کی معصوم مگر متجسس
فطرت کے اثر شناس ہیں۔

انھوں نے چار برس کے بچوں سے لیکر چودہ برس
کی عمر تک کے بچوں کے لیے لکھا ہے۔ یہ دس برس معمولی
برس نہیں ہوتے۔ زندگی میں ایک بڑا ذہنی انقلاب
انھیں دس برسوں میں آتا ہے اور سال بہ سال بچوں کا
ذہن نئے چاند کی طرح بڑھتا ہے۔ نیر صاحب نے بڑی
گہری نظر سے مختلف عمر کے بچوں کے ذہن کا مطالعہ کیا
ہے اور اپنے مطالعے اور مشاہدے کو دلچسپ اور خوبصورت
انداز سے پیش کیا ہے۔ انھیں زبان کے اس اہم اور
اساسی حصے پر غیر معمولی قدرت ہے جس میں بچوں کے
کے جذبات، احساسات اور خیالات کی پُرخلوص
ترجمانی کی جا سکتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ بچوں

کے دل کی بات کہتے کہتے کس طرح اپنے من کی بات کہی جاتی ہے۔ اور اس طرح خوبصورت کہانیوں، میٹھی میٹھی باتوں اور دلچسپ نظموں کے وسیلے سے اُن کی ذہنی تربیت کا بڑا مقصد پورا کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ یہ ایک معنیٰ میں چنے کی دال پر "قل ہواللہ" لکھنے کا فن ہے۔

اچھے آرٹ کی ایک بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں بہت معمولی وسائل سے غیر معمولی کام لیا جاتا ہے۔ بچوں کی زبان میں اچھی اچھی نظمیں کہنا، کہانیاں لکھنا اور لطیفے سنانا بھی ایک ایسا ہی آرٹ ہے۔ نیرؔ صاحب کو پڑھ کر ہم یہ پتا چلا سکتے ہیں کہ ہمارے آس پاس کی بظاہر بے حد معمولی چیزیں اور عام باتیں بھی کتنی دلچسپ اور معنی خیز ہوتی ہیں اور سیدھے سادے لفظوں اور ہلکے پھلکے جملوں میں کس طرح ان حقائق کی ایک دل کو بھانے والی جیتی جاگتی تصویر پیش کی جا سکتی ہے۔ چونکہ یہ چیزیں عام ہیں اور ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتی ہیں، اس لیے ان کا حسن ہماری نظروں سے چھُپ جاتا ہے۔ مگر جب ہم ان چیزوں کو بچوں کی معصوم نظر سے دیکھتے ہیں اور نیر صاحب کی نگاہ سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں، تو محسوس ہوتا ہے کہ اگر اس طرح دیکھا، سوچا اور سمجھا جائے تو زندگی عام حالتوں میں کتنی پُرکشش ہو جاتی ہے، یہ ایک طور پر زندگی کے فطری حُسن کی بازیافت ہے۔

نیرؔ صاحب ایک صاحبِ علم آدمی ہیں۔ بہت زمانے تک ثانوی اور اعلیٰ سطح پر اُردو زبان کے مطالعے اور تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ مگر یہ جانتے ہیں کہ زندہ زبان بڑے بڑے فارمولوں میں بند نہیں ہوتی۔ وہ اس علمی اور تاریخی خزانہ ہوتا ہے جو اس طرح کتابوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اصل زبان تو وہی ہوتی ہے جس میں دریا کا سا بہاؤ اور لہر دل کے دائرے جیسا پھیلاؤ ہوتا ہے۔ جو بچے کی مادری زبان ہوتی ہے۔ جس میں وہ کہانیاں لکھتا اور سُنتا ہے جس میں گیت گائے جاتے ہیں۔ نوک جھونک ہوتی ہے اور ہنسی مذاق کی باتیں کی جاتی ہیں۔ انھیں یہ زبان خوب آتی ہے اور وہ اس کے فطری لہجے پر اُستادانہ قدرت رکھتے ہیں۔ نیرؔ صاحب کو یہاں سے وہاں تک پڑھ جایئے لیکن مشکل ہی سے وہ لفظ آئے گا جو دودھ میں مصری کی ڈلی کی طرح محسوس ہو گا۔ وہ درجہ بدرجہ اور عام سطح پر نئے لفظوں کا استعمال کرتے ہیں تاکہ بچوں کی زبان میں اضافہ ہوتا رہے۔ ان کا بجا طور پر یہ مقصد ہوتا ہے کہ وہ جیسے جیسے آگے بڑھیں اور بڑے ہوں انھیں علمی اور ادبی زبان بھی آتی جائے۔

ان کے موضوعات اور عنوانات دیکھیے تو روزمرّہ کی زندگی اور گرد و پیش کا ماحول مانوس خیال کی طرح گردش کرتا نظر آئے گا۔ بعض چھوٹی چھوٹی چیزوں پر وہ لکھتے ہیں تو بچّوں کے نظیر معلوم ہوتے ہیں۔ نظیر عوامی زندگی میں گھل مل گئے تھے۔ انھیں تیج تہوار میلے ٹھیلے اور ہاٹ بازار کی طرح ریچھ کا بچّہ، ہری ککڑی اور کورا برتن بھی اچھا لگتا تھا۔ اس طرح نیرؔ صاحب کو گڈے گڑیا کا بیاہ، چڑیا کا گھونسلا، مرغی کے بچے، عید کی خوشیاں اور باولی بڑھیا کی کہانی اچھی لگتی ہے۔ اور جب وہ یہ سب لکھتے ہیں تو ہم ان سب چیزوں سے دلچسپی لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

وہ ہمیں اپنی نظموں میں بچّوں کے ساتھ بھی کھیلتے، ہنستے بولتے، کہانیاں کہتے، گیت سُناتے اور اچھی اچھی

باتیں بتاتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کبھی ہمارے سامنے گھر کی مرغی کے اپنے ننھے منّے ریشم کے گالوں جیسے بچّوں سے دلچسپی لیتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں کبھی ہم ان کے ساتھ بہت سے بچّوں کے درمیان کھڑے ہو کر بھالو کا ناچ دیکھتے ہیں اور کبھی سیر کو نکل جاتے ہیں موسم کی نیرنگیوں سے لطف اٹھاتے ہیں۔ اُن کی نظموں میں نیّر تخلّص آتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی بچّے کا نام ہے جو اِن سب کھیلتے کودتے اور شور مچاتے بچّوں میں شامل ہے۔

نیّر صاحب ایک سنجیدہ آدمی ہیں۔ اُن کی رفتار و گفتار میں بڑا رکھ رکھاؤ ہے۔ وضع داری اُن کے مزاج کا فطری سانچہ معلوم ہوتا ہے۔ اُن کو چلتے پھرتے اور عام گفتگو میں حصّہ لیتے دیکھ کر کبھی شبہ بھی نہیں ہوتا کہ یہ وہی شفیع الدّین نیّر ہیں جو بچّوں کے، ان کے ہم سِن اور ہم جولیوں سے بھی کچھ بڑھ کر دوست اور اُن کی فطرت کے رازدار ہیں۔ لیکن جب وہ لکھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم بچپن کے معصوم ماحول میں سانس لے رہے ہیں۔ اُن کی زبان و قلم نے بچّوں کی زبان میں ان سے باتیں کرنے کو ایک فن بنا دیا ہے جس کے ادبی دائرے کے آج وہ تنہا مالک ہیں۔

اُن کی زبان سے بچّوں کی کچھ باتیں آپ بھی سنیے اور لطف اٹھائیے۔

یہ چنوّ خاں کا قصّہ ہے — جو منّو خاں کے ننھے ہمدم
زیادہ عمر تھی اُن کی — مگر تھی عقل ان میں کم
وہ کہتے کھانے کو ہپّا — وہ کہتے پانی کو ممّم
بجاتے ہر گھڑی باجا — کبھی پوں پوں کبھی پم پم
وہ کہتے مَیں کو میں میں میں — وہ کہتے ہم کو ہم ہم ہم

دوسری باتوں کے ساتھ آوازوں کی تکرار اور صوتی اسما کی جھنکار سے اس نظم میں جو مزہ پیدا کیا تھا وہ تعارف سے بے نیاز ہے۔ بطخ کی کہانی میں آوازوں اور صداؤں میں بھی جادو جاگ رہا ہے۔

کہانی ہے یہ بطخ کی — کیا کرتی تھی جو قیں قیں
وہ بطخ بن گئی بکری — تو چلّانے لگی مَیں مَیں
وہ بطخ بن گئی توتا — تو وہ رٹنے لگا ٹَیں ٹَیں

یہ توتا بن گیا بھیڑا
تو وہ کرنے لگا بھیں بھیں

"چیونٹی کی کہانی" بھی کچھ ایسی ہی طلسماتی کہانی ہے۔

کہانی ہے یہ چیونٹی کی — جو اک دم بن گئی ہاتھی
گیا ہاتھی وہ دریا پر — تو اک دم بن گیا مچھلی
وہ مچھلی جال میں آئی — تو اک دم بن گئی مکھی
وہ مکھی دودھ پر بیٹھی — تو اک دم بن گئی برفی
وہ برفی تھی رکابی میں — تو اس کو کھا گئی "بلّی"
وہ بلّی جب گئی باہر — تو اس کو مل گئی "مُرغی"

وہ مُرغی اور وہ بلّی
چلیں مل کر گئیں دلّی

مغربی ادب میں بچّوں کے لیے جو لکھا گیا ہے انھوں نے اس سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مگر اُسے اس طرح مشرقیت کے سانچے میں ڈھالا ہے کہ یہ بات، یہ کہانی، اب ہماری اپنی ہو گئی ہے۔ اُن کی تشبیہیں اُن کے استعارے اور اُن کے دلچسپ مرقعے کوئی چیز بھی تو بدلی نہیں۔

اس مُرغی اور اس کے بچّوں کو دیکھیے۔

انڈے کھٹکے بچّے نکلے — ریشم کے سے لچھّے نکلے
اچھے اچھے رنگ رنگیلے — لال سفید اور کالے پیلے

(باقی [illegible] پر)

(علامہ) اخلاق حسین دہلوی

باکمال شاعر: نیّر صاحب

اُردو زبان کے شعراء میں محترم نیّر صاحب (مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیّر ایم اے) منفرد شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کا نتیجۂ فکر جولانیٔ طبع کا ثمرہ نہیں، بلکہ مقصدی سخن سنجی کا علمبردار ہے۔ نیّر صاحب اُردو زبان کے شعراء میں پہلے باکمال شاعر ہیں جنھوں نے نونہالانِ وطن کی فلاح و بہبود کو اپنی شاعری کا نصب العین قرار دیا اور استقلال سے اسے نبھایا۔ انھوں نے بچّوں کی استعداد کے مطابق بکثرت ایسے موضوعات کو منتخب کیا جن پر کبھی کچھ نہیں لکھا گیا تھا۔

بچّے قوم کی امانت ہیں۔ بچّوں ہی پر مستقبل کا دارومدار ہے۔ بچّوں میں سدھار آگیا تو قوم کا مستقبل تابندہ ہے۔ نیّر صاحب نے اسے [illegible] اپنایا، بلکہ ایسا لگتا ہے کہ نیّر صاحب کو اسی مقصد سے عالمِ وجود میں بھیجا گیا ہے۔ نیّر صاحب کا [illegible] وصف ہے کہ وہ ہلکے پھلکے جملوں میں مافی الضمیر کو اس خوبی سے ادا کرتے ہیں کہ مُدعا دل نشین ہوتا چلا جاتا ہے۔ مجھے بھی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ میں نے نوعمری میں شاید ہی محسوس کیا تھا جو لگ بھگ پچاس برس بعد زبانِ قلم پر آگیا ہے گویا کہ نیّر صاحب قدرتاً اس مشغلے کے اہل ہیں۔ جسے وہ کامیابی سے انجام دیتے رہے ہیں۔

بچّوں کے لیے لکھنا سہل نہیں، بہت دشوار ہے۔ بچّوں کی عقل اور ان کے فہم کے مطابق بلکہ ان کے ذوق کو متاثر کرنے والے ہلکے پھلکے عنوانات اختیار کرنا، ایسے ہی دل نواز خیالات کو منتخب کرنا، ایسے ہی سادہ و سہل مگر موثر اسلوب کے سانچے میں ڈھالنا اور اس خوبی سے نظم کر دینا کہ بچّے یہ سمجھیں کہ ان ہی کے دل کی بات ہے۔ . . . . .

. . . . پڑھتے ہی ان کے دل کی کلی کھل جائے۔ اخلاقی قدریں کچھ اس طرح اس میں مضمر ہوں کہ بچّے بے تکلف انھیں اپنا لیں اور ان پر کاربند ہو جائیں۔ یہ بہت اہم کام ہے اور اس سے وہی عہدہ برآ ہو سکتا ہے جو بچّوں کی نفسیات سے کماحقہٗ آگاہی رکھتا ہے۔ نیّر صاحب نے اس مشکل کو آسان کیا۔ ان کا کلام شاہد ہے کہ وہ اس باب میں آپ اپنی نظیر ہیں۔

نیّر صاحب کے کلام میں وہ تمام محاسن مجتمع ہیں جو ان منظومات کے لیے ضروری ہیں جو بچّوں کے لیے لکھی اور کہی جاتی ہیں۔ نیّر صاحب نے بچّوں

کے لیے جس قدر نظمیں لکھی ہیں وہ سب ہی شائع ہوئیں اور بار بار شائع ہوئیں۔ بچوں نے انھیں خوب پڑھا اور سب ہی نے انھیں پسند کیا۔ جنھوں نے پڑھا بولی ٹھٹولی کا مزا پایا۔ زبان میں سدھار رونما ہوا۔ روزمرہ اور محاورہ سے آشنائی حاصل ہوئی اخلاقی قدریں ان پر اثرانداز ہوئیں اور مثالی زندگی کی جھلک ان میں نظر آنے لگی۔ یہی مقصود ہے جو حاصل ہوا۔

کلام کلیم کے اخلاق و کردار کا آئینہ ہوتا ہے۔ نیر صاحب بذات خود خوش مزاج اور ملنسار ہیں۔ بچپن کی سی سادگی اور بھولپن کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویر نظر آتے ہیں۔ تمکنت و تکلف کی پرچھائیں بھی ان پر نہیں پڑی ہے۔ انھیں بچوں سے دلی پیار ہے۔ وہ قوم و وطن کے سچے ہمدرد ہیں ان کی عمر بھر کی کمائی یہی بچوں کے سدھار کا سرمایہ ہے جو بچوں کی منظومات ہیں۔ نیر صاحب کی یہ کوشش گو کامیاب ہے لیکن اگر اردو زبان کے حالات سازگار ہوتے تو کھل کے اعتراف کیا جاتا۔ سمینار منعقد ہوتے اور جوبلی منائی جاتی۔ خدا کرے کہ قوم کی سربرآوردہ ہستیاں متوجہ ہوں۔ میری تمنا ہے کہ پیام تعلیم کی یہ پرخلوص کوشش بارآور ہو اور نیر صاحب کی ذات رہتی دنیا تک بچوں کی راہ نما رہے۔ آمین۔

پیام تعلیم کا اگلا شمارہ
ضمیمہ نیر نمبر ہوگا۔
(مدیر)

نسیم شولاپوری

بچوں کے نگر کا سوداگر

ہم بچوں کی نگری میں
گھوم رہا ہے برسوں سے
چنچل پیاری بستی میں
اک سوداگر مستی میں

بانٹ رہا ہے وہ ہم میں
انکے دم سے دنیا میں
شوخ بہاریں گیتوں کی
شان بڑھی ہم بچوں کی

اُس کی یہ کوشش ہردم
لے لے اپنے دامن میں
ہم بچوں کے سارے غم
دے دے خوشیوں کا عالم

اپنی میٹھی باتوں سے
جیون کے ہر پہلو کو
ہر اُلجھن سُلجھاتا ہے
گیتوں سے سمجھاتا ہے

چاند، ستاروں، پریوں کی
پھولوں، کلیوں، شبنم کے
دنیا میں پہنچاتا ہے
راز ہمیں بتلاتا ہے

اُس کے نغمے اس کے گیت
ہم سب بچوں کی مُسکان
اپنی بستی کی ہیں شان
اُس کی عظمت پر قربان

عمر زمانے کا چکر
ہنستے بچپن کی بخشش
دے نہیں پایا ہات اُسے
قدرت نے سوغات اُسے

شعر و سخن کے سوداگر
ہے تجھ سے آباد نگر
اس کی سلطانی کا سدا
تاج رہے تیرے سر پر

ریحان احمد عباسی

نیّر صاحب کی کتابیں اور شخصیت

ایک عام آدمی کی نظر میں

مجھے جناب شفیع الدین نیّر صاحب کا شاگرد ہونے کا شرف حاصل نہیں ہے۔ لیکن میں نے ان کی تقریباً تمام کتابوں کو پڑھا ہے، اس لیے میں اس بات کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہوں کہ وہ اپنے شاگردوں کو کس قسم کی تعلیم دیتے ہوں گے۔ مجھے اُن کے ساتھ کسی دفتر یا اسکول میں کام کرنے کا بھی تجربہ نہیں، لیکن پچھلے ۲۷ برسوں کے دوران نیّر صاحب کو جس حد تک قریب سے دیکھنے اور برتنے کا موقع ملا ہے، اُس کی بنا پر میں پورے اعتماد کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کر سکتا ہوں کہ وہ اپنے اخلاق اور معاملات کے اعتبار سے عام زندگی میں کس قسم کے انسان ہیں۔

جہاں تک کتابوں کا تعلق ہے، نیّر صاحب کی کم و بیش پچاس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں نثر کی کتابیں بھی ہیں اور نظم کی بھی۔ یہ سب کی سب بچّوں کے لیے ہیں۔ ان میں اکثر کتابیں ایسی ہیں جن کے اب تک آٹھ آٹھ دس دس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اگر ہر کتاب کا ایڈیشن ایک ایک ہزار کا بھی رکھ لیا جائے تو آپ کی کتابیں اب تک ڈھائی لاکھ سے کچھ زیادہ ہی شائع ہو چکی ہیں۔ رسالوں وغیرہ میں جو کہانیاں اور نظمیں شائع ہوتی رہیں، اُن کی تعداد کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن ایک محتاط اندازے کے مطابق، ایسے اخبارات اور رسائل کی تعدادِ اشاعت کے لحاظ سے، یہ بلا شبہ لاکھوں تک ہوگی۔ اور اگر نیّر صاحب کی اُن نظموں وغیرہ کو بھی حساب میں جوڑ لیا جائے جو اُردو کی پہلی کتاب سے لے کر چوتھی کتاب تک پورے ملک میں پچھلے ۳۰ سال سے شامل نصاب چلی رہی ہیں تو پھر یہ گنتی لاکھوں سے گزر کر کروڑوں تک جا پہنچتی ہے۔ گویا اتنی بڑی تعداد کے پیش نظر یہ بات بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہی جا سکتی ہے کہ شمس العلما خواجہ حسن نظامی رح کے بعد اس نصف صدی میں اُردو کا کوئی بھی ادیب یا شاعر، اشاعت اور شہرت کے معاملے میں نیّر صاحب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ہم جانتے ہیں کہ لکھنا، وہ چاہے کسی تحریر کی نقل ہی کیوں نہ ہو، پڑھنے سے مشکل کام ہے۔ یہ مشکل اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب خود اپنی طرف سے کوئی بات، کوئی نظم یا کوئی مضمون لکھا جائے اور وہ بھی بڑوں کے لیے نہیں، بلکہ بچّوں کے لیے لکھا جائے۔ یوں تو ہم میں سے بہت سے لوگ بچّوں کے رسالوں کے لیے کہانیاں اور نظمیں لکھتے ہی رہتے ہیں، لیکن نیّر صاحب کے لیے یہ بات بغیر کسی جھجک کے کہی جا سکتی ہے کہ وہ صحیح معنوں میں

بچوں کے ادیب و شاعر ہیں اور انھوں نے نثر ہو یا نظم، جو چیز بھی بچوں کے لیے لکھی، وہ پوری طرح بچوں ہی کے لیے ہے۔ مثلاً اگر وہ نثر ہے تو مشکل اور بھاری بھرکم الفاظ سے بچتے ہوئے، نہایت آسان اور سلیس زبان میں، جس کو کامیابی سے پڑھ لینے میں بچوں کو خوشی محسوس ہو۔ چھوٹے چھوٹے جملے، جنھیں پڑھتے وقت گرانی نہ ہو، بلکہ آسانی کے احساس کے ساتھ آگے اور آگے پڑھنے کا شوق پیدا ہوتا ہو۔ عبارت میں ایسی دل کشی اور حُسن جو پڑھنے والے کا دل موہ لے۔ زبان میں ایسی سادگی جو ہونہار بچوں، بلکہ بڑوں تک میں یہ احساس پیدا کرے کہ وہ بھی اگر کوشش کریں تو اس طرح کے چھوٹے چھوٹے جملوں اور آسان الفاظ کے ساتھ 'کہانی' لکھ سکتے ہیں۔ نثر کی طرح، نیر صاحب کی نظموں میں بھی آپ اسی طرح کی تمام خوبیاں موجود پائیں گے۔ وہی آسان زبان اور چھوٹی چھوٹی مترنم بحریں کہ بچوں کو پوری پوری نظمیں زبانی یاد ہو جائیں اور وہ جگہ جگہ انھیں گاتے ہوئے دکھائی دیں۔ مثلاً:-

اے دنیا کے باغ کے مالی — اے اپنے بندوں کے والی
دل کے مالک جان کے مالک — دنیا کی ہر شان کے مالک
دوسرا تجھ سا کوئی نہیں ہے — تجھ سا داتا کوئی نہیں ہے
بخش ہمارے جسم کو طاقت — بخش ہمیں ہمت کی دولت

آؤ آؤ باغ میں جائیں — باغ میں جائیں جی بہلائیں
چل کر دیکھیں پھول رنگیلے — پھول رنگیلے، نیلے پیلے
باغ کی کیاری کیاری دیکھیں — کلیاں پیاری پیاری دیکھیں
میٹھے میٹھے میوے چکھیں — کچھ کھائیں کچھ جیب میں رکھیں

بیا

اُڑتی اُڑتی چڑیا آئی — دانا دُنکا چن کر لائی
بھولی بھولی صورت اُس کی — پیاری پیاری مورت اُس کی

نیر صاحب کی یہ اور اس طرح کی تقریباً دوسری سبھی نظمیں ایسی ہیں جنھیں یاد کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ کانوں کو متاثر کرنے والے اپنے صوتی آہنگ، اپنی موسیقیت اور روانی کے سبب خود بخود اس طرح یاد ہو جاتی ہیں کہ بھلائے نہیں بھولتیں۔ اس اعتبار سے اگر ہم یہ کہیں کہ بڑوں کو، دوسرے تمام شاعروں کے مقابلے، غالب کے شعر اور ان کا کلام یاد ہے تو بچوں میں شفیع الدین نیر صاحب کے علاوہ کسی اور شاعر کا نام آ ہی نہیں سکتا۔

نیر صاحب کی کتابیں، اپنی انھی خوبیوں کی وجہ سے پچھلی نصف صدی سے بچوں میں مقبول چلی آرہی ہیں۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ نیر صاحب کی کتابیں دادا سے لے کر پوتے تک، مسلسل تین نسلیں پڑھ چکی ہیں، تو یہ غلط بات نہ ہوگی۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بیشتر تحریریں وقت کے ساتھ ساتھ اپنی اہمیت کھو دیتی ہیں اور ایک وقت وہ آتا ہے جب وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گُم نامی کے غار میں غائب ہو جاتی ہیں۔ لیکن نیر صاحب کی کتابیں ابھی دُور دُور تک اس زُمرے میں نہیں آتیں۔ وقت کا طویل فاصلہ نیر صاحب کی کتابوں کی اہمیت اور افادیت میں ذرہ برابر کمی نہیں کر سکا ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی خوبیاں پہلے سے زیادہ نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آنے لگی ہیں تو یہ حقیقت کا اعتراف اور ایک سچّی بات ہوگی۔

زبان و بیان کی سادگی اور سلاست کے ساتھ ساتھ نیر صاحب کی کتابوں کی دوسری اہم خصوصیت ہے، اُن کا بامقصد ہونا۔ اپنی روزمرّہ کی عام زندگی میں وہ ایثار، سادگی، نفاست، سچائی، ایمانداری اور محنت کے عادی ہیں۔ دوسروں کی خوشی میں خوش اور رنج میں رنجیدہ ہونے والے۔ دیا اور

مکروفریب سے دور۔ نیر صاحب کی کتابیں دراصل ان کے اچھے احساسات، جذبات اور نظریات کی ترجمان ہیں جن کے پڑھنے سے بچوں میں اچھی بُری باتوں میں تمیز کرنے کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ انداز بیان نصیحت کرنے والا نہیں ہوتا، اس لیے پڑھنے والے کے دل میں لاشعوری طور پر ان تمام خوبیوں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے جو ایک "اچھے بچے" یا ایک "اچھے انسان" کے لیے ضروری قرار دی گئی ہیں۔ یعنی اپنے دوستوں عزیزوں سے اُنسیت، ناداروں اور کمزوروں سے ہمدردی، بڑوں کی اطاعت اور چھوٹوں پر شفقت، مشکلات کا ہنستے ہوئے مقابلہ کرنے کا حوصلہ، محنت کی عادت اور ان سب سے بالاتر وطن سے جذبۂ محبت۔ مثال کے طور پر سات آٹھ سال کی عمر کے بچوں کے لیے لکھی گئی چھ کتابوں کے سیٹ میں ایک کتاب ہے "تارا کا ڈنڈا"۔ چوں کہ دیو پریوں کی کہانیاں دوسری زبانوں اور ملکوں کی طرح اُردو اور ہندستان میں بھی خوب مقبول ہیں، اس لیے نیر صاحب نے بھی اس رجحان سے متاثر ہو کر اپنی دوسری کئی کتابوں کی طرح اس کتاب میں ایک دیو کا قصہ بیان کیا ہے کہ کس طرح پانچ چھ سال کی ایک لڑکی تارا کے صحن میں کھڑے نیم کے پیڑ پر دو رہتا اور کس کس طرح گھر والوں کو پریشان کیا کرتا تھا جن بچوں اور بڑوں نے یہ کتاب نہیں پڑھی ہے، وہ شاید یہ سوچیں کہ جن پریوں کی دوسری کہانیوں کی طرح اس کتاب کی ہیروئن "تارا" کو بھی کہیں سے کوئی جادو کی چھڑی یا انگوٹھی مل گئی ہوگی اور اُس دیو کو قابو میں کرلیا ہوگا۔ جی نہیں! نیر صاحب اس طرح کی فضول اُمیدوں کا سہارا لینے کی بات نہیں بتاتے، بلکہ سکھاتے ہیں بڑی سے بڑی مشکل کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی عقل اور ہمت پر بھروسہ کرنے کی بات، جو بچوں کی آنے والی زندگی میں مشکلات کا سامنا کرنے کی بنیاد ہے۔

اس کتاب کا ایک سین ہے: "کالے دیو کو اپنی طرف آتا دیکھ کر تارا گھبرا گئی۔ وہ اپنے کمرے کے ایک کونے میں جا کھڑی ہوئی اور اپنے بچاؤ کی تدبیر سوچنے لگی۔ اس کونے میں اُس کے ابا کا ایک موٹا سا ڈنڈا رکھا ہوا تھا۔ اس نے جھٹ پٹ وہ موٹا ڈنڈا اٹھا لیا۔ دیو نے اس کو پکڑنے کے لیے اپنا سیدھا ہاتھ بڑھایا۔ تارا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، وہی موٹا ڈنڈا بڑے زور سے مارا۔ یہ ڈنڈا دیو کی کلائی پر پڑا۔ اُس کے سیدھے ہاتھ کی کلائی اُسی وقت ٹوٹ گئی۔ یہ چوٹ کھا کر دیو اور بھی آپے سے باہر ہو گیا اُس نے اُلٹا ہاتھ بڑھایا۔ تارا بھی ڈٹی رہی ...... تارا شیرنی کی طرح غصے میں بھری کھڑی تھی۔ وہ آگے بڑھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کا پورا زور لگا کر وہ ڈنڈا دیو کے سر پر مارا ......" غرض ننھی تارا نے اپنی ہمت کے بل بوتے دیو کو بھگا کر ہی دم لیا۔

اسی طرح کی ان کی ایک کتاب ہے بونے کا ٹٹوا۔ یہ احسان کا بدلہ اتارنے سے متعلق کہانی ہے جس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جب دیو جیسے ظالم بھی احسان کا بدلہ اتارتے ہیں تو ہم انسان ایسا کیوں نہ کریں۔ 'پری کی چھڑی' میں بے غرض خدمت یعنی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال کر دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے کی کہانی ہے۔ 'انار راجا' میں بتایا گیا ہے کہ راجا کا کام رعایا کی خدمت اور اُن کی بھلائی کے سامان مہیا کرنا ہے نو دبطح 'شہزادی' ہمیں یہ تاثر دیتی ہے کہ ظلم کا بدلہ مل کر ہی رہتا ہے۔ اسی طرح بدھو کی بیوی 'ٹلو میاں'، کھٹو میاں اور انوکھی چھتری وغیرہ کہانیوں کی ایسی کتابیں ہیں جن سے کام کی لگن پیدا ہوتی ہے اور مشکلات کا ہنستے کھیلتے مقابلہ کرنے کی ترغیب ملتی ہے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ادیبوں اور شاعروں میں رشک

حسد کا مادہ بہت ہوتا ہے۔ اپنے علاوہ کسی کو نہیں گردانتے۔ نہ اس کی شخصیت کو، نہ اُس کے کام کو۔ ہر وقت دوسروں کی برائیاں اور خامیاں گنانے کے لیے تیار۔ لیکن نیر صاحب اس عیب سے بالکل پاک ہیں۔ بلکہ اگر انھیں یہ بھنک بھی پڑ جائے کہ کوئی بچہ یا بڑا، لکھنے پڑھنے کی کوشش میں لگا ہے تو مارے خلوص کے اس کے سر ہو کر رہ جائیں گے۔ ہر وقت رہنمائی اور ہدایت کے لیے آمادہ۔ خامیوں پر مذاق اُڑانے کے بجائے نیک اور مخلصانہ مشورے حاضر۔ ان الفاظ کے ساتھ حوصلہ افزائی کہ "آپ برابر ترقی کرتے رہیں۔ کوشش کیے جائیے۔ کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔" کہاوت ہے کہ کنواں، پیاسے کے پاس نہیں جاتا، لیکن نیر صاحب کے معاملے میں یہ کہاوت غلط ثابت ہو جاتی ہے، کیوں کہ وہ خود پیاسوں کے پاس جاتے ہیں اور اپنا علم، اپنا تجربہ، اپنی معلومات دوسروں تک پہنچانے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔

کہا جاتا ہے کہ بچوں کا 'کامیاب ادیب' بننے کے لیے، اپنی تحریر میں آسان اور عام فہم الفاظ استعمال کرنے کے علاوہ، سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہوتی ہے کہ بچوں کے لیے بچہ بن کر ہی لکھا جائے۔ نیر صاحب بچوں کے ایک انتہائی کامیاب ادیب شاید اس لیے بھی ہیں کہ اپنی کوششوں کے ساتھ ساتھ، انھیں قدرت کی طرف سے وہ تمام خوبیاں عطا ہوئی ہیں جو خاص بچوں کا حصہ سمجھی جاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ یہ کہیں کہ وہ بچوں کے لیے لکھتے لکھتے خود بھی بچہ بن کر رہ گئے ہیں۔ یا یہ کہ وہ اپنی طبیعت سے ہی ایسے ہوں یا اپنی کوششوں سے بچے بنے ہوں، یہ ایک حقیقت ہے کہ اُن کی چال ڈھال اور رہن سہن سے لے کر زندگی کے دوسرے معمولات تک میں ایک طرح کا بھولا پن ہے جو خود بخود دوسروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتا ہے اور یہی بھولپن انھیں اُن کے ہم عمروں سے بلند کیے رہتا ہے۔ لباس اور وضع قطع میں رکھ رکھاؤ ہوتے ہوئے بھی اُن کے سراپا میں جو معصومیت ہے، وہ دوسری جگہ شاید ہی کہیں دیکھنے کو ملے۔ ••

اللہ پاک، نیر صاحب کی عمر اور قلم میں برکت دے۔ آمین۔

(ص ۲۰ کا بقیہ)

اس انداز میں پیش کیا ہے:-

اے ساری دنیا کے مالک گُن ہم تیرے گاتے ہیں
رحمٰن اور رحیم ہے تو، یہ وصف تیرے دُہراتے ہیں
تو ہے روزِ جزا کا مالک یعنی روزِ قیامت کا
تیری ہی کرتے ہیں عبادت تو ہی شہ ہے اعانت کا
ہم تیرے ہی بندے ہیں تیرا ہی سہارا ہے درکار
الٰہی، راہ دکھا دے سیدھی ہو جائے بس بیڑا پار
اُن کی راہ پہ مالک! جن پر تو نے کرم فرمایا ہے
جن پر اپنی نعمت اور رحمت کا مینہ برسایا ہے
اُن کی روش سے ہم کو بچا جو تیرے غضب میں آئے ہیں
یعنی اُن کی روش سے جو گمراہ یہاں کہلائے ہیں

اس طرح جنابِ نیر کا ادب بچے کے قریبی ماحول سے گزر کر اس کائنات کے آخری سرے اور ذاتِ الٰہی تک لے جاتا ہے، جو در اصل اُس کی فطرتِ اصلیہ کا حقیقی سفر ہے اُن کی منظومات اور نثر دونوں میں یہی روح کارفرما ہے۔ البتہ ان کے ادب کو اگر الگ الگ کر کے دیکھا جائے تو اُن کے فن کا مقصد شاید پوری طرح سمجھ میں نہ آ سکے، لیکن اگر ان کی تمام نظم و نثر سامنے رکھا جائے تو بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس دور میں بچوں کی دنیا کے نیرِ اعظم ہیں۔

حافظ کی زبانی

سب کامیاب نظمیں کل لاجواب نظمیں
دل کا رباب نظمیں رنگین خواب نظمیں
نیر چچا نے لکھیں
ہاں بے حساب نظمیں

آنکھوں کا نور ان میں دل کا سرور ان میں
نکھرا شعور ان میں حمدِ غفور ان میں
نیر چچا نے لکھیں
با آب و تاب نظمیں

تاروں کی جگمگاہٹ پھولوں کی مسکراہٹ
موجوں کی گنگناہٹ زندہ دلی کی آہٹ
نیر چچا نے لکھیں
کیا لاجواب نظمیں

اک لالہ زار ہیں یہ رشکِ بہار ہیں یہ
سب یادگار ہیں یہ کیا شاہکار ہیں یہ
نیر چچا نے لکھیں
یہ پُر شباب نظمیں

بچوں کی آس ان میں پھولوں کی باس ان میں
مصری کی انگبیں کی بے حد مٹھاس ان میں
نیر چچا نے لکھیں
سب کامیاب نظمیں

کہہ دو زندہ باد نیر پائندہ باد نیر
تابندہ باد نیر رخشندہ باد نیرؔ
نیر چچا نے لکھیں
حافظ شتاب نظمیں

محمد احمد دلکش ایم،اے،ایم،ایڈ

جناب دل شاہجہاں پوری، مدیر پیام تعلیم سے
یہ معلوم ہو کر کہ پیام تعلیم کا نیّر نمبر شائع ہونے والا ہے،
مسرت ہوئی۔ جناب شفیع الدین صاحب نیّر کی عظمت اور
خدماتِ علمی کا اعتراف بارہا مختلف مواقع پر ہوا ہے اور
ہوتا رہے گا کیوں کہ نیّر صاحب نے ایک فن کار کی حیثیت
سے اُردو ادب میں ایک منفرد کارنامہ انجام دیا ہے وہ
بچّوں کے شاعر و ادیب ہیں۔ جناب اسمٰعیل میرٹھی کے
بعد آپ نے اُردو ادبِ بچّوں کے لیے نظم و نثر کا سب سے
بڑا اور قابلِ قدر سرمایہ فراہم کیا ہے۔ آپ نے نظموں
اور کہانیوں کی بے شمار کتابیں تصنیف کی ہیں جو نہ صرف
ننھے منّوں، بلکہ ناخواندہ بالغوں کو بھی زبان اردو سکھانے
میں نہایت کامیاب ہوئی ہیں۔ انگریز ماہرِ تعلیم مسٹر مائر
نے جنھوں نے کہ مادری زبانوں کے طریقۂ تعلیم پر مستند
کتابیں لکھی ہیں، اپنی کتابوں میں نیّر صاحب کی بعض کتابوں
کی تعریف کی ہے اور سفارش کی ہے کہ ان کے ذریعے
اُردو کی تعلیم دی جائے۔ نیّر صاحب نے محدود اور آسان
الفاظ کی تکرار سے چھوٹے بچّوں کے لیے ان کی عمر کے مطابق
نظم و نثر کی سلسلہ وار کتابیں لکھی ہیں جو اس امر کی دلیل
ہیں کہ انھوں نے اپنا کام باقاعدگی سے ایک پروگرام
کے تحت کیا ہے۔ ان کتابوں کو تھوڑی سی رہنمائی سے
بچّے خود بخود خوشی اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔
بیسک انگلش کے اصول پر جس میں تھوڑے سے آسان
الفاظ کو قرینے سے استعمال کر کے تمام مطالب ظاہر
کیے جا سکتے ہیں، نیّر صاحب نے بھی اپنایا ہے اور ان
کی اس طرح کی تمام کتابیں خوب صورت اور رنگین تصویروں
سے مزیّن ہیں۔ کتابوں کی زبان افسانہ اور نظم کی دلچسپی
اور تصویروں کے ذریعے اُن کی حسن کاری کے معاملے
میں انگریزی اور یورپ کی ان بے شمار کتابوں کو نیّر صاحب
نے اپنے لیے معیار بنایا ہے، جو چھوٹے بچّوں اور ناخواندہ
لوگوں کے لیے یورپ کے ممالک میں لکھی گئی ہیں۔ آپ نے
اکثر ان کہانیوں اور نظموں سے ذوق اور جذبۂ تخلیق
کا اکتساب بھی کیا ہے، اور ایک اچھے مترجم کے طور سے
کئی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ اس طرح
برصغیر ہند و پاک میں اُردو کے خزانۂ ادب میں بچّوں
کے لیے آپ نے اپنی تخلیقات اور ترجموں سے ایسا
گراں قدر اضافہ کیا ہے جس کی مثال کسی اور ادیب
کے یہاں نہیں ملتی۔ اس معاملے میں وہ ایک طرح
میر کارواں ہو گئے ہیں۔ بیشک انھوں نے ادھر جو انھوں

سے اپنا چراغ جلایا ہے لیکن خود انھوں نے ہندستان میں علم کا چراغاں کر دیا ہے اور یہی علم و عرفان کے پھیلنے کا انداز اور رسم ہے۔ چنانچہ نیر صاحب کی مثال سے خصوصاً ہندی ادب میں بچوں کے لیے لوگوں نے خاصہ کام کیا ہے اور ایسا ہی ہندستان کی دوسری زبانوں میں بھی ہوا ہے بلکہ ان کی بعض تخلیقات کو ان زبانوں میں جوں کا توں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اُن کی بے شمار کتابوں میں "بچوں کا تحفہ" نام سے جو سلسلۂ کتب ہے وہ مثالی ہے۔ ایک زمانے ہندستان بھر میں اُس کی دھوم مچ چکی ہے کیوں کہ "بچوں کا تحفہ" ہر اُس سرکاری اور غیر سرکاری اسکول کے نصاب میں شامل تھا جہاں اُردو سکھائی جاتی تھی۔ لیکن نیر صاحب کی کتابوں کی افادیت ہر زمانے میں باقی رہے گی۔ کیوں کہ وہ ایک اعلیٰ جذبے اور کامل فن کے تحت لکھی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ آپ نے اسلامی عقائد اور اخلاقیات اور قصوں کے موضوعات پر بھی نظم و نثر میں کتابیں لکھی ہیں اس طرح آج بھی ایک صاحبِ طرز ادیب کی حیثیت سے آپ مستند و منفرد ہیں جب کہ اس میدان میں اب بہت سے شہسوار اپنے جوہر دکھا رہے ہیں۔

ادبِ عالیہ کے اوصاف یہی نہیں ہوتے کہ الفاظ و اسلوبِ بیان پُرشکوہ، صنائع بدائع تشبیہات و استعارات و تلمیحات سے مزین اور خیالات فلسفیانہ ہوں بلکہ ادبِ عالیہ کی خوبی یہ بھی ہے کہ زبان سادہ، دل نشین ہو اور خیالات ایسے عام فہم کہ دل میں گھر کر جائیں اور پڑھنے والے کو احساس ہوتا ہو اور اس کی اخلاقی و شعوری بالیدگی و ترقی ہو یعنی ادب پارہ محض تضیع وقت اور حسن کاری کے لیے نہیں بلکہ کسی مقصد کے پیش نظر تخلیق کیا گیا ہو۔ اس طرح اگر قسم اوّل کے مطابق شیکسپیر و ملٹن، غالب و اقبال ادبِ عالیہ کے خالق ہیں تو قسم دوم کے مطابق ورڈز ورتھ، نظیر اکبرآبادی، محمد حسین آزاد، مولانا حالی اور مولوی شفیع الدین نیر، سادہ زبان میں ایک مقصدِ اعلیٰ کے تحت نظم لکھنے والے شعرا کی حیثیت سے ممتاز و مستند خالق ہیں۔

نیر صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے زیادہ تر بچوں کے لیے لکھا ہے، دراصل بچوں کے لیے ادب تخلیق کرنا اتنا مشکل کام ہے کہ علامہ اقبال جیسے عظیم شاعر بھی اس میدان میں کوئی کارنامہ سرانجام دینے سے قاصر رہے۔ اس کے لیے ایک بڑے انسان کو بچہ بن کر خود کو بچوں سے ہم آہنگ کر کے اُن کی شعور کے مطابق لکھنا ہوتا ہے تاکہ بچے ان چیزوں کے پڑھنے سے خوش بھی ہوں اور اُن کی ذہنی و اخلاقی تربیت بھی ہو۔ ظاہر ہے نیر صاحب نے اس کارِ دشوار کو انجام دینے میں اپنی افتادِ طبع کے علاوہ بچوں کی نفسیات کے متعلق نہ صرف بہت سا ادب پڑھا ہوگا۔ بلکہ ہندستان کے سماجی و معاشی ماحول میں ہندستانی بچوں کی ضرورتوں پر سوچا بھی ہوگا اور بحیثیت معلم بھی مختلف طبقات کے بچوں اور نوجوانوں سے سابقہ بھی پڑا ہوگا۔ اور ان مشاہدات و تجربات، اور ان کے وسیع مطالعے نے ایک ادیب و شاعر کے فرضِ منصبی کی نجام دہی میں ان کی بڑی مدد کی ہوگی اس اعتبار سے اُردو ادب میں ان کے اس علمی کارنامے پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے تحقیق کی جا سکتی ہے۔

نیر صاحب عجیب سادہ اور پُرکشش شخصیت کے مالک ہیں جو اپنے معصومانہ انداز میں مخلصانہ برتاؤ سے ہر شخص کو پہلی ہی ملاقات میں اپنا گرویدہ بنالیتے ہیں

محمد احمد دلکش ایم، اے، ایم، ایڈ

جناب دولت شاہجہاں پوری، مدیر پیام تعلیم سے یہ معلوم ہوکر کہ پیام تعلیم کا نیّر نمبر شائع ہونے والا ہے، مسرت ہوئی۔ جناب شفیع الدین صاحب نیّر کی عظمت اور خدمات علمی کا اعتراف بارہا مختلف مواقع پر ہوا ہے اور ہوتا رہے گا کیوں کہ نیّر صاحب نے ایک فن کار کی حیثیت سے اردو ادب میں ایک منفرد کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ بچوں کے شاعر و ادیب ہیں۔ جناب اسمٰعیل میرٹھی کے بعد آپ نے اردو ادب میں بچوں کے لیے نظم و نثر کا سب سے بڑا اور قابل قدر سرمایہ فراہم کیا ہے۔ آپ نے نظموں اور کہانیوں کی بے شمار کتابیں تصنیف کی ہیں جو نہ صرف ننھے منوں، بلکہ ناخواندہ بالغوں کو بھی زبان اردو سکھانے میں نہایت کامیاب ہوئی ہیں۔ انگریز ماہر تعلیم مسٹر مائر نے جنھوں نے کہ مادری زبانوں کے طریقۂ تعلیم پر مستند کتابیں لکھی ہیں، اپنی کتابوں میں نیّر صاحب کی بعض کتابوں کی تعریف کی ہے اور سفارش کی ہے کہ ان کے ذریعے اُردو کی تعلیم دی جائے۔ نیّر صاحب نے محدود اور آسان الفاظ کی تکرار سے چھوٹے بچوں کے لیے ان کی عمر کے مطابق نظم و نثر کی سلسلہ وار کتابیں لکھی ہیں جو اس امر کی دلیل ہیں کہ انھوں نے اپنا کام باقاعدگی سے ایک پروگرام کے تحت کیا ہے۔ ان کتابوں کو تھوڑی سی رہنمائی سے بچے خود بخود خوشی اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں —

بیسک انگلش کے اصول پر جس میں تھوڑے سے آسان الفاظ کو قرینے سے استعمال کر کے تمام مطالب ظاہر کیے جا سکتے ہیں، نیّر صاحب نے بھی اپنایا ہے اور ان کی اس طرح کی تمام کتابیں خوب صورت اور رنگین تصویروں سے مزیّن ہیں۔ کتابوں کی زبان، افسانہ اور نظم کی دلچسپی اور تصویروں کے ذریعے اُن کی حسن کاری کے معاملے میں انگریزی اور یورپ کی ان بے شمار کتابوں کو نیّر صاحب نے اپنے لیے معیار بنایا ہے، جو چھوٹے بچوں اور ناخواندہ لوگوں کے لیے یورپ کے ممالک میں لکھی گئی ہیں۔ آپ نے اکثر ان کہانیوں اور نظموں سے ذوق اور جذبۂ تخلیق کا اکتساب بھی کیا ہے، اور ایک اچھے مترجم کے طور سے کئی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ اس طرح برصغیر ہند و پاک میں اُردو کے خزانۂ ادب میں بچوں کے لیے آپ نے اپنی تخلیقات اور ترجموں سے ایسا گراں قدر اضافہ کیا ہے جس کی مثال کسی اور ادیب کے یہاں نہیں ملتی۔ اس معاملے میں وہ ایک طرح میر کارواں ہو گئے ہیں۔ بلاشک انھوں نے ادب چراغوں

سے اپنا چراغ جلایا ہے لیکن خود انھوں نے ہندستان
میں علم کا چراغاں کر دیا ہے اور یہی علم و عرفان کے پھیلنے
کا انداز اور رسم ہے۔ چنانچہ نیّر صاحب کی مثال سے
خصوصاً ہندی ادب میں بچّوں کے لیے لوگوں نے نمایاں کام
کیا ہے اور ایسا ہی ہندستان کی دوسری زبانوں میں
بھی ہوا ہے بلکہ ان کی بعض تخلیقات کو ان زبانوں میں
جوں کا توں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اُن کی بے شمار کتابوں
میں جو "بچّوں کا تحفہ" نام سے جو سلسلۂ کتب ہے وہ مثالی
ہے۔ ایک زمانے میں ہندستان بھر میں اُس کی دھوم
مچ چکی ہے کیوں کہ "بچّوں کا تحفہ" ہر اُس سرکاری اور
غیر سرکاری اسکول کے نصاب میں شامل تھا جہاں اُردو
سکھائی جاتی تھی۔ لیکن نیّر صاحب کی کتابوں کی افادیت
ہر زمانے میں باقی رہے گی۔ کیوں کہ وہ ایک اعلیٰ جذبے
اور کامل فن کے تحت لکھی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ آپ نے
اسلامی عقائد اور اخلاقیات اور قصوں کے موضوعات
پر بھی نظم و نثر میں کتابیں لکھی ہیں اس طرح آج بھی ایک
صاحبِ طرز ادیب کی حیثیت سے آپ مستند و منفرد ہیں
جب کہ اس میدان میں اب بہت سے شہسوار اپنے جوہر
دکھا رہے ہیں۔

ادبِ عالیہ کے اوصاف یہی نہیں ہوتے کہ الفاظ و
اسلوبِ بیان پُر شکوہ، صنائع بدائع تشبیہات و
استعارات و تلمیحات سے مزین اور خیالات فلسفیانہ
ہوں بلکہ ادبِ عالیہ کی خوبی یہ بھی ہے کہ زبان سادہ
دل نشین ہو اور خیالات ایسے عام فہم ہوں کہ دل میں گھر
کر جائیں اور پڑھنے والے کو احساسِ مسرت ہو اور اس کی
اخلاقی و شعوری بالیدگی و ترقی ہو یعنی ادب پارہ محض تضیعِ
وقت اور حسن کاری کے لیے نہیں بلکہ کسی مقصد کے پیشِ نظر
تخلیق کیا گیا ہو۔ اس طرح اگر قسمِ اوّل کے مطابق شیکسپیئر
و ملٹن، غالب و اقبال ادبِ عالیہ کے خالق ہیں تو قسمِ
دوم کے مطابق ورڈز ورتھ، نظیر اکبر آبادی، محمد حسین
آزاد، مولانا حالی اور مولوی شفیع الدین نیّر سادہ زبان
میں ایک مقصدِ اعلیٰ کے تحت نظم لکھنے والے شعرا کی حیثیت
سے ممتاز و مستند خالق ہیں۔

نیّر صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے زیادہ تر بچّوں
کے لیے لکھا ہے۔ دراصل بچّوں کے لیے ادب تخلیق کرنا اتنا مشکل کام ہے
کہ علامہ اقبال جیسے عظیم شاعر بھی اس میدان میں کوئی کارنامہ
سر انجام دینے سے قاصر رہے۔ اس کے لیے ایک
بڑے انسان کو بچّہ بن کر خود کو بچّوں سے ہم آہنگ
کر کے اُن کی شعور کے مطابق لکھنا ہوتا ہے تاکہ بچّے ان
چیزوں کے پڑھنے سے خوش بھی ہوں اور اُن کی ذہنی
و اخلاقی تربیت بھی ہو۔ ظاہر ہے نیّر صاحب نے اس کارِ
دشوار کو انجام دے کر اپنی افتادِ طبع کے علاوہ بچّوں
کی نفسیات کے متعلق نہ صرف بہت سا ادب پڑھا ہوگا۔
بلکہ ہندستان کے سماجی و معاشی ماحول میں ہندستانی
بچّوں کی ضرورتوں پر سوچا بھی ہوگا اور بحیثیت معلم انھیں
مختلف طبقات کے بچّوں اور نوجوانوں سے سابقہ بھی پڑا
ہوگا۔ اور ان مشاہدات و تجربات، اور ان کے وسیع
مطالعے نے ایک ادیب و شاعر کے فرضِ منصبی کی بجا
دہی میں ان کی بڑی مدد کی ہوگی۔ اس اعتبار سے اُردو
ادب میں ان کے اس علمی کارنامے پر پی۔ ایچ۔ ڈی
کے لیے تحقیق کی جا سکتی ہے۔

نیّر صاحب عجیب سادہ اور پُر کشش شخصیت
کے مالک ہیں جو اپنے معصومانہ انداز میں مخلصانہ برتاؤ
سے ہر شخص کو پہلی ہی ملاقات میں اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں

وہ انگریزی کی اس ضرب المثل کے مصداق ہیں جس کا ترجمہ "سادہ زندگی اور اعلیٰ خیالی" کیا جا سکتا ہے۔ اُن کی زندگی جہاد مسلسل کی درخشاں مثال ہے۔ انھوں نے زندگی میں جو کچھ بھی حاصل کیا ہے، وہ ان کی انتھک ایماندارانہ اور خود دارانہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اُن کے چھوٹے سے قد کو دیکھ کر آدمی اس حقیقت کا قائل ہو جاتا ہے کہ انسان اپنے جُثّہ سے نہیں بلکہ اپنی لیاقت و شرافت، محنت و دیانت اور خدمت ملک و ملت سے عظیم ہوتا ہے۔ زندگی کی سنگلاخ زمین کو انھوں نے اپنے تیشۂ شوق اور بازوئے ہمت سے لالۂ صد رنگ کے گلشن ہرے میں تبدیل کر دیا ہے۔ انھوں نے جو کام بھی اپنے ذمہ لیا اس کی تکمیل ہمیشہ ایسی خوش اسلوبی سے کی گویا حق ادا کر دیا۔ آپ نے دلی کے مشہور آغا قاسم ماڈرن اسکول میں اردو فارسی پڑھائی تو اس شان اور کامیابی سے کہ سر دار خشونت سنگھ ایڈیٹر السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا نے جو خود اپنی علمی عظمت، ادیبانہ حسن اور جرأت تحریر کے لیے اپنی مثال آپ ہیں، دنیا کے سامنے اپنے استاد جناب شفیع الدین نیّر صاحب کی بے پناہ قابلیت، فنی صلاحیت اور اپنے اس فیض تلمّذ کو جو انھوں نے اپنے ان سادہ اور من موہنی شخصیت والے استاد سے ماڈرن اسکول میں ایک طالب علم کی حیثیت سے حاصل کیا تھا، ظاہر کرنے کے لیے اور نیّر صاحب کو اپنی محبت و ممنونیت کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے ان پر السٹریٹیڈ ویکلی میں ایک خوبصورت مضمون لکھ کر مع ان کی تصویر کے شائع کیا۔ سردار صاحب جیسے دریا دل، اقبال مند اور احسان مند نیّر صاحب کے نہ جانے کتنے طالب علم دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں جو انھیں ہمیشہ محبت و احترام سے یاد کرتے ہیں اور ان کی دکھائی ہوئی خدمت انسانیت کی راہ پر گامزن ہیں۔

نیّر صاحب اس معاملے میں خوش قسمت ہیں کہ شروع ہی سے انھیں اُن کے قدر دان اور جوہر شناس دوست مل گئے۔ چناں چہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم نے اُن کی صلاحیتوں کو پہچان کر اُن سے جامعہ میں منصب معلمی سنبھال لینے کا اصرار کیا جب کہ نیّر صاحب پہلے ہی ماڈرن اسکول میں، جو مالی اعتبار سے اس وقت کی جامعہ سے بدرجہا بہتر ادارہ تھا، اُردو فارسی کے استاد تھے۔ لیکن نیّر صاحب میں جو قلندرانہ رجحان اور ملک و ملّت کی خدمت کا بے پناہ جذبہ ہے وہ انھیں جامعہ لے آیا اور یہاں انھیں جامعہ کے دوسرے قلندر و مجاہد کارکنوں کے ساتھ مدتوں تنگ دستی کی زندگی گزارنی پڑی۔ انھوں نے جامعہ کے مدرسۂ ثانوی میں بھی پڑھایا اور بعد میں کالج میں بھی۔ اس طرح ملک و ملّت کے چھوٹے چھوٹے بچوں سے نوجوانوں تک کی تعلیم و تربیت کرنے کا امتیاز انھیں حاصل ہوا اور فلسفہ و طریقۂ تعلیم کی دنیا میں ایک مقتدر مقام حاصل ہو گیا۔ آپ کے اسی باکمال معلّم ہونے کا فیض ہے کہ آپ کی ساری اولاد اعلیٰ ترین تعلیم نہایت اعلیٰ معیار سے حاصل کر کے زندگی میں کامران و سرفراز ہے۔ آپ کے گھر کی تہذیب کا یہ حال ہے کہ احباب میں مشہور ہے کہ آپ کے یہاں کے توتا مینا بھی جی جناب سے بات کرتے ہیں۔

دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ بے حد شاگرد نواز ہیں۔ چھوٹوں کی ہمت افزائی آپ کا شیوہ ہے۔ حد یہ ہے کہ کسی خورد کے علمی یا تہذیبی کام سے خوش ہو کر خود ان کے گھر جا کر اس کی ہمت افزائی کرتے ہیں اس کو

مبارک باد اور شاباش سمجھتے ہیں ۔ اور اس کے کام کو سراہتے ہیں ۔ اپنی طرف سے کوئی تنقید نہیں کرتے بلکہ اگر وہ شخص ان کی رائے جاننا ہی چاہتا ہے تو نہایت شفقت و محبت سے بہت سی ایسی مفید باتیں بتاتے ہیں کہ جو اس کے کام کے کو چار چاند لگا دیں ۔ آج تک اُن کے منہ سے کسی کی بُرائی نہیں سُنی جب کہ اُن کی کام یابی پر رشک و حسد کرنے والوں کی تعداد کافی زیادہ ہے ۔ جب جامعہ میں پہلی بار مجھے اُن سے شرف ملاقات حاصل ہوا اور میں نے مودبانہ انھیں بتایا کہ میں بھی ان کا غائبانہ شاگرد ہوں ، کیوں کہ جب میں بہت چھوٹا تھا تو میں نے ان کا بچّوں کا تحفہ پڑھا تھا تو وہ بہت خوش ہوئے اور مجھ سے بغل گیر ہو گئے ۔ واقعی نیّر صاحب جامعہ کی اُن عظیم شخصیت میں سے ہیں جو جامعہ کی شہرت و عظمت میں مہر و ماہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور جو اپنے فیض تصنیف و تالیف سے تہذیب عالم کو مالا مال کر رہے ہیں ۔ یہ اُن بزرگوں میں سے ایک ہیں ۔ جن کی درازیٔ عمر و فیض رسانی کے لیے چھوٹے بھی دعا کرتے ہیں کیوں کہ یہ باغ حیات انسان کے حقیقی باغبان ہیں اور دُنیائے تہذیب میں کار چمن بندی ان کا منصب ہے ۔ نیّر صاحب کی سادہ پُر وقار اور کام یاب زندگی کو دیکھ کر زندگی گزارنے کا یہ زرّیں اُصول حاصل ہوتا ہے کہ وہی انسان عظیم و کام یاب ہو سکتا ہے جو زندگی کا ایک مقصد اعلیٰ متعین کر کے ہمہ تن حصول مقصد میں گم ہو جائے ۔ پھر وہ گرد و پیش کے خارزار سے بے خبر ہو جاتا ہے ، اس کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا بلکہ وہ اپنی فیض رسانی سے محسنِ انسانیت بن جاتا ہے ۔

آپ جیسے مہذب اور سادہ مزاج انسان بے انتہا اُصول پرست اور قاعدوں کی پابندی کرنے کے معاملے میں نہایت سخت بھی ہوتے ہیں ۔ وہ نہ صرف خود زندگی کے زرّیں اصولوں ، مثلاً محنت و ایمان داری کے عامل ہوتے ہیں بلکہ چاہتے ہیں کہ اُن کے گرد و پیش تمام چھوٹے بڑے زندگی کے اچھے اصولوں پر کاربند ہوں ۔ اس لیے باوجود شفیق ہونے کے وہ اپنے چھوٹوں اور خصوصیت سے اُن لوگوں سے جو اُن کے زیرِ تربیت ہوتے ہیں اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ وہ کوئی غلط کام نہ کریں ۔ چناں چہ نیّر صاحب کا ایک تاریخی واقعہ اس ضمن میں مشہور ہے جب وہ جامعہ کالج میں پڑھاتے تھے ۔ تو ایک طالب علم نے جو نیّر صاحب کے ایک نہایت دوست اور رفیق کار کے صاحبزادے تھے ، سالانہ امتحان کے ایک پرچہ میں کچھ نقل کر لی ۔ نیّر صاحب نے اُن کو نہ صرف اس عمل سے روک دیا بلکہ جامعہ کے ذمہ داران کو باقاعدہ رپورٹ بھی کر دی جس پر ایک سال کے لیے ان صاحب زادے کو امتحان دینے سے روک دیا گیا ۔ یہ ہے ایک شان دار مثال ، پیشے کے اُصولوں سے وفاداری کی ، جب کہ دوسری طرف دوستی اور مصلحت کے تقاضے سے کوئی دوسرا شخص چشم پوشی سے کام لے سکتا تھا ۔ یہ مثال بہت سے ان لوگوں کے لیے مشعل راہ ہو سکتی ہے جو اپنے فرائض منصبی کو بہتر طور سے انجام دینے کے خواہش مند ہوں ۔

ایک اور خوبی نیّر صاحب میں خاک ساری اور ملن ساری کی ہے ۔ آپ سب سے جھک کر ملتے ہیں ۔ بیماروں کی تیمار داری اور غم زدوں کی غم خواری کرتے ہیں اور کسی چھوٹے بڑے سے اس بات کی توقع نہیں کرتے کہ وہ نیّر صاحب کو سلام کرنے میں پہل کرے

(۵۰ صفحہ پر)

خالد مزان

نیّر صاحب کی شاعری کے چند پہلو

اُردو ـــــ یہی زبان جس میں ہم آپ بات چیت کرتے ہیں، پڑھتے لکھتے ہیں، بڑی پیاری زبان ہے، میٹھی زبان ہے۔ آپ کو پسند آتی ہے، ہم کو پسند ہے، اس کو جو بولتے ہیں، لکھتے ہیں پڑھتے ہیں، وہ تو پسند کرتے ہی ہیں، لیکن جو سنتے ہیں وہ بھی اس کو پسند کرنے لگتے ہیں!۔ کبھی آپ نے سوچا اس کی پسندیدگی کا کیا سبب ہے؟ ـــ اس کے کئی سبب ہیں۔ ان اسباب میں سے ایک سبب ہے اس کی شاعری ـــ غزلیں، نظمیں، گیت ـــ جو سننے میں بھی بھلے لگتے ہیں اور پڑھنے میں بھی۔ ان میں رس گھلا ہوتا ہے، موسیقی ہوتی ہے۔ ان میں ہر مضمون بیان کیا جا سکتا ہے، نصیحت کی باتیں ہوتی ہیں، شرارت اور شوخی کی باتیں ہوتی ہیں۔ [illegible] مطالبے ہوتے ہیں، دوسروں کی مانگیں ہوتی ہیں، [illegible] کیا بات ہے جو نہیں ہوتی ـــ شاعری بڑوں کے لیے [illegible] ہے اور بچوں کے لیے بھی۔ بڑوں کے لیے جو باتیں [illegible] جائیں، خواہ وہ کتنے ہی پیچیدہ اور مشکل طریقے سے کہی جائیں، ان کو سمجھ لیا جا سکتا ہے، لیکن بچوں کے لیے جو باتیں کہی جائیں، ان کا انداز اور طرز ذرا سی قدر آسان ہوتا ہے، سادہ ہوتا ہے، مشکل سے مشکل بات کو اس قدر سہل بنا کر، دلچسپ بنا کر پیش کرنا پڑتا ہے کہ ننھے منّوں کا ذہن اس کو فوراً اپنا لے، قبول کر لے، ایسے کلام کو مزے لے کر نہ صرف پڑھے بلکہ اس کے پیغام کو سمجھ بھی لے، اپنا لے اور برتے۔

یہ اور دوسری چند خصوصیات ہیں جن کا بچوں کی شاعری میں پایا جانا ضروری ہے۔ ایسی شاعری کے لیے بڑوں کو بچہ بن کر سوچنا پڑتا ہے۔ لیکن ایک پختہ ذہن کے لیے بچے کی سطح پر آ کر سوچنا، سمجھنا اور پھر اس کے احساسات کو بچے ہی کی اپنی زبان میں بیان کرنا نہایت مشکل امر ہے۔ ایسا کٹھن کام اُردو شاعری میں بہت سوں نے کیا ہے۔ ان میں سرِ فہرست ہیں مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی، جن کو بلاشبہ اُردو زبان میں بچوں کا اوّلین کامیاب ادیب اور شاعر کہا جا سکتا ہے۔ ان کے بعد آپ بچوں کے لیے لکھنے والوں میں حامد اللہ افسر، مولانا حامد حسن قادری، مولانا محمد حسین محوی صدیقی، حفیظ جالندھری، جوہر چاندورکر، لطیف فاروقی، فضل الٰہی عارف، سیفی سیوہاروی اور مولوی محمد شفیع الدین نیّر کا نمبر آتا ہے۔ یہ نہیں کہ بس اتنے ہی شاعر ہیں جنھوں نے بچوں کے لیے لکھا ہے، نہیں، ان کے علاوہ بھی بے شمار شاعر ہیں جن کا بیشتر کلام بچوں کے لیے ہے یا جنھوں نے خاص خاص موقعوں پر بچوں کے لیے کوئی خاصے کی چیز لکھی ہے۔ لیکن میں نے جو چند نام گنائے ہیں، ان بزرگوں نے اپنی شاعری کے ذریعے بچوں کی تربیت اور تفریح کے مقدس فریضے کو اپنی زندگی

کا ایک مقصد بھی بنائے رکھا۔

ایسے شاعروں میں مولوی محمد شفیع الدین نیّر ایک طرح سے اس لیے بھی اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں کہ وہ پیشے کے اعتبار سے ایک اُستاد رہے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ استاد اوّل ہیں اور شاعر بعد میں یعنی ان کی کوئی نظم پڑھیے خواہ اس کی ابتدا کتنی ہی شوخ ہو یا اس کے متن میں ننھے منّوں کی شوخیوں اور شرارتوں کا ذکر کیوں نہ کیا گیا ہو، اس کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے آپ کو لگے گا کہ آپ کلاس کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ آپ کو درس دے رہے ہیں — اخلاق کا، علم کی اہمیت کا، جغرافیہ کا، شہریت کا، اور جانے کس کس بات کا!

میں نیّر صاحب کی نظموں کو تین عمومی عنوانوں کے تحت تقسیم کر کے، بچّوں کے لیے ان کی شاعری کی چند خصوصیات بتانا چاہتا ہوں۔ حوالے کے لیے میں نے ان کے کلام کے مجموعوں سے مدد نہیں لی ہے، بلکہ پیام تعلیم، کھلونا وغیرہ رسالوں میں شائع چند ایک نظموں اور گیتوں کو منتخب کیا ہے۔

نیّر صاحب کی نظموں میں اولیت اُن نظموں کو حاصل ہے جن میں کوئی نہ کوئی پیغام ہوتا ہے، درس ہوتا ہے۔ دوسری قسم کی نظموں میں آپ ان ہلکی پھلکی نظموں اور گیتوں کو شامل کر سکتے ہیں، جن میں بچّوں کے نازک احساسات معصوم شرارتوں اور برجستہ شوخیوں کا ذکر ہوتا ہے اور تیسری قسم کی نظمیں وہ ہیں، جن میں کہانیوں کو نظم کیا گیا ہے۔

پہلی قسم کی نظموں کے موضوع اسی قدر دلچسپ ہیں جس قدر [illegible] — ان میں کہیں محنت [illegible] کی تعریف ہے

کہیں مختلف موسموں کی خصوصیات کا ذکر ہے، کہیں کام کی اہمیت بیان ہو رہی ہے اور کہیں وطن کی محبت کا درس دیا جا رہا ہے۔ ان تمام نظموں کو ____ یہاں تک کہ "نیا سال مبارک" اور "عید مبارک" جیسی نظموں کو بھی پڑھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ نیّر صاحب کو بچّوں کی تعلیمی اور ذہنی ضرورتوں، صلاحیتوں اور دلچسپیوں کا ہر دم احساس رہتا ہے، پاس رہتا ہے۔ مقصد کبھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ نئے سال کی مبارکباد دیتے ہوئے بھی دعائیہ انداز ہی میں وہ نظر میں بلندی پیدا کرنے، محنت مشقت سے نہ گھبرانے، اپنے ہی بازو پر تکیہ کرنے اور جان و دل سے وطن کی خدمت کرنے کے پیغام کو دہراتے ہیں۔ "لو آ رہا ہے یارو مارچ کا مہینہ" میں جو باتیں بتائی گئی ہیں، وہ لگتی تو معمولی ہیں، ہر طالب علم جانتے بوجھتے یا انجانے میں ان کا مرتکب ہوتا ہے اور اکثر حالات میں اس کی آنکھیں اُس وقت بھی نہیں کھلتیں جب امتحان سر پہ آ کھڑا ہوتا ہے، ایسے تمام بچّوں کے لیے یہ نظم ایک تازیانے کا کام اس قدر غیر محسوس طریقے سے انجام دیتی ہے کہ اگر کسی طالب علم نے اس نظم کے پیغام کو سمجھ لیا تو وہ اپنی پڑھائی کے میدان ہی میں نہیں، بلکہ زندگی کے ہر میدان میں کبھی محنت سے جی نہیں چرائے گا۔ ابتدا ہی سے اپنے خون اور پسینے کو ایک کرنے میں لگ جائے گا۔ اس لیے کہ جہاں اس نظم میں غفلت کے نقصانات کا ذکر ہے وہیں محنت کے صلہ کی للچاہٹ بھی ہے۔

ان "پیغامی" نظموں کی ایک اور خصوصیت ان کی سادگی ہے۔ شاعرانہ گرفت ہے، جس کی وجہ سے سنجیدہ موضوع اور اہم سے اہم بات نہایت ہی [illegible] اور دلنشین انداز میں بیان کی جاتی ہے [illegible] شہریت

پڑھانے والے اساتذہ بھی اس قدر آسانی سے بچے کے
ذہن میں "اچھے شہری" کی تعریف اور خصوصیات
نہیں بیان کر سکیں گے جیسا کہ نیر صاحب نے کہا ہے ؎

جو لوگ بھی مل کر رہتے ہیں، وہ سب شہری کہلاتے ہیں
یہ شہری آپس میں مل جل کر اپنے کام چلاتے ہیں
الفت سے یہ شیوہ ان سب کا، پیار سے مل کر رہتے ہیں
دکھ بھی اگر آجائے کوئی، تو بھی خوش ہو کر سہتے ہیں

کچھ یہی بات "اپنا گھر" میں پائی جاتی ہے۔ اس نظم کے پہلے
ہی شعر میں ایک خیالی گھر کی کتنی بڑی خصوصیت کی طرف
بالکل ہی معمولی الفاظ میں توجہ دلائی گئی ہے :-

گھر تو ہے اپنا ہی گھر، خوش حال یا بدحال ہو
ہاں مگر آپس کی الفت سے وہ مالا مال ہو

ان تمام نظموں میں نیر صاحب نے اپنی بات —
اچھی بات یا کام کی بات، اہم بات کو پیش کرتے ہوئے
مثبت لہجہ اختیار کیا ہے، بات بالراست کہی ہے، گھما پھرا کر
نہیں، بالکل اسی طرح جیسا کہ خود آپ کے مدرسے میں ماسٹر
صاحب سکھاتے ہیں یا مسجد میں مولوی صاحب یا گھر پر دادا ابا
یا نانا ابا۔ لیکن صرف یہی طریقہ آپ نے نہیں اپنایا ہے،
ایسی کئی پیاری نظمیں بھی کہی ہیں جن میں بلاواسطہ بات کہی
گئی ہے یعنی انداز منفی ہے، بات تو کی ہے غلطیوں کی،
کمزوریوں کی اور وہ بھی مزے لے لے کر لیکن اس کو پڑھتے
ہوئے خود بخود ذہن پر ایسا نفسیاتی اثر پڑنے لگتا ہے،
جس سے وہی تاثر قائم ہوتا ہے جو کہ پہلی طرز کی نظموں کو
پڑھنے سے ہوتا ہے، بلکہ اس سے سوا ہوتا ہے۔ آیئے
یہاں ان دونوں طریقوں کے تاثر کو ثابت کرنے کے لیے
ایک ہی موضوع پر لکھے ہوئے دو گیتوں اور ایک نظم کا ذکر
کریں۔ موضوع ہے کام کی اہمیت، انعامات، برکتوں
اور کامیابیوں کا۔

"کرتے رہو اپنا کام بچو" میں نیر صاحب جو استاد
ہیں، بولتے نظر آتے ہیں، کہتے ہیں :-

میرا ہے یہی پیام بچو! کرتے رہو اپنا کام بچو
کرتے ہیں جو کام دل سے پیارے
بنتے ہیں وہ چاند اور ستارے

ملتی ہے اسی سے شان و شوکت
دولت بھی ہے اسی کی بدولت

اور :-

جی کام سے جو بھی ہیں چراتے
پھرتے ہیں وہ ٹھوکریں ہی کھاتے

اور :-

ہیں آب، پر آبرو نہیں ہے
ہیں پھول، پر ان میں بو نہیں ہے

اسی طرح کی پیاری نظم ہے "محنت کا منتر"، جس میں
کھیتی اور روزی سے لے کر غریبی ہٹاؤ مہم تک محنت کی
کارکردگی کو بتاتے ہوئے نعرہ لگاتے ہیں کہ :-

محنت کا منتر سب سے نرالا
ہے بول اس کا دنیا میں بالا

ان دونوں پہلی طرز کی نظموں کے مقابلے میں آپ "نکھٹو
کا گیت" پڑھیے۔ یہاں استاد نیر صاحب پر شاعر نیر
صاحب غالب آجاتے ہیں، جس کی وجہ سے اس گیت میں
رنگینی، شوخی اور تاثر در آتا ہے۔ اور اس کو پڑھ کر بجائے
نکھٹو بننے کے ہر کوئی "کام چو" بننے کی سعی کرنے لگتا ہے حالانکہ
بادی النظر میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔ اس گیت کے آخری دو
بند پڑھیے :-

مُجّا اک دن پڑھ لکھ کر پا جائے گا اونچا نام
عزت اور دولت اور شہرت کا چھوے گا بام
سب کامی انسانوں کو ملتا ہے۔ یہی انعام
پھر بھی میری زباں پر بس رہتا ہے یہ ایک کلام
میں ہوں نکھٹو یار! مجھ کو کام سے ہے کیا کام

بے کاری کے ہاتھوں سے، ہر حال میں ہوں مجبور
دنیا کی سب خوشیاں میرے دل سے رہیں گی دور
یہ غفلت پیالہ بھر دے گی غربت کا بھرپور
ظاہر ہو کے رہے گا اک دن عقل کا میری فتور
میں ہوں نکھٹو یار! مجھ کو کام سے ہے کیا کام

لگتا ہے نیّر صاحب کو فطرت اور اس کی نیرنگیوں سے خاص لگاؤ ہے۔ بالخصوص انھوں نے بدلتی رُتوں کو بڑی گہری نظر سے دیکھا ہے اور ان کی تمام خصوصیات کو بچوں کے ذہن میں بڑی خوبصورت نظموں کے ذریعے جاگزیں کرنے کی شاعرانہ کوشش کی ہے۔ ایسی نظموں میں ایک طرف "گرمی کی گرماگرمی" پائی جاتی ہے، دوسری طرف "سردی کی شان نرالی ہے" اور باتوں ہی باتوں میں کئی کام کی باتیں بتادی گئی ہیں تو ایک اور طرف "ہمارے دیس کی برسات" کی بات کی گئی ہے اور "برکھا رُت" کا حال بیان کیا گیا ہے۔ تصویر کشی اس قدر موثر ہے کہ پڑھ کر یہ "گرمی کی گرماگرمی سے سب کا دم ناک میں آجاتا ہے" اور سردی کے موسم میں ہم "سوں سوں سوں سوں" سی سی اور تھر تھر" کرنے لگتے ہیں۔ پھر "برکھا رُت" کی آمد اس قدر چہل ہوتی ہے کہ پکنک کے پروگرام بننے لگتے ہیں اور خود نیّر صاحب بھی "سیر کو نکلے" کی تیاری کرنے لگتے ہیں۔

اس قسم کی نظموں کی آپ کے کلام میں کثرت ہے۔

ایسی نظموں میں شخصی خاکے بھی مل جائیں گے، جن میں "استاد صاحب" کے سنجیدہ خاکے سے لے کر "میاں بھوندل" اور "شرارت کی پتلی" جیسے مزاحیہ خاکے تک شامل ہیں۔ ان نظموں کی خصوصیات ان کے اختصار کے ساتھ، شخصیت کے ایسے پہلوؤں کی نشاندہی ہے جن تک عموماً ہر کسی کی نظر نہیں پہنچتی، لیکن جو اس شخصیت کا ایک لازمی بلکہ یقینی جز اور عنصر ہوتے ہیں۔ اس مکمل تصویر کشی میں کبھی استاد نیّر، کبھی شاعر نیّر، اور کبھی دونوں اپنی مہارت کا ثبوت دیتے ہیں۔

اب آئیے، کچھ دوسری قسم کی نظموں کے تعلق سے باتیں کریں۔ ان نظموں کے موضوع ہی کچھ ایسے شوخ اور شریر ہیں کہ خود بخود طبیعت ان کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ نیّر صاحب کی ایسی کئی نظمیں ہیں، اور ان میں وہ بچوں کے احساسات کو بیان کرنے میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ میں نے "بڑی حد تک" اس لیے کہا ہے کہ بات اگر ننھی منی شرارتوں کی ہو رہی ہے تب بھی لہجے میں وہی بندگی چھلکتی ہے، جو نیّر صاحب کا خاصہ ہے۔ ایسی نظموں میں، میں نے حامد اللہ افسر صاحب کے ہاں ایسی برجستگی پائی ہے جو خود ننھے بچوں کی معصوم باتوں اور حرکتوں کا ایک خاصہ ہے۔ مثلاً افسر صاحب کی ایک نظم ہے جو غالباً ۱۹۴۲ء میں پہلی بار چھپی تھی، لکھا ہے:

توڑ دیے کل میز پر جا کر
کس نے پیالے؟ میں نے اماں
ڈالے داغ یہ دیواروں پر
کس نے کالے؟ میں نے اماں
فرش پہ کیچڑ کے یہ دھبے
کس نے ڈالے؟ میں نے اماں

اور ۔۔۔ کس کے جواب ہیں گھر میں ایسے
بھولے بھالے؟ میرے اماں!

اسی طرح ایک نظم نیر صاحب کی لکھی ہے "مسٹر کوئی نہیں!" اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے:۔

کس نے گرا کر میز سے توڑا شیشے کا گل دان
کس نے پنسل سے دیواریں رنگ دیں کھا کر پان
کس نے سارے گھر میں پھیلا رکھے ہیں یہ دھان
کس نے توڑ کے پھینکے میرے سارے تیر کمان
مسٹر کوئی نہیں یہ بولے، ہم کو کیا معلوم؟

اسی طرح "مسٹر کوئی نہیں" کے کارناموں کی تفصیل آگے بڑھتی ہے اور پڑھنے والا مسکرا اٹھتا ہے، گردن بھی ہلانے لگتا ہے، لیکن "مسٹر کوئی نہیں" اور ان کے جواب "ہم کو کیا معلوم" میں ایک طرح سے "بڑا پن" نظر آتا ہے اور ہم نیر صاحب کی بزرگی کو بھلا نہیں پاتے!

اسی قدر پیاری نظمیں "شرارت کے پتلے" اور "شرارت کی پتلی" ہیں۔

"وہ نچلے نہیں بیٹھتے اک گھڑی
مچاتے ہیں دن بھر دھما چوکڑی"

یہ "شرارت کے پتلے" کا حال ہے تو "شرارت کی پتلی" کی بات یوں ہے:۔

"شرارت سے بس بوٹی بوٹی بھری تھی
وہ منی شرارت کی اک پھلجھڑی تھی"

اسی ضمن میں چند ایسی نظموں کا ذکر بھی ضروری ہے جو ننھے منوں کے احساس تجسس کی تسکین کا سامان بڑے ہی جاندار اور دل نشین انداز میں فراہم کرتا ہے۔ اس سلسلے کی دو نظمیں مجھے خاص طور سے پسند ہیں۔ ایک ہے "[illegible] کی تتلی" جس میں اس سائنسی حقیقت کو جس کے تحت کیڑے جو کہلاتے ہیں، کیسے تتلی بنتے ہیں، بہت ہی سہل، سادہ اور شاعرانہ انداز میں ننھے منوں کے ذہن نشین کرایا گیا ہے۔ خاص کر اس چھوٹی سی نظم کا اختتام تو اتنا حقیقی اور فطری ہے کہ بس جی جھوم اٹھتا ہے، کہتے ہیں:

اڑ گئی تتلی موقع پا کر
رہ گئے صالح ہاتھ اٹھا کر

اسی طرح کی ایک نظم ہے "بلی کے بچے کی حیرانی" جس میں آنکھ، ناک، کان وغیرہ جسمانی اعضا کی ضرورت اور وظیفوں کو نہایت ہی سادہ اور آسان زبان میں پیش کیا گیا ہے۔

نیر صاحب نے کئی کہانیوں کو بھی نظم کیا ہے اور خوب کیا ہے۔ نانی اماں سے کہانی سننے میں جو مزا آتا ہے، وہی لطف نیر صاحب کی کہانی کو پڑھنے میں آتا ہے۔ یہ کہانیاں کچھ اپنے ہاں کی ہیں اور کچھ دوسری زبانوں سے لی گئی ہیں۔ پتا چلتا ہے کہ نیر صاحب بچوں کی دل چسپی کے تربیتی اور تعلیمی سامان کی فراہمی کے لیے مختلف زبانوں کے خزانوں کو کھنگالتے رہتے ہیں، اور جب بھی قیمتی ہیرے موتی ملتے ہیں فوراً اپنا لیتے ہیں اور حوالے کے ساتھ پیش کر کے ان سے آپ جیسے بچوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ ان کہانیوں کی چاشنی اس لیے بھی بڑھ گئی ہے کہ نظم کی پابندی کے تحت یہاں صرف موزوں ترین الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ غیر ضروری تفصیلات کاٹ دی گئی ہیں اور ان میں صوتی ہم آہنگی کا خیال رکھا گیا ہے۔ ان نظموں میں "بدھو نفر" (جس کے آخری حصے نے مجھے جاپان کی بچوں کے لیے لکھی ہوئی ایک بڑی پیاری نظم کی یاد دلا دی) "منہ سے کہنا اور ہے کرنا ہے اور" اور "رانی کی مرغی" کا حوالہ کافی ہے۔ خاص کر "رانی کی مرغی" کو پڑھ کر [illegible] کہ چھوٹے بچوں کے لیے لکھتے وقت نیر صاحب [illegible]

کی ضرورتوں، صلاحیتوں اور مزاج کو کبھی نہیں بھولتے۔

آپ کی شاعری کی دو اور خصوصیات کی طرف توجہ دلا کر میں اس مضمون کو ختم کیے دیتا ہوں۔

میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ نیّر صاحب زبان کے ماہر ہیں۔ الفاظ، محاوروں اور ضرب الامثال کے انتخاب اور استعمال میں بڑی احتیاط برتتے ہیں۔ لیکن آپ کے فن کی ایک اور خصوصیت ہے۔ اُردو کے دامنِ الفاظ کو مالا مال کرنے کی آپ برابر کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ہندی، انگریزی اور دوسری زبانوں کے الفاظ کو اس طرح اپنا لیتے ہیں کہ وہ خود اپنی زبان، یعنی اُردو کے الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً "باپو کا پیغام" ایک نظم ہے جس میں محبت کی وہی چاشنی ہے، ٹھنڈی ٹھنڈی آگ ہے جس کو باپو نے جلایا تھا۔ اس میں ہندی الفاظ کو ایسی خوبی سے اپنایا ہے کہ پڑھتے ہوئے محسوس نہیں ہوتا کہ یہ دوسری زبان کے الفاظ ہیں۔ مثلاً :-

ہیں رنگ برنگے پھول اس کے، ہر ہر بے کو سکھ دیتے ہیں
اس دیس کے رہنے والوں کے من کی، چنتا ہر لیتے ہیں

یا ایک اور نظم کے یہ اشعار ہیں :-

کُٹیا سے آ رہے تھے ایشور سے لَو لگائے
بھگتی کے پاک جذبے تھے قلب میں سمائے
قاتل کے واسطے بھی "پَرنام" منہ سے نکلا
گرتے ہوئے بھی ان کے "ہے رام" منہ سے نکلا

ان اشعار میں ہندی کے الفاظ کو کس خوبی سے "اُردوایا" گیا ہے، اندازہ لگائیے!

اسی طرح اس شعر میں :-

شرارت کی پُتلی تھی باجی کی مُنّی
وہ اتنی سی ننھی تھی باجی کی مُنّی

"ننھی" پڑھ کر سوچنا پڑتا ہے کہ یہ لفظ "ننھا کا" اِسمِ تصغیر" ہے کہ "صیغہ تانیث" ؟

دوسری خصوصیت ایسے الفاظ کی تکرار ہے جن سے کلام میں موسیقی پیدا ہوتی ہے، جن کو دُہرا کر آپ نہ صرف خوش ہوتے ہیں بلکہ ان آوازوں کی مدد سے آپ کے ذہن کے پردے پر وہ سارا منظر، سارا نقشہ کھنچ جاتا ہے جس سے آپ ایک قاری کی طرح نہیں، بلکہ ایک تماشائی کی طرح حظ اُٹھاتے ہیں۔ مثلاً "رانی کی مرغی" کے دوسرے بند کے الفاظ ہیں۔

روز پری بن جاتی تھی وہ
اپنا ناچ دکھاتی تھی وہ
چھمی چھم چھمی چھم چھمک چھمیا
دھمی دھم دھمی دھم دھمک دھمیا

اس طرح ناچ کا پورا منظر نگاہوں کے سامنے ناچ اٹھتا ہے۔

بادل گرجے گڑ گڑ گڑ گڑ
بوندیں آئیں تڑ تڑ تڑ تڑ
بجلی چمکی چم چم چم چم
بارش برسی چھم چھم چھم چھم

اور :-

گلیوں میں بھی ہو گئی کیچڑ
لوگ گریں گے دھڑ دھڑ دھڑ دھڑ

"برکھا رُت" کے ان اشعار کو پڑھ کر کیا آپ کی نظروں کے سامنے بارش برسنے اور برس کر تھمنے کا پورا نظارا نہیں آجاتا ؟

اسی طرح شاعرانہ جدت کی بھی مثالیں دی جا سکتی ہیں، جیسے "باپو نے اپنے دل پر پسٹل کا تیر کھایا"۔ "پسٹل کا تیر کھانا" یوں تو کھٹکتا ہے، لیکن ہے جدت!

"بلی کی شادی" ایک ایسی نظم ہے جس میں تصور جاگ اٹھتا ہے، بلی کی شادی ہو رہی ہے، بینڈ ڈھول بجا رہے ہیں اور "چوہے" گا گا کر رہے تھے:

ڈھم ڈھم ڈھم بجتی تھی ڈھولک

ڈم ڈم ڈھم ڈھم ڈھمک ڈھمک

اور ڈھم ڈھم گولے چھٹتے تھے

پھول ہوا میں گھٹتے تھے

کیا دھوم دھڑکا تھا

کیا دھکم دھکا تھا

اور دولھا ہاتھی پر چڑھ کر

آیا دلھن کے گھر پر

تصور کے پردے پر ایک ایک تصویر زندہ ہو کر ناچنے لگتی ہے۔

نیر صاحب نے اپنی شاعری میں ہر طرح کے تجربے کیے ہیں، خواہ یہ بچوں کی شاعری ہی کیوں نہ ہو، اس کا انداز کتنا بار بار بدل رہا ہے، جدید رہا ہے، جدت آمیز رہا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ تبدیلی اور جدت ترقی کی نشانی ہیں — مادی ہی نہیں ذہنی اور وجدانی ترقی کی بھی۔ خود فرماتے ہیں:-

نئی بات ہے مجھ کو نیر گوارا

ہر انداز اپنا نیا چاہتا ہوں

اس نئے اور پختہ انداز سے نیر صاحب نے بچوں کے ادب میں نہ صرف اپنی نظموں اور گیتوں کے ذریعے بلکہ اپنی نثری کہانیوں کے ذریعے بھی ایسا نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے کہ جہاں بچوں کی تفریح کی تفریح میں صالح تربیت ہو جاتی ہے وہیں، بچوں کے لیے لکھنے والوں کے لیے بھی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

اپنے رنگ کے بے تاج بادشاہ

بچوں کے بیان کی استعداد کے مطابق آسان، عام فہم، دلچسپ، سبق آموز اور اثر انگیز نظمیں کہنا کار دارد ہے۔ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی اور جناب محمد شفیع الدین نیر ایم اے کے درمیان یا ان سے پہلے اردو میں بلکہ یہاں تک عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ نیر صاحب کے معاصرین میں بھی کوئی ایسا جوہر قابل نظر نہیں آتا، جسے بچوں کے شاعر کی حیثیت سے آپ کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے۔

بہت ممکن ہے کہ چند دیگر حضرات نے بھی اس موضوع پر طبع آزمائی فرمائی ہو۔ لیکن اپنی شاعری میں ہنوز وہ "مولوی مدن" کی بات پیدا نہ کر سکے۔ مجھے یہ کہنے میں مطلق باک نہیں کہ نیر صاحب اپنے رنگ سخن کے بے تاج بادشاہ ہیں اور جہاں تک بچوں کی نفسیات کو سمجھ کر شعر کہنے کا تعلق ہے۔ نہ کوئی ان کا حریف نہ مد مقابل۔

نیر صاحب سے غالباً ۱۹۴۰ء سے علیک سلیک ہے۔ میں نے آپ کو ہمیشہ متین، محتاط، ذمے دار، کم گو اور سنجیدہ پایا۔ یہ خاموشی سے ٹھوس اور قابل قدر ادبی خدمات سر انجام دینے کے قائل ہیں۔ پروپیگنڈا اور شہرت کی ہوس آپ کے مزاج کے منافی ہے۔

حالیہ قحط الرجال میں آپ اور آپ جیسے دوسرے مخلص کارکنوں کا دم لبا غنیمت ہے۔ کاش کہ ہمیں بھی یہ توفیق ہو کہ ہم اپنے محسنوں کو پہچانیں اور ان کی صحیح قدر اور مناسب حوصلہ افزائی کر سکیں۔

مخلص

طالب دہلوی (۲۷ر نومبر ۱۹۶۸ء)

سید اصغر علی عابدی

بچوں کی دنیا کے نیر اعظم

بچوں کے ادیب اور شاعر جناب شفیع الدین نیر گذشتہ نصف صدی سے اُردو دنیا کے بچوں کے لیے جس طرح کام کر رہے ہیں اُسے دیکھتے ہوئے اُسے ایک مستقل مکتبِ فکر اور تحریک کا ادب کہا جا سکتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ بہت ہے اور اسے خوب پیٹ بھر کے پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک خاص نقطۂ نظر کارفرما ہے۔ یہ محض آسان نہیں ہے۔ بلکہ آسانی کا ایک اصول سامنے رکھ کر آسان بنایا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کو ہضم کرنے میں کوئی زحمت نہیں ہوتی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ خود بہت سی دوسری چیزوں کو ہضم کرنے کے لیے اوپر سے پلایا جانے والا شربت ہے جو میٹھا اور لذیذ بھی ہے اور مفید بھی، جیسے گرائپ واٹر — مگر جناب نیر کا ادب صرف اسی مقام پر نہیں رُک جاتا بلکہ وہ بچوں کی ذہنی ساخت کے ساتھ ساتھ خود بھی آگے بڑھتا ہے۔ اس طرح ایک بچہ انھیں کے ادب سے سنِ بلوغ اور سنِ شعور تک پہنچ جاتا ہے۔ اور پھر بھی بعض دفعہ اُسے جناب نیر کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے بچّہ کی اُس ذہنی بنیاد کو جو خدا نے بنائی ہے، نظر انداز نہیں کیا ہے۔ جس کے ساتھ اُس کا نسل در نسل کا رشتہ چلا آتا ہے اور جو اُس کے خون میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ پھر انھوں نے اس ماحول اور تمدّن کی بھی اعانت کی ہے جو اس کے اطراف پایا جاتا ہے۔ اس طرح نہ تو وہ اس کو اجنبی رکھتے ہیں اور نہ آس پاس کی دنیا کو اس کے لیے اجنبی رہنے دیتے ہیں۔

جناب نیر ایک طرف بچوں کی فطرت سے قریب ہیں اور اُن کا ادب ہر انسانی بچّہ کا ادب بن سکتا ہے چاہے وہ کسی ذہنی سطح اور معیار کا ہو تو دوسری طرف وہ ایک انسانی ادیب اور شاعر ہیں۔ یعنی ہر ملّت و قوم اُن کے ادب سے فیض یاب ہو سکتی ہے۔ تیری طرف وہ خود اپنی ملت و تہذیب کے ترجمان ہیں وہ خود آشنا اور خود شناس ہیں۔ اور شاید یہی ہو وہ سب سے بڑا وصف ہے جس کے سبب وہ دوسروں کو بھی آسانی سے پہچان جاتے ہیں۔ وہ انسانیت کی ہستی میں کھو کر

گئے ہیں۔ وہ اپنی جگہ پر ہیں، سب کو دیکھ رہے ہیں، سب کے
وجود کا اقرار کر رہے ہیں۔ اور اپنے وجود کا احساس بھی
دلا رہے ہیں۔ ایمان دارانہ حقیقت پسندی دراصل
یہی ہے

جناب نیر کی بعض کتابوں کے ٹائیٹل دیکھیے:-
گھی شکر، منی کے گیت، بچوں کا کھلونا، منی کا تحفہ،
باپ کی ناؤ، پیسے کا صابن، میاں مٹھو، بونے کا بٹوارہ،
بادلا، انگوٹھی، گھر کا آئینہ، چلبل منن، بدھو کی ہوکی،
کھلیاں وغیرہ یہ اپنی ترکیب سے ہی آسان اور اس کے
ساتھ فطرت کے ترجمان ہیں یعنی یہ تہذیب اور ماحول
کے بھی ترجمان ہیں۔ اسلامی نظمیں، ہماری نعت،
اور غالب کی کہانی میں انھوں نے براہ راست اُس
تہذیبی فکر اور معاشرت کی ترجمانی کی ہے جس کے ساتھ
خود ان کی ذات وابستہ ہے۔ انھوں نے جس وقت
بھی اسلام کا نام لیا ہے تو اُسے محض ایک لفظ کے
طور پر استعمال نہیں کیا ہے بلکہ اُس کے مفہوم اور
مدعا کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ غور سے دیکھا جائے
تو اُن کا پورا ادب اسی طرح ہے وہ الفاظ کی ظاہری
شکل سے زیادہ اُس کی روح اور معنی کو پیش نظر رکھتے
ہیں۔ اس اعتبار سے ان کا پورا ادب اسلام یا اسلامی تہذیب
یا فطرتِ صالحہ کا ترجمان ہے اگرچہ اس پر عنوان
دوسرا ہے۔

جناب نیر نے اپنی کتاب "غالب کی کہانی"
میں بڑی خوبی سے غالب کی زندگی کے ایک ایک گوشہ
کی اور اُن کے ادب کی عکاسی کی ہے، جو بچوں کے
ساتھ ساتھ بڑوں کے مطالعے کی چیز بھی ہے۔ انھوں نے
غالب کے ساتھ وہ انصاف کیا ہے جو اکثر ادبِ غالب
کے مشہور نقاد نہ کر سکے۔

"غالب کی کہانی" میں غالب کی شخصیت کا تعارف
کراتے ہوئے خود جناب نیر کی شخصیت ہی جھلک گئی ہے
لکھتے ہیں:-

؎ پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا (غالب)

اپنے مرتبے کے بارے میں اپنے آپ بتانا مشکل
ہو جاتا ہے۔ مگر اُن کے لیے جو بات مشکل تھی میرے
لیے وہ آسان ہے۔

ایک اور جگہ غالب کے بارے میں خود غالب
کی عبارت نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-
"مجھے علم و فضل سے کام نہ تھا۔ اپنی بدنامی
اور رسوائی کی فکر نہ تھی۔ اوباشوں کی صحبت تھی اور
آوارہ گردوں کی ہم رنگی۔ بری راہوں پر چلتا تھا۔
اور بیہودہ باتوں اور فضول کھیلوں میں اپنا وقت
گنواتا تھا۔" مگر ؎

اُس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
صبح جو جائے اور آئے شام

وہ بھلائی کی طرف مائل ہوئے۔ اپنے آپ کتابیں
پڑھ پڑھ کر لیاقت بڑھائی۔ ایک نومسلم پارسی
عبدالصمد کی صحبت سے بھی کافی فائدہ اٹھایا۔ آہستہ
آہستہ ایسے ہو گئے جیسے کہ آج کل مشہور ہیں۔

اس طرح جناب نیر نے اپنی رائے ٹھونسنے کی
کوشش نہیں کی، بلکہ لوگوں کی رائے کو درست
قرار دیتے ہوئے اُسے واقعی درست ہی کر دیا۔ یہ
خود اُن کی شخصیت اور کردار کا انداز ہے، جو اُن کی صحبت
سے فیض یاب ہونے والا ہر شخص جانتا ہے اور ہر بڑے اہلِ قلم

کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔

یہ مضمون تشنہ رہ جائے گا۔ اگر اس موقع پر جناب نیرؔ کے چند اقتباسات پیش نہ کیے جائیں "ہماری زندگی" جو منظومات پر مشتمل ہے میں بچے سے آس پاس کی زندگی کا تعارف کراتے ہوئے اپنے معاشرے کی مختلف شخصیتوں کا ذکر انھوں نے بڑے ہی دلچسپ اور مفید انداز میں کیا ہے۔ مثلاً ڈاکیا (پوسٹ مین) کا تعارف اس طرح کراتے ہیں۔

خاکی وردی جسم پہ ڈانٹے — لال سا فیتہ اُس پر ٹانکے
دُور سے چل کر آتا ہے یہ — خط بیٹر پہنچاتا ہے یہ
گھر گھر جانا، در در جانا — خط لے جاؤ "خط" چلّانا
بیٹھے ہیں سب آس لگائے
شاید کوئی خط آجائے

اور پھر ـــ

گرمی ہو یا سردی آئے — یا بادل بارش برسائے
پھر بھی ڈیوٹی پر آتا ہے — اپنا کام کیے جاتا ہے
ہوتے ہیں یوں شام سویرے — شہر میں اس کے دو دو پھیرے
نیرؔ ڈاک کا یہ ہرکارا
لگتا ہے سب ہی کو پیارا

"لکشمی چند سنار" کا تعارف ـــ

لکشمی چند ہوں سنار ہوں میں — دستکاری میں ہوشیار ہوں میں
گہنے گھڑتا ہنر دکھاتا ہوں — کام کرتا ہوں نام پاتا ہوں
بالی، پتّے، بُلاق، نتھ، بُندے — بجلیاں، جھومر، انٹیاں، جھمکے
یہ اور ایسے ہی بیسیوں زیور — دیتا رہتا ہوں روز گھڑ گھڑ کر
موٹا باریک ہر طرح کا کام — کر کے پاتا ہوں دام اور اکرام
میرا زیور سبھی کو بھاتا ہے — کیوں نہ ہو حُسن کو بڑھاتا ہے
آرٹ یہ بے مثال رکھتا ہوں — دل میں خوش اس کمال رکھتا ہوں

"جو کرنا ہے ابھی کر لو" میں موجودہ وقت کا تعارف اس طرح کراتے ہیں ـــ

جو کرنا ہے کر لو، اسی وقت ابھی
یہی زندگی ہے، یہی زندگی
گزشتہ زمانہ تو جا ہی چکا
جو آئے گا اب اعتبار اس کا کیا
جو موجودہ ہے بس وہ ہے کام کا
کہیں تم اسے بھی نہ دینا گنوا
جو کرنا ہے کر لو اسی وقت ابھی
یہی زندگی ہے، یہی زندگی
یہ مانا کہ محنت اکارت گئی
یہ مانا کہ ناکام کوشش رہی
یہ سچ ہے کہ تم نے ترقی نہ کی
مگر جو ہے کیا ہو گیا پھر سہی
جو کرنا ہے کر لو اسی وقت ابھی

اس نظم کی جو دُھن (RHYTHM) ہے وہ عمل پر اُکسا رہی ہے۔ اور خود نظم بھی مکمل طور پر بامعنی ہے۔ گزشتہ زمانہ سے مراد ایک بچّہ کا ماضی ہے جو کسی امتحان میں فیل ہو گیا ہے۔ اس سے مراد قوموں اور ملّتوں کا ماضی نہیں ہے۔ جس کے ساتھ انسانیت کا اٹوٹ رشتہ ہے اور اسی پر مستقبل کا مدار ہے۔

اپنے مجموعہ اسلامی نظمیں میں "مسلمان بچوں کا گیت" میں مسلم بچّے کا تعارف اس طرح کراتے ہیں

ہم مسلم بچّے، مسلم بچّے، مسلم بچّے ہیں
ہم بات کے سچّے، بات کے سچّے، بات کے سچّے ہیں
ہم خطروں کو خاطر میں کبھی لاتے ہی نہیں لاتے ہی نہیں
ہم حرص و ہوا کے پھندے میں آتے ہی نہیں آتے ہی نہیں

ہم دل پہ میل نہیں لاتے خوش رہتے ہیں خوش رہتے ہیں
ہم ہنس ہنس کر دُکھ سہتے ہیں ہم ہنس ہنس کر دُکھ سہتے ہیں
ہم کوہ سے بھی ٹکراتے ہیں ہم شیر سے بھی لڑ جاتے ہیں
وہ پوری ہو کر رہتی ہے، جس بات پہ ہم اَڑ جاتے ہیں
دکھ درد میں سب کے کام آنا خدمت کرنا خدمت کرنا
ہے کام ہمارا سب کی خاطر خوش ہو ہو کر دکھ بھرنا
سختی سے نہیں گھبراتے ہم محنت سے نہیں کتراتے ہم
دولت پہ نہیں اتراتے ہم، ہیں کام میں راحت پاتے ہم
ہم مسلم ہیں ہم مسلم ہیں اسلام کے ہم شیدائی ہیں
کچھ فرق نہیں تیرہ میں آپس میں بھائی بھائی ہیں

"غازی" کا تعارف اس طرح کراتے ہیں: —

خوش ہے کسی پہ آپ یہ چڑھ کر نہیں گیا
حملہ ہوئے بغیر یہ بڑھ کر نہیں گیا۔
دنیا کو اپنی تیغ کے جوہر دکھا دیے
اعدائے دین و امن کے چھکے چھڑا دیے
لیکن کسی کا جنگ میں پیچھا نہیں کیا
مانی شکست جس نے اسے دکھ نہیں دیا
کچھ اس طرح سے جنگ کا نقشہ جما دیا
کم عمر اور ضعیف کو زد سے بچا دیا
عورت پہ اُس نے ہاتھ اُٹھایا نہیں کبھی
بچوں کو بھول کر بھی ڈرایا نہیں کبھی
آبادیوں کو اُس نے مٹایا نہیں ذرا
پُر امن شہریوں کو ستایا نہیں ذرا
ظلم و ستم مٹانے کو تلوار اٹھائی تھی
دنیا کے امن کے لیے تیغ آزمائی تھی
تھی آرزو کہ دین کا جھنڈا بلند ہو
دنیا میں صدق و عدل سدا ارجمند ہو

نے مال کے لیے تھی نہ تھی جاہ کے لیے
جنگ اُس کی جنگ تھی فقط اللہ کے لیے

"ہماری نعت" میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کا تعارف بعنوان "نعت" اس طرح کراتے ہیں۔

طریقے یہ جینے کے کس نے سکھائے
یہ گُر آدمیت کے کس نے بتائے
محبت کی یہ ریت کس نے سکھائی
بنے سارے انسان آپس میں بھائی
نئی زندگی کس سے دنیا نے پائی
بدل سی گئی کیسی ساری خدائی
نہ باقی رہا فرق کچھ ان میں اصلا
برابر ہوئے سب غلام اور آقا
یہ دَب دَب کے کس نے ابھرنا سکھایا
رہ حق میں خوش ہو کہ مرنا سکھایا
کسی سے جہاں میں نہ ڈرنا سکھایا
مدد آپ خود آپ کرنا سکھایا
سکھایا بلاؤں سے جا جا کے اَڑنا
سکھایا مصائب کی موجوں سے لڑنا
بنایا ہمیں خیر اقوام کس نے
دکھائی ہمیں راہ اسلام کس نے
سنایا ہمیں حق کا پیغام کس نے
دیے ہم کو توحید کے جام کس نے
وہ اشرف، وہ افضل وہ اکرم وہ امجد
محمدؐ، محمدؐ، محمدؐ، محمدؐ

اپنی اسی کتاب میں سورۃ فاتحہ کا ترجمہ بعنوان "حمد"

(باقی صفحہ ۱۲۱ پر)

کوثراعظمی

شاعر ہمارا

وہ نیّر ادیب اور شاعر ہمارا
درخشندہ چرخِ ادب کا ستارہ

وہ بچّوں کی دنیا کا فن کار یکتا
زباں جس کی میٹھی، بیاں جس کا پیارا

قلم میں وہ جس کے رَوانی بلا کی
سلامت سخن کی سُبک سیر دھارا

جو کاغذ پہ لفظوں کے موتی بکھیرے
تو ذہنوں میں معنی کا گلشن سنوارا

لکھیں ایک سے ایک نظمیں اچھوتی
مضامین دل کش، فسانے دلآرا

اُمنگوں سے بھرپور لکھّے ترانے
بنا کر، شکستہ دلوں کا سہارا

زمانے کو "پیغامِ تعلیم" دے کر
ترقّی کا ہر دل میں جذبہ اُبھارا

بتایا کہ ہے علم انمول دولت
سکھایا کہ ہے جہل یکسر خسارا

سمجھایا کہ اے نوجہاں پاؤ حکمت
کہ ہے گمشدہ مالِ حکمت تمھارا

کیا سب کو گرویدہ دانش کا ایسا
کہ تھا جس میں جو بھی وہ جوہر نکھارا

لیا باتوں باتوں میں من موہ سب کا
چلن رفتہ رفتہ سبھی کا سُدھارا

غرض جو دیا ہے سبق اُس نے کوثرؔ
نہ بھولیں کبھی آپ بھی وہ خدا را

مشرف عالم ذوقی

نیّر صاحب اور اُن کی نظمیں

نیّر صاحب کو بچّوں کے ادب میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ نیّر صاحب ایک اچھے شاعر ہی نہیں، بلکہ ایک اچھے ادیب بھی ہیں۔ بچّوں کے لیے انھوں نے بہت سی چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کی پیاری پیاری نظمیں اور کہانیاں [illegible] بھی شائع ہو چکے ہیں۔ نیّر صاحب بچوں کی پسند سے واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بچّے اُن کی نظموں اور کہانیوں کو چٹخارے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ اسمٰعیل میرٹھی کے مرنے کے بعد بڑوں نے سوچا کہ بچوں کا ادب اب ختم ہو گیا۔ مگر جب لوگوں کی نظر نیّر صاحب کی طرف گئی تو ان کی بات غلط ثابت ہوئی۔ نیّر صاحب نے ایک بار پھر سے بچّوں کے ادب میں ترقی لانے کی کوشش کی اور کامیاب ہوئے۔ آپ نے دنیا کی ہر چیز پر نظمیں کہی ہیں۔ یہاں تک کہ استاد کے ساتھ حلوائی بزاز کمہار کو بھی نہیں چھوڑا ہے۔

آؤ بچو! ہم تمھیں نیّر صاحب کے کمہار سے ملاتے ہیں۔

کس قدر خوش ہے کس قدر ہے مگن
کام سے اپنے کس قدر ہے لگن

ظرف مٹی کے یہ بناتا ہے
اُس میں اپنا ہُنر دکھاتا ہے

دیکھا بچو! کتنی پیاری زبان ہے اپنے نیّر صاحب کی۔ جب کمہار کا ذکر آیا تو چاک کا ذکر بھی ضروری ہے۔

چاک رکھا ہوا ہے کیلی پر
خوب کھاتا ہے اس پہ یہ چکّر
لوندا مٹّی کا وہ اُٹھاتا ہے
چاک کے بیچ میں جماتا ہے
پھر یہ لکڑی وہ چاک پر رکھ کر
دیتا رہتا ہے چاک کو چکّر
ہاتھ لوندے میں پھر لگاتا ہے
برتن اس طرح ڈھلتا جاتا ہے

دیکھا بچو تم نے نیّر صاحب کا کمال۔ کمہار کی بات آئی تو چاک کو لے کر مٹّی کے برتن بنانے تک کی ساری بات تم کو سمجھا دی۔

بزاز کی تصویر بھی نیّر صاحب نے خوب ہی کھینچی ہے:

ہیں گدّی پر میاں بزاز بیٹھے
وہ کپڑا ناپ کر گاہک کو دیتے
قریب ان کے کئی گز بھی پڑے ہیں
یہ گز لوہے کے پیتل کے بنے ہیں

ہے کپڑا کاٹنے کی ایک قینچی
بہت اچھی بنی ہے دھار اُس کی

اب ذرا نیرؔ صاحب کے استاد سے مل لیں، تو پھر میں تمھیں ایک غور کرنے والی بات بتاؤں گا:

انھیں دیکھیے یہ ہیں استاد صاحب
یہ بچوں کو ہیں ٹھیک رستہ دکھاتے
ریاضی ہو، تاریخ ہو، یا ادب ہو
پڑھانے میں ہیں نقش دل پر جماتے
بھلائی کا یہ بیج بوتے ہیں دل میں
برائی سے دامن ہیں ان کا بچاتے

پیارے بچو! میں نے تمھیں یہاں تین فن کاروں سے ملایا — کمہار، بزاز اور استاد۔ تم نے ایک بات غور کی؟ ضرور غور کی ہوگی۔ جب کمہار کا ذکر آیا تو انھوں نے چاک کا ذکر چھیڑ دیا۔ اسی طرح جب بزاز کی بات چلی تو کپڑا کاٹنے کے لیے قینچی اور ناپنے کے لیے گز کا ذکر چھیڑ دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ گز پیتل اور لوہے کے بنے ہوتے ہیں۔ جب استاد صاحب کی بات آئی تو انھوں نے صاف طور پر یہ بات بتا دی کہ استاد لڑکوں کے دل میں بھلائی کا بیج بوتے ہیں اور برائی سے اُن کے دامن کو بچاتے ہیں۔ ایک ادیب اور ایک اچھے شاعر کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ جس چیز کو بیان کرنا چاہے اُسے اس طرح بیان کرے کہ پڑھنے والا پوری بات اچھی طرح سمجھ جائے۔ نیرؔ صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی کی طرح نیرؔ صاحب نے بھی بچوں کے لیے نصیحت آمیز نظمیں بہت لکھی ہیں۔ اُن کی ایک نظم ہے — منہ سے کہنا اور ہے اور کرنا ہے:

ایک دن کا ذکر ہے سنیے ذرا
مل کے کچھ چوہوں نے ایک جلسہ کیا
اپنے جلسے کی بڑھائی قدر بھی
ایک چوہے کو بنایا صدر بھی
مدعا یہ تھا کہ بلی سے بچیں
اُس کے حملوں سے سلامت رہ سکیں
گھنٹی اک اس کے گلے میں ڈال لیں
یوں بلا بلی کی سر سے ٹال لیں
اس نے اس تجویز کی تائید کی
ہو گئی چوہوں کے گھر میں عید سی
ایک چوہا ان میں کچھ ایسا بھی تھا
اُس نے کھائی تھی زمانے کی ہوا
پہلے تو تجویز اُن سب کی سنی
اُس نے آہستہ سے پھر تقریر کی
بات اتنی سی مجھے دیجیے بتا
کون گھنٹی باندھنے کو جائے گا
سُن کے یہ باتیں ہوئے خاموش سب
ہو گیا کافور اُن کا جوش سب
منہ سے کہنا اور ہے کرنا ہے اور
کیجیے اس بات پہ نیرؔ سی غور

دیکھا بچو! اس منظوم کہانی کے ذریعے نیرؔ صاحب نے تمھیں ایک پیار بھری نصیحت دے دی۔ مجھے فارسی کی ایک رباعی یاد آ گئی —

چیزے کہ نہ پرسند تو خود پیش مگوئی
گوئی دگر مصلحت خویش مگوئی

گوشش تو دہ دا دند و زبان تو یکے
یعنی کہ دو بشنو و یکے پیش مگو ی

یعنی کم بول اور سوائے اپنی مصلحت کے کچھ نہ بول۔ جو بات تجھ سے لوگ نہ پوچھیں، تو خود پہلے ہی سے نہ بول اُٹھ۔ تجھے دو کان اور ایک زبان دی گئی ہے۔ یعنی دو بات سُن تو ایک بات بول۔

بظاہر یہ ایک نصیحت ہے۔ مگر ایسی نصیحت ہے کہ جسے اپنی زندگی میں کام میں لانے کی کوشش کی جائے تاکہ تمھیں دوسروں کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

پیارے بچو! تمھیں ایک اچھا شہری بننا چاہیے۔ اچھا شہری بننے کے گُر تم نیّر صاحب کی اس نظم سے سیکھ لو:

یہ شہری آپس میں مِل جُل کر اپنا کام چلاتے ہیں
قانون کی پابندی کرنا یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں
یہ امن و اماں کی دولت کو، جنتا کا قرض سمجھتے ہیں
دُکھ درد کے ساتھی بنتے ہیں اور سب کی مدد سب کرتے ہیں
یہ ڈاکو، چور، اُچکے، رہزن سارے اُن سے ڈرتے ہیں
ہے اچھا شہری صرف وہی جو اچھا پیشہ کرتا ہے
ہے خوفِ خدا دل میں جس کے، اللہ سے اپنے ڈرتا ہے

کتنی پیاری زبان ہے، کتنی سلیس اور کتنی سہل ہے۔ ایک امریکی مصنف کا قول ہے ـــ "شعر میں مشکل الفاظ کا استعمال آسان ہے۔ جبکہ آسان الفاظ کا استعمال کرنا مشکل۔"

واقعی آج ہر شاعر بچوں کے لیے نظمیں تو کہہ لیتا ہے، مگر دیکھا جائے تو وہ نظم بچوں کے لائق نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کی نظم میں بہت سے الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو مشکل ہوتے ہیں اور بچوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔

نیّر صاحب کی سب سے بڑی اور اہم خوبی یہی ہے کہ وہ اپنی کہانیوں اور نظموں میں آسان الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ بچوں میں بہت مشہور ہیں۔ نیّر صاحب بچوں کے رہنما بھی ہیں۔ اپنی کہانیوں، نظموں وغیرہ کے ذریعے آپنے ایسی نصیحتیں کی ہیں جو بچوں اور بڑوں دونوں کے لیے ترقی کا باعث ہوں گی۔ بچوں کے لیے آپ نے ایک ترانہ بھی لکھا ہے۔ بڑا ہی پیارا ترانہ ہے۔ یہ پیام تعلیم میں پہلے بھی چھپ (شائع) چکا ہے۔ پھر بھی تم سُن لو۔

ہم نونہال پڑھ کر دنیا میں کیا کریں گے
خلقِ خدا کی خدمت دل سے کیا کریں گے
ہم راستی کی رہ پر بڑھتے ہی جائیں گے سب
دنیا کو نیکیوں سے ہم آشنا کریں گے
جو بات بھی کہیں گے پورا اُسے کریں گے
وعدہ جو کر لیا ہے اُس کو وفا کریں گے
ماں باپ کی اطاعت ہوگی ہماری عادت
استاد کی نصیحت دل سے سنا کریں گے
پائیں گے درد دُکھ میں ہم مبتلا کسی کو
اُس درد اور دُکھ کی اُس کے دوا کریں گے
باطل کے راستوں سے ہم دور ہی رہیں گے
جو حق کی راہ ہوگی اُس پر چلا کریں گے۔

(باقی صفحہ [illegible] پر)

شوکت پردیسی

محترم بزرگ جناب محمد شفیع الدین نیر صاحب پر کچھ لکھنے سے پہلے میں بچوں کے ہردلعزیز ماہنامہ "پیام تعلیم" نئی دہلی کے مدیر جناب ولی شاہجہاں پوری کو مبارک باد دینا ضروری سمجھتا ہوں، جنھوں نے عام روش سے ہٹ کر "پیام تعلیم" کا "محمد شفیع الدین نیر" نمبر نکالنے کا اعلان کر دیا۔ کسی عظیم شخصیت کی خدمات کا اس کی زندگی ہی میں اعتراف کرنا یقیناً ایک جرأت مندانہ اقدام ہے۔ اور اس نئے قدم کے لیے مدیر "پیام تعلیم" کو جس قدر بھی سراہا جائے کم ہے۔

اگر میں مرزا غالب مرحوم کا یہ شعر ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

بچوں کے غالب حضرت محمد شفیع الدین نیر ایم اے کے لیے استعمال کروں تو بیجا نہ ہوگا اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے بعد ملک کے دوسرے اہل قلم حضرات نے بھی بہت کچھ لکھا اور کہا ہے۔ اس میں علامہ اقبال، سلام مچھلی شہری۔ رئیس امروہوی، شمیم کرہانی، احمد ندیم قاسمی، حامد اللہ افسر، واقف مراد آبادی، تلوک چند محروم، جرم محمد آبادی، مولانا محوی صدیقی لکھنوی۔ مولانا علیم منظفر نگری، محمد حسین حسان ندوی، مختار بارہ بنکوی، نرلسخس کمار شاد، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، نثار عباسی، راجہ مہدی علی خاں، حافظ باقوی، اثر صہبائی، عبدالغفار مدھولی، عشرت رحمانی، سیفی سیوہاروی، ڈاکٹر امانت، کیف احمد صدیقی اور بھی بہت سے دوسرے اہل قلم حضرات نے بچوں کے ادب کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں وہ صرف ناقابل فراموش ہیں بلکہ بچوں کے ادب کا قیمتی سرمایہ بھی ہیں۔ ان حضرات میں علامہ اقبال کو اس لیے منفرد مقام حاصل ہے کہ انھوں نے

بڑوں کے ادب کے لیے بھی جو ذخیرہ چھوڑا ہے اس کی ہمہ گیریت سے ادبی دنیا کو انکار نہیں ہو سکتا۔

بظاہر بچوں کے موضوع پر کچھ لکھنا آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ بچوں کے ادب کا لب و لہجہ بڑوں کے ادب سے بالکل مختلف ہے۔ بچوں کے لیے کچھ لکھتے وقت بہت سی باتوں کا پورا پورا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً عام فہم الفاظ، ہلکی پھلکی بندش رواں بحر، صاف اور سیدھا خیال، کچھ اصطلاحی پہلو وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسی نازیبا بندشیں ہیں جہاں پہنچ کر اچھے سے اچھا لکھنے والا بھی دائرہ سے باہر ہو جاتا ہے۔ یا تو وہ بچوں کے ناپختہ ذہن سے بہت آگے بڑھ جاتا ہے یا خود اپنے معیار سے نیچے اتر آتا ہے۔ ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے شیشہ و ساغر کہے بغیر

کے بجائے یہ کہنا ؎

اٹھو بیٹا! آنکھیں کھولو
بستر چھوڑو، لو منھ دھولو

ایک عمر رسیدہ فنکار کے لیے یقیناً بہت بڑی دردسری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت ہی کم ادیب و شاعر ان اصولوں پر قائم رہ سکے جو بچوں کے ادب کے لیے ضروری خیال کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں محترم محمد شفیع الدین نیر صاحب کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ اور انہیں اپنی انفرادیت کے اعتبار سے بچوں کا غالب کہنا کسی طرح بھی غلط نہ ہوگا۔ جس طرح غالب کو بڑوں کے ادب میں ایک خاص بلندی حاصل ہے اسی طرح نیر صاحب کو بھی بچوں کے ادب میں منفرد اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ نیر صاحب کے سوچنے اور لکھنے کا انداز سب سے جدا ہے۔ نیر صاحب کو بچوں کی زبان و ادب میں خداداد ملکہ حاصل ہے۔ وہ نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں وہ ذاتی طور پر بھی بچوں سے گفتگو کرنے میں اتنی کشش رکھتے ہیں کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔

نیر صاحب ایک عظیم شخصیت کے مالک ہیں۔ وضع داری ان کا وہ وصف ہے جو آج کے دور کے لوگوں سے مفقود ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے نیر صاحب کے بارے میں کتنا صحیح لکھا ہے۔

"نیر صاحب میں بچوں کے ذہن کو سمجھنے اور محبت کرنے کی وہ صفت ہے، جو پیدائشی معلم کا جوہر ہوتی ہے۔ نیز ذوق ادب اور ذوق جمال کی سمت بچوں کی رہنمائی کے لیے جس صلاحیت کی ضرورت ہے وہ ان میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ بچوں کے لیے جو نظمیں انھوں نے لکھی ہیں وہ ایک پیش رو کی حیثیت سے ان کا نہایت قیمتی کارنامہ ہے۔ انھوں نے وہ میدان سر کیا ہے جسے سر کرنے کی بہت ہی کم اصحاب نے جرأت کی ہے ان کی نظموں نے تعلیم کے خشک کام کو خوشگوار بنا دیا ہے۔ ان بچوں میں بھی ادبی دلچسپی پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں جو دوسرے مضمونوں کی طرح مادری

زبان کی تحصیل کو غیر دلچسپ سمجھتے تھے۔"
اُردو کی تاریخ میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم
کے کارنامے ہمیشہ سرِ فہرست رہیں گے۔ یہ ذاکر صاحب
کی ہی دور رس نگاہ کا کمال تھا کہ انھوں نے بچّوں
کے لیے "غالب کی کہانی" لکھنے کے سلسلے میں
محمد شفیع الدین نیّر صاحب کو منتخب کیا۔ اور یہ اہم
اور نازک کام بالآخر اپنے تقاضوں سے انھوں نے
نیّر صاحب کو انجام دینے پر مجبور کر دیا۔ وہ خوب
جانتے تھے کہ بڑوں کے غالب کی کہانی بچّوں ہی کے
غالب لکھ سکتے ہیں۔

آجکل سائنس کا دور دورہ ہے۔ زمانہ
مادّی علوم کی جانب متوجہ ہے۔ طلبہ کے لیے نل کی
ساخت کے اصول جاننا زیادہ قابلِ قدر سمجھا
جاتا ہے۔ ایسے دَور میں اس کی بہت سخت ضرورت
ہے کہ آج کے بچّوں کے لیے ایسی نظمیں کہی جائیں
جو جذبات عالیہ و احساسات لطیف کے ساتھ
ساتھ مادّی علوم کی بھی نمائندگی کرتی ہوں بچّوں
کے اندر اعتماد پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔
اور یہاں بھی نیّر صاحب کی فکر سب سے منفرد اور
نمایاں مقام رکھتی ہے۔ بلاشبہ نیّر صاحب بچّوں
کے ایک ایسے کامیاب اور خوش نصیب غالب
ہیں جن کو شہرت عزت اور مقبولیت غالب کی طرح
ان کی وفات کے سَو سال بعد نہیں بلکہ اپنی زندگی
میں ہی حاصل ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی درجوں
سے لے کر بڑے درجوں تک کے لیے نظم و نثر میں
جس قدر قیمتی کتابیں لکھی ہیں، وہ اُردو ادب کا
ایک ایسا سرمایہ ہیں جس سے آنے والی نسلوں
کی خاطر خواہ رہنمائی ہوتی رہے گی۔ ان کی کتاب
"غالب کی کہانی" اُردو کی ایک ایسی تصنیف
ہے جس کی مثال غالب پر لکھی جانے والی ملک
کی کسی بھی زبان میں بچّوں کے معیار پر نہیں ملے
گی۔ یہ کتاب فکر و فن اور علم و تحقیق کا ایک نایاب
تحفہ ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے والے کو ایسا محسوس
ہوتا ہے، جیسے انھوں نے مرزا غالب کو خود اپنی
آنکھوں سے دیکھا ہو۔

نیّر صاحب بیحد خلیق اور منکسر المزاج بزرگ
ہیں۔ وہ اپنے چھوٹوں سے بحیثیت استاد کے
پیش نہیں آتے بلکہ ایک بزرگ، ایک مشفق، ایک
صلاح کار اور ایک دوست کی طرح ملتے اور باتیں
کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے ملنے کے بعد ہر
شخص کے دل و دماغ پر ان کی عظیم شخصیت کا ایسا
نقش قائم ہو جاتا ہے جو کبھی نہ مٹ سکے۔ وہ خطوط
کے جواب بھی بڑی چاہ اور اپنائیت سے دیتے
ہیں۔ وہ ان لوگوں کی طرح جو محض اس وجہ سے
خطوط کے جواب نہیں دیتے کہ لوگ انھیں
عدیم الفرصت اور بڑا آدمی سمجھیں کبھی خاموش نہیں
رہتے۔ محبت، رواداری، شرافت ان کا طرۂ امتیاز
ہے۔ ان سے ملاقات کرنے والے پہلی ہی ملاقات
میں ان کی عظمت، انفرادیت اور شخصیت کے گرویدہ
ہو جاتے ہیں۔ بلاشبہ اُردو کی ترویج و اشاعت
میں نیّر صاحب کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں
وہ بہت بڑی شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی ادبی
لگن اور اُردو سے بے پناہ محبت کا یہ عالم ہے کہ
وہ بچّوں کے نئے رسائل کے لیے اپنا گرانقدر کلام

بغیر کسی پس وپیش کے عنایت کردیتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اُردو پھولے پھلے اور بچوں میں اُردو کا صحیح ذوق پیدا ہو۔ غالباً ۱۹۵۰ء میں میں نے بمبئی سے بچوں کا ایک ماہنامہ "منا" جاری کیا تھا۔ میں نے پہلی بار نیر صاحب کو "منا" پر نگاہِ کرم ڈالنے کی درخواست کی۔ نیر صاحب نے اس کے جواب میں نہ صرف میری بڑی حوصلہ افزائی کی بلکہ "منا، ڈاک سے چل کر آیا" کے عنوان سے اپنی ایک دل کش نظم بھی خاص "منا" کے لیے عنایت فرمائی۔ اس وقت سے آج تک موصوف کی مجھ پر کرم فرمائی جاری ہے۔ میں دل کی دھڑکن کا مستقل مریض ہوں اور اکثر بستر علالت پر رہا کرتا ہوں۔ نیر صاحب کی بے پناہ محبت، وضع داری انسانیت کا یہ عالم ہے کہ وہ جونپور تشریف لاتے ہیں۔ اور بغیر ہی اطلاع کے شہر سے ۱۰ میل دور ایک پسماندہ دیہات (رحمد پان) میں صرف مجھ سے ملاقات کی غرض سے سفر کی غیر معمولی تکلیف اٹھا کر تشریف لاتے ہیں۔ مجھ پر بیماری کا شدید دباؤ رہتا ہے۔ وہ مجھے کچھ بھی کرنے کی اجازت نہیں دیتے خاطر و مدارات کے لیے یہاں شہر کی سی آسانیاں نہیں ہیں۔ لیکن موصوف کے سامنے جو بھی آیا، انھوں نے اس طرح اس کی تعریف کی کہ اہلِ خانہ کو یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اگر موصوف بار بار تشریف لاتے تو اچھا تھا۔ خلوص محبت اور رواداری کا یہ انداز نیر صاحب کی شخصیت کو عظیم سے عظیم تر بنا دیتا ہے۔ موصوف اس کے بعد بھی غریب خانہ پر تشریف لائے اور آس پاس کے کچھ مدارس کو بھی دیکھا۔ وہ جہاں بھی گئے اور جس سے بھی ملے آج تک لوگ انھیں یاد کرتے ہیں۔ ان کے اندر وہ اخلاق، وہ لگاؤ اور وہ اپنائیت ہے کہ جس کی کشش سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ وہ ایک روشن خیال بزرگ، ایک سچے دوست اور مخلص رہنما ہیں۔ ان کا مطالعہ بڑا وسیع ہے ان کی نگاہ دور رس ہے۔ اور ان کی فکر نئی قدروں کے لیے بیحد کار آمد ہے۔

نیر صاحب نے اُردو ادب میں جو تعمیری کام کیا ہے اس کے بارے میں جس قدر بھی لکھا جائے کم اور بہت کم ہوگا۔ وہ اگر ہندستان کی بجائے یورپ میں پیدا ہوئے ہوتے تو انھیں وہ مقام ملتا جو تاریخ میں ہمیشہ نمایاں رہتا۔ لیکن افسوس کہ ہمارے ارباب قلم حضرات نے نیر صاحب کے ٹھوس کارناموں کو اس حد تک نہیں سراہا جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ہر اُردو مدرسہ میں نیر صاحب کی تصانیف اور تالیفات کو لازمی طور پر زیادہ تعداد میں پڑھایا جاتا۔ اہلِ قلم نیر صاحب کی خدمات پر زیادہ سے زیادہ روشنی ڈالتے اور حکومت تعمیری ادب پیش کرنے والے اس عظیم بزرگ کو ایسے انعامات اعزازات اور مستقل وظیفہ سے نوازتی جس سے حکومت کی فراخ دلی اور اردو دوستی کا بول بالا ہوتا لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا اور دوسرے عظیم فنکاروں کی طرح نیر صاحب بھی ایک اچھے، کامیاب مگر ہندستانی فنکار سے آگے نہ بڑھ سکے۔ کچھ بھی ہو نیر صاحب کا ادب غیر فانی ہے۔

(باقی صفحہ ۸۵ پر)

ریاض آفندی

نیّر — بچّوں کے قلم کار

اُردو ادب میں بچّوں کا ادب کھانے میں
نمک کے برابر ہے۔ اسماعیل میرٹھی، حسین حسّان،
ذاکر حسین، اطہر پرویز اور شفیع الدین نیّر بچّوں کے
ادیب کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ یوں
تو اُردو کے دوسرے ادیبوں، شاعروں اور
مُصنفوں نے بھی بچّوں کے لیے لکھا ہے۔ لیکن جب
اسماعیل میرٹھی، اطہر پرویز اور نیّر صاحب کا نام
آتا ہے تو وہ خاص بچّوں کے ادیب، بچّوں کے
شاعر کی حیثیت سے آتا ہے۔

'بچّوں کے لیے لکھنا، جوئے شیر لانے سے کم
نہیں۔ اِس کا احساس مجھے اُس وقت ہوا جب
میں نے اقبال کے ترانے اور چاچا نہرو لکھی۔
بچّوں کے لیے قلم اُٹھاتے وقت بچہ بننا پڑتا ہے،
بچّوں کی طرح سوچنا پڑتا ہے اور بچّوں کی طرح
لکھنا پڑتا ہے۔ آسان آسان لفظ، چھوٹے موٹے
جملے، ہلکی پھلکی ترکیبیں، دلچسپ مگر کارآمد باتیں،
ان باتوں کا خیال رکھتے ہوئے لکھنا پڑتا ہے اور
ساتھ ہی ساتھ اِس بات کو بھی مدّنظر رکھنا پڑتا
ہے۔ کہ جو چیز لکھی جا رہی ہے، پڑھنے والا ذہن
اس کو آسانی سے قبول کر لے، وہ صرف آسان
ہی نہ ہو، بلکہ معلوماتی بھی اور دلچسپ بھی ہو۔

نیّر صاحب ایسا ہی لکھتے ہیں۔ اگر اُن کو
اِس دَور کا اسماعیل میرٹھی کہا جائے تو مبالغہ
نہیں ہوگا۔ نیّر صاحب نے بچّوں کے لیے کہانیاں، نظمیں اور
چٹکلے لکھے ہیں اور لکھتے وقت ہر جگہ انھوں نے بچّوں کے معیار اور
اُن کے ذہن کو مدّنظر رکھتے ہوئے لکھا ہے۔ آپ کی طرزِ نگارش
کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ بچّے کی عمر اور اُس کے معیار کو
ذہن میں رکھ کر لکھتے ہیں۔ آپ نے چھ سال سے دس سال کے
بچّوں کے لیے اتنا آسان اسلوب اپنایا ہے جو مبتدی کے لیے
ہونا چاہیے۔ دس بارہ سال کے بچّوں کا اسلوب
اُس سے ہٹ کر ہے اور بارہ سال کے بعد کے
بچّوں کا اسلوب اس سے الگ ہے۔ بچّوں کے لیے
یہ بات صرف نیّر صاحب ہی نے اپنائی ہے اور
یہ اُن کے اسلوب کی ایک خاص خوبی ہے۔

آپ کے اسلوب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ
آسان لفظوں، آسان جملوں اور آسان ترکیبوں
سے ابتدا کرتے ہیں اور بتدریج مشکل لفظوں،
مشکل جملوں اور مشکل ترکیبوں کی طرف بڑھتے

ہیں۔ یہ تدریسی انداز ہے اور یہ انداز نیرؔ صاحب ہی کا
خاصّہ ہے۔ آپ کے اس اسلوب کی وجہ سے
پڑھنے والے بچے یہ سمجھتے ہیں کہ جیسے: "یہ بات
انھیں کی بات ہے، انھیں کے دماغ نے اسے سوچا
ہے۔ اور انھیں کے دل سے یہ نکلی ہے۔" یہی وجہ
ہے کہ اُن کی کہانیاں، اُن کی نظمیں اور اُن کے چٹکلے
بچوں کے دل ودماغ پر منقش ہوکر رہ جاتے
ہیں۔ آپ کے اسی اسلوب کی یہ کرامت ہے کہ
جب کوئی بڑا آپ کی اُن کہانیوں، نظموں اور
چٹکلوں کو پڑھتا ہے تو پڑھتے وقت وہ اپنے بڑے
پن کو بھول جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لیے بچہ
بن جاتا ہے۔

یہ تو اسلوب کی بات تھی۔ اب آیئے
کہانیوں اور نظموں کے مرکزی خیال کی طرف۔ آپ نے
اپنی کہانیوں اور نظموں کے ذریعے بچوں کو حُسنِ
اخلاق کا درس دیا ہے۔ اُن میں ہمدردی،
محبت، بھائی چارہ، حُبّ الوطنی، ایثار کا جذبہ پیدا
کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے کردار کو بنانے اور
سنوارنے کے لیے کہانیوں اور نظموں میں جیتے جاگتے
کردار پیش کیے ہیں۔ ان کردار کو پیش کرنے کے لیے
آپ نے بعض کہانیوں میں جانوروں کی خوبیوں اور
خصوصیتوں سے کام لیا ہے۔ جیسے پاپ کی ناؤ میں
پدم کا کردار۔ پدم ایک خرگوش ہے۔ بظاہر
خرگوش ایک بزدل اور کمزور جانور ہے۔ لیکن اس
کہانی میں پدم ظلم کے خلاف کمربستہ ہوجاتا ہے اور
اپنے سے قوی پر قابو پالیتا ہے۔ اس قسم کے کردار
پیش کرنے کا مقصد یہی ہے کہ بچے جو عمر کے لحاظ
سے چھوٹے اور طاقت کے لحاظ سے کمزور ہوتے ہیں
وہ بھی ظلم کے خلاف، جھوٹ کے خلاف سینہ سپر ہوسکتے
ہیں اور حق کے لیے لڑ سکتے ہیں۔ کیوں کہ سچ اور حق
ایک زبردست طاقت ہیں۔ ان سے کوئی نہیں لڑسکتا
اور آخر میں جیت سچ کی ہوتی ہے۔ حق کی ہی ہوتی
ہے۔ اس طرح کی کئی مثالیں نیرؔ صاحب نے اپنی
کہانیوں میں پیش کی ہیں۔ بچوں کو بات بات میں
کام کی بات بتانا یہ بھی آپ کا ایک کمال ہے۔ "ہماری
زندگی" آپ کی ہلکی پھلکی نظموں کا ایک مختصر سا مجموعہ
ہے۔ لیکن آپ نے ان آسان اور چھوٹی چھوٹی بحروں
والی نظموں کے ذریعے بچوں کو مہتر، دھوبی، نائی،
بنیا، حلوائی، ڈاکیہ، مالی، کسان، غرض سبھی
پیشہ وروں سے اس طرح متعارف کرایا ہے کہ بچے
اُن کے نام اور کام کو کبھی نہیں بھول سکتے، اور
بچوں کے دل میں اُن کے لیے ہمدردی، محبت اور
قدر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

نیرؔ صاحب کی نظموں، کہانیوں اور چٹکلوں کو پڑھنے کے بعد
محسوس ہوتا ہے کہ وہ بچوں کے صرف ادیب ہی نہیں ہیں بلکہ
بچوں کے ایک شفیق معلم بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بات میں بات
پیدا کرنے کے گر جانتے ہیں۔ لکھتے لکھتے کام کی بات بتا جاتے ہیں
چٹکلوں میں نکتے پیدا کرتے ہیں۔ اور شعروں میں نصیحت کرتے ہیں۔ مثلاً

یوں ہی لالچ سے بگڑتے ہیں کام
سچ ہے لالچ کا بُرا ہے انجام

غرض ہم کو لازم ہے نیرؔ یہ بات
کہ ہم تندرستی کو جانیں حیات

وقت کی قدر کرو، وقت کی قیمت جانو
ہو میسر تمھیں فرصت تو غنیمت جانو

نیرؔ صاحب برسوں سے لکھ رہے ہیں اور صرف بچوں کے لیے لکھ رہے ہیں۔ نیرؔ صاحب نے جس طرح جس انداز سے اور جتنا بچوں کے لیے لکھا ہے، شاید آج تک بچوں کے لیے اتنا کسی نے نہیں لکھا۔ آپ نے بچوں کے ادب میں گراں مایہ اضافہ کیا ہے۔ آپ نے بچوں کے ادب کی قدروں کو اجاگر کیا ہے اور اردو ادب میں بچوں کے ادب کے معیار کو بلند کیا ہے۔ آپ کے اس کام کو دیکھتے ہوئے، آپ کے ان حوصلوں کو دیکھتے ہوئے ہی مرحوم ڈاکٹر ذاکر صاحب نے فرمایا تھا " انھوں نے وہ میدان سر کیا ہے جسے سر کرنے کی بہت ہی کم اصحاب نے جرأت کی ہے "

(صد ۴۹ کا بقیہ)

بلکہ چھوٹا بڑا کوئی ہو بلا امتیاز اُسے پہلے وہی سلام کر لیتے ہیں۔ غرض کہ نیرؔ صاحب ایسی شخصیت کے مالک ہیں کہ لوگ ان کا تذکرہ کرنا اپنی عزت و نیک نامی میں اضافے کا موجب سمجھتے ہیں بلکہ اکثر تو یہ تصور کرتے ہیں کہ وہ اس احسان کا شکریہ ادا کر رہے ہیں جو نیرؔ صاحب نے تہذیب انسانی کی ترقی کے لیے اپنی شاعری کے ذریعے بنی نوع انسان پر کیا ہے۔ نیرؔ صاحب جیسے انسان ہی دنیا کو اپنے خیال و عمل سے ایک ایسی خوبصورت اور پُرامن جگہ بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں، جہاں تمام انسان اور حیوان راحت و عافیت کی زندگی گزار سکیں۔ اسی مقصد نیک کی تکمیل کے لیے خود کو وقف کر دینے والے انسان، خدا اور اس کے بندوں کے اسی طرح محبوب بن جاتے ہیں جیسے کہ نیرؔ صاحب۔

بچوں کا شاعر نیّر

چمکتا ہے جو بن کر چاند ایک اُردو کے امبر کا
وہ نیّر جس نے بچوں کے ادب کو زندگی دی ہے
وہ نیّر جس کے گیتوں میں تسلسل ہے روانی ہے
وہ نیّر جو مسلسل چھپتا رہتا ہے رسالوں میں
وہ نیّر جو کہ شاعر ہے گلستانوں کا پھولوں کا
وہ نیّر پیار کا رس جس کے شعروں سے چھلکتا ہے
وہ نیّر جامعہ کا نام جس کے دم سے روشن ہے
وہ نیّر ہر سیاسی جس کی تحریروں کا شیدا ہے
وہ جس کی نظم میں ایک سادگی بھی ہے سلاست بھی
وہ نیّر خوب واقف ہے جو معصوموں کی فطرت سے
واقف ہے جس نے ندیوں کو پہاڑوں آبشاروں کو
سہانے موسموں پر چاند سورج پر ستاروں پر
وطن کے عالموں پر فاضلوں پر رہنماؤں پر
کبھی تو جذبۂ حب وطن کے گیت لکھے ہیں
سبق سکھلائے ہیں بچوں کو اخلاص و محبت کے
مرتب کیا ہیں استادوں کے بچوں کو سکھائے ہیں
ہر ایک شاگرد پہ استاد کا کیا فرض ہوتا ہے
کبھی لکھے ہیں قصے سادھوؤں اور بادشاہوں کے
کہانی کی کبھی تخلیق دیووں اور پریوں کی
کتب تصنیف کیں بچوں کی خاطر ان گنت جس نے

تو وہ ہے نام نامی بس شفیع الدین نیّر کا
وہ نیّر فکر کے غنچوں کو جس نے تازگی دی ہے
وہ نیّر جس کے نغموں میں لڑکپن ہے جوانی ہے
وہ نیّر جو کہ ہے مقبول اپنے پڑھنے والوں میں
وہ نیّر جو کہ شاعر ہے محبت کے اصولوں کا
کہ تحریروں سے جس کی رنگ چاہت کا جھلکتا ہے
وہ نیّر جو کہ نباض سخن ہے ماہر فن ہے
وہ نیّر نونہالوں کا جو دلبر ہے چہیتا ہے
کہ قرباں جس پہ ہو جائے فصاحت بھی بلاغت بھی
لکھا ہے جس نے ہر عنوان پر بچوں کی نسبت سے
درختوں پر پرندوں پر گلستاں پر بہاروں پر
رواجوں اور ریتوں مذہبوں پر اور تیوہاروں پر
کبھی لکھا ہے شہروں پر کبھی لکھا ہے گاؤں پر
ہمالہ کے کبھی گنگ و جمن کے گیت لکھے ہیں
بزرگوں کی بزرگی بھائیوں بہنوں کی الفت کے
تقاضے دوستوں کو دوستی کے بھی بتلائے ہیں
کبھی اس طرح کہ اولاد کا کیا فرض ہوتا ہے
کبھی مضمون لکھے ہیں ثوابوں اور گناہوں کے
الف لیلیٰ کے شہروں کی نئی دنیا کے قریوں کی
ادب کو بے بہا موتی کیے ہیں مرحمت جس نے

عطا ہو فکر کو اس کے خدایا اور تابانی
فلک پر فن کے تیرے رہے یونہی درخشانی

محبوب راہی

اور اب سُنیے
نیّر صاحب کی کہانی خود اُن کی زبانی

میری پیدائش بمقام قصبہ اترولی ضلع علی گڑھ ۹ فروری ۱۹۰۳ء مطابق ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۲۰ھ کو جمعرات کے دن ہوئی۔ میرے والد صاحب کا نام حکیم الدین اور میرے دادا کا نام نورالدین صاحب تھا۔ نورالدین معلّمی کا پیشہ کرتے تھے۔ مگر میرے والد ناخواندہ ہونے کی وجہ سے پولس کے محکمے میں پہلے چوکیدار اور پھر کانسٹیبل ہو گئے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

میری ددھیال اترولی میں تھی۔ ننھیال سکندرہ راؤ ضلع علی گڑھ میں۔ زندگی کے ایک [illegible] میں بسر ہوئے۔

پانچ سال کی عمر میں بسم اللہ ہوئی۔ قاعدے اور عم یتساءلون کے سیپارے پر کافی وقت صرف ہوا۔ باقاعدہ تعلیم مدرسہ مصباح الاسلام اترولی میں شروع ہوئی۔ یہاں گلزارِ دبستاں اور گلستان سعدی کے چند باب پڑھے اور فارسی اور اردو زبان سے تھوڑی بہت واقفیت ہو گئی۔ علی گڑھ میں کتابت بھی سیکھی۔ مگر کتابت کی تکمیل نہ ہو سکی۔

۱۹۱۵ء کا ذکر ہے۔ ہمارے محلے قانون گویان میں کمپونڈر بلیسرن صاحب نے اپنا مطب جاری کیا۔ وہ ہمارے خاندان سے جلد ہی مانوس ہو گئے اور دوا علاج میں ہماری مدد کرنے لگے وہ اپنے دلّی والے دوستوں کے نام مجھ سے خط بھی لکھوایا کرتے تھے۔ اس لیے ان کے پاس جانا آنا رہتا۔ اچانک ان کا بچہ سخت بیمار ہو گیا۔ وہ اسے ڈاکٹر مترا صاحب کو دکھانے دہلی لائے۔ میری خواہش اور میری والدہ کی اجازت سے مجھے بھی اپنے ساتھ دہلی لیتے آئے۔ یہ واقعہ ۳ اپریل ۱۹۱۵ء کا ہے۔

اس وقت میری عمر بارہ سال کے قریب تھی۔ دہلی آکر چار پانچ مہینے میں نے اپنے ہم وطن اور ہم مدرسہ حافظ باقر علی صاحب کے ہاں گزارے۔ ان کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ ان پر بار ڈالتا اس لیے میں نے اخبار فروشی اور محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالا اور خالی وقت میں دو تین مہینے کتابت کی مشق بھی کی۔

علی گڑھ کے قیام میں، مجھے اپنے رشتہ کے نانا مولانا مفتی لطف اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے دولت خانہ پر بھی اپنی والدہ کے ساتھ چند ماہ رہنا پڑا۔ مولانا مرحوم کا برتاؤ ہمارے ساتھ ایسا تھا جیسا کم و بیش حقیقی نواسوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہاں شب و روز بچوں اور بڑوں میں شعر و شاعری، بیت بازی کا چرچا رہتا اور طرح طرح کے علمی کھیل کھیلے جاتے۔ اس زمانے میں حفیظ اللہ بن مولانا سلامت اللہ، عبدالمجید ابن مولوی عبدالحمید اور صفی اللہ ابن مفتی عنایت اللہ صاحب میرے ہم عمر تھے۔ ان سے خوب گاڑھی چھنتی تھی یہ تینوں مولانا مرحوم کے پوتے تھے۔ بڑے ہو کر سب نے کامیاب علمی زندگی گزاری۔ میری والدہ کو علم کا شوق تھا۔ انھیں بہت سی دلچسپ کہانیاں اور کہاوتیں یاد تھیں طبیعت میں خودداری حد درجہ کی تھی کسی محنت اور مشقت سے انھیں عار نہ تھا۔ چاہتی تھیں کہ میرے بیٹے پڑھ لکھ جائیں۔ میری بڑی بہن محمود فاطمہ کی شادی ہو چکی تھی میرے بڑے بھائی مرضِ صرع میں مبتلا تھے اس لیے ان کی ساری امیدیں میری ذات سے وابستہ

تھیں اس تعلیمی شوق ہی کی وجہ سے انھوں نے مجھے دہلی آنے کی اجازت دی۔ کتنا خوش نصیب تھا میں کہ مجھے ایسی وسیع النظر اور بلند خیال ماں کی گود نصیب ہوئی۔ ان کی مامتا اگر مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور کرتی تو معلوم نہیں میرا کیا حشر ہوتا۔ میرے ملازم ہو جانے کے چار برس بعد وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ میں ان کی خدمت سے محروم ہو گیا تاہم احسان مندی اور محبت کے جذبے سے ان کی دور اندیشی کو یاد کرتا ہوں اور اس یاد ہی کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھتا ہوں۔

میرے دہلی آتے وقت میری والدہ کی مالی حالت ایسی سقیم تھی کہ ریل کا کرایہ بھی مہیا نہ کر سکیں۔ بابو بلیسرن صاحب کو یہ بوجھ اٹھانا پڑا۔ کپڑوں کا ایک جوڑا اور کل پانچ پیسے دہلی آ جانے پر میری کل کائنات تھی۔ یہاں آنے کے چند دن بعد عید آئی۔ میں نے جو خط گھر لکھا اس میں یہ قطعہ بھی درج کیا۔ یہ مجھے پہلے سے یاد تھا۔

مناتے ہیں خوشی اب عید کی سارے جہاں والے
مبارکباد دیتے ہیں زمین و آسماں والے
وطن والوں کو جو ہیں بے وطن ان کی خبر کیا ہے
خوشی کے دن بھی ہیں غمگین ہم آہ و فغاں والے

غرض میں اخبار "ہمدرد" دہلی اور اخبار "رسالت" کلکتہ فروخت کرتا تھا۔ خدا کے فضل سے حالات سازگار ہونے کی صورت پیدا ہوئی۔ شمس العلماء مولانا سید احمد صاحب بخاری شاہی امام جامع مسجد دہلی مجھ سے اخبار خریدا کرتے تھے۔ جامع مسجد میں ایک دو بار ویسے بھی ملاقات کا اتفاق ہوا۔ مرحوم نے ایک روز دریافت کیا۔ "تم پڑھنا چاہتے ہو؟" اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میری والدہ نے تعلیم ہی کی امید پر مجھے دہلی آنے کی اجازت دی تھی میں بخوشی آمادہ ہو گیا۔ یہ واقعہ ستمبر یا اکتوبر ۱۹۱۵ء کا ہے۔ پانچ چھ مہینے میں نجی طور پر انگریزی اور حساب کا تھوڑا بہت علم حاصل کیا۔ اپریل ۱۹۱۶ء میں میرا داخلہ اینگلو عربک ہائی اسکول کی پرائمری شاخ جوڑیوالان کی پانچویں جماعت میں ہو گیا۔ یہ تھی ابتدا میری تعلیم اور ترقی کی۔

اپنے شوق اور محنت کی بدولت تھوڑے ہی دن میں آگے بڑھنے لگا۔ استادوں نے میری ترقی کی رفتار دیکھی تو مجھے ضلع دہلی کے مقابلے کے امتحان میں شریک کرنے کا فیصلہ کیا۔ استادوں کی ہمدردی اور توجہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ پانچ میں سے تین طالب علم وظیفہ یاب ہوئے۔ ان میں ایک میں بھی تھا۔ چھٹی جماعت میں تھا کہ میری مستقل تعلیم کے پیش نظر امام صاحب نے مجھے انجمن مؤید الاسلام دہلی کے یتیم خانے میں داخل ہونے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے یقین دلایا کہ میری تعلیم عربک اسکول ہی میں جاری رہے گی۔ مگر ماسٹر اصغر علی صاحب جو عربک اسکول میں استاد تھے اور مجھ پر پدرانہ شفقت فرمانے لگے تھے، انھیں یہ تجویز پسند نہیں آئی۔ مجھے بھی یتیم خانے کی زندگی کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا اس لیے میرا دل بھی یتیم خانے کے داخلے پر مائل نہیں ہوا۔ امام صاحب مغفور نے بھی اپنی تجویز پر اصرار نہیں فرمایا اور ان کے گھر سے بے تعلق ہو جانے کے بعد بھی ان کی ہمدردی اور شفقت میرے ساتھ رہی۔ کچھ زمانہ ماسٹر صاحب کے ساتھ گزارا۔ پھر موصوف ہی کی کوشش سے مولوی فضل الدین صاحب ہیڈ ماسٹر نے مجھے بورڈنگ میں رہنے کے لیے جگہ دے دی۔

میں نے چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعتیں اینگلو عربک مڈل اسکول واقع کوچہ چیلان سے پاس کیں۔ میں ہر کلاس میں قریب تمام مضامین میں اول پوزیشن حاصل کرتا تھا۔ آٹھویں جماعت میں ضلع کے وظیفے کے مقابلے کا امتحان ہوا تو اس میں بھی میں نے وظیفہ حاصل کر لیا۔ چھ روپے ماہوار

کا پرچہ نکلنے لگا۔ مجھے دو سال ملنا تھا قیام و طعام کا انتظام مربک ہائی اسکول میں تھا استاد مہربان تھے میں حصول تعلیم میں مصروف رہنے لگا۔

مڈل اسکول کوچہ چیلان میں تعلیم کے زمانے کی چند باتیں قابل ذکر معلوم ہوتی ہیں۔ اسکول میں اپنے چند ساتھیوں سے مل کر میں نے انجمن خدام الطلباء کی بنیاد ڈالی اور ایک لائبریری قائم کی۔ انجمن کا مقصد یہ تھا کہ اسکول میں طلباء کے جلسوں کا انتظام کرے، مدرسہ میں نظم و ضبط قائم رکھنے میں مددگار ہو۔ اس انجمن کے انتظام میں کئی جلسے اور بیت بازی کے مقابلے ہوئے۔ اس مہم میں میرے دوست اور ساتھی بشارت اللہ، عبدالرحمن، محمد زبیر قریشی اور محمد صدیق وغیرہ شریک رہے۔ ہیڈ ماسٹر شیخ عبدالحمید، سید اصغر حسین اور سید تاج محمد صاحب کے علاوہ ماسٹر محمد ہاشم صاحب نے ہماری بہت ہمت افزائی کی اور تائید تو ہمیں سبھی استادوں کی حاصل رہی۔ اسکول کا یہ زمانہ بڑے مزے میں گزرا۔ بیت بازی میں مجھے کافی مہارت تھی مضمون نگاری میں اول رہتا تھا۔ تقریر بھی بری بھلی کرنے لگا تھا اور کبھی کبھی اپنے تخلص کی رعایت سے شعر بھی کہہ لیا کرتا تھا۔ ساتھیوں میں تھوڑی بہت چشمک ہوا ہی کرتی ہے۔ ایک روز اسکول آیا تو دیکھا بشارت اللہ نے اسکول کے بورڈ پر ایک اعلان چسپاں کر رکھا ہے۔ اس میں خاص طور پر مجھے چیلنج کیا گیا تھا کہ اگر نیر صاحب شاعر ہیں تو طرح کے اس مصرع پر غزل لکھیں۔

اس قدر تیز ہوا میں کوئی کیونکر نکلے۔

میں نے یہ اعلان پڑھا سوچا، کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی چاہیے۔ خدا کا کرنا تھوڑی سی دیر میں سات آٹھ شعروں کی غزل تیار ہوگئی۔ مطلع تھا سہ

ہم نے دل جس کو دیا آہ وہ بندر نکلے
شکل و صورت میں خصائل میں قلندر نکلے

گر نمی سے کہیں ایسا نہ ہو سردی کا خلل ہو جائے
اس قدر تیز ہوا میں کوئی کیونکر نکلے

اور شعر کیا تھے اب یاد نہیں آرہے۔ البتہ یہ شعر یاد ہے سہ

نام میں جن کے ہے ب ش الف اور ر ت
وہ بھی سن سن کے ان اشعار کو ششدر نکلے

اتفاق سے اس روز مولوی سید محمد علی صاحب کا بھی گھنٹہ تھا۔ بڑے سیدھے اور نیک استاد تھے ان کے گھنٹے میں میں نے غزل سنائی تو ہر ہر شعر پر ساتھیوں نے خوب خوب داد دی۔ اور غزل کے ختم ہو جانے کے بعد بڑے جوش سے تالیاں بجائیں

ایک بار ہمارے مدرسے کی فٹ بال ٹیم کا میچ مہرولی کے ... ان اسکول کی ٹیم سے ہوا۔ چند ساتھیوں نے صلاح کی کہ اس میچ کو دیکھنے کے لیے چھٹی ملنی چاہیے ہم نے ہیڈ ماسٹر صاحب سے درخواست کی تو انھوں نے فرمایا چھٹی مطلوب ہے یا مہرولی جا کر میچ بھی دیکھنا ہے میں نے انجام سوچے بغیر کہہ دیا کہ ہم لوگ میچ دیکھنے کے لیے مہرولی جائیں گے چھٹی مل گئی۔ جیب میں پیسے کہاں کہ کرایہ ادا کریں۔ بشارت اللہ اور عبدالرحمان پیدل چلنے پر تیار ہو گئے۔ میچ کے میدان تک ہمیں ۱۲ میل چلنا پڑا۔ میچ کے بعد دہلی نظام الدین کے راستے سے آئے اور نظام الدین ایسے وقت پہنچے کہ رات ہو گئی یہ بات ۱۹۱۹ء کی ہے۔ دہلی دروازے سے نظام الدین تک جنگل ہی جنگل تھا اس سنسان راستے سے دہلی جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ رات گزارنے کے لیے بنگلہ والی مسجد میں داخل ہوئے۔ مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ چند بچوں کو قرآن پاک پڑھا رہے تھے ہم لوگ اپنی حرکتوں سے ان کی یکسوئی میں ضرور خلل انداز ہوئے ہوں گے، مگر موصوف

نے اس کا کچھ خیال نہیں کیا۔

درس سے فارغ ہونے کے بعد ہمیں اپنے پاس بلایا اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور سونے کا انتظام کر دیا۔ اگلے دن صبح کو ناشتہ کرنے کے بعد مولانا سے رخصت ہوئے۔ ان کی شفقت کا اثر آج بھی میرے دل پر بہت گہرا ہے

ساتویں جماعت میں تھا کہ خواجہ حسن نظامی صاحب سے ملاقات کا موقع ملا۔ موصوف کا نام تو سنا تھا۔ ان کے مضمون بھی پڑھے تھے مگر ان سے ملنے کا شرف اب تک حاصل نہیں ہو سکا تھا اسی زمانے میں انھوں نے اخبار "رعیت" نکالا اور اس کا دفتر اجمیری دروازے کے بازار میں گلی شاہ تارا کے مقابل قائم کیا۔ موصوف سے ملاقات ہوئی تو بڑی شفقت سے پیش آئے۔ وہ عبارت بول بول کر مجھ سے مضمون لکھواتے اور کبھی کبھی تھوڑی بہت میری مدد بھی کر دیا کرتے تھے گرمی کی بڑی چھٹیوں کا زمانہ، دوبار میں نے دفتر رعیت ہی میں گزارا اس قیام میں اخبارات پڑھنے کا خوب موقع ملا۔ اور میں دہلی کے ہر قسم کے سیاسی اور سماجی جلسوں میں شریک ہونے لگا مجھے ملک کے حالات سے دلچسپی پیدا ہوئی اور مضمون نگاری کا شوق بڑھ گیا۔ اخبار "رعیت" ہی میں میرا اپنا لکھا ہوا پہلا مضمون "سُدرشنی برچار" کے عنوان سے شائع ہوا۔ خواجہ صاحب نے اپنی اصلاح سے اسے اشاعت کے قابل بنا دیا تھا۔ کیا بتاؤں اس اشاعت سے مجھے کیسی خوشی ہوئی اسی قیام کے زمانے میں خواجہ صاحب کی شبانہ روز محنت اور جفاکشی اور خوش معاملگی کا بھی اندازہ ہوا ۱۹۱۸ء میں ان کے ساتھ ایک بار شملے کا سفر بھی کیا وہاں وہ کسی سیاسی کام سے گئے تھے مگر دوسرے ہی دن خواجہ صاحب دہلی واپس آگئے اور شملے کی سیر کی حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی خواجہ صاحب ہی کے طفیل مجھے بھیا احسان الحق ملا واحدی ایڈیٹر نظام المشائخ منشی عبد الحمید ایڈیٹر صوفی، مولانا عارف ہسوی، سردار دیوان سنگھ مفتون، سید عزیز حسن بقائی اور انوار احمد میرٹھی مالک خواجہ بک ڈپو اور بہت سے ادیبوں اور شاعروں سے نیاز حاصل ہوا۔

مولانا احمد سعید صاحب اور مفتی کفایت اللہ صاحب بھی مجھ پر مہربان ہو گئے۔ ۱۹۱۹ء میں ان کے ساتھ میں نے امرت سر کا سفر کیا۔ مقصد یہ تھا کہ محمد شریف صاحب تاجر چرم سے سفارش کر کے وہ میرا وظیفہ مقرر کرا دیں۔ یہ مقصد تو حاصل نہیں ہوا، البتہ ان بزرگوں کی وجہ سے مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا اور انڈین نیشنل کانگریس کے لیڈروں کے جلوس اور ہنگامے دیکھے اور بہت سا سیاسی لٹریچر پڑھنے کا موقع ملا۔

غرض میں نے آٹھویں جماعت بڑے امتیاز کے ساتھ پاس کی اور اینگلو عربک ہائی اسکول اجمیری دروازہ کی نویں جماعت میں داخل ہو گیا۔

تحریک آزادی میں شرکت :-

۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی کی تحریک عدم تعاون شروع ہوئی۔ پنجاب میں جو ظلم انگریزی حکومت نے ڈھائے تھے، اور خلافت کے معاملے میں برطانوی حکومت نے جو وعدہ خلافی کی تھی اس کی وجہ سے سارے ملک میں جوش پھیلا ہوا تھا۔ اس تحریک کی ایک شق یہ بھی تھی کہ طلبہ سرکاری کالج اور اسکول چھوڑ دیں۔

مجھ پر بھی اس تحریک کا اثر ہوا اور ۸ نومبر ۱۹۲۰ء کو میں نے اپنا اسکول اور اپنا وظیفہ چھوڑ دیا اس سلسلے میں میں نے ایک عرضی ہیڈ ماسٹر صاحب کی خدمت میں پیش کی دوسری عرضی ڈپٹی کمشنر صاحب دہلی کی خدمت میں بذریعہ ڈاک

اُرسال کی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ۱۱ نومبر ۱۹۲۰ء کے اخبار روزانہ "فتح" دہلی میں ان کی نقلیں شائع ہوئیں۔

عربک اسکول چھوڑنے کے بعد میں "آزاد قومی درسگاہ" میں داخل ہو گیا یہ درسگاہ کٹرہ دینا بیگ خاں کے ایک وسیع مکان میں قائم ہوئی تھی جہاں آج کل ہمدرد دواخانہ کا دفتر ہے۔ کچھ عرصے کے بعد یہ درسگاہ پریڈ گراؤنڈ کے سامنے کوچہ بلاقی بیگم میں منتقل ہو گئی وہیں کئی سال کے بعد اس درسگاہ کا خاتمہ ہو گیا۔

آزاد قومی درسگاہ، دہلی :-

میں نویں جماعت میں داخل ہوا۔ یہاں اپنے ساتھیوں کی دوستی اور استادوں کی شفقت مجھے حاصل رہی۔ میں تقریر کر لیا کرتا تھا۔ مضمون لکھ لیتا تھا اور کبھی کبھی شعر بھی موزوں ہو جاتے تھے۔ اسکول کھلنے کے بعد مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مسٹر آصف علی بیرسٹر اور دوسرے مہمان ۲۴ نومبر ۱۹۲۰ء کو اسکول میں تشریف لائے تو گاندھی جی کے خیر مقدم میں اسکول کی طرف سے میں نے اپنا مضمون پڑھا۔ یہ مضمون اتنا پسند کیا گیا کہ روزنامہ اخبار "فتح" دہلی میں شائع ہوا۔ اور گاندھی جی نے بھی اسی مضمون کے جواب میں تقریر فرمائی۔

آزاد قومی درسگاہ کا الحاق جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ سے تھا اور میٹرک کا امتحان جامعہ جونیئر کہلاتا تھا۔ یہ امتحان میں نے ۱۹۲۲ء میں اپنے اسکول کے امیدواروں میں اول رہ کر فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا۔

آزاد قومی درسگاہ کی زندگی میں چند خاص امور ایسے پیش آئے جن کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ۱۹۲۰ء میں بمقام ناگپور انڈین نیشنل کانگرس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ اسی زمانے میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس کا اجلاس بھی ہونا تھا۔ اسکول کی طرف سے اس اجلاس میں شریک ہونے کے لیے دسویں کلاس کے طالب علم کیلاش ناتھ کول منتخب ہوئے اور نویں جماعت کی طرف سے میں۔ ہم دونوں نمائندے اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ کانفرنس میں تو ہماری کچھ بھی پذیرائی نہیں ہوئی۔ البتہ لالہ شنکر لال سکریٹری دہلی کانگرس کمیٹی نے ہم دونوں کو انڈین نیشنل کانگرس کا ڈیلیگیٹ بنا دیا اس لیے ہمیں کانگرس کے جلسوں میں شریک ہونے ملک کے بڑے بڑے رہنماؤں کی تقریریں سننے اور وہاں کے ہنگامے دیکھنے کا خوب موقع ملا۔ وہیں خلافت کانفرنس بھی منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے اجلاس میں میں بھی شریک ہوا۔ اس سفر میں کیلاش ناتھ کول کا برتاؤ میرے ساتھ بڑا ہی اچھا اور شریفانہ رہا۔

اِس اسکول میں بھی میں نے ایک لائبریری قائم کی اس میں ایک ہزار سے زیادہ کتابیں جمع ہو گئیں تھیں۔ جناب تمیز الدین احمد صاحب سکریٹری ہوئے تو الماریاں اور میزیں کرسیاں بھی مل گئیں اور لائبریری بڑی شاندار نظر آنے لگی یہ درسگاہ ختم ہوئی تو میری معلومات کے مطابق یہ لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ کے حوالے کر دی گئی، جو ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ سے منتقل ہو کر دہلی آ گئی تھی۔

پڑھائی کے زمانے میں میں نے کانگرس کی اشاعت کا بھی کام کیا۔ پنڈت شو دیال اور عبدالخالق احمیری کے ساتھ دہلی کے قریب و جوار کے دیہات میں جانے، آزادی کا پیغام گھر گھر پہنچانے اور کانگرس کے ممبر بنانے کی کوشش کی مئی اور جون کی تپتی دھوپ اور لوؤں میں ہم لوگ گاؤں گاؤں پھرتے تھے۔ چیزوں یا گاؤں والوں کے ہاں روٹی ترکاری پر گزارہ ہوتا۔ اسی سلسلے میں ہیڈ ماسٹر سید صغیر علی صاحب

استاد کامرس (Commerce) کے ساتھ مشاہدہ جلسے اور یہاں کے جلسوں میں تقریریں کرنے کا اتفاق ہوا ۱۹۲۰ء میں خانپور والوں نے اپنے علاقے کا نمائندہ منتخب کر کے مجھے دہلی کانگرس کمیٹی میں بھیجا۔ یہاں سوامی شردھانند جی ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور حکیم اجمل خاں صاحب کی صدارت میں جتنا وہاں جلسے ہوئے ان میں شریک ہونے کا موقع بھی ملا ۱۹۲۱ء میں آزاد قومی درسگاہ کی انجمن اتحاد کا نائب صدر بلا مقابلہ منتخب ہوا۔

بہرحال اس کا اعتراف ضروری سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں اگر ماسٹر اصغر علی صاحب کے دوست جناب محمد احمد شاہ سوت والے اور شیخ برکت علی صاحب قریشی میری دستگیری نہ کرتے تو اپنی تعلیم جاری رکھنا میرے لیے مشکل ہوتا۔ میں ان بزرگوں کا شکر گزار اور ان کے حق میں دعاگو رہتا ہوں۔ اپنے تجربے کی بنا پر میرے دل میں یہ بات جم گئی ہے کہ تعلیمی زمانے میں طالب علموں کو عملی سیاست کے ہنگاموں میں شریک ہونے سے احتراز کرنا چاہیے۔

نئی جد و جہد (۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۶ء تک)

۲ جولائی ۱۹۲۲ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کالج علی گڑھ کی ابتدائی (Preliminary) کلاس میں داخل ہو گیا۔ باوجود جامعہ کی طرف سے خاص مراعات کے ضروری اخراجات کا انتظام نہ ہو سکا۔ مجبوراً تیسرے مہینے واپس دہلی آگیا رہنے کا کچھ ٹھکانا نہیں تھا۔ اس لیے ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو مدرسہ عالیہ فتحپوری میں داخلہ لے لیا۔ وہاں فارسی کی تعلیم کے ساتھ، پرائیوٹ ٹیوشن کر کے گزارا کرنے لگا چند ماہ یہاں گزارے یہاں کے طالب علموں کا مقولہ تھا "پہلے طبق پیچھے سبق" یعنی دعوتوں میں شریک ہونے کی وجہ سے تعلیم کی پرواہ نہیں کرتے تھے میں ایسی کسی دعوت میں کبھی شریک نہیں ہوا۔ یہاں فارسی کی کچھ کتابیں پڑھیں اور استادوں کی مدد اور ذاتی محنت سے بیک وقت ۱۹۲۲ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے دو امتحان یعنی فارسی منشی اور اردو ادیب عالم میں شریک ہو کر دونوں میں اول پوزیشن کے ساتھ اول درجہ میں کامیابی حاصل کی۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ ان امتحانوں کی فیس کا انتظام بڑی مشکل سے ہو سکا اور دہلی سے لاہور کا سفر سید الطاف علی صاحب ریلوے کلرک کی اعانت سے طے ہوا۔ قیام اسلامیہ کالج لاہور کے بورڈنگ ہاؤس میں رہا۔ مولوی فضل الدین صاحب ہیڈ ماسٹر کی عنایت اور اعانت بھی کام آئی اور اینگلو عربک ہائی اسکول کی یکم اپریل ۱۹۲۳ء سے انگریزی کلاس میں حاضری شروع کر دی اور ۱۲ جون ۱۹۲۳ء کو باقاعدہ داخل ہو گیا اور ۱۹۲۴ء میں پنجاب یونیورسٹی کا میٹرک، صرف انگریزی میں پاس کیا۔

اس دوران میں عارضی ملازمتیں بھی کرتا رہا مثلاً ہمدرد اور کانگرس اخبار دہلی میں بطور مترجم چند ماہ کام کیا۔ نواب بشیر الدین احمد صاحب مرحوم کے دو پوتے قدیر الدین احمد صاحب اور حمید الدین احمد صاحب میرے شاگرد بن گئے۔ اس خاندان سے تعلق ہو جانے کی وجہ سے مجھے بہت سی آسانیاں میسر آگئیں ۱۹۲۵ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کا امتحان ادیب کامل فرسٹ ڈویژن میں اول پوزیشن حاصل کر کے پاس کیا اور ۱۹۲۶ء میں اسی یونیورسٹی سے صرف انگریزی میں انٹرمیڈیٹ کر لیا۔

اسی دوران میں چار پانچ مہینے دہلی میونسپلٹی کے کٹرہ نیل کے پرائمری اسکول میں کام کیا یہ جگہ مجھے نواب فیض احمد خاں صاحب کی سفارش پر شیخ عبد الحمید صاحب ڈسٹرکٹ انسپکٹر اسکول کی مدد سے حاصل ہوئی تھی، سالانہ معائنے کے موقع پر جناب شیخ صاحب تشریف لائے تو انھوں [illegible]

کے ساتھ بہت بُرا برتاؤ کیا۔ لاگ بک (Log book) میں میری اگرچہ تعریف لکھی تھی مگر مجھے موصوف کا طرزِ عمل پسند نہیں آیا اور میں نے اس جگہ سے استعفا دے دیا۔ پھر اینگلو عربک اسکول میں کئی بار تھوڑی تھوڑی مدت کام کیا اسی اسکول کی عارضی اور آخری ملازمت تقریباً چھ ماہ کی تھی یعنی ۱۹۲۵ء کے نومبر یا دسمبر کے مہینے سے اپریل ۱۹۲۶ء تک۔ یہ زمانہ بڑا کامیاب رہا۔ اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے میری خدمات کا بہت اچھے سارٹیفکٹ میں اعتراف فرمایا۔

موڈرن اسکول کی ملازمت :-

اینگلو عربک ہائی اسکول کی عارضی ملازمت ختم ہو چکی تھی اور میں کسی نئی ملازمت کی جستجو میں تھا کہ موڈرن اسکول میں اردو ٹیچر کی خالی جگہ کا حال معلوم ہوا۔ مولوی فضل الدین صاحب کے تعارف نامے کے ذریعے لالہ رگھبیر سنگھ صاحب سے ان کی کوٹھی پر ملاقات کی انھوں نے میرے سارٹیفکٹ دیکھے۔ مسٹر سین رجسٹرار دہلی یونیورسٹی اور لالہ مدن لال ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول دہلی کے پاس انٹرویو کے لیے بھیجا اور ایک ماہ کے لیے میرا عارضی تقرر اس شرط پر کیا گیا کہ نہ مجھے بڑی تعطیل کے زمانے کی تنخواہ ملے گی اور نہ اس آسامی پر مستقل تقرر کے وقت میری اس عارضی ملازمت کا کچھ حق مانا جائے گا مجھے یہ شرطیں ماننی پڑیں۔ نہ مانتا تو کیا کرتا میں نے پوری محنت اور اوقات کی پابندی سے کام شروع کر دیا بس کے بوس پرنسپل اور لالہ رگھبیر سنگھ سکریٹری میرے درس وغیرہ کی نگرانی کرتے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی ایک ماہ کی مدت ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ گرمیوں کی تعطیل کے بعد اس آسامی پر تقرر کا پروانہ مجھے مل گیا۔ گریڈ ساٹھ سے سو روپیہ تک مقرر ہوا جو سرکاری اسکولوں کے مقابلے میں زیادہ تھا چھ ماہ کی آزمائشی مدت کے بعد میری ملازمت مستقل کر دی گئی۔ اگلے سال پھر ڈبل ترقی ہوئی آخر میں ایک سو پچاس روپے گریڈ ہو گیا ۱۹۳۳ء میں ایک سو پچیس روپے تنخواہ مل رہی تھی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے ایما پر میں نے موڈرن ہائر سیکنڈری اسکول بارہ کھمبا روڈ نئی دہلی سے استعفا دے کر ۱۳ جنوری ۱۹۳۴ء سے جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی کے مدرسہ ثانوی میں کام شروع کر دیا۔

موڈرن اسکول میں ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۴ء تک آٹھ سال سے بھی زیادہ مدت تک کام کیا اسی اسکول کی ملازمت کے زمانے میں میرے مضامین اور انگریزی سے اردو میں ترجمے ملک کے مقتدر اخباروں اور رسالوں مثلاً 'کامیابی'، 'نظام المشائخ'، 'ارمغان'، 'تبلیغ نسواں'، 'سعید'، 'طبیب نسواں'، 'مجموعی دہلی'، 'ہمایوں لاہور'، اور 'اخبار قوم دہلی' میں چھپتے رہے۔

۱۹۲۹ء میں رسالہ 'کامیابی' دہلی نے اس عنوان پر کہ

'انگریز حاکم اور ہم محکوم کیوں ہیں'؟

مقابلے کے ایک مضمون کا اعلان کیا۔ میرا مضمون سب سے اچھا سمجھا گیا اور فیصلہ کرنے والی کمیٹی نے تیس روپے کا انعام مجھے عطا فرمایا۔ موڈرن اسکول میں مجھے بڑے اچھے ساتھی ملے۔ جناب جیون ناتھ در۔ جناب منداینی مکرجی، پنڈت دسترتھ اوجھا رنگ۔ بہادر ناتھ اور مس ینگ صاحبہ۔ موڈرن اسکول کی زندگی اور ساتھیوں کی ہمت افزائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے کام کی سمت مقرر ہو گئی۔ اب اپنی زندگی میں بچوں کے ادب اور زبان اردو کی جو تھوڑی بہت خدمت کر سکا ہوں، تو میں اسی ادارے کی دین سمجھتا ہوں۔

موڈرن اسکول میں مس ینگ مونٹیسوری کلاس کے چھوٹے بچوں کو پڑھاتی تھیں۔ وہ انگریزی نرسری نظموں سے کام لیا کرتی تھیں میں نے کوشش کی کہ ایسی ہی نظمیں اردو

میں لکھوں۔ میرا خیال تھا کہ غیر زبان کے مقابلے میں مادری زبان کی نظمیں بچوں میں زیادہ مقبول ہوں گی۔ چنانچہ میں نے ایسی نظمیں لکھنی شروع کر دیں۔ میری پہلی نظم بچوں کے ماہنامہ "ہونہار" دہلی میں شائع ہوئی۔ خدا کے فضل سے میری نظمیں چھپتے ہی مقبول ہونے لگیں۔ پیام تعلیم دہلی، بچوں کی دنیا الہ آباد، غنچہ بجنور، [illegible] سعادت، پھول، پریم، حکایت اور تعلیم و تربیت لاہور وغیرہ رسالوں میں چھپتی رہیں اور کئی نظمیں بچوں کے اردو نصاب کی ابتدائی کتابوں میں شامل کر لی گئیں جب ان نظموں کا معقول ذخیرہ جمع ہو گیا تو میں نے "بچوں کا تحفہ" کے نام سے دو مجموعے ترتیب دیے۔ مگر انہیں شائع کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

میرے محترم بزرگ جناب ڈاکٹر سید احمد صاحب بریلوی نے، جو خود ایک اچھے شاعر، ادیب اور کامیاب صحافی تھے، شاعرانہ نقطہ نظر سے میری ان نظموں کو پوری توجہ سے دیکھا اور تعلیمی نقطہ نظر سے جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے ان دونوں مجموعوں کو شروع سے آخر تک ملاحظہ فرمایا۔ ان بزرگوں نے میری بڑی حوصلہ افزائی فرمائی اور ۱۹۳۲ء میں یہ کتابیں شائع ہو گئیں۔

ان کتابوں پر اردو اور انگریزی اخبارات نے بڑے ہمت افزا تبصرے شائع کیے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے رائے لکھی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق اور [illegible] علامہ ربانی صاحب دہلوی کی اعانت سے ان کتابوں کے ایک ہزار سیٹ محکمہ تعلیم حیدرآباد نے خریدے۔ خواجہ غلام السیدین صاحب نے یہ کتابیں یوپی بورڈ سے منظور کرائیں۔ بمبئی، پنجاب، دہلی، حیدرآباد وغیرہ کے تعلیمی محکموں نے کتب خانوں اور انعامات کے لیے منظور کیا۔ سینکڑوں اسکولوں میں یہ کتاب پڑھائی جانے لگی۔ غرض اس کی مقبولیت دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھتا رہا کہ بچوں کے ادب کی خدمت، میں نے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ اب تک ایک درجن سے زیادہ میری نظموں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مثلاً بچوں کا کھلونا، گھی شکر، نئی کہانیاں، منی کا تحفہ، منی کے گیت، وطنی نظمیں، اسلامی نظمیں، ہماری نعت، تعلیمی تحفہ، ہماری زندگی اور اچھی چڑیا۔ اور نصف درجن کے قریب چھپنے کے لیے تیار ہیں۔ نظم نگاری کے علاوہ پیام تعلیم دہلی اور غنچہ بجنور کے ایڈیٹروں کی فرمائش پر میں نے بچوں کے لیے کہانیاں لکھنی شروع کیں یہ کہانیاں بھی ملک میں بے حد مقبول ہوئیں تین درجن سے زیادہ کہانیوں کی چھوٹی چھوٹی کتابیں مختلف عمر کے بچوں کے لیے اب تک شائع ہو چکی ہیں یہ بھی اتنی مقبول ہیں کہ ہر کہانی کے آٹھ آٹھ نو نو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور ان کی مانگ برابر بڑھ رہی ہے۔

میں نے متعدد انگریزی کہانیوں اور نظموں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ پرندوں کی دنیا اور خالہ بلی کا خاندان۔ یہ دو ترجمے نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی کی طرف سے شائع ہو چکے ہیں۔ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی نے "اچھی چڑیا" کے نام سے میری چند نظموں کا مجموعہ حال ہی میں شائع کیا ہے میں نے اپنی دانست میں یہ نظمیں چار پانچ برس کے بچوں کے لیے لکھی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اردو کی ابتدائی تعلیم میں چار پانچ برس کے بچے ان نظموں سے کافی فائدہ اٹھائیں گے غرض موڈرن اسکول کی زندگی سے ذہنی طور پر مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ امتحان دے کر ترقی کا دروازہ بند پایا تو تصنیف و تالیف کی طرف توجہ کی اور خدا نے میری محنت میں برکت دی۔

موڈرن اسکول دولت مندوں کے لیے تھا۔ ہر قسم کی تعلیمی سہولتیں میسر تھیں۔ کام کی قدر کی جاتی تھی۔ وقت کی پابندی، اپنے فرض کو محنت سے انجام دینا، رات دن علمی مشاغل میں مصروف رہنا، اس لیے ممکن نہ تھا کہ تنخواہیں معقول نہیں

اور یکسوئی سے تعلیمی شغل میں مصروف رہا جا سکتا تھا میں
نے ہندوستان کے کئی پبلک اسکول دیکھے ہیں میری نظر
میں تو اب تک موڈرن اسکول سے بہتر کوئی اسکول نہیں
بچا اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ لالہ رگھبیر سنگھ نے اپنی پوری
زندگی اس کے لیے وقف کر رکھی تھی اور دامے درمے قدمے
سخنے، پورے اخلاص کے ساتھ اس کی خدمت میں لگے
رہتے تھے مس بوس پرنسپل بھی شبانہ روز اسکول کی بہتری
میں لگی رہتی تھیں۔ وہ تعلیمی ادارہ اسکول تھا ایسے موقع بھی
آئے کہ ان کی رائے سے اتفاق نہ ہو سکا مگر اس میں کچھ
شک نہیں کہ فرائض منصبی کو محنت اور خوش اسلوبی سے انجام
دینا اور اسکول کے انتظام میں ہر شعبے پر تفصیلی توجہ رکھنا، یہ
بات میں نے صرف ان میں دیکھی اور ان کے اس طرز
عمل سے بہت کچھ حاصل کیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی :-

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم شیخ الجامعہ علی گڑھ میں میرے
استاد رہ چکے تھے میں ان کے حسن اخلاق سے اس قدر متاثر تھا
کہ ان کے دہلی کے قیام کے زمانے میں ان کی خدمت میں حاضر
اور ان کے زمانے کی جامعہ کی زندگی کو دیکھ دیکھ کر متاثر ہوتا رہا۔
اسی وجہ سے ۱۹۴۵ء میں جب انھوں نے جامعہ کی خدمت کی
دعوت دی تو میں نے یہ دعوت بطیب خاطر منظور کر لی۔
موڈرن اسکول کے سکریٹری اور پرنسپل صاحبہ کو میرا یہاں
آنا ناگوار گزرا اور بعض احباب جامعہ نے بھی یہی رائے دی
کہ آپ کا گزارہ یہاں نہیں ہو سکے گا میں نے ان امور کو
نظر انداز کیا اور خدا اور اپنی ذات پر بھروسہ کر کے ۱۳ جنوری ۱۹۴۵ء
سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مدرسہ ثانوی میں کام کرنا شروع کر دیا
میرے تقرر کے بارے میں جو خط مرحوم ڈاکٹر صاحب نے
رجسٹرار صاحب جامعہ کے نام لکھا تھا اس سے اس تقرر
پر روشنی پڑتی ہے۔

نقل تحریر جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ :-

جناب مسجل صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ۔

جناب عالی۔ السلام علیکم۔

محمد شفیع الدین نیر کا تقرر مدرسہ ثانوی میں استاد
کی حیثیت سے بہ امید منظوری مجلس منتظمہ ۱۳ جنوری ۴۵ء سے
کیا گیا ہے۔ یہ مشاہرہ مبلغ [illegible] ہوگا۔ نیر صاحب نے
میری درخواست پر ایک سو پچیس روپیہ ماہوار کی ملازمت
سے علاحدگی اختیار فرما کر جامعہ کی خدمت قبول کر لی ہے میں
نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ رہنے کے لیے مکان اقامت گاہ میں
دے سکوں گا لیکن اس کا انتظام نہ ہو سکا اس لیے انھیں مبلغ
۱۵ بطور کرایہ مکان دیے جانے کی سفارش کرتا ہوں۔ نیز یہ
کہ ان کا تقرر تاریخ کارکردگی سے کیا جائے اور آزمائشی مدت
کی شرط سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ براہ کرم مجلس منتظمہ میں میری
تحریر پیش فرما دیں۔ شکریہ۔ نیاز مند۔

(ذاکر حسین)

جامعہ میں آیا تو جامعہ کی پچیس سالہ جوبلی کی تیاریاں
شروع ہو چکی تھیں اس لیے مقررہ درس و تدریس کے علاوہ،
یوم شبلی کی تیاری، دہلی کے ادیب اور شاعروں کے حالات
اور تصاویر اور تحریر کے نمونے جمع کرنا، آل انڈیا اردو مشاعرہ
کی تنظیم اور بیت بازی کی تیاری کی ذمہ داری بھی میرے سپرد
ہوئی جوبلی ۱۹۴۶ء میں ہوئی۔ ڈیڑھ سال کا یہ زمانہ شبانہ
روز مصروفیت میں گزرا۔ جامعہ کے لیے چندہ جمع کرنے کی
غرض سے عبدالرزاق صاحب کے ساتھ بہار کا دورہ بھی کیا
غرض خدا کے فضل سے یہ تمام خدمات حسن و خوبی انجام پذیر
ہوئیں۔ آل انڈیا مشاعرہ کے انتظام اور انصرام میں ڈاکٹر ذاکر

حسین صاحب کے علاوہ ڈاکٹر سید عابد حسین اور ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی نے میری مدد کی، غرض یہ زمانہ خواب کی طرح گزر گیا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں آزادی آئی اور بربادی بھی اپنے ساتھ لائی۔ پانچ ماہ کی غیر حاضری کے بعد جنوری ۱۹۴۸ء میں جامعہ آیا تو پورے اسکول میں پانچ چھ طلبہ سے زیادہ نہ تھے ڈاکٹر صاحب نے ہدایت فرمائی کہ یہ زمانہ مطالعہ کتب میں گزارا جائے آہستہ آہستہ طلبہ کی تعداد بڑھنے لگی اور پھر وہی پرانی سی چہل پہل نظر آنے لگی۔

۱۹۵۰ء میں میری کچھ کتابیں حالی پبلشنگ ہاؤس اور رائل ایجوکیشنل بک ڈپو نے شائع کی تھیں اور مجھے اچھی خاصی آمدنی ان کتابوں کی رائلٹی سے ہونے لگی تھی کچھ روپیہ پرووڈنٹ فنڈ کا موڈرن اسکول سے مجھے ملا تھا غرض جامعہ کی قلیل تنخواہ کے باوجود جیسے تیسے گھر کا خرچ چلتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب کا اثر تھا کہ لوگ ہر حالت میں کام میں لگے رہتے تھے تنخواہ کی کمی، ترقی، رعایت کی خواہش کسی میں نہیں تھی سب کے سب ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی میں بطوع خاطر ہر قسم کی مالی پریشانیوں میں مبتلا رہتے پر قانع تھے ڈاکٹر صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ چلے گئے ان کے قائم مقام پروفیسر محمد مجیب صاحب بنے آزادی کے بعد امن چین ہونے پر حکومت کی اس ادارے کی طرف توجہ ہوئی سرکاری امداد ملی تو پہلا سوال لیاقت سے زیادہ تعلیمی سندوں کا پیش آیا۔ کچھ ساتھی ایسے بھی تھے جن کے پاس اونچی سندیں تو نہ تھیں مگر سالہاسال سے وہ جامعہ کی خدمات صبر اور شکر کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔

میں جامعہ میں نیا تھا۔ تعلیم صرف ادیب کامل اور انگریزی انٹرمیڈیٹ اور موڈرن ہائی اسکول کی زندگی کا تعلیمی تجربہ اور بس۔ اب تک یہی سنا تھا کہ آدمی کی استعداد اور کارکردگی کی صلاحیت دیکھی جاتی ہے۔ جامعہ میں سندوں کی پرواہ نہیں کی جاتی مگر حالات کی تبدیلی سے یہ خیالات بھی خواب ہو گئے۔

طبیعت بہت جزبز ہوئی مگر خدا نے فضل فرمایا ۱۹۵۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سولن سے بی اے کا امتحان انگریزی خاص اور تاریخ میں پاس کر لیا انگریزی میں تو نمبر کم آئے۔ فارسی اور تاریخ میں نمبروں کی مجموعی تعداد ۶۵٪ تھی۔

مجیب صاحب اُس زمانے میں کشمیر گئے ہوئے تھے میں نے ایم اے کے امتحان میں شریک ہونے کی اجازت کے لیے موصوف کی خدمت میں عریضہ ارسال کیا۔ اختصار مدنظر ہے اپنے خط سے قطع نظر کرکے صرف جواب نقل کر دینے پر اکتفا کرتا ہوں۔

۴ جولائی۔

برادرم نیر صاحب۔

السلام علیکم۔ آپ کا محبت نامہ پرسوں ملا آپ کی کامیابی کی خبر سن کر انتہائی مسرت ہوئی۔ لیکن آپ کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین بھی تھا کہ آپ کو ضرور نمایاں کامیابی حاصل ہوگی۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کی محنت بار آور ہوئی اور میرا یقین اور پختہ ہوگیا۔ شاید آپ جانتے ہوں گے کہ میں کسی کی بے حد تعریف نہیں کرتا۔ مگر میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ میری اس عادت کی وجہ سے غلط فہمی پیدا ہو مجھے جب کبھی خیال ہوتا ہے کہ جامعہ کے تعلیمی کاموں میں باقاعدگی اور استقلال نہیں ہے تو آپ کے طریق کار کو اور اس اعتبار کو جو اس نے آپ کے تمام ساتھیوں میں پیدا کیا ہے، یاد کرتا ہوں اور دل کو سہارا ہو جاتا ہے۔ میں ہندستان میں کسی یونیورسٹی کو اس قابل نہیں سمجھتا ہوں کہ آپ کا امتحان لے سکے، اگرچہ یہ بھی ضروری سمجھتا ہوں

کہ آپ کی خواہش پوری ہو جائے۔

اگلے سیشن میں چاہتا ہوں کہ زیادہ وقت مدرسہ ثانوی میں صرف کروں اور آپ نے جو طریقہ اول اور دوم کے نصاب کو پڑھانے کا جاری کیا ہے، وہ اور مضمونوں میں بھی رائج کراؤں۔ اس لیے میرے خیال میں بہتر ہوگا کہ آپ ایم اے اردو میں کریں تاکہ مجھے آپ سے مشورہ کرنے میں تامل نہ ہو۔ آپ کو بہت دنوں سے چھٹی لینے اور آرام کرنے کا موقع نہیں ملا ہے، مگر اس کے لیے میں کوئی اور بہتر شکل سوچ رہا ہوں۔

میں ان شاء اللہ ۲ جولائی کو دہلی پہنچ جاؤں گا۔

آپ کا مخلص۔

محمد مجیب۔

مختصر یہ ہے کہ پروفیسر محمد مجیب صاحب شیخ الجامعہ کا ہمدردانہ رویہ میرے لیے سازگار ہوا اور ۱۹۵۳ء میں اردو ایم اے کا امتحان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اول درجے میں پاس کر لیا اس کامیابی سے میرے دل کو بڑی تسکین ہوئی اور میری ہمت بہت بڑھ گئی مگر مالی مشکلات کے حل کی کوئی سبیل نہ نکل سکی۔

۱۹۵۱ء میں میں نے شیخ الجامعہ صاحب کی خواہش پر جامعہ کا حیاتی رکن بننا منظور کر لیا تھا اس میں جامعہ کی بیس سال تک خدمت کا عہد تھا مگر معاشی اور ذہنی پریشانی میں مبتلا رہ کر یکسوئی سے کام ہو تو کیسے ہو۔ مجبور ہو کر اپنی ضرورت کے پیش نظر میں نے شیخ الجامعہ صاحب کی خدمت میں درخواست دی۔ موصوف کی ذاتی امداد کا میرے ساتھ تھی مگر بعض ارکان جامعہ کی طرف سے مخالفت کا اندیشہ تھا۔ آپ نے یہ سبیل نکالی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے میرے مسئلے پر بات چیت کی اس گفتگو کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور ڈاکٹر صاحب نے پروفیسر محمد مجیب صاحب کو میری تائید میں خط لکھا۔

غرض ان بزرگوں کی تائید اور اعانت سے یہ مسئلہ میری منشا کے مطابق طے ہو گیا۔ میری خواہش پر ۱۹۵۶ء میں میری منتقلی جامعہ کالج میں ہو گئی اور جولائی ۱۹۵۶ء سے جامعہ کالج میں درس و تدریس کی خدمت انجام دینی شروع کی یہ سلسلہ اواخر ۱۹۶۹ء تک، تقریباً ۱۴ سال جاری رہا۔ میرا خیال ہے کہ یہ زمانہ بڑی کامیابی سے گزرا۔ میرے شاگرد، میرے ساتھی کالج کے پرنسپل اور شیخ الجامعہ صاحب میرے کام سے مطمئن رہے۔ جامعہ میں تصنیفی کام کی فرصت کم ملی۔ البتہ موڈرن ہائی اسکول میں نظم اور نثر کی جو کتابیں میں نے لکھ لی تھیں، ان کی اشاعت ہوتی رہی۔ کالج کی ملازمت کے آخری زمانے میں اپنے محترم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب صدر جمہوریہ ہند کے ارشاد پر میں نے غالب کی کہانی لکھی۔ اس کتاب کے ذریعے میں نے مرزا صاحب اور ان کی شاعری اور نثر نگاری سے بچوں کو روشناس کرایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب میری اس محنت سے بہت خوش ہوئے اور کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو چکنے کے بعد میرے لیے کچھ کرنے کا وعدہ فرمایا۔ افسوس کہ وہ میری سبکدوشی سے پہلے ہی سفر آخرت اختیار کر گئے۔ انھیں کی ایما پر میں نے دلّی کے نئے ادیب اور شاعر کے موضوع پر ایک ضخیم کتاب لکھنی شروع کی تھی جامعہ کی جوبلی کی رعایت سے ایسے پچیس اصحاب کا حال لکھنا طے ہوا۔ چودہ اصحاب پر مقالے لکھ چکا تھا ان میں سے سات مقالے مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ زندگی رہی تو اس کام کے مکمل کرنے کا ارادہ ہے اسی زمانے میں مختلف موضوعات پر اتنی نظمیں جمع ہو گئی ہیں کہ ایک درجن کے قریب ان کے

چھوٹے چھوٹے مجموعے شائع ہو سکتے ہیں پروفیسر محمد مجیب صاحب کی فرمائش پر نظیر اکبرآبادی پر بھی ڈیڑھ سال کے قریب کام کیا موصوف نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے سفارش کی تھی کہ وہ اس کام کے لیے فیلوشپ منظور کرے۔ مگر یہ نہ ہو سکا اور دوسری ضروری مصروفیتوں کی وجہ سے یہ کام جاری نہ رہ سکا خدا کی مرضی ہوئی تو بچوں کے لیے نظیر پر اب بھی ایک چھوٹی موٹی کتاب لکھنے کا ارادہ ہے دیکھیے وہ کب پورا ہوتا ہے جامعہ کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنی سماجی نظموں کا مجموعہ 'ہماری زندگی' کے نام سے شائع کیا اس پر اترپردیش اردو اکادمی نے مجھے ایک ہزار روپیہ کا اعزاز بخشا۔ گذشتہ پچاس سال کی مدت میں میں جو بھی تھوڑی بہت اردو زبان اور بچوں کے ادب کی خدمت کر سکا ہوں۔ اس میں بڑا حصہ ذاکر صاحب کی حوصلہ افزائی کا ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔

اسی زمانے میں کئی سال جمعیۃ العلماء ضلع نئی دہلی کا صدر رہا مگر چونکہ کئی سال تک میں کچھ بھی کام نہ کر سکا، اس لیے میں نے نام کا صدر رہنا مناسب خیال نہیں کیا۔ ذاکر صاحب نے جامعہ اردو علی گڑھ کے لیے جامعہ کی طرف سے مجھے اپنا نمائندہ تجویز فرمایا۔ اس وقت سے لے کر جامعہ کا نمائندہ نہ سہی کسی نہ کسی صورت میں جامعہ اردو کا رکن رہا ہوں اور شاید اب میں سب سے پرانا رکن باقی رہ گیا ہوں۔ پچیس برس کے قریب اس مدت میں جہاں تک ہو سکا ہے، اس کی ترقی اور نیک نامی کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ جامعہ کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب کی صدارت میں جو الوداعی جلسہ ہوا اس میں موصوف نے اور پرنسپل کالج ضیاء الحسن صاحب فاروقی نے میری خدمات کو جن الفاظ میں سراہا اس کے لیے میں ان کا ہمیشہ ممنون رہوں گا۔ اس کے بعد ۱۷ اگست ۱۹۶۹ء کو جامعہ ٹیچرز ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس میں جملہ ارکان کی طرف سے جناب عبداللطیف اعظمی سکریٹری نے جو تحریر پڑھ کر سنائی وہ بھی میرے دل کو ہمیشہ گرمانی رہے گی۔

بات میں سے بات نکلتی رہی، اور یوں سلسلہ طویل ہوتا گیا میں نے اپنی دانست میں بہت ہی اختصار سے کام لیا ہے۔ میری ناچیز زندگی کا اسے ایک خاکہ سمجھیے۔

۱۹۶۹ء میں پینسٹھ برس کی عمر میں جامعہ کی ملازمت کے بعد سے زیادہ تر وقت کتابوں کے مطالعے میں گزرتا ہے۔ کتابوں کے مطالعے کا مجھے بچپن سے شوق ہے حسب ضرورت نظمیں بھی لکھ لیا کرتا ہوں۔ کمزوری بڑھتی جا رہی ہے اور آئے دن کسی نہ کسی شکایت میں مبتلا رہنے لگا ہوں ۱۹۷۶ء کا تقریباً پورا سال کم و بیش علالت میں گزرا پھر بھی جہاں تک ممکن ہوتا ہے اپنے آپ کو مصروف رکھتا ہوں اور میری تمنا یہ ہے کہ آخری وقت تک کسی نہ کسی مفید کام میں مصروف رہ سکوں۔

میں آخر میں اپنے بزرگوں اور دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے یہ ادبی شغل جاری رکھنے میں میری مدد کی ہے ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین، خواجہ غلام السیدین، بابائے اردو مولوی عبدالحق۔ خواجہ حسن نظامی، ڈاکٹر سعید احمد بریلوی لالہ رگھوناتھ سہائے اور حکیم کوثر چاندپوری اور حامد علی خاں مینیجنگ ڈائرکٹر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور جناب یونس دہلوی مینیجر شمع اور جناب شیلیش، جیندر طالب دہلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میں اردو، انگریزی اور ہندی کے اخبارات اور رسالوں کا بھی شکر گزار ہوں، جنھوں نے میری کتابوں

پر حوصلہ افزا تبصرے فرمائے اور میرے کام کو پبلک سے روشناس کرایا۔

پیام تعلیم، کھلونا دہلی، غنچہ بجنور، رتن جموں، سعادت لاہور، بچوں کی دنیا الہ آباد اور کلیاں اور نونی لکھنؤ نے وقتاً فوقتاً میری کتابوں کی اشاعت میں میری مدد کی میں مکتبہ جماعت اسلامی اور ایجوکیشنل بک ہاؤس کا بھی احسان مند ہوں جو میری کتابوں کی اشاعت میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

میں اپنے کام میں مصروف تھا۔ مجھے خیال بھی نہیں تھا کہ میری ناچیز خدمات کسی تحسین کی مستحق ہیں ۱۷ / جنوری ۱۹۷۸ء کی بات ہے کسی تقریب سے لبرٹی پریس، دہلی میں شاہد علی خاں صاحب، جنرل منیجر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ سے ملاقات ہوگئی انھوں نے فرمایا کہ آپ کی ادبی خدمات کے اعتراف میں پیام تعلیم ایک مخصوص نمبر نکالنا چاہتا ہے''۔ یہ خوش خبری سن کر تھوڑی دیر کے لیے تو میں سُن ہو کر رہ گیا مجھے معلوم تھا کہ شاہد صاحب کتنے پختہ ارادے کے آدمی ہیں میں پچھلے تیس سال سے انھیں جانتا ہوں کاروباری ہوتے ہوئے بھی انھیں اردو ادب اور شاعری سے دلچسپی ہے۔ مجھے اپنی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں کسی سے کچھ کہنے میں بڑا تکلف ہوتا ہے۔ لیکن ان کی اس دلچسپی کو دیکھ کر بارہا میں نے ان سے اس سلسلے میں مدد لی ہے اور انھوں نے خندہ پیشانی سے مدد کی ہے۔ ان کا منصوبہ کامیاب رہا تو اس سے دوسرے بچوں کے ادیبوں اور شاعروں کی بھی بڑی ہمت افزائی ہوگی اور اس صنف ادب کی ترقی کی نئی راہیں نکل جائیں گی اور ان کا نام بھی بچوں کے ادب کے محسنوں میں شمار ہونے لگے گا۔ اس منصوبے کی کامیابی

اس لیے بھی یقینی ہے کہ پیام تعلیم کے موجودہ ایڈیٹر جناب ولی صاحب اسے شاندار بنانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ میں ان کی عمر، علالت، اور ان کی مصروفیت کی نوعیت کو دیکھتا ہوں تو مجھے حیرت ہونے لگتی ہے کہ وہ اپنے اتنے فرض کس طرح ادا کر لیتے ہیں، انھیں بچوں کے ادب سے بڑی دلچسپی ہے اور اسی لیے وہ ہمیشہ سے میری ہمت افزائی فرماتے رہے ہیں۔ ولی صاحب پیام تعلیم کے اس مخصوص نمبر کی ترتیب و تہذیب میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ پیام تعلیم کا یہ خاص نمبر غیر معمولی مقبولیت حاصل کرے گا ان اصحاب قلم کا شکریہ ادا کرنا میری طاقت سے باہر ہے جنھوں نے پیام تعلیم کی دعوت پر اپنے مضامین نظم و نثر سے اس نمبر اس ماہنامے کو نوازا ہے۔ غرض شاہد صاحب نے یہ منصوبہ بنا کر مجھے ایک دفعہ پھر یہ موقع بہم پہنچایا ہے کہ:۔

تمھاری سینہ فگاری کوئی تو دیکھے گا۔
نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے کبھی تو دیکھے گا۔

(۶۸ کا بقیہ)

بچوں کے ادب کی کوئی بھی تاریخ نیر صاحب کی خدمات کو نمایاں حیثیت دیئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ نیر صاحب کو اپنی زندگی میں جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے، بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی۔ وہ اہل علم کی کوتاہیوں کے باوجود بہت آگے ہیں اور ہمیشہ آگے رہیں گے۔

محمد شفیع الدین نیر ایم اے

پکّا ارادہ

(نیر صاحب کی تازہ ترین نظم)

کوئی بھی کام ہو کرنا ارادہ اُس کا لازم ہے
ارادہ ہو اگر پکّا تو اچھا کام ہوتا ہے
ارادے ہمّت اور محنت کے ہوتے دل کیتا ہے
ارادے سے ہماری طاقتیں بیدار ہوتی ہیں
طریقے کامیابی کے ارادہ ہی سُجھاتا ہے
کسی بھی امتحان میں کامیابی کی طلب ہوگی
یہ محنت سرخ روئی کی سند ہم کو دلائے گی
نئے علم اور نئے فن جس قدر دنیا میں پھیلے ہیں
نہ ہوتے کوششوں میں عزم و استقلال تو ان کے
انوکھی ایسی ایجادیں نہ دنیا کو کبھی ملتیں
یہ اہلِ عزم و ہمّت معجزے کیا کیا دکھاتے ہیں
نہ سیلابوں سے رُکتے ہیں نہ طوفانوں سے ڈرتے ہیں
ارادہ ہی مدد دے گا بدی سے باز رکھنے میں
اگر ہم سعی و کوشش کے قدم آگے بڑھائیں گے

ارادہ ہی نہیں پکّا ارادہ اس کا لازم ہے
ہر اچھے کام کا اچھا ہی پھر انجام ہوتا ہے
کٹھن ہو کام کیسا ہی وہ پورا ہو کے رہتا ہے
اسی کی شہ پر کوشش کے لیے تیار ہوتی ہیں
یہی جذبہ ہمیں گُر کامیابی کے بتاتا ہے
اگر پکّا ارادہ ہو تو محنت روز و شب ہوگی
یہ محنت ہی ترقی کی نئی راہیں دکھائے گی
بڑے دُکھ عالموں نے اُن کے پھیلانے میں جھیلے ہیں
تو شہرت اور عظمت کچھ کبھی آتی نہ ملتی اُن کے
نہ اس گلشن میں ایسی خوش نما کلیاں کبھی کھلتیں
زمیں تو پھر زمیں ہے آسماں تک اُڑ کے جاتے ہیں
ارادہ کر لیا جس کام کا بھی کر گزرتے ہیں
یہی یاور بنے گا نیکیوں سے ساز رکھنے میں
تو ہر ہر گام پر اللہ کی امداد پائیں گے۔

ہمیں بھی ہمت اور محنت اگر دل سے گوارا ہوں
خدا کی رحمتیں نیر ہمارا بھی سہارا ہوں

●

(بقیہ میاں مٹھو صفحہ سے آگے)

ہرے ہرے پودے، اونچے اونچے اور گھنے گھنے درخت۔ عجیب بہار تھی! دیکھتے ہی آنکھوں میں تراوٹ آگئی۔ دل کھل گیا۔ اِدھر اُدھر ذرا کھیلے کودے تھے کہ بھوک لگنے لگی۔ میاں مٹھو نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "وہ دیکھو۔ آم کے اس پیڑ پر کیسے بڑے بڑے اور پکے پکے آم لگے ہیں۔ پیڑ خوب گھنا ہے۔ کوئی دیکھ بھی نہ سکے گا۔ چلو آم کھائیں۔" اس بے چارے کو کیا خبر تھی کہ اس کرنی کا پھل کیا ملے گا۔ اس نے کہا "اچھا" اور میاں مٹھو کے ساتھ ہولیا۔

دونوں آن کی آن میں اس درخت پر جا پہنچے پکے پکے آم جو چکھے تو ان کا مزا بہت اچھا معلوم ہوا پھر کیا تھا خوب پیٹ بھر کھائے۔ پیٹ بھر گیا۔ نیت پھر بھی نہیں بھری۔ لاؤ۔ ایک اور کھالیں۔ یہ اسی طرح کھا رہے تھے کہ باغ کا رکھوالا گھومتا گھومتا اِدھر آنکلا۔ اس نے جو کترے ہوئے آم گرتے دیکھے تو سمجھا کہ توتوں کے جھنڈ نے اس پیڑ پر دھاوا بولا ہے۔ اس نے جھٹ ایک غلّہ گوپھیے میں لگایا اور چکّر دے کر جو مارا تو ان دونوں کے لگتا، پتوں سے گزرتا، دور جاکر پڑا۔

دونوں سمجھے کہ بندوق کی گولی آکر لگی۔ اس چوٹ سے زمین پر گر پڑے۔ رکھوالے نے ان کی طرف کچھ دھیان نہ دیا۔ گر تو گئے مگر خیر یہ ہوئی کہ جان بچ گئی۔ میاں مٹھو کا تو ایک بازو زخمی ہوا اس کے ساتھی کے دو چار پر ہی جھڑ کر رہ گئے۔

اس چوٹ کا اثر کچھ ہوا تو ساتھی نے کہا "اللہ تیرا شکر ہے۔ جان بچی۔ لاکھوں پائے۔ کہو، دوست! تمھارا کیا حال ہے!"

میاں مٹھو نے کہا "بھائی! کچھ نہ پوچھو بازو ٹوٹ گیا ہے۔ خون بہہ رہا ہے۔ کمزوری بڑھ رہی ہے دل بیٹھا جاتا ہے۔ گھڑی دو گھڑی کا مہمان ہوں۔ اب شام ہونے کو آئی ہے۔ میرے ابا اور اماں گھونسلے میں آگئے ہوں گے۔ تم مجھ پر اتنا احسان کرو کہ ابھی اُڑ کر جاؤ اور انھیں یہاں بلا لاؤ۔ انھوں نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ بیٹا لالچ میں نہ آنا۔ پرائی چیز کبھی نہ چرانا۔ افسوس میں نے ان کی بات نہ مانی۔ اب مرتے وقت ان سے اپنی خطا بخشوا لوں تو جی کو خوشی ہو جائے گی۔ اب دیر نہ کرو"

یہ کہہ کر وہ تو مارے درد کے لگا ہائے ہائے کرنے۔ اور یہ جھٹ پٹ اُڑتا ہوا اس کے گھونسلے میں پہنچا۔ میاں مٹھو کے ماں باپ چر چُگ کر آچکے تھے۔ اور اس سوچ میں اداس بیٹھے تھے کہ نہ جانے بچہ کہاں چلا گیا۔ اب تک کیوں نہیں آیا۔ وہ اس کی تلاش میں کہیں جانے ہی والے تھے۔ کہ یہ پہنچ گیا۔ اس کی زبانی میاں مٹھو کے زخمی ہو جانے کا حال سنا۔ یہ سن کر اُن کے ہاتھوں کے توتے اُڑ گئے۔ دونوں اُسی وقت وہاں آئے۔ بچّہ کا زخم دیکھ کر بہت گھبرائے۔ مگر نرے گھبرانے سے کیا ہو سکتا تھا یہ سوچ کر اس کا باپ اسی وقت اُڑا۔ اور ایک بڈھے توتے کے پاس گیا۔ یہ بُڈھا توتا بہت دانا تھا۔ اور آڑے میں توتوں کے ہمیشہ کام آیا کرتا تھا۔ اس نے جاکر اس کو سارا حال سنایا۔ وہ توتا بڈھا اور کمزور تھا۔ مگر خدا نے رحم اور ہمدردی اس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ وہ ہر وقت دوسروں کی خدمت کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ وہ دوسروں کی

خدمت کو سب سے بڑی بھلائی سمجھتا تھا۔ وہ اسی وقت ایک بوٹی لے کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ یہ بوٹی ایسے زخموں کو اچھا کرنے میں جادو کا اثر رکھتی تھی۔ ان کے ساتھ دو تین چھوٹے چھوٹے توتے اور بھی ہو لیے۔ تاکہ اپنے ساتھی کو دیکھیں اور ہو سکے تو اس کی کچھ مدد بھی کریں۔ بڈھے توتے نے زخم دیکھا تو کہا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ خدا نے چاہا تو یہ جلد اچھا ہو جائے گا۔ ابھی دوا لگائے دیتا ہوں۔ مگر زخم پر خون جم گیا ہے اس کو دھونے کے لیے پانی کی ضرورت ہوگی۔ زخم دھل سکا تو دوا بھی جلد اثر کرے گی۔" چھوٹے توتوں نے کہا۔ "اس کام کے لیے ہم حاضر ہیں۔ جاتے ہیں اور پانی لے کر ابھی آتے ہیں" یہ کہہ کر ان میں سے دو توتے اڑ گئے۔ انھوں نے بڑی پھرتی سے ڈھاک کے پتوں کا ایک دونا بنایا اور تالاب کے کنارے جا کر اس دونے میں پانی بھر لیا اور بڑی ہوشیاری سے اس کو اپنی اپنی چونچ میں پکڑ کر آم کے درخت کے نیچے لے آئے۔

بڈھے توتے نے پہلے تو اچھی طرح زخم دھویا پھر اس نے وہ بوٹی جو اپنے ساتھ لایا تھا، ایک پتھر پر گھسی اور آہستہ آہستہ اس زخم پر لگائی اور کہا "خدا نے چاہا تو صبح تک یہ زخم اچھا ہو جائے گا، اور یہ آپ اپنے پروں سے اڑ کر جا سکے گا۔"

یہ کہہ کر اور بہت ڈھارس بندھا کر بڈھا توتا چلا گیا۔ چھوٹے توتے بہت دیر تک بیٹھے میاں مٹھو کا دل بہلاتے رہے۔ جب شام کا اندھیرا ہوا تو دوسرے دن سویرے آنے کا وعدہ کر کے یہ بھی چلے گئے۔

بیچارے ماں باپ ماتا کے مارے رات بھر خدا سے دعا مانگتے رہے کہ ان کا بچہ اچھا ہو جائے۔ میاں مٹھو کچھ دیر تو کراہتے رہے۔ پھر دوا سے کچھ ایسی ٹھنڈک پڑی کہ ان کو نیند آ گئی اور صبح ہوتے ہوتے ان کا زخم اتنا اچھا ہو گیا کہ وہ اپنے ماں باپ کا سہارا لیے ہوئے اڑ کر اپنے گھونسلے میں آ گئے۔

ماں باپ کو میاں مٹھو کی طرف سے اتنی فکر تھی کہ اس سے اب تک کچھ بھی نہ کہہ سکے تھے۔

میاں مٹھو نے آپ گھونسلے میں آ کر اپنے ماں باپ سے اس خطا کی معافی چاہی وہ کہنے لگا۔

"اب میں کبھی لالچ نہ کروں گا۔ پرائی چیز کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا۔ چوری کا خیال تک میرے دل میں نہ آئے گا۔ میری بھلائی کی جو بات بھی آپ مجھے بتائیں گے۔ میں دل سے اس پر عمل کروں گا۔"

اپنے بچے کی یہ باتیں سن کر ماں باپ اپنا سارا غم بھول گئے۔ خوشی کے مارے ان کے چہرے پھول کی طرح کھل گئے۔ انھوں نے میاں مٹھو کی خطا معاف کر دی۔ اسے پیار کیا اور دعائیں دیں۔

اس کے بعد یہ سب ہنسی خوشی اسی طرح مزے سے رہنے لگے جس طرح اور توتے مدت سے نیم کے اس درخت پر رہتے چلے آئے تھے۔

قطعۂ تاریخ

ناوک حمزہ پوری

رخشاں ہے فلک پہ نیر پیام تعلیم
اے صلی علیٰ! انجمن در پیام تعلیم
فردوس نظر ہے، راحت دل و جاں بھی ہے
یہ روئے نگار پیام تعلیم

۱۳۹۷ھ

Regd. No. D(S)-097

SEPTEMBER, 1977.

Payam-I-Taleem

NEW DELHI-110025

پیام تعلیم

انجمن اصلاح الطلبا کے دوسرے جلسے کے موقع پر درمیان میں پیر صاحب ۱۹۲۵ء

جلد ۱۴ شمارہ ۱۰

ایڈیٹر:۔ ولی شاہجہاں پوری

اکتوبر ۱۹۷۷ء

قیمت فی پرچہ ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ سات روپے

اس شمارے کی قیمت: ایک روپیہ

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دلی ۲۵ سے شائع کیا۔

علامہ گوپی ناتھ صاحب امن لکھنوی
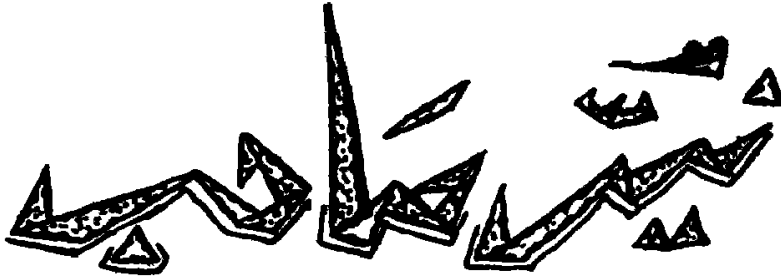
مرے محسن شفیع الدین نیتر
ہیں علم و حلم کے حامل برابر

بہت خاموش خدمت کی ادب کی
رہی اُن پر عنایت خاص رب کی

رہے جو بچّے اُن کے طالبِ علم
ہے بہرہ علم کے ایثار اور حلم

جواب اعزاز ان کا ہو رہا ہے
بہت موزوں ہے، زیبا ہے، بجا ہے

جو اسماعیل تھے پچھلی صدی کے
انھوں نے بہرِ طفلاں شعر لکھے

وہ نیترّ نے روایت رکھی قائم
رہی بچّوں کی الفت دل میں دائم

اسی جذبے سے لکھے ایسے اشعار
ہیں جن میں علم و حلم و جذب و ایثار

سلیقہ چھوٹے بچوں کو سکھایا
انھیں تہذیب کا رستہ دکھایا

مرے لڑکوں نے اُن سے فیض پایا
جو اُن کی زندگی میں کام آیا

ہزاروں اُن کے منّت کش ہوئے ہیں
ہیں خوش قسمت جو اُن سے کچھ پڑھے ہیں

نہیں ہے ذاتِ نیترّ میں تصنّع
ہے اُن کے خلق میں داخل تواضع

سنیں باتیں اگر اُن کی زبانی
تو گویا ہو رہی ہے گل فشانی

زبانِ سہل میں ہے دل کشی بھی
کجی خامی نہیں ہے اُن میں کوئی

بہت سے دیکھے نیتّر ایسے ویسے
مگر ہیں شاذ و نادر اُن کے جیسے

صد و سی سال اُن کی زندگی ہو
فزوں رخشندگی تابندگی ہو

ہے امنِ لکھنوی مدّاح اُن کا
ابھی کل یہ عقیدت نامہ لکھا

بچوں سے باتیں

لیجیے حسب وعدہ نیرؔ نمبر کا ضمیمہ بھی حاضر ہے۔ ہمیں ان خطوط کو دیکھ کر جو ستمبر کے شمارے کے متعلق اب تک موصول ہوئے ہیں، خوشی ہوئی ہے کہ احباب اور بزرگوں نے نیرؔ نمبر کو اس کی بعض خامیوں کے باوجود پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ نیرؔ صاحب پر مختلف زاویوں سے اُن کے مداحوں کی نگارشات کو خاصا سراہا گیا، اور ہمارے جس اقدام کو سب سے زیادہ داد اور تحسین ملی وہ یہ ہے کہ ہم نے بچوں کے ایک ادیب کو اس کی حیات میں خراجِ عقیدت پیش کرنے میں سبقت کی۔

سب سے پہلے نیرؔ صاحب ہی نے ہمیں مبارک باد کا خط لکھا کہ ہم نے اس جدت کے ذریعہ بچوں کے ادیب اور شاعر کی خدمات کی اہمیت کا احساس دلایا۔ اور بھی بہت سے احباب نے جو خطوط لکھے ہیں، انھیں ہم اس شمارے میں شائع کرنے کی گنجائش نہ نکال سکے، ہم کوشش کریں گے کہ آپ کو ان سے روشناس کرائیں۔

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، نیرؔ صاحب پر مضامین ہماری توقع سے زیادہ تعداد میں آ گئے تھے۔ اس شمارے کے بعد بھی کچھ مضامین باقی رہ گئے ہیں جنھیں اپنے محدود وسائل کے سبب ہم سر دست شائع نہیں کر پائے۔ ایسے اصحاب سے ہم معذرت خواہ ہیں، کوشش کریں گے کہ عام شماروں میں دے سکیں۔

ہمیں اس کا احساس ہے کہ بعض ایسے مضامین جو ستمبر کے شمارے میں جانے چاہیے تھے مگر نہ دیے جا سکے، اس کی وجہ ہم پچھلے شمارے میں بتا چکے ہیں۔ ایسے بعض کرم فرماؤں کو ستمبر کے شمارے میں اپنا نام نہ دیکھ کر یقیناً کوفت ہوئی ہوگی۔ ہم ان سے معذرت خواہ ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ اس شمارے کے ملاحظہ کے بعد ہماری طرف سے بدگمانی رفع ہو جائے گی۔

ہمیں افسوس ہے کہ یہ شمارہ بھی آپ تک تاخیر سے پہنچ رہا ہے۔ اس کی وجہ دلّی میں ملیریا اور فلو کی وہ وبائیں تھیں جنھوں نے ادارے اور مکتبہ جامعہ کے دوسرے کارکنوں میں سے کسی نہ کسی کو خود یا گھر کے افراد کو اپنا شکار بنا رکھا ہے۔ اگر کسی خوش قسمت پر اُن کا زور نہ چلا تو اسے تیمارداری نے جکڑ رکھا۔ ورنہ قاعدے کے مطابق تو، شمارہ آپ تک ستمبر کی ہی آخری تاریخوں میں پہنچ جاتا۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ یہ اپنے وقت پر ہی شائع ہوگا۔

نیرؔ نمبر کی قیمت غلطی سے پانچ روپے چھپ گئی تھی دراصل اس کی قیمت تین روپے ہے براہ کرم نوٹ فرما لیں۔

مصورِ فطرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کی رائے

ماسٹر محمد شفیع الدین صاحب نیرؔ کو میں اُس وقت سے جانتا ہوں جب کہ وہ ابتدائی کتابیں بچّوں کے پڑھنے کی پڑھتے تھے۔ اور اُس وقت اُن میں ایک خاص قسم کی ہونہاری پائی جاتی تھی۔ وہ بہت بے استطاعت تھے۔ اُن کی گزر اوقات کا بھی کوئی مقررہ سامان نہ تھا۔ مگر اُنھوں نے اپنے خدا داد شوق سے تعلیم حاصل کی۔ اور آج سے دس پندرہ سال پہلے جو پیشین گوئی میں نے اُن کی نسبت کی تھی اُس کو اپنی محنت اور لیاقت سے پورا کر دیا۔

اب وہ اُردو زبان کے بہت اچھے ماہر ہیں۔ اُن کے علمی مضامین اعلیٰ درجے کے رسائل میں شائع ہوتے ہیں اور علمی طبقے میں توجہ اور پسند سے پڑھے جاتے ہیں۔

میری رائے میں وہ اُردو زبان کی تعلیم دینے میں ایسی مہارت حاصل کر چکے ہیں کہ اگر میں دہلی والا پڑھا لکھا نہ ہوتا اور اُردو زبان پڑھنی چاہتا، تو اُن سے سبق لینے میں شرم نہ کرتا۔

اُن کو چھوٹے بچوں کو تعلیم دینے کا نیا سائنس معلوم ہے اور وہ اس خاص اور اہم فن میں معقول تجربہ رکھتے ہیں۔

(دستخط)

(خواجہ) حسن نظامی دہلوی

اُردو کیسے لکھیں

(صحیح املا) (طباعت بذریعہ آفسٹ)

رشید حسن خاں

محمد حسین حسان مرحوم سابق ایڈیٹر

"پیام تعلیم" کی فرمائش پر جناب رشید حسن خاں نے "حرفوں کا جادو" کے عنوان سے کہانیوں کے انداز میں "اُردو املا" کے موضوع پر بچّوں کے لیے ایک سلسلۂ مضامین مئی ۱۹۷۲ء میں شروع کیا تھا جو بہ وجوہ مکمل نہ ہو سکا۔ اب ہماری خواہش پر جناب رشید حسن خاں نے اب تک کی معلومات کی روشنی میں یہ نئی کتاب از سرِ نو طلبہ اور پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کے لیے تیار کی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ طلبہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں گے۔

قیمت: چار روپے۔

کامران ملک سنبھلی

نیر چچا سے مختصر انٹرویو

نیر صاحب ہم سب کے جانے پہچانے ادیب وشاعر ہیں۔ وہ بچوں کے دوست، بڑوں کے ساتھی اور سب کے عزیز ہیں۔ کم لوگ ہی ہوں گے جن کا اتنے لوگوں سے اپنائیت کا رشتہ ہو! آئیے آج ہم نیر صاحب کے بارے میں کچھ بتائیں۔

میں تکان سے چور ہو گیا تھا لیکن اجنبی ہوتے ہوئے بھی میں نے "نیر منزل" ڈھونڈھ نکالی نیر صاحب کو دیکھتے ہی میری ساری تھکن دور ہو گئی۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور اپنا مدعا بیان کیا! ارے بھئی میں کس قابل ہوں جو آپ کو کچھ بتاؤں۔ خیر جب آپ اتنی دور سے آئے ہیں تو ضرور بتاؤں گا۔ تھوڑی دیر میں چچا میاں چائے اور بسکٹ لے آئے۔ چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہوئے چچا اچانک بولے۔ ہاں پوچھیے کیا پوچھنا ہے؟

س۔ نیر چچا آپ اپنی زندگی کے بارے میں بچوں کو کچھ بتانا پسند کریں گے؟

ج۔ میرا نام شفیع الدین نیر ہے۔ والد صاحب کا نام حکیم الدین صاحب تھا۔ میں قصبہ اترولی ضلع علی گڑھ میں ۲۳ فروری ۱۹۰۵ء بروز جمعرات مطابق ۱۰ ار ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ ہجری کو پیدا ہوا۔ آپ پہلے شخص ہیں جس کو میں اپنی صحیح تاریخ پیدائش بتا رہا ہوں کیونکہ مجھے ابھی تک اپنی صحیح پیدائش معلوم نہیں تھی۔ حال ہی میں تحقیق ہو سکی ہے۔ جب میں صرف سات برس کا تھا تو ۱۹۱۲ء میں والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس سے پہلے معمولی مکتبوں میں پڑھتا رہا۔ ۱۹۱۳ء میں (ٹھیک یاد نہیں) اترولی کے ایک مدرسے مصباح الاسلام میں تعلیم شروع کی۔ فارسی میں گلزار دبستان گلستاں کے چند باب پڑھے جس سے اچھی خاصی لیاقت پیدا ہو گئی۔ لوگوں کی مدد پر گزارا تھا۔ بچپن سے ہی لوگ سمجھتے تھے کہ اگر موقع ملا تو یہ بڑا ہو کر ضرور ترقی کرے گا۔

۲۰ اپریل ۱۹۱۵ء کو میرا کام کی تلاش میں دہلی آنا ہوا۔ یہاں چند مہینے اخبار بیچے اور محنت مزدوری کر کے پیٹ پالا۔ شمس العلماء مولانا سید احمد بخاری شاہی امام جامع مسجد دہلی مجھ سے اخبار خریدا کرتے تھے۔ انھوں نے میرے حالات سے واقف ہو کر میری تعلیم کا انتظام کر دیا۔ چند ماہ انگریزی اور حساب سیکھ کر اپریل ۱۹۱۶ء میں اینگلو عربک اسکول دہلی

کی شاخ چوڑی والان کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا۔ اس وقت میری عمر ۱۴ سال تھی۔ میں نے جماعت میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۱۹ء میں نویں جماعت میں آگیا۔ پھر اینگلو عربک ہائی اسکول اجمیری گیٹ میں میرا داخلہ ہوگیا۔ مجھے پانچویں اور آٹھویں جماعت میں ضلع کے امتحان میں شریک ہوکر وظیفہ بھی ملا۔ نومبر ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی اور کانگریس کی تحریک کے سلسلے میں عربک اسکول چھوڑ دیا اور آزاد قومی درسگاہ دہلی میں داخل ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں جامعہ ملیہ علی گڑھ سے میٹرک کا امتحان اوّل درجے میں پاس کیا۔ چونکہ وہاں تعلیم کا خرچ نہیں اٹھا سکا اس لیے مجبوراً دہلی آگیا۔

۱۹۲۳ء سے لے کر معمولی ملازمتیں کیں ٹیوشن کیے اور مندرجہ ذیل امتحان پاس کیے ان تینوں امتحانوں میں اوّل رہا۔

۱۔ فارسی منشی } ایک سال میں
۲۔ ادیب ماہر }
۳۔ ۱۹۲۴ء میٹرک انگریزی میں کیا۔

۱۹۲۵ء میں ادیب کامل ۱۹۲۶ء میں ایف۔اے انگلش سے کیا۔ اور مختلف کتابوں کا مطالعہ کرکے علم بڑھاتا رہا۔ ۱۹۲۸ء سے لے کر ۱۹۶۳ء تک جامعہ ملیہ دہلی میں بحیثیت استاد کام کیا۔ آج کل کتابیں لکھنے اور ترجمے کرنے میں لگا ہوا ہوں۔"

اب میرا ذہن کھیل کی طرف گیا۔ میں نے ان سے کھیلوں کے بارے میں پوچھا

وہ چائے ختم کرتے ہوئے بولے مجھے کبھی کھیل کا وقت نہیں ملتا تھا۔ ویسے کبھی کبھی فٹ بال بھی کھیلا اور گلی ڈنڈا بھی کرکٹ کا بھی کچھ شوق تھا لیکن کھیل کا موقع بہت کم ملا۔"

اب میں اپنے اصلی سوال کی طرف پلٹا اور پوچھا نیر چچا آپ یہ بتائیے کہ یہ لکھنے لکھانے کا شوق آپ کو کب سے ہوا؟ وہ میرے اس سوال پر سنجیدہ ہوگئے مجھے ایسا لگا کہ جیسے وہ اپنے ماضی کے بارے میں سوچ رہے ہوں۔ کچھ سوچتے ہوئے بولے:

"میرا ۱۹۲۸ء میں موڈرن ہائی اسکول میں تقرر ہوا۔ ۱۹۴۸ سال وہاں اردو کا ماسٹر رہا۔ اس زمانے میں میرے مضمون اور ترجمے چھپنے لگے تھے۔ اسکول میں انگریز استانی کو چھوٹی چھوٹی نظمیں پڑھاتے دیکھا تو میں نے سوچا کہ جب یہ انگریزی زبان سے فائدہ اٹھاتی ہیں تو کیوں نہ ہم بھی اپنی مادری زبان سے فائدہ اٹھائیں۔ میں نے کچھ نظمیں لکھیں اور کلاسوں میں ان سے فائدہ اٹھایا۔ میرے ساتھ پنڈت جیون ناتھ در، جو پنڈت رتن ناتھ سرشار کے قریبی عزیز تھے انھوں نے یہ نظمیں جغرافیہ کے کلاس میں استعمال کیں۔ اس طرح یہ سلسلہ شروع ہوا۔ یہ نظمیں بچوں کے ماہنامہ "ہونہار" میں جب پہلی بار شائع ہوئیں تو میں خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ اور پھر تو ہندستان کے مختلف رسالوں میں چھپنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

جب ان نظموں کا کافی ذخیرہ ہوگیا تو ۱۹۳۲ء میں میں نے ان کو "بچوں کا تحفہ" حصہ اوّل اور دوم کے نام سے شائع کرادیا۔ اہلِ علم نے انھیں کافی پسند کیا۔ اخبارات و رسائل نے اچھے تبصرے کیے اور یہ کتابیں ملک میں کافی پھیلیں۔ اس وقت سے بچوں کے لیے لکھنا میں نے اپنی زندگی کا مقصد بنالیا میں نے بڑوں کے لیے بھی مضامین لکھے ہیں شاعروں کے حالات لکھے ہیں۔ کچھ چھپ چکے ہیں اور کچھ چھپنے والے

میں نے اگلا سوال کیا؟
بچوں کے ادب کی ترقی اور اُسے بہتر بنانے کے سلسلے میں نئے لکھنے والوں کے لیے آپ کا کیا پیغام ہے؟
کرسی پر ٹیک لگاتے ہوئے بولے اگر نئے لکھنے والے یہ چاہتے ہیں کہ وہ ملک میں مقبولیت حاصل کریں، ان کی تخلیق کا معیار بلند ہو تو انھیں تعلیم میں اونچا درجہ حاصل کرنا پڑے گا۔ ان کا مشاہدہ و مطالعہ جتنا وسیع ہوگا وہ اتنا ہی عقل و شعور سے کام لیں گے۔ اور ایسے موضوعات پر لکھیں گے جس سے خدا کے بندوں کا بھلا ہو۔ ملک و قوم کا فائدہ ہو۔ لوگ دلچسپی اور فائدے کا خیال کر کے ان کی تخلیقات کو پڑھیں گے۔ معمولی محنت سے کام نہیں چل سکتا۔ چند نظمیں یا چند کہانیاں لکھ کر مطمئن نہیں ہونا چاہیے۔ ابھی بچوں کے لیے بہت سے لکھنے والوں کی ضرورت ہے، لوگوں کی اس طرف توجہ نہیں ہے۔ خدا پر بھروسہ کر کے اور اپنے کام کو نیک سمجھ کر جاری رکھنا چاہیے۔"
میں نے پوچھا: نیر چچا یہ بتائیے کہ اسمٰعیل میرٹھی جو بچوں کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ آپ ان سے کہاں تک متاثر ہیں؟
میرا یہ سوال سنتے ہی ان کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہو گئیں اور ایسا لگا کہ جیسے وہ جھنجھلا گئے ہوں۔
وہ تیزی سے بولے:
"آپ نے مولانا اسمٰعیل میرٹھی کو ہی کیوں چُنا؟ بچوں کے لیے تو اور بہت سے شاعروں نے بھی لکھا ہے۔ البتہ مولانا پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے ان کے علاوہ علامہ اقبال، حفیظ جالندھری، تلوک چند محروم، مولانا حالی اور مولانا آزاد وغیرہ سب ہی سے فائدہ اٹھایا ہے۔"
میں نے اس سے ہٹ کر ایک سوال کیا۔
آپ اپنی زندگی میں سب سے زیادہ کس شخصیت سے متاثر ہوئے ہیں؟
وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے:
"ہمارے ایک استاد تھے ماسٹر اصغر علی صاحب وہ ہمیں حساب پڑھاتے تھے۔ بڑے محنتی اور دیانتدار تھے۔ دوسرے ہیں سید محمد تاج صاحب ہیڈ ماسٹر جو بڑی با اصول زندگی گزارتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب کو رات دن کام میں مصروف دیکھ کر سبق حاصل کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، جنھوں نے ہمیں انگریزی پڑھائی، اُن کے حسن و اخلاق نے ہمیں متاثر کیا۔ لالہ رگھبیر سنگھ صاحب، انھوں نے ساری زندگی علم کی خدمت میں گزار دی، ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی کے اچھے اخلاق سے متاثر ہوا۔ شاعری اور ادب میں میں نے ان کے ساتھ رہ کر بہت کچھ سیکھا۔ شاعری میں میرا کوئی استاد نہیں ہے۔"
میں نے آخری سوال کیا:
نیر چچا میں نے آپ کا کافی وقت ضائع کر دیا ہے۔ آخر میں بچوں کے لیے کوئی ایسا پیغام دیجیے جسے پڑھ کر وہ کچھ حاصل کر سکیں؟
ان کا جواب تھا:
"اِس زمانے میں تعلیم رسمی ہو کر رہ گئی ہے۔

تربیت کی طرف بھی توجہ کم ہوئی ہے۔ دیانت داری، محنت، وعدہ پورا کرنا، اوقات کی پابندی، کسی اچھے مقصد کا پیش نظر ہونا۔ اُسے حاصل کرنے کے لیے کوشش کرتے رہنا۔ پوری ذمہ داری اور محنت سے انجام دینا نہایت ضروری ہے۔ دنیا میں کامیابی لیاقت کے بغیر نہیں ملتی۔ اخلاق کی برتری بھی کامیابی کی کلید ہے۔ بچے اس کلید کو حاصل کریں ایسا ہوا تو زندگی میں ہر قسم کی مشکلات کے قفل وہ آسانی کے ساتھ کھول سکیں گے۔ خدا ہمیں توفیق دے کہ ہم اچھے شہری بنیں۔ اور ہمارا وجود دنیا میں مسرت اور سکون کا اضافہ کرسکے۔ ان باتوں سے زندگی کی کامیابی کی امید ہوسکتی ہے۔"

مجھے تقریباً ۲ گھنٹے نیر صاحب کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ چلتے وقت نیر چچا نے مجھے تقریباً اپنی دس کتابیں پڑھنے کو دیں اور تاکید کی کہ "ایک خط ضرور لکھیے کہ آپ کو یہ کتابیں پسند آئیں یا نہیں۔" اور میں وعدہ کرکے چلا آیا ۔۔ دیکھیے یہ وعدہ کب پورا ہوتا ہے۔

(ص۲۰ کا بقیہ)

کی وجہ سے شفیع الدین نیر کا مقام اُردو بچوں کی شاعری میں کافی بلند ہے اور اہل اُردو نیر کو نغماتی نظمیں لکھ کر اُردو میں نغماتی شاعری کی بنیاد رکھنے کی وجہ سے کبھی بھول نہیں سکتے۔ بچوں کے شعری ادب کے ساتھ شفیع الدین نیر کا نام اُردو دنیا میں کافی روشن رہے گا۔

(ص۱۱ کا بقیہ)

کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ دنیا کے کاروبار کی مصروفیت سے فرصت ملتی ہے تو کبھی کبھی اپنے اچھے شاگرد بھی یاد آتے ہیں اور میری نظر میں سبھی شاگرد اچھے تھے لیکن زمانہ ان کا نام لوحِ دل سے مٹا دیتا ہے۔ جب کبھی ایسا موقع ملتا ہے جیسا کہ آپ کی تحریر سے ملا تو انتہائی خوشی ہوتی ہے۔"

یہاں ایک بات میرے ذہن میں آتی ہے کہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم خود ایک بہترین استاد تھے اس لیے انھوں نے جامعہ میں ایسے اچھے اچھے اساتذہ کو جمع کر دیا تھا جن کی قربانیوں اور جانفشانیوں سے جامعہ نگر کی بستی آباد ہوئی۔ نیر صاحب ان میں سے ایک ہیں۔ نہ جانے کتنے اچھے اچھے اور ہونہار شاگرد اُن کی زندگی میں آئے ہوں گے لیکن انھوں نے مجھ جیسے حقیر اور در افتادہ شاگرد کو بھی اپنے حافظہ میں محفوظ رکھا۔ نیر صاحب نہ صرف بچوں کے شاعر اور مصنف ہیں جیسا کہ وہ عام طور پر مشہور ہیں بلکہ ایک شفیق اور کامیاب استاد بھی ہیں۔

سنہ ۱۹۶۰ء میں جامعہ کالج ہوسٹل میں الوداعی تقریب تھی جس میں شیخ الجامعہ جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب تشریف رکھتے تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ جب آپ یہاں سے فارغ ہوکر نکلیں تو صرف یہ نہ کہیں کہ میں نے جامعہ میں تعلیم پائی بلکہ آپ اپنے استادوں کا نام لے کر کہہ سکیں کہ میں فلاں صاحب کا شاگرد ہوں۔ تو میں آخر میں اپنا یہ مضمون اس پر ختم کرتا ہوں کہ میں جناب محمد شفیع الدین نیر صاحب کا ایک ادنیٰ شاگرد ہوں۔

★ ★

عبداللطیف اعظمی

بچّوں کے مشہور شاعر اور مخلص استاد

محمد شفیع الدین نیّر

جناب شفیع الدین نیّر صاحب بچّوں کے شاعر اور ادیب ہیں۔ اُردو میں چوٹی کے ایسے ایسے شاعر اور ادیب گزرے ہیں اور اس وقت بھی ہیں، جو دنیا کی بڑی سے بڑی زبان کے شاعروں اور ادیبوں سے ٹکّر لے سکتے ہیں۔ مگر بچّوں کی شاعری اور ادب کی طرف بہت بعد میں توجہ کی گئی اور بہت تھوڑے سے لوگ ہیں جنھیں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ مثلاً شاعروں میں سب سے زیادہ اسمٰعیل میرٹھی مشہور ہوئے۔ انھوں نے واقعی بہت زیادہ اور بہت اچھی نظمیں کہی ہیں۔ یہ ۱۲ر نومبر ۱۸۴۴ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے تھے اور نومبر میں ہی پہلی تاریخ کو ۱۹۱۷ء میں اپنے وطن میرٹھ میں انتقال کیا۔ اس کے بعد میرٹھ ہی کے رہنے والے بچّوں کے شاعر اور ادیب حامد اللہ افسر میرٹھی کا نمبر آتا ہے۔ وہ ۱۸۹۵ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ اور آج سے تین سال پہلے ۱۹ر اپریل ۱۹۷۴ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ لکھنؤ کے ایک شاعر اور ادیب مولانا محمد حسین محوی صدیقی لکھنوی تھے۔ انھوں نے بچّوں کے لیے بہت کچھ کہا اور لکھا ہے۔ پچھلے سال ۵ر دسمبر ۱۹۷۶ء کو ان کی نظموں کا ایک مجموعہ "بالک باغ" کے نام سے بھوپال سے شائع ہوا ہے۔ آج سے ۳۶، ۳۷ سال پہلے اسی مکتبہ جامعہ سے جس سے آپ کا پیارا رسالہ "پیام تعلیم" چھپتا ہے، محوی صاحب کی سچّی کہانیوں کے دو مجموعے چھپے تھے، جو بہت پسند کیے گئے تھے۔ محوی صاحب ۱۵ر مئی ۱۸۹۱ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور ۱۹ر نومبر ۱۹۷۵ء کو بھوپال میں جہاں وہ مستقل طور پر رہنے لگے تھے، وفات پائی۔ اب تک ہم نے جن لوگوں کا ذکر کیا ہے وہ بنیادی طور پر بچّوں کے شاعر نہیں تھے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ انھوں نے بچّوں کے لیے اچھے اچھے مضمون اور دلچسپ کہانیاں بھی لکھیں۔ مگر "پیام تعلیم" کے سابق ایڈیٹر محمد حسین حسّان صاحب صرف ادیب تھے۔ انھوں نے بچّوں کے لیے بڑی اچھی اچھی کتابیں لکھی ہیں۔ اور

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ بچوں کے ادیب کی حیثیت سے بڑی ادبی حیثیت کے مالک تھے۔ ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی انھوں نے بچوں کے ادب کی بڑی شان دار خدمت کی ہے۔ اصل میں وہ پیلی بھیت کے رہنے والے تھے۔ لیکن پوری زندگی جامعہ دہلی میں گزار دی۔ ۱۹۰۷ء میں پیلی بھیت میں پیدا ہوئے۔ اور ۳۱ جولائی ۱۹۷۴ء کو دہلی میں انتقال کیا۔ جامعہ میں ایک الیاس مجیبی صاحب تھے۔ جو رہنے والے تو تھے قائم گنج کے، مگر پاکستان چلے گئے تھے اور وہیں انتقال کیا۔ انھوں نے بھی بچوں کے لیے بہت اچھی اچھی کہانیاں لکھیں اور کتابیں چھاپیں۔ ہم نے صرف ہندوستان کے بچوں کے شاعروں اور ادیبوں کا ذکر کیا ہے۔ پاکستان میں بھی پاکستان کے بننے سے پہلے اور بننے کے بعد بچوں کے بہت اچھے اچھے ادیب و شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ اور انھوں نے بچوں کے ادب کی بڑی اچھی خدمت کی ہے۔ اس وقت ہندستان اور پاکستان دونوں جگہ کے بچوں کے موجودہ شاعروں اور ادیبوں میں محمد شفیع الدین نیر صاحب سب سے زیادہ بزرگ اور سب سے زیادہ مقبول شاعر اور ادیب ہیں۔ تعداد میں جتنی زیادہ انھوں نے کتابیں لکھی ہیں اور جس قدر زیادہ یہ پسند کی گئیں اور بکیں، شاید اردو کا بچوں کا کوئی اور شاعر اور ادیب ہو۔ اسی خصوصیت کی بنا پر آج "پیام تعلیم" ان کے بارے میں ایک خاص نمبر نکال رہا ہے۔

نیر صاحب، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں عرض کیا ہے، اس وقت برصغیر ہند و پاک میں سب سے زیادہ بزرگ اور ہر دل عزیز بچوں کے شاعر اور ادیب تو ہیں ہی، لیکن ان کی ایک خصوصیت بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، وہ یہ کہ وہ ایک بہت اچھے اور مخلص استاد بھی ہیں اور شاید ان کی نظموں اور کہانیوں کے اچھے ہونے کی وجہ بھی یہی ہے، اس لیے کہ جو شخص بچوں کو پڑھانے لکھانے کا کام کرتا ہے، وہ بچوں کی پسند طبیعت اور ضرورت کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔ اگر نیر صاحب بچوں کے استاد نہ ہوتے تو میرے خیال میں وہ بچوں کے لیے اتنی اچھی اچھی کتابیں نہ لکھ پاتے۔

نیر صاحب ویسے رہنے والے تو ہیں اتر پردیش کے لیکن انھوں نے قریب قریب پوری زندگی دلی میں گزاری ہے اور اب پکے دلی والے ہو گئے ہیں، وہ چاہیں تو اپنے آپ کو غالب کی طرح دہلوی لکھ سکتے ہیں، کیوں کہ غالب بھی تو اکبرآباد — آگرہ کے رہنے والے تھے، مگر بچپنے ہی میں دلی آ گئے اور ایسا آئے کہ پھر واپس نہ گئے۔ یہی حال نیر صاحب کا بھی ہے، غالب نے دلی میں اپنا کوئی مکان نہیں بنایا تھا سدا کرایے کے مکان میں رہے، مگر نیر صاحب نے جامعہ نگر میں ایک اچھا سا مکان بنا لیا ہے، اور اب یہیں کے باسی ہو گئے ہیں۔ میں بھی رہنے والا تو ہوں اتر پردیش کے ایک مشہور ضلع اعظم گڑھ کا، مگر کچھ زیادہ چالیس سال سے دلی میں رہ رہا ہوں اور اب سچ پوچھو تو یہیں کا ہو گیا ہوں۔ نیر صاحب جامعہ میں ۱۹۴۵ء میں آئے مگر میں ان سے کچھ پہلے آ گیا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں جامعہ میں کالج کے طالب علم کی حیثیت سے آیا اور کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد ۱۹۴۱ء سے جامعہ ہی میں کام کر رہا ہوں سب سے پہلے مکتبہ جامعہ میں کام

شروع کیا جس سے آپ کا یہ پیارا رسالہ "پیام تعلیم" نکلتا ہے۔ اُس وقت یہ قرول باغ سے نکلتا تھا اور اس کے ایڈیٹر حسین حسان صاحب اور میں اکٹھا کوئی چار سال تک کام کرتے رہے ہیں۔ پھر جب ۱۹۳۶ء میں جامعہ نگر کی بستی بسائی گئی تو سبھی لوگ آہستہ آہستہ قرول باغ سے جامعہ نگر آگئے لیکن ۱۹۴۷ء تک قرول باغ میں مکتبہ جامعہ کی عمارت میں رہا، اس کے بعد جامعہ نگر آگیا اور حسین حسان صاحب، نیر صاحب اور میں، ہم تینوں بہت دنوں تک ایک دوسرے کے پڑوسی رہے ہیں، اس کی وجہ سے نیر صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا مجھے موقع ملا ہے، میں آج تک فیصلہ نہیں کر سکا ہوں کہ وہ بچوں کے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے زیادہ اچھے ہیں یا اُردو کے ایک استاد کی حیثیت سے، حقیقت یہ ہے کہ وہ دونوں حیثیتوں سے بہت اچھے ہیں۔ عمر کا بڑا حصہ اسکول کے بچوں کو پڑھانے میں گزرا۔ آخر میں کالج میں چلے گئے تھے۔ اور وہیں سے کوئی آٹھ سال پہلے ۱۹۶۹ء میں ریٹائر ہوئے، میں نے دیکھا ہے کہ اسکول کے بچے ہوں یا کالج کے لڑکے، نیر صاحب بڑی محنت اور لگن سے پڑھاتے، گٹھری کی گٹھر کاپیاں لاد کر گھر لاتے، رات کو انھیں دیکھتے اور پھر دوسرے روز اسکول لے جاتے۔ اُس عمر میں جب لوگ اپنے آپ کو بوڑھا سمجھنے لگتے ہیں اور محنت کا کوئی کام کرنا ان کے لیے دشوار ہو جاتا ہے، میں نے بارہا دیکھا ہے کہ نیر صاحب دوڑتے ہوئے — واقعی دوڑتے ہوئے، کاپیوں اور کتابوں سے لدے ہوئے اسکول یا کالج جا رہے ہیں۔ دوڑنے کی وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ کچھ دیر ہو گئی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ گھنٹہ شروع ہونے سے پہلے پہنچ جائیں۔

ان کی محنت اور خلوص ہی کا نتیجہ ہے کہ آج وہ اچھی اور خوش و خرّم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ورنہ اسکول کے استاد — کالج تو بہت بعد میں گئے ہیں — اور اردو کے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے، وہ بھی بچوں کے ادیب و شاعر کی حیثیت سے کس نے اچھی اور مطمئن زندگی بسر کی ہے۔ ان کا اپنا گھر ہے، بہت کشادہ اور صاف ستھرا، تمام لڑکے لڑکیوں نے اونچی تعلیم حاصل کی ہے اور سبھی پڑھنے پڑھانے میں لگے ہوئے ہیں اور آج بھی، جبکہ نیر صاحب تقریباً ۷۵ سال کے ہیں، لکھنے لکھانے اور کتابوں کے چھپوانے میں لگے رہتے ہیں۔

مجھ میں اور نیر صاحب میں ایک اور بات ملتی جلتی ہے، وہ یہ کہ انھوں نے بھی عمر کے آخری حصے میں اُردو میں ایم اے کیا اور انھیں کی طرح میں نے بھی۔ وہ جب کبھی ملتے ہیں — اور اکثر ملتے ہیں تو بیٹھے ٹھوک کر اور بڑی محبت سے اس کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ میں نے پی، ایچ، ڈی میں بھی داخلہ لے رکھا ہے۔ کہا کرتے ہیں کہ میں نے تو پی ایچ ڈی نہیں کی۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ مگر تم ضرور کر ڈالو۔ میں بھی نیر صاحب کی طرح اپنا ذاتی مکان بنوا رہا ہوں، فرق صرف اس قدر ہے کہ انھوں نے جامعہ نگر کے بیچوں بیچ بنوایا ہے اور میں جامعہ نگر سے قریب ہی ذاکر نگر میں بنوا رہا ہوں۔ یہ سب جامعہ ملیہ کے طفیل ہے کہ بہت سے دیوانے اکٹھا ہو گئے ہیں۔ دیوانے آپس میں لڑا کرتے ہیں اور یہ محبت سے اور مل جل کر ایک دوسرے کا سہارا بن کر رہتے ہیں۔ یہ سب ذاکر صاحب، عابد صاحب مجیب صاحب اور جامعہ کے دوسرے استادوں کے خلوص اور نیک نیتی کا نتیجہ ہے۔

رؤف انجم

کیمیا گر

ادب کے آسماں پر ہے نمایاں جس کی تابانی
منور جس کی کرنوں سے ہے محفل ننھے منوں کی
نہالِ نو کو جس نے زندگی کی تازگی بخشی
پروئے تربیت کے ہار میں اخلاق کے موتی
جو ہر ذرے کی خاطر سادگی کا ماہِ انور ہے
وہ جس کا نام دنیا میں شفیع الدین نیر ہے

شفق سے رنگ لے کر رنگ شعروں کو دیا جس نے
مہک پھولوں کی لے کر شاعری میں بھر دیا جس نے
سبک الفاظ کو مانندِ شبنم کر دیا جس نے
انھی کو فکر و فن کے اک نیا جوہر دیا جس نے
جو ہر بے مول سی شے کے لئے پارس کا پتھر ہے
وہ جس کا نام دنیا میں شفیع الدین نیر ہے

پرندے گھونسلوں میں جس طرح سے چہچہاتے ہیں
گھروں میں یونہی بچے گیت اس کے گنگناتے ہیں
ترانے ہر گلی کوچے میں جس کے گائے جاتے ہیں
پیامی جس کی تخلیقوں سے اب بھی فیض پاتے ہیں
کہانی کار ہے، شاعر ہے یا پھر کیمیا گر ہے
وہ جس کا نام دنیا میں شفیع الدین نیر ہے

ترنم بادلوں کا جس کے گیتوں میں ترانوں میں
بھری ہے آبشاروں کی تڑپ جس نے جوانوں میں
ہے ٹھنڈک اوس کی جس کے نصیحت خیز گانوں میں
تبسم کلیوں کا جس کے نغموں میں نصابوں میں
کبھی پُرشور دریا ہے کبھی ٹھہرا سمندر ہے
وہ جس کا نام دنیا میں شفیع الدین نیر ہے

محبت کے، شرافت کے، قناعت کے، دیانت کے
سبق سکھلائے جس نے سخت محنت کے، ریاضت کے
سنائے خوب نغمے مادرِ گیتی سے الفت کے
وطن کی آبرو کے واسطے عزمِ شہادت کے
حقیقت کی منازل کا جو انجم ایک رہبر ہے
وہ جس کا نام دنیا میں شفیع الدین نیر ہے

ضیاء الرحمن غوثی

رنگارنگ شخصیت کے مالک نیّر صاحب

اگر ساری دنیا کے لوگوں سے یہ رائے لی جائے کہ دنیا کی سب سے پیاری چیز کیا ہے تو میرے خیال میں بیشتر لوگوں کی رائے ہوگی "بچہ"۔

ہر بھلے اور شریف آدمی کو نہ صرف سارے جہان کے بچوں سے پیار ہوتا ہے بلکہ وہ ہر ملک، ہر علاقے، ہر مذہب اور ہر رنگ و نسل کے بچوں کی نشوونما، تعلیم و تربیت اور فلاح و بہبود کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتا ہے۔ اب تو کسی معاشرے کے معیار کا اندازہ بھی اسی بات سے کیا جاتا ہے کہ وہاں بچوں کی فلاح و بہبود پر کتنی توجہ دی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے جس انسان میں بچوں سے پیار اور اُن کی فلاح و بہبود کا جذبہ نہیں وہ بڑا آدمی بن ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کہ بچوں کی معصومیت میں فرشتوں کا پرتو ہوتا ہے۔ آپ نے کسی ننھے بچے کو سوتے میں مسکراتے دیکھا ہوگا۔ سچ سچ بتائیے کہ آپ کے ذہن میں فرشتے کا جو تصور ہے وہ کیا اس سے الگ کوئی اور چیز ہے؟ پیغمبروں، صوفیائے کرام، ہر مذہب و ملت کے پیشواؤں، اکابرین، سنتوں اور مہاتماؤں کو لازمی طور پر بچے بہت عزیز رہے ہیں۔ ہمارے نبی کریم حضرت محمدؐ کو بھی بچوں سے بے پناہ پیار تھا۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جس کا دل بچوں کی محبت سے بھرا رہتا ہے وہ اتنا قانع اور مسرور ہوتا ہے گویا دنیا کی ساری مسرتوں سے ہم کنار ہے۔

ہمارے ملک میں بھی مہاتما گاندھی کو بچوں سے بے حد پیار تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو بھی ہم بھول نہیں سکتے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور نام قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن موجودہ صدی میں ہندستان کی دو شخصیتوں کو بچوں کے پیار کی وجہ سے مخصوص اور لازوال شہرت ملی ہے۔ ایک ہیں بچوں کے پیارے "چاچا نہرو" جن کا یوم پیدائش ہر سال ۱۴ نومبر کو بچوں کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اور دوسرے بچوں کے مشہور شاعر شفیع الدین نیّر۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے شفیع الدین نیّر صاحب کے سوا کسی ہندستانی زبان کے شاعر نے اتنے خلوص، تسلسل اور فن کاری سے بچوں کے لیے شعر نہیں کہے ہیں۔ اور اس طرح اُن کی حیثیت اردو میں بچوں کے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں میں پیش رو کی ہے۔

نیّر صاحب تقریباً ۵۰ برس سے لکھ رہے ہیں۔ جن لوگوں نے نیّر صاحب کی نظمیں پڑھی ہیں ان میں وہ لوگ بھی بڑی تعداد میں شامل ہیں جو کے

پوتے بھی آج نیرؔ صاحب کی نظمیں اور کہانیاں چٹخارے لے کر پڑھ رہے ہیں۔ اس طرح نیرؔ صاحب نے کم و بیش تین نسلوں کی ذہنی تربیت اور نشو ونما کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ برصغیر پاک کے طول و عرض میں جہاں بھی اردو پڑھی اور بولی جاتی ہے، ناممکن ہے کہ شفیع الدین نیرؔ کو لوگ نہ جانتے ہوں۔ اب تک نیرؔ صاحب نے ۵۰ سے زائد کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں متعدد نظموں کے مجموعے بھی ہیں۔

نیرؔ صاحب کی پہلی نظم جناب فیاض حسین صاحب کی ادارت میں دہلی سے شائع ہونے والے رسالے 'نونہال' میں 'صبح' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ ان کی تازہ ترین نظم "پکا ارادہ" ہے جو فروری ۱۹۸۶ء کے کھلونا میں شائع ہوئی ہے۔

نیرؔ صاحب نے مختلف عمر کے بچوں کے لیے ان کی عمر کے تقاضوں اور نفسیات کو پیش نظر رکھ کر لکھا ہے ان میں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور اسلوب بیان کی فن کاری بھی۔ 'بچوں کا کھلونا' میں زبان سیکھنے کی عمر کے بچوں کے لیے آسان اور رواں نظمیں ہیں۔ نظموں کا ایک مجموعہ 'بچوں کا تحفہ' دو حصوں میں ہے جو سات سے گیارہ برس کے بچوں کے لیے لکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں ان تمام موضوعات پر نظمیں ہیں جن سے بچوں کو دل چسپی ہوتی ہے اور جو ان کی فکر کی رسائی سے باہر نہیں۔ یہ کتاب اب تک مختلف ایڈیشنوں میں ۵ ہزار سے زاید تعداد میں چھپ چکی ہے۔ اس ضمن میں حال میں چھپی کتاب "ہماری زندگی" خاص طور پر قابل ذکر ہے اس کتاب میں شامل نظمیں ہماری سماجی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ ان میں مختلف چھوٹے بڑے پیشوں کی اہمیت بتائی گئی ہے اور آسان زبان میں کم و بیش تمام اہم پیشہ وروں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ان نظموں سے بچوں میں سماجی شعور بیدار ہوتا۔

حب الوطنی، وطن پرستی، قومی یک جہتی، ثقافتی ہم آہنگی اور عمل اور جدوجہد کے اہم اور ضروری موضوعات پر بھی نیرؔ صاحب نے بڑی پیاری نظمیں لکھی ہیں۔ ایسی نظموں کا مجموعہ "وطنی نظمیں" پہلی بار ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اب تک اس کتاب کے بھی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پانچویں اور چھٹی جماعت کے بچوں کے لیے نیرؔ صاحب نے اسلامی نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں کا مقصد بچوں میں اسلام کی واقفیت کرانا اور مذہب و اخلاق کی خوبیوں سے آگاہ کرنا ہے۔

بچوں کے لیے نیرؔ صاحب کی نعتیہ نظموں کا مجموعہ 'ہماری نعت' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں نیرؔ صاحب نے بارگاہ رسالت میں محبت اور عقیدت کے پھول پیش کیے ہیں۔ مولانا عبدالسلام قدوائی کے لفظوں میں، نیرؔ صاحب نے ان نعتوں کے ذریعے دل کے ساتھ عقل کو بھی متاثر کیا ہے۔

نیرؔ صاحب سے خاص طور پر بچیوں کو یہ شکایت تھی کہ ان کی نظمیں زیادہ تر لڑکوں کی دل چسپی کی ہیں چنانچہ نیرؔ صاحب نے لڑکیوں کی دلچسپی کے موضوعات پر نظمیں لکھیں جو 'منی کے گیت' اور 'منی کا تحفہ' میں شامل ہیں۔ یہ کتابیں بالترتیب چھ سے دس اور گیارہ سے چودہ برس تک کی لڑکیوں کے لیے ہیں۔

اپنی نظموں کے ذریعے نیرؔ صاحب نے "اپنے گرد و پیش کی چیزوں سے دل چسپی لینے اور ان کا بغور مشاہدہ کرنے کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس مقصد کے لیے انھوں نے سلیس، عام فہم اور بامحاورہ زبان استعمال کی ہے۔ سادہ خیالات اپنائے ہیں۔ عام اور مفید معلومات فراہم کی ہیں نصیحت کا پیرایہ اختیار کیے بغیر اخلاقی تعلیم کا پورا لحاظ رکھا ہے نظموں میں روانی اور اختصار ہے۔ عنوانات میں تنوع اور بحروں میں ترنم ہے۔"

یہ بات بھی دیکھنے میں کم ہی آتی ہے کہ کوئی اچھا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھا ادیب بھی ہو، خاص طور پر بچوں کا نثری ادب تخلیق کرنا تو اور بھی مشکل کام ہے۔ لیکن یہ خصوصیت نیّر صاحب ہی کو حاصل ہے کہ وہ بچوں کے جتنے عظیم شاعر ہیں، اتنے ہی اعلیٰ پایے کے ادیب بھی ہیں۔ انھوں نے مختلف عمر کے بچوں کے لیے بیسیوں کہانیاں لکھی ہیں، مثلاً پانچ چھ برس کے بچوں کے لیے انھوں نے گلگلے کی دوڑ" ڈھول کا پول، میں گھر جاؤں تو کیسے؟ آٹے کا پتلا۔ مکھن کا ڈبا، ہوشیار حسن، گھی شکر وغیرہ، سات آٹھ برس کے بچوں کے لیے تارا کا ڈنڈا، بونے کا بٹوا، انار راجہ، پری کی چھڑی، بطخ شہزادی، پرستان کی سیر، اور آٹھ برس کے بچوں کے لیے چنبن منن، میاں مٹھو، ٹلو میاں، منی کا پرستان، طلسمی مینا، کھلو میاں وغیرہ کتابیں لکھی ہیں۔ ان سبھی کتابوں کی کہانیاں بچوں میں بے حد مقبول ہوئی ہیں۔ ان کتابوں کی کہانیاں نصیحت آمیز اور سبق آموز ہیں۔ ان سے بچوں کی زبان دانی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان کی کردار سازی ہوتی ہے۔ ان کے اخلاق سنورتے ہیں اور ان کی شخصیت کی نشو و نما ہوتی ہے۔ اور اعلیٰ پایہ کے ادب کے اصلی مقاصد بھی یہی ہیں۔ ان کہانیوں کی روشنی میں نیّر صاحب کو اردو کا آسکر وائلڈ کہا جا سکتا ہے۔

میاں مٹھو نیّر صاحب کی سب سے پہلی کہانی ہے۔ جو پہلی بار ۱۹۳۲ء میں چھپی تھی۔ نیّر صاحب کی تمام کتابوں کے اب تک کئی کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں یہ فخر اردو زبان میں بچوں کے کسی دوسرے شاعر یا ادیب کو حاصل نہیں۔ نیّر صاحب کی کہانیوں کی تازہ ترین کتاب اچھی چڑیا ہے۔ جو ۱۹۷۶ء میں ترقی اردو بورڈ نے شائع کی ہے۔

نیّر صاحب ایک ماہر مترجم بھی ہیں جب کہ بذاتِ خود ترجمہ ایک مشکل فن ہے۔ نیّر صاحب کی ترجمہ کی ہوئی دو کتابیں گذشتہ برسوں میں نیشنل بک ٹرسٹ نے چھاپی ہیں۔ ایک پرندوں کی دنیا جو ۱۹۷۰ء میں چھپی دوسری خالہ بلی کا خاندان جو ۱۹۷۲ء میں چھپی۔

چند سال قبل نیّر صاحب نے غالب کی کہانی، لکھ کر فن تذکرہ نویسی میں نئے باب کا اضافہ کیا ہے یہ کتاب بڑی عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے اتنی ہی دل چسپ ہے، جتنی اہل علم حضرات کے لیے مفید۔

نیّر صاحب بنیادی طور پر ایک معلم ہیں۔ بابائے ذاکر صاحب کے لفظوں میں پیدائشی معلم ہیں۔ اور پھر جب کوئی معلم بیک وقت شاعر اور ادیب بھی بن جائے تو سونے پر سہاگا ہو جاتا ہے۔

بچوں کا ادب پیش کرنا میرے خیال میں مشکل ترین کام ہے، اور یہ کام خوش اسلوبی سے وہی ادا کر سکتا ہے جو تخلیق کے وقت بچوں کے ذہن سے سوچ سکتا ہو اور ان ہی کے لب و لہجے اور

بان میں اپنے خیال کو الفاظ کے پیکر میں ڈھال سکتا ہو
س اعتبار سے نیر صاحب ایک کامیاب فن کار ہیں۔
کسی بڑے اور ذی شعور انسان کا حسب ضرورت ذہنی
طور پر بچہ بن جانا بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن نیر صاحب کو
اپنے موضوع سے اتنا گہرا تعلق ہے، کہ وہ واقعی لکھتے
وقت خود بچہ بن جاتے ہیں۔ بقول جناب کوثر چاندپوری
"معصومیت ان کی ذات اور وجود کا ایک حصہ ہے۔" اور
واقعی آپ نیر صاحب سے ملیں، ان سے باتیں کریں،
تو ایسا لگے گا کہ ان کی شخصیت کے اندر کوئی بچہ چھپا
بیٹھا ہے، جو ان کی شخصیت پر سراپا معصومیت بن کر
چھا گیا ہے۔

نیر صاحب کی شخصیت کا ایک اور روشن پہلو
یہ ہے کہ وہ ایک عملی انسان ہیں۔ وہ ایک محبت کرنے
والے شفیق باپ، اور فرض شناس شوہر ہیں۔ ان کے
علمی اور ادبی مشغلے میں ان کی نیک سیرت اور دیندار
اہلیہ کے تعاون کا بھی بڑا دخل رہا ہے۔ انھوں نے
اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی ہے۔ اور
ان میں سے بیشتر معزز عہدوں پر فائز ہیں۔ نیر صاحب
ہی کی طرح ان کے بچے بھی خوددار، جفاکش، ذہین
علم دوست اور بے حد خلیق ہیں۔ ایسی خوش نصیبی اردو
کے کم ہی شاعروں اور ادیبوں کو حاصل ہوتی ہے۔

نیر صاحب کے تعلقات کا دائرہ کافی وسیع ہے
عہدے اور منصب کی کافی بلندیوں تک ہندوستان بھر
میں ان کی رسائی ہے۔ ہندوستان کے سابق صدر
جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کے ساتھ
انھوں نے جامعہ ملیہ میں برسوں کام کیا۔ لیکن انھوں نے
ذاتی منفعت کے لیے تعلقات کا کبھی ناجائز فائدہ نہیں

اٹھایا۔ اور زندگی بھر خالص علمی مشغلے سے اپنے خاندان
کی کفالت کی یہی ایک اہل علم و دانش کی سچی شان
ہے۔ انھوں نے اپنے گاڑھے پسینے اور حق حلال کی کمائی
سے ایک چھوٹا سا بنگلہ "نیر منزل" بنایا ہے جو جامعہ نگر
میں ایک پُرفضا مقام پر واقع ہے۔ عام طور پر کہا جاتا
ہے کہ اردو کا ادیب اور شاعر فاقہ مست ہوتا ہے
اور اسے صرف شہرت اور تعریف کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔
لیکن نیر صاحب کی زندگی لوگوں کے لیے ایک مثال
ہے۔ نیر صاحب نے کسی صلہ و ستائش کی پروا کیے
بغیر بچوں کے لیے خلوص سے لکھا۔ اور علم و ادب کی
خدمت کی۔ نیر صاحب آج بھی اتنے جوان سال اور
فعال ہیں اور فل فارم میں ہیں کہ یقیناً انھوں نے
اب تک جتنا کام کیا ہے اتنا اور کریں گے (انشاء اللہ)

اگر میں نیر صاحب کے بارے میں ایک خاص بات
کا ذکر نہ کردوں تو اُن کے ساتھ بڑی بے انصافی ہوگی۔
نیر صاحب ایک اچھے نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک
اچھے مراسلہ نگار بھی ہیں یعنی غالب کی طرح اُن کے
مراسلے میں بھی مکالمے کا مزا آتا ہے۔ خلوص، اپنا پن،
شیریں بیانی، سادگی، ان کے خطوط کی خصوصیتیں
ہیں۔ نیر صاحب کبھی کبھی ایک ایک دن میں ایک ایک
درجن خطوط، بچوں کے رسالوں کے مدیروں، بچوں اور
دوسرے لوگوں کو لکھتے ہیں۔ وہ خطوط کا جواب بڑی
پابندی سے دیتے ہیں۔ نیر صاحب کے درجنوں خطوط
آج بھی میرے پاس تبرکاً محفوظ ہیں۔ اور فرصت ملنے
پر میں انھیں پڑھتا ہوں۔ اور فیضان حاصل کرتا ہوں۔

نیر صاحب کی کتابوں کا ہندی اور انگریزی میں
بہت کم ترجمہ ہوا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

محمد صبیح عالم جامعی

نیّر صاحب میری نظر میں

۱۹۴۶ء کی بات ہے مجھے "بچوں کا کھلونا" کی اکثر نظمیں یاد تھیں۔ اور میں مزے لے لے کر انھیں پڑھا کرتا تھا۔ اس وقت میری عمر سات سال کی تھی۔ اور جب میرے بچے کی عمر سات سال کی ہوئی تو میں وہی نظمیں اس کی زبانی سُن کر کچھ سوچتا ہوں کہ آخر ان نظموں میں کیا جادو ہے اور جب اس سے بڑی لڑکی کی زبانی "توتے کا بٹوا" "تارا کا ڈھنڈا"۔ چُنن مُنن اور بلبلِ شہزادی کی کہانیاں سُنتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ ان کہانیوں میں کیا اثر ہے، بات یہ ہے کہ نیّر صاحب نے یہ کتابیں بچّوں کی ذہنی اور اخلاقی ضرورتوں کو مدِّنظر رکھ کر لکھی ہیں جو ہر زمانے کے بچّوں کو پسند آتی ہیں۔ ان سے زبان کی اصلاح ہوتی ہے۔ علم کا شوق بڑھتا ہے۔ اچھے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جناب نیّر صاحب نے اپنی ساری عمر بچّوں ہی کے لیے کیوں وقف کر دی، حالانکہ ماہنامہ معارف کی رائے میں "ان کو نظم نگاری پر اتنی قدرت ہے کہ وہ آسانی سے بلند پایہ نظمیں لکھ کر اونچے درجے کے شعرا میں شمار ہو سکتے ہیں" جی ہاں وجہ یہ ہے کہ نیّر صاحب کے دل میں یہ بات جم گئی کہ یہ بچے ہی قوم و ملت کی سب سے بڑی دولت ہیں۔ انھیں پیستالوزی کے ان اقوال پر مکمل یقین ہے کہ "بچہ قدرت کا انمول تحفہ ہے اور دنیا کی سب سے معصوم شے۔ بچہ نفسیات کا منبع ہے اور معلم کی لیبارٹری۔ بچہ انسان کا خالق ہے۔ اس کی نشوونما پر ہی دنیا کی نشوونما کا انحصار ہے"۔ اسی لیے "معارف" کی رائے سو فیصد صحیح ہے کہ "انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد بچوں کے لیے لٹریچر فراہم کرنا قرار دیا ہے اور اپنی ساری علمی اور ادبی صلاحیتیں اس کی نذر کر دی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انکی نظموں اور کہانیوں میں مذہبی، قومی اور وطنی جذبات کھیلتے ہیں، اس لیے ہر طبقے کے بچوں میں مقبول ہیں"

آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ جتنے بھی بڑے آدمی گزرے ہیں ان کو بچوں سے خاص محبت تھی۔ سر سید، ٹیگور، اقبال، گاندھی، نہرو، ذاکر سب کو بچوں سے بیحد محبت تھی۔ خود ہمارے نبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی کا درس دے گئے ہیں اور علم کی ضرورت و فضیلت بتا گئے ہیں اس کی روشنی میں ہم یہ بات آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ جناب نیّر صاحب کی شخصیت بھی قابلِ تحسین ہے۔

عجب اتفاق ہے کہ ۱۹۴۸ء میں جب پورنیہ کے بچوں کا قافلہ جامعہ ملیہ میں حصولِ تعلیم کے لیے جناب لمل یزدانی صاحب کی زیرِ نگرانی دِلّی جنکشن پہنچا تو ہم لوگ پریشان تھے کہ اب جامعہ نگر پہنچنے کا کیا سامان ہوگا۔ اتنے میں حسنِ اتفاق سے ایک ایسے شخص سے ہماری ملاقات ہو گئی جو ہم لوگوں سے نہایت شفقت اور محبت سے پیش آئے اور ہمیں اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیا۔ جامعہ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ آپ ہی جناب شفیع الدین نیّر صاحب ہیں۔ اپنے دل کی حالت کیا بتاؤں کہ انھیں دیکھ کر مجھے کتنی مسرت ہوئی تھی۔

میرا داخلہ تیسری کلاس میں ہوا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں ساتویں کلاس میں پہنچا تو جناب نیّر صاحب کے شاگردوں میں ہونے کا شرف ملا۔ اُردو کی کلاس مخصوص تھی۔ چاروں دیواروں پر مایۂ ناز ادیبوں اور شعرا کی تصاویر آویزاں تھیں۔ ان کے علاوہ بعض ادیبوں کے اقوال کے اقتباسات اور بعض شعراء کی غزلیں اور اشعار۔ یہ تمام نمونے ایسے کہ ان کو جب ہم پڑھتے ہیں غیر شعوری طور پر بیشتر ہمیں یاد بھی یاد ہو جاتے ہیں اور زندگی ان ہی لائنوں پر ڈھلتی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اقبال کا شعر ؎

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

یا بہادر شاہ ظفر کا شعر ؎

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا، ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

شاید آج بھی یہ تمام نمونے اُردو کی کلاس میں موجود ہوں گے اور طلبہ کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتے ہوں گے۔

جہاں تک کلاس کی پڑھائی کا سوال ہے وہ ہمیشہ وقت کے پابند تھے۔ پڑھانے کا انداز لیا دلچسپ اور موثر کہ ان کے پڑھائے ہوئے اسباق آج بھی یاد ہیں۔ وہ ہماری لکھائی پر خاص دھیان دیتے تھے۔ حاشیہ میں تاریخ کا ہونا ضروری ہوتا ایک لائن چھوڑ کر لکھنا ہوتا۔ کام کے ختم پر ان کے ریمارکس ہوتے۔ اور پھر غلطیوں کی مشق کرنی ہوتی۔ ایک بار دورانِ کلاس ایک واقعہ میرے ساتھ پیش آیا جس سے میں نے ایسی عبرت لی کہ اب بھی اس پر عمل پیرا ہوں۔ کسی سلسلے میں ان سے میں نے عرض کیا کہ "آپ سمجھ نہیں سکے" آپ نے مجھے سکھایا کہ آپ یوں کہیے کہ "میں آپ کو سمجھا نہیں سکا" چنانچہ آج بھی اپنے بزرگوں سے بات کرتے ہوئے محتاط رہتا ہوں۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے شاگردوں کی تربیت کا کتنا اہتمام رکھتے تھے۔

میں نے ۱۹۵۶ء میں میٹرک کے بعد جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لیا تو میری خوش قسمتی کہ جناب نیّر صاحب کا شاگرد نہ رہا کیوں کہ آپ جامعہ کالج کے استادوں میں شامل ہو چکے تھے۔ اتفاق سے اس زمانے کی ایک کاپی ابھی بھی میرے سامنے موجود ہے اس میں موقع اور موسم کے لحاظ سے یہ مضامین شامل ہیں۔ اُمنگ، دسہرہ، سیلاب، دیوالی، تعلیمی میلہ، خودرائی کا نتیجہ، کوشش کیے جاؤ، اشعارِ ذوق کی تشریح، محنت سونے سے بہتر ہے۔ اکثر پر نیّر صاحب کا ریمارک "اچھا ہے" ایک جگہ ہے

"اچھا ہے مگر آپ سے کہا گیا تھا کہ اپنی کتاب کی
ظم کے مضمون کی روشنی میں لکھیے، اس کا آپ نے خیال نہیں
رکھا۔" ایک جگہ آپ نے تحریر فرمایا ہے "اچھا ہے کام
نت اور توجہ سے کیا ہے۔" آپ نے محسوس کیا ہوگا
ن کے ریمارکس کتنے حوصلہ افزا ہیں۔ ان میں بعض
ضامین تو اب بھی میرے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ جناب
یرّ صاحب لڑکوں کے موڈ کو دیکھتے ہوئے پڑھانا
شروع فرماتے۔ ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ ہمارے ایک
ر تکلف دوست نے پہلے ہی سے بلیک بورڈ پر بڑے
روف میں یہ شعر لکھ رکھا تھا ؎

اے ذوقِ تکلف ہے شرافت کی نشانی
وہ لوگ ہیں دہقاں جو تکلف نہیں کرتے

جناب نیرّ صاحب کلاس میں داخل ہوئے تو
ن کی نظر بلیک بورڈ پر پڑی۔ آپ نے چاک لیا
ر جواباً تحریر فرمایا ؎

اے ذوقِ تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہیں جو تکلف نہیں کرتے

میں نے نیرّ صاحب کا اس شعر پر عمل بھی دیکھا
ن کی زندگی بہت سادہ اور تکلف سے خالی ہے۔
ب تک جامعہ میں رہا ان کی قیام گاہ پر بھی آنا جانا
ہا۔ بچہ ہو یا بڑا بہت تپاک سے ملتے ہیں۔ ہم لوگ
ب بھی ان کے گھر جاتے، کچھ نہ کچھ ضرور کھلاتے پلاتے
ے پیار و محبت سے باتیں کرتے اور ہمیں ایسا
وس ہوتا جیسے ہم اپنے کسی قریبی رشتہ دار کے گھر
ئے ہوں۔

نیرّ صاحب نے ہمیشہ اپنے شاگردوں کو قوم
امانت سمجھا اور بس پھر ان کی صلاحیتوں کو ابھارنے
کی کوشش کی۔ ہمیشہ اپنے شاگردوں سے محبت و
شفقت سے پیش آئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شاگرد
آج بھی انھیں یاد کرتے ہیں۔ یہ خوبیاں میں نے
اپنے وقت کے جامعہ کے اکثر اساتذہ میں پائیں۔

جامعہ میں ایک طویل مدت حصولِ تعلیم میں گزار کر
۱۹۶۰ء میں جامعہ سے جدا ہوا لیکن جامعہ کی یاد باقی
رہی۔ کیا کروں کہ خط و کتابت میں تاخیر بہت ہو جاتی
ہے۔ ۱۹۶۲ء میں پٹنہ یونیورسٹی میں ایم۔ اے کا پہلا
سال تھا۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم اسی
زمانے میں بہار کے گورنر تھے۔ ۷ مئی ۱۹۶۲ء کو ان سے شرفِ ملاقات
کے بعد میں نے اس کی اطلاع جامعہ کے اپنے ایک شفیق استاد
جناب اختر حسین صاحب فاروقی مرحوم کو دی۔ ان کا جواب ملاحظہ ہو
"بہت خوشی ہوئی کہ تم نے محترم ذاکر صاحب کی دو اچھی تصویریں
بنائیں جن کا ذکر خود ذاکر صاحب نے تمہارا خط پہنچنے سے پہلے
ہی فرمایا تھا کہ آپ کے شاگرد نے میری دو بہت اچھی تصویریں
بنا کر ایک مجھے بھی دی جس سے محترم ڈاکٹر صاحب
کو بہت خوشی ہوئی۔ ذاکر صاحب کی زبانی تمہاری
تعریف سن کر مجھے جس قدر خوشی ہوئی اس کا اظہار
کیوں کر کروں، خدا کرے تم اسی طرح ترقی کرتے
رہو۔" پھر ایک بہت ہی طویل مدت کے بعد میں نے
۲۵ دسمبر ۱۹۷۶ء کو اپنے شفیق استاد جناب
شفیع الدین نیرّ صاحب کی خدمت میں ایک خط
ارسال کیا۔ آپ ان کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔
"آپ نے اتنے عرصے کے بعد مجھے یاد کیا، میری
کتابوں کو دیکھا۔ اپنی محبت اور دلی تعلق کا اظہار
کیا۔ اس سے آپ کی سعادت مندی ظاہر ہوتی ہے
آپ کی خوشی اور خوشحالی اور دینی اور دنیوی ترقی

(باقی صفحہ [illegible] پر)

علقمہ شبلی

نیّر صاحب

بچّوں کا خراجِ عقیدت

غالب، مومن، میر اور سودا   شاد، اقبال کہ ہوں وہ انشا

حالی، اسمٰعیل اور افسر   آزاد اور محروم سے رہبر

شاعر ہیں سب اپنے وطن کے   پھول ہیں سارے اپنے چمن کے

بیلا کوئی، کوئی چمیلی،   کوئی گلاب اور کوئی جوہی

ایک مگر ہے سب سے نرالا   ہم سب کا من موہنے والا

شاعر ہے وہ ہم بچّوں کا
تارا ہم سب کی آنکھوں کا

اس نے لکھیں پیاری نظمیں   اچھی نظمیں، میٹھی نظمیں

اس نے لکھیں اپنی باتیں   میری باتیں، دل کی باتیں

اس کے قلم نے پھول کھلائے   سُرخ، گلابی، چمپئی، پیلے

رنگ اُن کا آنکھوں کا سُرمہ   خوشبو اُن کی دل کا تحفہ

میلے ٹھیلے، عید اور ہولی   نظموں میں تصویر ہے سب کی

کھیت، پہاڑ، اور ندی، نالے   لفظوں میں ہیں سب کے نقشے

خاکِ وطن کا شیدا ہے وہ   ملّت کا پروانہ ہے وہ

پیغام اس کا سب سے الفت   دنیا میں ہے یہ اک نعمت

نیّر صاحب ہیں وہ بڑوں کے
شاعر ہیں وہ ہم بچّوں کے

سرور جمال

بابائے اطفال شفیع الدین نیّر

شفیع الدین نیّر کو میں اس وقت سے جانتی ہوں جب مجھے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ نیّر صاحب ہیں کیا۔ بچپن میں ہمارے یہاں "غنچہ" "پھول" "بنات" "بچوں کا باغ" "کھلونا" اور "نونہال" جیسے رسالے آتے تھے۔ ہم بھائی بہنوں میں رسالہ پڑھنے کے لیے کم اور نیّر صاحب کی مزیدار اور پُرلطف کہانیاں اور نظمیں پڑھنے کے لیے زیادہ خوب خوب لڑائیاں ہوتیں۔ خواہر خورد ہونے کے باوجود پڑھنے میں اوّلیت زیادہ مجھے ہی ملتی کیونکہ میں ڈاکیہ کی تاک میں زیادہ رہتی۔ رسالہ آیا ہی نہیں کہ باہر ہی باہر ڈاکیہ کے ہاتھ سے رسالہ لے کر کسی کونے کھدرے میں چھپ کر بیٹھ جاتی اور بغیر الف سے یے تک پڑھے رسالے کو منظرِ عام پر نہ لاتی۔ لیکن لڑائی اس دن ہوتی جس دن میری اس ڈکیتی کا انھیں علم ہو جاتا۔ یا وہ میری غیر موجودگی کا فائدہ اُٹھانا چاہتے۔ بس اس دن نہ تو میری خیر ہوتی نہ رسالے کی۔ چھینا جھپٹی میں رسالہ بے مرمت ہو جاتا اور اس بے مرمتی کا خاتمہ، میری مرمت پر ہوتا۔

لیکن اس پٹائی کے باوجود میں اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتی۔ مجھے اور میری سہیلیوں کو ان کی بعض نظمیں اس قدر پسند تھیں کہ ہم نے انھیں زبانی یاد کر لیا تھا۔ اور باقاعدہ کورس میں گایا کرتے تھے۔ جن کے کچھ بند اب مجھے یاد ہیں۔ مثلاً سردی کا زمانہ آیا کے یہ بند

چلتی ہیں ہوائیں سر سر سر
تن کانپ رہے ہیں تھر تھر تھر
ہے سردی کا چرچا گھر گھر
ہیں بھاری کپڑے اور بستر
ٹھنڈک نے ناچ نچایا ہے
سردی کا زمانہ آیا ہے
کرتا ہے جب کوئی سی سی
ہاہاہا ہی ہی ہی ہی
بجتی ہے کڑکڑ بتیسی
آتی ہے آپ ہی آپ ہنسی
یہ لطف بھی جاڑا لایا ہے
سردی کا زمانہ آیا ہے

اس کے علاوہ ہم اپنے باورچی، دھوبی اور مالی کو "چمن باورچی" "منگو دھوبی" اور "باغبان" گا گا کر سنایا کرتے، جس کے صلہ میں ہمیں اچھا پکوان اور اچھے اچھے پھل ملتے تھے۔

بہرحال ان رسالوں نے مجھے اس حد تک دلدادہ

بنا دیا کہ بچپن کا دور ختم ہوتے ہی میں ان میں چھپنے والی
تخلیقات کے مصنفوں اور شاعروں کے پیچھے پڑ گئی۔
جن ادیبوں اور شاعروں سے ملنے کا شوق بچپن سے ہی
میرے دل میں تھا ان میں شفیع الدین نیرؔ کا نام نامی
سرِ فہرست ہے۔ اس لیے جب ان سے میری پہلی
ملاقات "سرور منزل" لکھنؤ میں ہوئی تو میری خوشی
کا ٹھکانا نہ تھا۔ اس پہلی ہی ملاقات میں مجھے ایسا لگا
جیسے ان سے میری ملاقات برسہا برس سے ہے کیونکہ
ان کو دیکھ کر اور ان سے باتیں کرکے اندازہ ہوا کہ ان کی
باتوں میں اور کہانیوں اور نظموں میں کوئی فرق نہیں۔
ان کی تخلیقات ہی اتنی سادہ، پُرلطف اور دل کش
نہیں ہوتیں بلکہ وہ خود بھی نہایت سادہ، معصوم اور
پُرکشش شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی باتیں اتنی
دل چسپ ہوتی ہیں، لگتا ہے کہ ہم ان کی لکھی ہوئی کوئی
کہانی سن رہے ہیں۔ پھر کئی بار ان سے لکھنؤ اور دلی
میں ملاقاتیں ہوتی رہیں اور ہر بار ان سے مل کر ویسی
ہی مسرت ہوتی رہی جیسے کہ بچپن میں ہر بار ان کی نئی
کہانی پڑھ کر ہوتی تھی۔ وہ جب کبھی ملے ایک نئی کہانی
کی طرح ملے۔

ویسے بچوں کے ادیب اور شاعر تو بہت سے
ہیں لیکن نیرؔ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ بچوں کے خالص
ادیب ہیں۔ وہ تقریباً نصف صدی سے بچوں کے لیے
ہلکی پھلکی زبان، سیدھے سادے بیچے اور چھوٹے چھوٹے
جملوں میں دلچسپ کہانیاں، خوبصورت نظمیں اور مزیدار
چٹکلے لکھتے رہے ہیں۔ انھیں بچوں کی نفسیات پر پورا
عبور حاصل ہے۔ وہ بچوں کے دماغ سے سوچتے ہیں،
ان ہی کی زبان سے بولتے ہیں اور ان ہی کے دل
سے خوش ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں
بچوں کے :- — age group کا بڑا خیال
رکھا ہے اس لیے انھوں نے ہر گروپ کے بچوں کے لیے
کتابوں کے الگ الگ سیٹ تیار کیے ہیں۔ لیکن لطف
یہ ہے کہ یہ کتابیں ہر گروپ کے بچوں کو یکساں طور پر
پسند آتی ہیں۔

عموماً بچوں کی عقل وسمجھ اور استعداد کے مطابق
تخلیقات پیش نہیں کی جاتیں۔ بلکہ ہمارے اکثر ادیب جو
بڑوں کے ادیب زیادہ ہیں، جب بچوں کی کہانیاں لکھنے
بیٹھتے ہیں تو ان میں بھاری اور پیچیدہ مسائل رکھ کر کہانیوں
کو خشک اور بچوں کے دماغوں کو بوجھل بنا دیتے ہیں لیکن
نیرؔ صاحب کے یہاں یہ بات نہیں۔ وہ باتوں ہی باتوں
میں بچوں کو بڑے کام کی بات بتا دیتے ہیں۔ ان کی چھوٹی
چھوٹی ہلکی پھلکی سیدھی سادی کہانیوں اور نظموں میں
بڑی نصیحتیں ہوتی ہیں جن کا گہرا نقش بچے جانے انجانے
قبول کر لیتے ہیں۔ نیرؔ صاحب اپنی آسان زبان، دل چسپ
اندازِ بیان اور دل کش طریقۂ اظہار سے بچوں کو اس دنیا
میں پہنچا دیتے ہیں جہاں خوشی اور سرشاری کے علاوہ
اور کچھ نہیں ہوتا۔ نظم "حلوائی" پڑھ کر بھلا کون سا ایسا
بچہ ہوگا جس کے منہ میں پانی نہیں بھر آئے گا۔ خاص کر
اس بند کو پڑھ کر ہم بڑوں تک کے منہ میں طرح طرح کی
مٹھائیوں کا مزا آجاتا ہے۔ آپ بھی اس کا ذائقہ چکھیے۔

ایک دکان پر یہ حلوائی
بیچ رہا ہے اپنی مٹھائی
گرما گرم جلیبی لے لو ٹکیاں بالو شاہی لے لو
موتی پاک امرتی پیڑا لڈو برفی سوہن حلوا
پھینی کھجلے اور رس گلے سیو اور میٹھے کے [illegible]

(باقی صفحہ [illegible] پر)

سیّدہ فرحت

بچّوں کے شاعر نیّر

جہاں تک اُردو ادیبوں اور شاعروں اور اُن کی تخلیقات کا تعلق ہے، بڑی نامی گرامی ہستیاں ہمیں نظر آتی ہیں مگر بچوں کے لیے لکھنے والے شاعر و ادیب گنے چنے ہی ہیں۔ اور بات ہے کہ کبھی کبھی کسی مشہور ادیب یا ادیبہ نے بچّوں کے لیے ایک آدھ کوئی نظم یا کہانی بھی لکھی ہے مگر ان کو بچّوں کا ادیب یا شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ بچّوں کے شاعروں میں مولوی اسمٰعیل اور افسر میرٹھی کے بعد شفیع الدین نیّر ہی کا نام مقبول و مشہور ہے۔ اس سلسلے میں پہلے ایک لطیفہ بیان کرنا چاہتی ہوں۔ دو تین سال پہلے کی بات، جامعہ اُردو علی گڑھ سے ادیب کے امتحانات کے سلسلے میں نظم سے متعلق کچھ کاپیاں میرے پاس جانچنے کو آئی تھیں۔ چند مشہور شعرا کی مشہور نظموں کے عنوانات برائے سوال میں دیے گئے تھے۔ اور اُن کے لکھنے والوں کے نام پوچھے گئے تھے۔ اس میں ایک نظم جوش ملیح آبادی کی تھی اور جس کا عنوان تھا بچپن۔ کسی بھولے اور ناداں طالب علم نے بڑی معصومیت سے یہ نظم شفیع الدین نیّر کے نام منسوب کر دی۔ میں نے سوچا کہ معلوم ہوتا ہے کہ طالب علم محض ابھی بچہ ہے اور نیّر صاحب کے علاوہ کسی شاعر یا اس کے کلام سے ناواقف ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ بچّوں اور بچپن کے عنوان سے نیّر صاحب کا جو تعلق ہے، اس کی شہرت کا بھی اندازہ ہوا۔

بچّوں کے لیے لکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ بچّوں کے لیے وہی نظم یا نثر میں لکھ سکتا ہے جو بچّوں سے گہرا لگاؤ رکھتا ہو اور ان کی نفسیات سے واقف ہو۔ جو بچّوں کے لیے لکھتے وقت خود بھی اپنے آپ کو بچہ محسوس کرے اور بچّوں ہی کی زبان میں اُن کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کر سکے۔

مثلاً یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ بچّوں کو پرندوں سے کتنی دلچسپی ہوتی ہے۔ بچہ جب بولنا اور چلنا بھی سیکھنے کے قابل نہیں ہوتا، اُسی وقت سے وہ پرندوں کے اُڑنے اور ان کی آوازوں میں دلچسپی لینے اور توجہ دینے لگتا ہے۔ اب ذرا نیّر صاحب کی نظم "کوّوں کی بارات" کو اس روشنی میں دیکھیے جس میں کوّوں کی بارات سجاتے اور خود اس میں گیت سناتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں وہ مولوی شفیع الدین نہیں محض بچّوں کے شاعر نیّر ہیں۔

نیّر صاحب کیونکہ ایک علمی ادارے سے تعلق رکھتے

ہیں، بلکہ خود بھی معلّم ہیں، اس لیے وہ کھیل کود کے ساتھ بچّوں کے لیے ایسی نظمیں بھی لکھتے ہیں، جن سے بچّوں کو اپنے اسکول اور اس کے تعلیمی پروگرام سے دل چسپی ہو تو دوسری طرف وہ گھر میں بھی اپنا کام آپ کرنے اور اوقات کی پابندی کے عادی ہوں۔ یوں تو اس قسم کی نصیحتیں عام طور پر والدین اور اساتذہ اپنی خاص شان بزرگانہ اور ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ کرتے ہی رہتے ہیں مگر وہ استاد جو بچّوں کا شاعر ہے، وہ بچے ہی کی زبان میں اس کا پروگرام اس کے ذہن نشین کراتا ہے۔

میں چھ بجے سو کر اٹھا
پہلے تو بستر تہہ کیا

پھر ہاتھ منھ دھو کر ذرا
اللہ سے مانگی دعا

گھنٹہ بجا جب سات کا
میں نے کیا تب ناشتہ

بیٹھا میں پڑھنے آٹھ پر
پڑھتا رہا پڑھتا رہا

ٹن ٹن بجے نو جب گھڑی
گھنٹے نے یہ مجھ سے کہا

تیار ہے کھانا اٹھو
کھا پی کے لو بستہ اٹھا

اسکول جاؤ وقت پر
ہے وقت پر جانا بھلا

آخر میں ایک شاعر کی حیثیت سے، محترم نیّر صاحب سے معافی چاہتے ہوئے، اپنے ایک احساس کا ضرور اظہار کرنا چاہتی ہوں۔ وہ یہ ہے کہ نیّر صاحب کی نظموں میں موسیقیت یا سنگیت، جو بھی کہہ لیجیے اس کی کمی کا احساس! اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ نیّر صاحب "ابا" ہیں "امّی" نہیں۔ اس لیے غالباً ان کی شاعری میں وہ مدھر سنگیت جو ماں کی لوری میں ہوتا ہے اور دہ کو ملتا" جو بچّوں کے نرم و نازک جذبات و احساسات کے اظہار کے لیے ضروری ہے اور بچّوں کے احساسِ شعریت و سنگیت کو پروان چڑھانے میں مدد دے سکتی ہے، نیّر صاحب کی نظموں میں کم پائی جاتی ہے۔

بہرحال بحیثیت مجموعی بچوں کے شاعر کے روپ میں نیّر صاحب کا اُردو داں بچّوں پر بڑا احسان ہے کہ ان کی نظموں کے ذریعے اپنی مادری زبان بولنا اور لکھنا پڑھنا سیکھنے میں نیّر صاحب کی محبت و شفقت، خلوص و سادگی جو ان کی شخصیت کا جز وہیں، ان کی شاعری میں یہ سب اوصاف بھرپور جھلکتے ہیں، نیّر صاحب بچّوں میں مقبول رہے ہیں اور رہیں گے۔

(صہ ۱۶ کا بقیہ)

چلڈرن بک ٹرسٹ، نیشنل بک ٹرسٹ اور اس طرح کے دوسرے ادارے نیّر صاحب کی کتابوں کا ہندستان کی تمام علاقائی زبانوں میں ترجمے کا اہتمام کریں۔ غیر ملکی زبانوں خصوصاً روسی، عربی، انگریزی، اور فارسی زبانوں میں بھی ان کتابوں کے ترجمے کا اہتمام ہونا چاہیے۔ یہ کتابیں اتنے سائنٹیفک طریقے سے لکھی گئی ہیں کہ اسکولوں کے نصاب میں بھی شامل ہونا چاہیں۔

نیّر صاحب کی طویل اور اعلیٰ ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومتِ ہند کی ساہتیہ اکادمی، ریاستوں کی اردو اکادمیوں، اور دلّی کی ساہتیہ کلا پریشد نے نیّر صاحب کو ادبی اعزازات سے نوازا تو یہ ان کی علم دوستی اور ادب شناسی کا ثبوت ہوگا۔

نشاط حیدری ویاوی

بچوں کا ادب اور — شفیع الدین نیّر

چاچا نہرو نے ایک بار کہا تھا ہندوستان کی زبانوں میں سب سے زیادہ دولت مند زبان اردو ہے۔ یہ بات سو فیصد درست ہے کیونکہ اردو ادب کا دامن مختلف اصناف کے شہ پاروں سے بھرا پڑا ہے۔ اس کے باوجود اگر ہم شروع سے نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ بچوں کے ادب میں اردو میں اتنا کام نہیں ہوا جتنا کہ ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے حضرت امیر خسروؒ کا نام آتا ہے، جنھوں نے آسان زبان میں پہیلیاں اور دو سخنے لکھ کر ننھے منّوں کو نہایت دلچسپ اور خوبصورت تحفے دیے۔ پیاری بھائی بہنوں کو وہ دو سخنے اور پہیلیاں ضرور یاد ہوں گی جیسے:-

(۱) گھوڑا کیوں اڑا پان کیوں سڑا۔

(۲) گوشت کیوں نہ کھایا گانا کیوں نہ گایا۔

(۳) وزیر کیوں نہ رکھا انار کیوں نہ چکھا وغیرہ۔

جواب:- (۱) پھیرا نہ تھا (۲) گلا نہ تھا۔ (۳) دانا نہ تھا۔

اٹھارویں صدی میں بچوں کے لیے لکھنے کا کام ایک نہایت رنگین مزاج اور سمجھدار بچے نظیر اکبرآبادی نے سنبھال لیا۔ ان کے بارے میں آپ مارچ ۷۷ ۱۹ء کے پیام تعلیم میں ایک دلچسپ مضمون پڑھ ہی چکے ہیں۔

پھر ایک دور ایسا آیا جب بڑے بڑے شاعروں نے بچوں پر کچھ دھیان نہیں دیا۔ مصحفی، ذوق، مومن اور داغ کا تو ذکر ہی کیا، رہے چچا غالب، سو وہ شکایت مٹانے کو صرف "قادرنامہ" لکھ کر الگ ہو لیے۔ اماں! چچا جان!! آپ نے بڑا دل توڑا۔ لیے تو دیوان پر دیوان مرتب کروا لے اور ہمیں صرف "قادرنامے" پر ہی ٹرخا دیا۔ اب کوئی ان سے پوچھے کہ یہ کہاں کا انصاف ہے۔

اس کے بعد مجاز، شاد، مخدوم بھی بچوں کے لیے کچھ نہ کر سکے۔ البتہ کبھی اختر شیرانی بیکل کی جون میں آئے؛ تو انھوں نے [illegible] کی چند نظمیں لکھ دیں۔ ویسے اس زمانے میں بھی بڑی عمر کے چند دانشور بچے بہت زیادہ عقل مند نکلے۔ انھوں نے بچوں کے ادب میں ایک نئی روح پھونک دی۔ جیسے علامہ اقبالؒ، مولانا حالیؒ اور تلوک چند محروم۔ آزادی سے قبل اقبالؒ کی نظموں نے جہاں نوجوان طبقے میں جوش و ولولہ بھر دیا تھا، وہاں

ن کا ترانہ" "بچّے کی دُعا" "پرندے کی فریاد" "ہندستانی
بچّوں کا قومی گیت" اور "جگنو" نے بچّوں کے دل میں گھر
کرلیا تھا۔ مولانا حالیؔ نے بہت اچھی اچھی بامقصد
نظمیں لکھیں۔ تلوک چند محروم خاص طور سے بچّوں کے
شاعر تھے۔ اُن کی اچھوتی طرزِ نگارش اور دل فریب
انداز نے کسے متاثر نہیں کیا؟ مجھے اس وقت ان کی
بہت پیاری نظم "اچھا آدمی" یاد آرہی ہے۔

"حکمراں اچھا ہے" کوئی اور کوئی "اچھا وزیر"
کوئی ہے "اچھا مدبّر" اور کوئی "اچھا امیر"
کوئی ہے "اچھا قلم زن" کوئی "اچھا تیغ زن"
کوئی "اچھا پہلواں" ہے کوئی "اچھا اہلِ فن"
کوئی "اچھا ہے مہندس" کوئی "اچھا فلسفی"
کوئی ہے "اچھا مؤرخ" کوئی "اچھا منطقی"
کوئی ہے "اچھا سخن ور" کوئی "اچھا نکتہ جو"
کوئی ہے "اچھا مصوّر" کوئی "اچھا خوش گلو"
خوبیٔ قسمت سے بن جاتا ہے کیا کیا آدمی

مزاحیہ نظموں میں ہم راجہ مہدی علی خاں کو کبھی
نہیں بھول سکتے۔ ان کا بے ساختہ پن اور معصومیت
اب ڈھونڈے نہیں ملتی۔

جن شخصیتوں نے بچّوں کے ادب میں بھرپور کام کیا
ہے ان میں مولانا اسمٰعیل میرٹھی، حسین حسّان ندوی،
ڈاکٹر ذاکر حسین، کرشن چندر، حامد اللہ افسر اور
شفیع الدین نیّر کا نام سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے

ڈاکٹر ذاکر حسین کو بچّوں سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان کے
بارے میں آپ جانتے ہوں گے کہ وہ بڑا صاف ستھرا
سفید لباس پہنتے تھے۔ بہت صفائی پسند تھے۔
لیکن ننھے منّوں سے محبت کا یہ عالم تھا کہ جہاں راہ میں
کوئی دُھول اَٹا میلا کچیلا روتا ہوا بچّہ مل گیا، ڈاکٹر
صاحب نے بلا تکلف اُسے اپنی گود میں اُٹھا لیا اور
چُمکار چُمکار کر اُسے چُپ کرانے کی کوشش کرنے لگے۔
ان کی پیاری پیاری کہانیاں دل چسپ اور سبق آموز
ہیں جیسے مشہور مجموعہ "ابو خاں کی بکری" کی کہانیاں۔
یہ اتنی آسان اور مزے دار ہیں کہ پڑھنے والا لطف
اندوز بھی ہوتا ہے اور اچھی اچھی باتیں بھی سیکھتا
ہے۔ لیکن پیامیوں کو خود محسوس ہوتا ہوگا کہ اس
فقیر منش انسان کی دل نواز سادہ اور مخلص
شخصیت بھی اُن کے لیے ایک انمول دل چسپ اور
لاثانی کردار بن گئی ہے

جناب حسین حسّان ندوی نے پیام تعلیم کے ذریعے
ایک طویل عرصے تک بچّوں کے ادب کی جو قیمتی خدمات
انجام دی ہیں، اس سے کون واقف نہیں۔ بچّوں کے
اس مشہور و ہردل عزیز ادیب و صحافی کا اُردو ادب
میں بہت بلند مقام ہے۔ ان کی نرم اور شیریں زبان
مؤثر تحریر اور دل لبھانے والی کہانیاں ہمیشہ زندہ
رہیں گی۔ بچّوں کے معصوم دلوں میں اس عظیم فن کار
کی یاد کی شمع ہمیشہ روشن رہے گی۔

مولانا اسمٰعیل میرٹھی بچّوں کے ادب میں کلیدی
حیثیت کے مالک ہیں۔ ان حضرت کا دل کش اسلوب
نصیحت کا اچھوتا انداز، سلیس زبان اور بے مثال
طرز، انمول اور لافانی ہے۔ ان صاحب کو بچّوں کا
ماہرِ نفسیات کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیوں کہ انھوں نے
تمثیلات کے پردے میں اخلاقی مضامین اور پند و
نصائح کے موضوعات اس طرح پیش کیے ہیں کہ آپ
کی معصوم طبیعت خود بخود اس طرف مائل ہو جائے۔

مولانا کی معاملہ فہمی اور حسنِ تحریر پر ذرا غور کیجیے اور مزے لیجیے، بچّے کو اُبّو جان، خدا کی نعمتوں اور اس کے وجود کا قائل کرانے بیٹھے کہ "میاں! تم تو بڑے شریر ہو، سارا دن پھرتے ہو، پڑھتے لکھتے نہیں۔ خدائے عزّوجل نے تمھارے لیے اتنی ساری چیزیں بنائیں اور تم ہو کہ اُسے بھول کر بھی یاد نہیں کرتے۔" بچّے بڑی سعادت مندی سے ہر قول استاب پر سر جھکا کر "جی ہاں، جی اچھا" کہتے جا رہے ہیں کہ کسی بات پر بھولے سے بھی نہیں غور کرتے کہ آخر یہ بڑے میاں کہاں کی ہانک رہے ہیں۔ اِدھر سے مولانا نکلے اور بڑے شیریں انداز میں پڑھنا شروع کیا

رَب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی
دُودھ دہی اور مکھن مسکہ
دے نہ خدا تو کس کے بس کا

لیجیے جناب ان کے گرد بچوں کا جمگھٹا اور دوسرے دن ہر ایک کی زبان پر "رب کا شکر ادا کر بھائی"۔

شب برات آئی بازاروں میں پھلجھڑیوں اور اَنار پٹاخوں کا ڈھیر لگ گیا اب یہ تو آپ جانیے کہ ان کو جلانے میں صرف پیسہ برباد ہوگا اور فائدہ کچھ نہیں ہمیں تو تماشہ چاہیے۔ لیکن مولانا بھلا یہ فضول خرچی کیسے گوارا کرتے۔ چنانچہ حلوے، لڈّو اور لوز وغیرہ کھا کر صحن میں آ گئے۔ اتفاق سے ساون کا مہینہ تھا۔ بوندا باندی شروع ہو گئی اب ہم برآمدے میں آ کر انار پٹاخے اور پھلجھڑیاں جلانا چاہتے ہیں تو سب پھُسپھُسی۔ مولانا کو سنہرا موقع ہاتھ آیا اور برسات کی "شب برات" شروع ہو گئی۔

بگڑی ہے کیا انار پٹاخوں کی اب کے بات
ساون میں اتفاق سے آئی شبِ برات
بارُود ہے خراب پٹاخے ہیں پُھس پھُسے
کمزور ہے انار چھچھوندر ہے واہیات
مہتاب میں مزا ہے نہ کچھ پھلجھڑی میں لُطف
پیسے ہمارے مُفت گئے یوں ہی آٹھ سات
پاتا ہے اس جہان میں کچھ کھُو کے آدمی
آئندہ ایسے کھیل پہ ماریں گے ہم بھی لات

تو جناب یہ ہے اچھا اور سچّا ادب۔ مولوی صاحب کے بعد بچّوں کے ادیب کی حیثیت سے آج کے دور میں جو نام زبان پر آتا ہے، وہ شفیع الدین نیّر صاحب کا ہے۔

نیّر صاحب کی ہمہ گیر شخصیت

شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ انھوں نے پچاس سال سے بچّوں کے ادب کی جو بیش بہا خدمت انجام دی ہیں، اسے کبھی نہیں فراموش کیا جا سکتا۔ نیّر صاحب نے نہ صرف نظمیں بلکہ چھوٹی چھوٹی آسان اور دل چسپ کہانیاں بھی کافی تعداد میں لکھی ہیں؛ "گلگلے کی دوڑ"، "مکھن کا ڈبّا"، "چُنن مُنن"، "پیسے کا صابن"، "ٹلّو میاں"، "پری کی چھڑی"، "انوکھی چھتری" اور "میاں مٹھو" وغیرہ۔ یہ مزے دار کہانیاں آپ نے ضرور پڑھی ہوں گی۔ اگر نہیں پڑھیں تو نیّر نمبر کو ختم کرنے کے بعد فوراً ہی کتب خانے یا بُک اسٹال کا رُخ کیجیے۔ کیونکہ یہ اس قدر دل چسپ و سبق آموز ہیں کہ ان کو پڑھ کر آپ کو ایسا معلوم ہوگا جیسے آپ جادوئی قالین پر بیٹھے چاندی کی تشتری میں رس گلّے اور گلاب جامن کھا رہے ہوں۔

بچوں کے لیے وہی ادیب اور شاعر اچھا لکھ سکتے ہیں جو بچوں کے دلوں کا حال جانتے ہوں، یعنی خود ہی بچّے کی طرح سادہ لوح ہوں۔ اوپر اُردو کے چند بڑے سمجھ دار بچوں کا ذکر آچکا ہے اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ اس وقت اُردو ادب میں سب سے عظیم بچّہ کون ہے تو بلا تکلف میرا جواب ہوگا — "شفیع الدین نیّر"

نیّر میاں کے بچّہ ہونے کا ثبوت اس طرح ملتا ہے کہ ان حضرت نے ننھّے منوں کے ساتھ ذہنوں میں جھانک کر دیکھا ہے اور ان کی نفسیات اور پسند ناپسند کا بالکل صحیح اندازہ لگایا ہے، جب کہ یہ بڑا کٹھن کام ہے۔ وہ بچوں سے ان ہی کی زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ بھاری بھرکم الفاظ قطعی نہیں استعمال کرتے۔ حال ہی میں ان کی نظموں کا تازہ مجموعہ "ہماری زندگی" منظر عام پر آیا ہے، اور بہت مقبول ہوا ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ اسلامی نظمیں، وطنی نظمیں اور منّی کے گیت وغیرہ لکھ کر شہرت دوام حاصل کر چکے ہیں۔ "ہماری زندگی" تقریباً ۳۲ نظموں کا مجموعہ ہے اس میں انھوں نے مختلف پیشہ وروں کا ذکر جس دل کش اور اچھوتے انداز میں کیا ہے، وہ ان کے صاحب طرز ہونے کی دلیل ہے۔ ان لوگوں میں "ڈاکٹر صاحب" اور "باورچی" سے لے کر "تانگے والا" "رامو کنجڑا" "درزی" "باغ بان" "جمّن باورچی اور "راجہ رام مہتر" تک شامل ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان میں دو اوّل الذکر کو چھوڑ کر سماج کے باقی غریب و چھوٹے لوگوں پر ہمارا دھیان کبھی بھولے سے بھی نہیں جاتا۔ آج کے ترقی پذیر دور میں جبکہ فرقہ بندی اور ذات پات کے خلاف بھرپور جنگ چھڑی ہوئی ہے تو نیّر صاحب نے اپنے مخصوص مدھم اور شیریں لب و لہجے میں، ان تمام فن کاروں کے تعارف کے پردے میں دراصل بچوں کو سیکولرازم سے روشناس کرایا ہے۔ "ہماری زندگی" میں نیّر صاحب نے اپنے انوکھے انداز اور دل کش اسلوب کو جا بجا اُجاگر کیا ہے۔ ایک سادہ سی نظم "تانگے والا" ملاحظہ فرمایئے اور لطف اُٹھایئے۔

تانگے والا تانگے والا
تانگہ روز چلانے والا
اُٹھ جاتا ہے صبح سویرے
تڑکے تڑکے خوب اندھیرے
گھوڑے کو دانہ ہے کھلاتا
پانی بھی اس کو ہے پلاتا
ٹخ ٹخ کرکے چلاتا ہے یہ
گھوڑے کو دوڑاتا ہے یہ
آنے والے جانے والے
بوڑھے بالے گورے کالے
لطف سواری کا لیتے ہیں
اس کو کرایہ دے دیتے ہیں
کام سبھی کے آتا ہے یوں
اپنی روزی پاتا ہے یوں

صبح و شام بچّے تانگے والے کو دیکھتے ہیں لیکن آج جو "گلشن پارک" جانے کو پکنک کا سامان لے کر تانگے پر بیٹھے تو خوشی سے اُچھل پڑے۔ ارے یہ تو وہی تانگے والا ہے جس کا ذکر رات نیّر صاحب

کررہے تھے۔ اوہو ہو!!!! واقعی یہ تو بڑی دلچسپ
شخصیت ہے۔ ذرا ہم بھی اس سے گپ شپ کرکے
دیکھیں۔ شام کو واپسی پر نیر صاحب کے باغ سے
گزرے تو دیکھا کہ باغبان بہت خوش خوش پودوں
میں پانی ڈال رہا ہے۔ اس سے اس کی مسرت کی
وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ جناب نیر نے اس پر
نظم لکھ دی ہے۔ ذرا دیکھیے یہ صاحب کیسے سب
لوگوں کو خوش کرتے ہیں۔

نام احسن ہے باغ بان ہے یہ
باغ کی جان اور شان ہے یہ
رات دن دیکھ بھال کرتا ہے
دل کو اپنے نہال کرتا ہے
بیج بوتا قلم لگاتا ہے
روشیں خوش نما بناتا ہے
کلیاں چاروں طرف مہکتی ہیں
چڑیاں چاروں طرف چہکتی ہیں
خوشنما پھول پھولتے ہیں سدا
بھونرے آ آ کے جھولتے ہیں سدا
باغ کی سیر کو جو آتے ہیں
سبزہ شاداب اس کو پاتے ہیں
دیکھ کر یہ بہار شام و سحر
خوب پڑتا ہے اس کے دل پہ اثر
تندرستی اگر ہو پیش نظر
باغ بانی بھی خوب ہے نیر

درزی۔ اس کی حیثیت سماج میں سب کو معلوم
ہے ہاں اگرچہ فرسٹ کلاس درزی ہوا تو لفٹ دے
دی، ورنہ بھلا اس سے ہمیں متعارف ہونے کی کیا
ضرورت؟ لیکن شاعر کی نگاہ ہر باریکی پر غور کرتی ہے
اس کے دردمند دل میں سبھی انسانوں کی ایک سی
قدر ہے۔ ہر عظیم شاعر ساری دنیا کو ایک نظر سے دیکھتا
ہے۔ (کہیں آپ اس کا مطلب یہ نہ سمجھ لیجیے کہ
شاعروں کے ایک ہی آنکھ ہوتی ہے۔) خیر بات
ہو رہی تھی درزی کی، بلکہ سبھی پیشہ وروں کی۔ تو
جناب اگر ڈاکٹر صاحب ہمارے کام آتے ہیں تو
"راجا رام مہتر" کے بغیر بھی ہماری زندگی بڑی کٹھن
ہے۔ درزی کا اپنی جگہ بہت مقام ہے وہ بھی اپنی
محنت سے روزی کماتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کبھی نیر
صاحب اپنی اچکن سلوانے خود ہی درزی کے
یہاں چلے گئے ہوں گے۔ اس نے جو اتنے مشہور
شاعر کو آتے دیکھا تو نہایت عزت و احترام سے
بٹھایا اور بڑی عاجزی سے ذرا دوسرے گاہکوں
سے نپٹنے کی مہلت چاہی۔ اتنی دیر میں انھوں نے
اس کی پوری دکان کا جائزہ لے لیا۔ اور سامنے
بیٹھے ایک بچے سے مخاطب ہو کر بولے:

دیکھیے درزی کی یہ دوکان ہے
صاف ستھرا اس کا سب سامان ہے
ہوشیاری سے یہ کرتا کام ہے
شہر میں مشہور اس کا نام ہے
خوب ہوتی ہے کتر بیونت اس کی ٹھیک
اس کا بخیہ، کھونپا اور ترپن بھی ٹھیک
ایک طرف رکھی ہے قینچی بھی بڑی
ہے یہ قینچی خاص میرٹھ کی بنی
پاس ہی رکھی ہوئی ہے استری
یہ دہکتے کوئلوں سے ہے بھری

کام کرکے وقت پر دیتا ہے یہ
پھر بھی اُجرت واجبی لیتا ہے یہ
فائدے محنت کے سمجھاتا ہے یہ
دست کاری کا صلہ پاتا ہے یہ

نیر صاحب کی زبان نہایت بامحاورہ، سلیس اور نکھری ہوئی ہے۔ ان کی ہر تخلیق میں بھائی چارے، ہمدردی اور محبت کا پیغام ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب تک انسان اچھی باتوں پر خود عمل پیرا نہ ہو، اس کی نصیحتیں اثر نہیں کرتیں۔ چونکہ جناب شفیع الدین نیر خود ہی سراپا انکسار، خلوص و محبت اور سادگی کے پیکر ہیں، اس لیے ان کی پیاری پیاری نظمیں اور رسیلی کہانیاں دل کی گہرائیوں میں اُتر کر اپنا اَن مِٹ نقش چھوڑ جاتی ہیں۔ لیجیے ہم تو باتوں میں گھر گئے اور اُدھر "بابوجی" آن پہنچے اور وہ بھی کیسے:

سوٹ پہن کر ایک نیا
بوٹ بھی کالا کالا سا

ہاتھ میں تھامے ایک چھڑی
جیب میں ڈالے جیب گھڑی

سر پر انگلش ہیٹ جمائے
اے لو بابو صاحب آئے

مونہہ میں ایک سگار دبا
چھوٹا موٹا ڈنڈا سا

دھواں اُڑاتے آتے ہیں
سیٹی بجاتے آتے ہیں
جیسے انجن آتا ہو
دل سب کا دہلاتا ہو

کتا بھی ایک ساتھ میں ہے
زنجیر اس کی ہاتھ میں ہے
قد ہے اُن کا یا فٹ بال
پھولے ہوئے پھلکے سے گال

اس نظم میں مزاح کی ہلکی سی چاشنی ہے اور زبان اتنی آسان کہ فوراً یاد ہو جائے۔ اپنی شخصیت بچوں کے لیے وقف کر دینا نیر صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ پچھلے پچاس عہد ساز سالوں میں انھوں نے جس پاکیزہ اور بامقصد ادب کی تشکیل کی ہے، اس سے بچے رہتی دنیا تک فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ مجھے امید ہے کہ جناب نیر آئندہ بھی اسی طرح بچوں کے ادب کا دامن ایسے ہی رنگا رنگ، خوش بودار پھولوں سے بھرتے رہیں گے۔

دل کی گہرائیوں سے ہماری دعا ہے کہ خدا بچوں کے محبوب شاعر کی عمر دراز کرے اور وہ ہمیشہ صحت مند رہیں۔ (آمین)

محمد ایوب واقف

بچّوں کے محبوب شاعر محمد شفیع الدین نیّر

اسکولوں میں تعلیم و تربیت کے لیے جو بھی اقدام کیے جاتے ہیں، اُن کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں، لیکن اسکول سے باہر کی زندگی میں بچے جو نظمیں، کہانیاں اور مضامین وغیرہ پڑھتے ہیں اُنھیں میں بہت اہم سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ بچوں کے ذہن کو بنانے اور زندگی کی راہ متعیّن کرنے میں ان سے بڑی مدد ملتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ آخر وہ کون سا پیمانہ ہے جس کے ذریعے ہم کسی ادیب یا شاعر کو جو بچّوں کے لیے لکھ رہا ہے پرکھیں۔ میری رائے میں ہمیں ان باتوں کو تلاش کرنا چاہیے۔

(۱) شاعر یا ادیب نے زبان کیسی استعمال کی ہے۔ آیا اُس نے بچوں کی سطح کی زبان استعمال کی ہے یا مشکل زبان میں لکھا ہے؟

(۲) اُس کی تخلیق کا بچّوں کے ذہن پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اکبر الہ آبادی کی زبان میں ہمیں کہنا پڑے ع ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں؟

(۳) فن کار کا پیرایۂ بیان بڑوں کی طرح بچّوں کو بھی بیحد متاثر کرتا ہے، اس لیے ہمیں بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں اور نثر پاروں میں دیکھنا چاہیے کہ فن کار کا پیرایۂ بیان بچّوں کے لیے کہاں تک پُر کشش ہے۔

(۴) بچّوں کے لیے موزوں موضوع کا انتخاب ضروری ہے

(۵) بچّوں کے لیے لکھی جانے والی نظموں افسانوں یا مضامین میں اصل موضوع سے کبھی نہیں ہٹنا چاہیے۔ اس لیے کہ بچّوں کا ذہن اتنا پختہ نہیں ہوتا کہ وہ بیک وقت کئی باتوں کو سُن کر اپنے ذہن میں محفوظ کر سکیں۔

مولانا محمد اسماعیل میرٹھی، مولانا محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، منشی سورج نرائن مہر، ڈاکٹر محمد اقبال، منشی تلوک چند محروم، حفیظ جالندھری اور ناظم انصاری وغیرہ کے ہاں اکثر ایسی نظمیں مل جاتی ہیں جنھیں آج کے بچے بھی پڑھ کر لطف حاصل کر سکتے ہیں، اور کچھ بن بھی سکتے ہیں۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ جن شاعروں کا ذکر ہم نے کیا ہے وہ سب کے سب بنیادی طور پر بچّوں کے شاعر

نہیں ہیں۔ ان میں مولانا اسمٰعیل بچوں کے شاعر ہیں، ان کی نظمیں ریل گاڑی، ہوا چلی، کچھوا اور خرگوش، اور ماں کی مامتا، کوشش کیے جاؤ، محنت کرو، عجیب چڑیا وغیرہ پسندیدہ نظمیں ہیں۔

مولانا اسمٰعیل کے بعد بچوں کے ادیب اور شاعر کی حیثیت سے صرف ایک ہی مردِ باکمال زبان زدِ خاص و عام ہیں اور وہ ہیں جناب محمد شفیع الدین صاحب نیرؔ۔ مولانا اسمٰعیل میرٹھیؒ اور محمد شفیع الدین صاحب نیرؔ کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ عقیدہ کچھ راسخ سا ہو جاتا ہے کہ بچوں کے لیے ان کی ذہنی نفسیات کے عین مطابق صرف وہی شخص لکھ سکتا ہے جو بچوں کے درمیان رہا ہو۔ مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھیؒ ایک مدت تک اسکولوں میں بچوں کو تعلیم دیتے رہے محمد شفیع الدین نیرؔ بھی گذشتہ تیس چالیس برس تک بچوں کی تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ انھوں نے بچوں کی پسند ناپسند، ان کی دوستی اور دشمنی، ان کی بات چیت غرض کہ ان کی ایک ایک بات کا مشاہدہ کیا ہے اور پھر ان کے مطلب کی باتیں اُنھیں کی زبان میں انھیں کے رُوبرو پیش کی ہیں۔ نیرؔ صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنا مطلب انتہائی کامیابی کے ساتھ اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے۔ اور شاید اسی بنیاد پر وہ بچوں کے ادب میں ممتاز مقام کے مالک ہو گئے ہیں۔ اور اب دُور دُور تک ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔

اس موقع پر مرحوم جاں نثار اختر کا بیان یاد آ رہا ہے۔ غالباً چار سال پرانی بات ہوگی۔ ان کے گلے میں کچھ تکلیف تھی۔ ہم دونوں ایک ڈاکٹر کے پاس، جو برسوں سے ان کا علاج کر رہا تھا، جا رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں ایک کتاب تھی پتلی سی۔ جاں نثار اختر صاحب نے پوچھا یہ کون سی کتاب ہے؟ میں نے بتایا کہ محمد شفیع الدین صاحب نیرؔ کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ بھائی کے بچوں نے فرمائش کی تھی۔ انھیں کے لیے لے جا رہا ہوں۔ جاں نثار اختر مرحوم نے میرے ہاتھ سے لے کر اُسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور کہا:۔

"بھئی! نیرؔ صاحب کا کیا کہنا۔ انھوں نے تو میدان مار لیا۔ لیکن میدان مارنے میں انھوں نے کوئی اُلٹی سیدھی چال نہیں چلی ہے۔ نہ ہی کوئی ساز باز کیا ہے۔ بلکہ پوری عمر اس کام میں گنوا دی ہے۔ اُن کی نظموں اور دیگر تحریروں میں قوم کے بچوں کی ہمہ جہتی ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔ اس سے پہلے بچوں کا اتنا بڑا ادب کسی نے پیش نہیں کیا۔ مولانا اسمٰعیل میرٹھیؒ کا نام اگرچہ بہت مشہور ہے، لیکن اُن کے یہاں اتنی رنگا رنگی کہاں جتنی کہ شفیع الدین نیرؔ کے یہاں ہے۔"

مولانا الطاف حسین حالیؔ نے قوم کے نونہالوں کے اخلاق کی درستی اور ذہن کی تعمیر کا جو حسین و جمیل خواب دیکھا تھا، اس خواب کو خوب صورت تعبیر عطا کرنے کے لیے جناب محمد شفیع الدین صاحب نیرؔ گذشتہ پچاس سال سے اپنا دماغ صرف کر رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے مولانا حالی کی روح نے نیرؔ صاحب کے ذہن میں سکونت اختیار کر کے اُن سے بچوں کے ادب کی تعمیر کا مکمل کام لیا ہے۔ نیرؔ صاحب کا اندازِ بیان حد درجہ پُرکشش اور سادہ و

بھیجتا ہے۔ نصیحت کی تلخی اور واعظانہ رنگ کی خشکی کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ بچوں کے لیے نظمیں لکھنے کے لیے جس خلوص محبت اور ہمدردی کی ضرورت ہوتی ہے جناب شفیع الدین نیر صاحب کا دل اس کا گہوارہ ہے

مذکور بالا سطور میں نیر صاحب کی نظموں اور ان کی دیگر تحریروں کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے انھیں حق بجانب ثابت کرنے کے لیے ہم نیر صاحب کی نظموں کے کچھ نمونے پیش کرتے ہیں۔ ان سے اول تو یہ کہ بچے ان کی نظموں سے براہ راست لطف اندوز ہوں گے۔ دوم یہ کہ نیر صاحب کے فن کے بارے میں ہم نے جو کچھ کہا ہے اُسے تسلیم کر لینے میں ان سے مدد ملے گی۔

اس سلسلے میں زیادہ نہ کہہ کر نیر صاحب کی ایک حمد کے کچھ اشعار پیش ہیں۔

اے دنیا کی شان کے مالک جسم کے مالک جان کے مالک

جسم کے مالک جان کے مالک
دکھ سکھ میں کام آنے والے
بگڑی بات بنانے والے
سورج چاند بنائے تو نے
پیارے پھول کھلائے تو نے
ٹھنڈی ہوائیں تو نے بھیجیں
کالی گھٹائیں تو نے بھیجیں
بھینس بنائی گائے بنائی
کھانے کو دی دودھ ملائی
جب یہ ساری چیزیں پائیں
گن ہم تیرے کیسے نہ گائیں

نیر صاحب نے بڑی سے بڑی بات کتنی سادگی اور دل کشی کے ساتھ چھوٹی بحر کے اشعار میں سمو دی ہے۔ بچوں کے لیے اس سے زیادہ پُر اثر اور دل کش انداز بیان کیا ہو سکتا ہے۔ ایک حمد کے کچھ اشعار اور سنیے۔ اس میں بھی وہی روانی اور شگفتگی ہے جو مذکورہ بالا حمد کی خصوصیت ہے۔ کہتے ہیں:

اے دنیا کے باغ کے مالی ٭ اے اپنے بندوں کے والی
دل کے مالک جان کے مالک ٭ دنیا کی ہر شان کے مالک
دوسرا تجھ سا کوئی نہیں ہے ٭ تجھ سا داتا کوئی نہیں ہے
بخش ہمارے جسم کو طاقت ٭ بخش ہمیں محنت کی عادت
پڑھنے پر دل مائل کر دے ٭ علم و ہنر کا قائل کر دے
ہمت دے کچھ کام کریں ہم ٭ جگ میں روشن نام کریں ہم
ہو انصاف اصول ہمارا
صرف اک تیرا ڈھونڈیں سہارا

ان نظموں کو پڑھ کر کم سے کم اس کا اندازہ تو ہوگا کہ ان میں کسی طرح کا کوئی جھول نہیں ہے اور نہ بیان کی کرختگی اور بے ترتیبی ہے۔

نیر صاحب نے اپنی پوری شاعرانہ زندگی میں اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ جو بھی محاورات اور تشبیہات نظموں میں آئیں وہ زیادہ سے زیادہ ہندستانی ہوں۔ اور شکر کا مقام ہے کہ وہ اس کام میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اب سب سے پہلے اُن کی وہ نظم پڑھی جائے جو انھوں نے ہوا کے بارے میں لکھی ہے! دیکھیے نیر صاحب نے ہوا کے بارے میں خود بھی غور کیا اور ہمیں بھی غور کرنے کی دعوت دی ہے کس طرح دیکھیے:

عجب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے
یہ گرمی میں پنکھے ہمیں جھل رہی ہے

سمندر سے آئی تو سوغات لائی
بسنے کو گرمی کے برسات لائی
مگر اس کا غصہ بہت ہی بڑا ہے
بگڑنے پہ آئے تو بس پھر بلا ہے
گرجتی ہوئی آتی ہے سنسناتی
ہر اک چیز کو توڑتی اور گراتی
سمندر کی موجوں کو ایسا اچھالا
کہ پانی کا ہی بن گیا اک ہمالا
عجب شے ہے نیر جہاں میں ہوا بھی
کہ نعمت بھی کہیے اسے اور بلا بھی

ہوا کا غصہ اور اُس کی گرج اور سنسناہٹ کے ساتھ اس کی ٹھنڈک اور دل خوش کن کیفیت کا ایک جہان اپنے دامن میں رکھنے والی نظم کو آپ نے سُنا اور خلوصِ دل سے اپنے شاعر کو داد بھی دی ہو گی۔ سُننے اور داد دینے کا شغل جاری رکھیے۔ اس کے لیے لیجیے ہم "برسات" نظم کے کچھ اشعار پیش کرتے ہیں:

برسات کی رُت آئی چلنے لگی پُروائی
لو اُٹھ کے وہ پورب سے گھنگھور گھٹا چھائی
کافور ہوئی گرمی ہر چیز میں ہے نرمی
سرسبز ہوئے جنگل باغوں میں بہار آئی

ہے کھیتوں میں سیرابی ہے دھوپ کی نایابی
بیدار ہوئے پودے لینے لگے انگڑائی

ہر سمت بھرا پانی پانی کی ہے طغیانی
گویا کہ سمندر نے کھیتوں میں جگہ پائی

ہمارے محبوب شاعر محمد شفیع الدین نیر صاحب بہار اور بسنت کے عاشق ہیں اور اُن کی نوکِ قلم پر اس کی تعریف کے جو کلمے آئے ہیں وہ پیش کیے جاتے ہیں، تاکہ آپ لطف حاصل کریں۔

برس کے کھل چکا ہے مینہ زمیں پہ ہے ابھی تری
عجب سماں دکھا رہی ہیں کھیتیاں ہری بھری
زمیں پہ سبز مخملوں کے فرش سے بچھے ہوئے
اور ان میں زرد زرد پھول ہر طرف کھلے ہوئے
کہیں مٹر کے کھیت ہیں، کہیں ہیں جو کہیں چنے
یہ دانے ننھے ننھے سے بتاؤ کس طرح بنے
ہیں سبز سبز پتوں پہ قطرے اوس کے پڑے
بہار دے رہے ہیں موتیوں کی طرح سے جڑے
ہر اک بشر کی اس گھڑی زباں پہ بار بار ہے
بسنت کی بہار ہے بسنت کی بہار ہے

نظم "صبح" میں وہ کہتے ہیں ؎

صبح ہوئی ہے وقت سہانا گاؤ خدا کی حمد کا گانا
سورج نکلا تارے بھاگے دنیا والے سارے جاگے
ڈالی ڈالی چڑیاں چہکیں کیاری کیاری کلیاں مہکیں

بنیا، پنساری، حلوائی سب نے اپنی دکان لگائی
ہل اور بیل کسان لے کر جا پہنچا اپنی کھیتی پر

صبح کا منظر دیکھنے کے بعد ذرا شام کی کیفیت بھی ملاحظہ فرمائیے:-

ہوئی شام سونے کا وقت آ گیا
اندھیرا سا چاروں طرف چھا گیا
گیا ڈوب پچھم میں اب آفتاب
اُفق پر چمکنے لگا ماہتاب
پرند آشیانے میں جانے لگے
مویشی بھی جنگل سے آنے لگے

فلک پر ستارے چمکنے لگے
جواہر کی صورت دمکنے لگے
نمایاں ہوئی نہ ابر نہ گرد و غبار
مزہ دیتی ہے آسماں کی بہار

غرض کہ اس قسم کی باغ و بہار نظمیں کہنا جناب شفیع الدین نیّر کا طرّۂ امتیاز ہے۔ ہم اگر ہر نظم کے اشعار پیش کریں گے تو مضمون ضرورت سے زیادہ طویل ہو جائے گا۔ اس لیے بادل ناخواستہ ختم کرتے ہیں لیکن بچّوں کو ترغیب دیتے ہیں کہ اگر وہ نیّر صاحب کی سب نظمیں نہ پڑھ سکیں تو کم از کم آموں کا مزہ، موٹر، توتا، بلی کا بچّہ، کبوتر، عید کا چاند، مُرغی، فوارا، نیا سال مُبارک، صفائی، ضرور پڑھیں۔ ان سب نظموں میں نیّر صاحب نے بڑے مزے اور کام کی باتیں بیان کی ہیں۔ طرزِ بیان میں دل کشی اور دل نشینی ہے۔ آخر میں ایک بات کہنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ وقت آ گیا ہے کہ ملک کے نہ صرف بچّے بلکہ بڑے لوگ بھی نیّر صاحب کی شاعرانہ شخصیت کو پہچانیں اور جس احترام اور عظمت کے مستحق ہیں، وہ احترام اور عظمت اُنھیں دکھلائے۔ نیّر صاحب ابھی حیات ہیں، ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ بہت دنوں تک زندہ رہیں، اور بچّوں کی ذہنی تربیت کا کام یوں ہی انجام دیتے رہیں۔ اس لیے کہ اُن جیسا بچّوں کا محسن دنیا کے شعر و ادب میں دُور دُور تک نظر نہیں آتا۔ غالب کی زبان میں ہم جناب نیّر صاحب کے حق میں بس یہ دعا کرتے ہیں کہ ؂

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

* * *

(صـ۲۲ کا بقیہ)

نام اُن کا جو زباں پر آیا
کھا لینے کو جی للچایا

لاکھوں بچّوں نے جن میں سے زیادہ تر آج بچّوں کے بھی بچّوں کے باپ بن چکے ہیں۔ اُن کی کہانیوں کے ذریعے اُردو سیکھی۔ اُردو زبان کے پیچ و خم سیکھے۔ ان کی کتابوں "گلگلے کی دوڑ"، "بونے کا بٹوا"، "بونے کا انصاف"، "پاپ کی ناؤ"، "پری کی چھڑی" اور "بطخ شہزادی" وغیرہ وغیرہ نے بے شمار بچّوں کو علم و ادب کا دل دادہ بنا دیا۔

نیّر صاحب کے منظوم خاکوں کا بھی جواب نہیں۔ انھوں نے محنت کش طبقے کی جو چلتی پھرتی لفظی تصویر کھینچی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ "جمن باورچی"، "مولا بخش بھشتی"، "راجہ رام مہتر"، "منگو دھوبی"، "نائی" اور "ڈاکیا" وغیرہ نظمیں پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ ان کے دل میں محنت کش طبقے کی کتنی قدر ہے اور وہ محنت کی عظمت کو کتنی وقعت دیتے ہیں۔ ان نظموں کے ذریعے انھوں نے کوشش کی ہے کہ بچّے اس طبقے کی اہمیت اور عظمت کو پہچانیں اور مانیں۔ پچھلے سماج نے جو عزّت انھیں نہیں دی، اس کمی کو آج کے بچّے پورا کریں۔

غرض کہ بابائے اطفال شفیع الدین نیّر کی خوب صورت نظموں اور مزے دار کہانیوں کو جس طرح بھی ہم دیکھتے ہیں پیاری ہی پاتے ہیں۔ خدا ان پیاری پیاری تخلیقات کے خالق کو رہتی دنیا تک قائم رکھے۔ تاکہ ہماری آئندہ نسل بھی اپنے بابا سے فائدہ اٹھاتی رہے۔ اور ان کے لطف و کرم کا سایہ سدا ہم پر قائم رہے۔ آمین۔

* *

ضیاہانی

بچوں کے تم ادیب ہو، شاعر ہو اے شفیع
آساں زبان لکھنے میں، ماہر ہو اے شفیع

تم نیک دل ہو، تم میں ہزاروں ہیں خوبیاں　　تم نے جدید قسم کی لکھیں کہانیاں
ہر نظم میں خلوص و محبت کی جھلکیاں　　پڑھتے ہیں شوق سے انھیں بچے دبچیاں
تم بوستانِ طفل کے، طائر ہو اے شفیع
اطفال کے ادیب ہو، شاعر ہو اے شفیع

اخلاق کا نمونہ، تمھاری ہے نیک ذات　　تم سے "تیامیوں" کے ہیں اَن مٹ تعلقات
بچوں میں "خود شناسی" کے پیدا کیے صفات　　تم نے کہانیوں میں بتائی پتے کی بات
بچوں کی نفسیات کے، ماہر ہو اے شفیع
ہر دل عزیز بچوں کے شاعر ہو اے شفیع

بچوں کو تم نے بخشے، بتائے نئے نئے　　تعلیمی کارنامے، دکھائے نئے نئے
نقشے ترقیوں کے، بنائے نئے نئے　　علم و ادب کے جام، پلائے نئے نئے
گہری نظر تمھاری ہے، ناظر ہو اے شفیع
بے شک عزیز بچوں کے، شاعر ہو اے شفیع

جولانیاں قلم کی، دکھائیں پچانش سال　　تم نے کیا وہ کام جو، بے شک ہے بے مثال
بچوں کی تربیت کا تمھیں ہر گھڑی خیال　　پیدا کیا تمھیں نے، وہ اطفال میں کمال
قدرت زباں پہ تم کو ہے، قادر ہو اے شفیع
بچوں کے تم ادیب ہو شاعر ہو اے شفیع

مجید بیدار

شفیع الدین نیّر کی نغماتی شاعری

نغمہ سے مُراد وہ سُریلی آواز ہے جو ذہن سے نکل کر دل کو موہ لیتی ہے یعنی نغمہ وہ میٹھا اور دل لبھانے والا سُر ہے جو کانوں کو مسحور کرنے اور دل کو سکون بخشنے کا کام انجام دیتا ہے۔ اور اس قسم کی خصوصیت جب شاعری میں پیدا ہو جاتی ہے تو اُسے "نغماتی شاعری" کا نام دیا جاتا ہے۔ نغماتی شاعری سے مراد اشعار میں نغمگی کو شامل کرنا ہے اور نغمگی گانے و گنگنانے کی وہ سُریلی لے ہے جو نغمہ موسیقی کے سحر انگیز ماحول پیدا کرتی ہے۔

نغمگی کا شمار لفظ نغمہ سے کیا جاتا ہے یعنی ایسا عمل جس میں نغمہ شامل ہو اُسے نغمگی کا نام دیا جائے گا۔ اور جس شاعری میں نغمہ کا درد اور نغمگی کی لے شامل ہو جائے گی وہ "نغماتی شاعری" کہلائے گی۔

اُردو میں نغماتی شاعری کی ابتدا محمد اسمٰعیل میرٹھی کی بچّوں کے لیے لکھی گئی نظموں سے ہوئی۔ پھر حفیظ جالندھری کے کلام نے نغماتی شاعری میں عروج پیدا کیا۔ علّامہ اقبال نے "بچّے کی دعا" اور "چاند اور تارے" جیسی نظمیں لکھ کر نغماتی شاعری کو چمکایا اور پھر محمد شفیع الدین نیّر نے اپنی شاعری کے ذریعے نغماتی شاعری کو اوج ثریا تک پہنچایا۔ اس طرح اُردو شاعری میں نغمات کا عروج ہونے لگا۔

نغمگی پانے کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے انگریزی زبان میں لفظ Rhythm کا استعمال ہوتا ہے اور بچّوں کے لیے لکھی جانے والی نظموں کو Rhymes کہا جاتا ہے۔ لفظ ردھم سے رائمس کی ایجاد ہوئی۔ انگریزی شاعری میں بچّوں کے لیے لکھی جانے والی نظموں میں لے یا نغمگی کا پایا جانا ضروری ہے۔ بچّوں کی نظموں میں نغمگی کا شمار ہونے کی وجہ سے انگریزی زبان کی "چلڈرنس رائمس" ساری دنیا میں دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔

بچّوں کے لیے لکھی جانے والی نظموں میں خاص طور پران کی زبان، لفظیات اور گنگناہٹ کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ ابتدا ہی سے کم سن بچّوں میں راگ کھینچ کر الفاظ کو ادا کرنے کی فطرت ہوتی ہے۔ اسی لیے انھیں تعلیم کی جانب راغب کرنے کے لیے ان کی فطرت سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔ چنانچہ کم عمر بچّوں کے لیے جو نظمیں لکھی جائیں گی ان میں نغمگی، گنگناہٹ پانے کا خصوصی خیال رکھا جاتا ہے اور اسی طریقۂ شاعری کو "نغماتی شاعری" کہا جاتا ہے جو بچّوں کے لیے دلچسپی کا سامان مہیا کرنے کے علاوہ انھیں علم سے لگاؤ رکھنے کی رغبت دلاتی ہے۔ اسی

وجہ سے ابتدائی تعلیم میں "نغماتی شاعری" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

نغماتی شاعری کے حدود کافی محدود ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ صرف تین سال سے بارہ سال کی عمر والے بچوں کے لیے لکھی جاتی ہے تاہم اس کی اہمیت کسی عمارت میں نصب ہونے والے بنیادی پتھر کی طرح ہے۔ اس شاعری کا مقصد بچوں میں تعلیم سے دلچسپی پیدا کرنا، صالح اور اخلاقی ذہن بنانا اور نیک عادتیں پیدا کرنا ہوتا ہے چونکہ یہ شاعری بچوں کی نفسیات کے مطابق ہوتی ہے اس لیے اس سے بچوں کی توجہ میں یکسانیت اور سوچنے، سمجھنے کی عادتوں کو ترقی دینے کا کام لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ شاعری بچوں میں علمی لگاؤ پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ "ادب اطفال" کو مقصدی بنیادوں پر گامزن کرنے کا فرض بھی انجام دیتی ہے۔

محمد شفیع الدین نیّر کی شاعری میں وہی عناصر کارفرما ہیں جو نغماتی شاعری کے اجزا سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے بچوں کی نفسیات، زبان اور عمر کو ملحوظ رکھتے ہوئے شاعری کی، جس میں نغمگی، مقصدیت اور اخلاقی اقدار کا پاس ولحاظ پوری طرح نمایاں ہے۔ وہ بچوں کی فطرت کے مطابق شاعری کو بروئے کار لاتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی اکثر نظمیں بچوں کی زبان پر یاد ہو جاتی ہیں۔ ان تمام خصوصیات کا جمگھٹا نیّر کی شاعری میں ہونے کی وجہ سے انھیں اردو کے مایۂ ناز "نغماتی شاعر" کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔

نغمہ، نغمگی اور نغماتی شاعری سے واقفیت کے بعد یہ جاننا ضروری ہو جاتا ہے کہ نغماتی شاعری کن عناصر سے مرکب ہے اور نیّر نے اس کی پاسداری کس حد تک کی ہے۔ نغماتی شاعری بچوں کی ایسی ضرورت ہے جس میں شاعری کے انداز، مفہوم اور شعر کے مطلب کو جانے بغیر بچے اس کے نغمے اور ترنم میں گم ہو جاتے ہیں یعنی نغماتی شاعری بچوں کے لیے ایسی فطری ضرورتیں پیدا کرتی ہے کہ جس سے شاعری کو بچوں کی زندگی سے قربت کا موقع ملتا ہے اور یہی نغماتی شاعری کی کامیابی کی دلیل ہے۔ شفیع الدین نیّر کی شاعری میں اتنا ورد ضرور ہوتا ہے کہ وہ بچوں کی زندگی سے گھل مل جاتی ہے۔ نیّر کی اسی خصوصیت کی وجہ سے ان کی نظمیں بچوں میں کافی مقبول ہیں۔ چوں کہ نغماتی شاعری کا دار ومدار نغمگی سے ہوتا ہے، اسی لیے نغمگی کے اصول ومراتب کا جائزہ لینا اور اس کے پس منظر میں شفیع الدین نیّر کے کلام کی خصوصیات کو جانچنا ہی درحقیقت شفیع الدین نیّر کی شخصیت کو "نغماتی شاعر" کی حیثیت سے قبول کرنا ہے۔ اسی لیے اطفال کے لیے کی جانے والی شاعری کو اس کے نغمے اور لے کی مناسبت سے پانچ حصوں میں تقسیم کر کے نیّر کے کلام کا جائزہ ان کی خصوصیات کے آئینہ میں لیا جا رہا ہے تاکہ اردو شاعری اطفال میں نیّر کی جدّت طبع اور ان کے کارناموں سے واقفیت حاصل ہو سکے۔ شفیع الدین نیّر نے اپنی نغماتی شاعری میں پانچ طرح کی نغمگی کو بروئے کار لیا ہے (۱) رواں نغمگی (۲) دھیرج نغمگی (۳) رمق نغمگی (۴) توالوی نغمگی (۵) میزان نغمگی۔

نظموں کو لے اور ترنم کی جن جکڑ بندیوں سے وابستہ کیا ہے، اس کی مثال اردو میں نیّر کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کے ہاں اتنی منظم نہیں ملتی۔ وہ آسانی سی آسان نغمگی کے ساتھ بچوں کے لیے نظمیں لکھ کر بچوں کے شعری ادب میں جدید اضافہ کرتے ہیں۔ ان

شعری رجحان "سہل پسند نغمگی" سے معنون ہے۔ پانچوں انداز نغمگی سے شفیع الدین نیر کی شاعری کا جائزہ لینا ان کے بچوں کے عظیم شاعر ہونے کی دلیل پیش کرتا ہے۔

روانی نغمگی: نغماتی شاعری کا یہ ایسا انداز ترنم ہے جس میں لے کو روانی کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس نغمگی میں الفاظ تیزی سے ادا ہوتے ہیں۔ اسی لیے چھوٹے بچوں کی زبان میں اس نغمگی کے انداز پر لکھی جانے والی نظمیں بہت جلد [illegible] کرتی ہیں۔ اسی وجہ سے بچے اس نغمگی کو بہت پسند کرتے ہیں۔ شفیع الدین نیر کی شاعری میں سے چند اشعار یہاں پر درج کیے جا رہے ہیں جو روانی نغمگی کے علم بردار ہیں۔ نظم "باغ کی سیر" میں نیر روانی نغمگی کو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

آؤ آؤ باغ چل جائیں — باغ میں جائیں دل بہلائیں
چل کر دیکھیں پھول رنگیلے — پھول رنگیلے، پیلے پیلے

نظم "بندر والا" میں روانی نغمگی کی عکاسی نیر کی شاعری کی روح ہے ؎

ڈگ ڈگ، ڈگ ڈگ کرتا آیا — بندر والا بندر لایا
ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا — ڈنڈے میں ایک لال سا جھنڈا

نغمگی کی روانی اور بیان کی تیز رفتاری نظم "تارے" میں نمایاں ہے ؎

چمکو چمکو تارو چمکو — چمکو چمکو پیارے چمکو
کندن کے مانند دمکتے — دنیا کو حیرت سے تکتے

نیر کی روانی نغمگی کا عکس "چڑیا" نظم میں بھی رفتار کے ساتھ رواں دواں ہے ؎

آؤ آؤ ننھی چڑیا آئی — دانا دنکا چگ کر لائی
[illegible] اس کی — پیاری پیاری [illegible] اس کی

نظموں کے ان اشعار کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نیر "روانی نغمگی" کے اظہار میں نہ صرف کامیاب ہیں بلکہ "نغماتی شاعر" کی حیثیت سے انھوں نے اس اصولِ نغمگی میں بہترین مثالیں پیش کی ہیں۔ اسی خوبی کے ساتھ وہ "دھیرج نغمگی" کا بھی اظہار کرتے ہیں۔

دھیرج نغمگی: بچوں کی نظموں میں پیش ہونے والے ترنم اور لے کی دوسری خصوصیت دھیرج نغمگی کہلاتی ہے جس میں الفاظ کی ادائیگی دھیمے دھیمے سُروں میں کی جاتی ہے۔ اور ہر لفظ کو ادا کرنے کے بعد سانس کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ شفیع الدین نیر نے اس طریقے کو بھی اپنی نظموں میں جگہ دی ہے۔ چنانچہ نظم "شام" میں ادائیگی کے خلوص کی جھلکیاں نمایاں ہیں ؎

ہوئی شام سونے کا وقت آگیا — اندھیرا سا چاروں طرف چھا گیا
گیا ڈوب پچھم میں اب آفتاب — افق پر چمکنے لگا ماہتاب

نظم "نیا سال مبارک" میں شفیع الدین نیر نے اس نغمگی کا بھرپور اظہار کیا ہے ؎

نیا سال تم کو مبارک ہو بچو — سدا خوش رہو تم پھلو اور پھولو
خدا کی عنایت رہے تم پہ دائم — ہمیشہ رہو سیدھے رستے پہ قائم

نیر کی شاعری میں ایسی ہی متعدد نظمیں ملتی ہیں جہاں دھیرج نغمگی کا اظہار ہوا ہے۔ طوالت کے خوف سے یہاں صرف چند نظموں کے اشعار نقل کیے جا رہے ہیں اس نغمگی کے علاوہ "رمق نغمگی" میں بھی نیر کا لہجہ بڑی شان والا ہے۔

رمق نغمگی: آواز کی ہر کا وہ انداز جس میں ترنم لوچ کے ساتھ ادا کیا جائے۔ اسے رمق نغمگی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس طریقے سے دل چسپی اور امنگ کا جذبہ امڈتا ہے۔ نیر کے ہاں اس نغمگی کی

پاسبانی بھی نظر آتی ہے۔ چنانچہ نظم بہار کا موسم میں ان کے ترنم کے لوچ کا اندازہ کیجیے ؎

نہ گرمیوں کا زور ہے نہ سردیوں کی مار ہے
نہ دھوپ تن پہ بار ہے نہ ٹھنڈ ناگوار ہے
ہوا بھی خوش گوار ہے نہ گرم ہے نہ سرد ہے
نہ بجلیاں نہ آندھیاں نہ ابر ہے نہ گرد ہے

نظم "ہلالِ عید" میں بھی لوچ اور ترنم سے نظم کو گرما دیا ہے ؎

پھر ہلالِ عید سے دنیا پہ رونق چھا گئی
لیجیے عید آ گئی عید آ گئی عید آ گئی
پھر زمانے میں محبت کی ہوا چلنے لگی
پھر مسرت کی کلی ہر قلب میں کھلنے لگی

لوچ اور ترنم سے بھرپور اس نغمگی کے بعد نیر مزید ایک انداز ترنم کو اپنی نظموں میں جگہ دیتے ہیں جسے ترانوی نغمگی کہا جا سکتا ہے۔

ترانوی نغمگی: ملی جذبات کو ابھارنے اور جوش اور ولولہ [illegible] کے جو لے اور ترنم کو استعمال کیا جاتا ہے اسے "ترانوی نغمگی" کا نام دیتے ہیں۔ اس نغمگی سے قوموں کی بیداری اور نعرے وغیرہ ممکن ہیں نیر کی شاعری میں اس نغمگی کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں چنانچہ وہ نظم "بڑھے چلو" میں اسے برقرار رکھتے ہیں ؎

قدم بڑھاؤ دوستو قدم اٹھاؤ دوستو
بڑھے چلو بڑھے چلو چلے چلو، چلے چلو

اسی طرح "ہمارا قرآن" نظم میں بھی ترانوی شان کو برقرار رکھتے ہیں ؎

اللہ کا اکرام ہے قرآن ہمارا اللہ کا انعام ہے قرآن ہمارا
آفاق کو دیتا ہے یہ اخلاق کی تعلیم
کرتا یہ اہم کام ہے قرآن ہمارا

نیر کی جوش اور ولولے سے بھرپور نظمیں ترانوی نغمگی کی نمائندگی کرتی ہیں اسی طرح "میزان نغمگی" کی پیشکش میں بھی نیر اوّل اوّل ہیں۔

میزان نغمگی: ترنم اور رَے کے اظہار کے ساتھ ساتھ جب کسی نظم میں کوئی درس اور تہذیب اخلاق دیا جاتا ہے تو اسے میزان نغمگی کا نام دیا جاتا ہے۔ نغمے کی اس خصوصیت میں یکسانیت کا اظہار ہوتا ہے، شفیع الدین نیر اپنی کئی نظموں میں تربیت اور سبق دینے کی یکسانیت کا درس دیا ہے۔ چنانچہ نظم "محنت" میں کہتے ہیں ؎

اے نونہال بچو محنت سے کام کرنا
محنت کے بل پہ اپنی دنیا کو رام کرنا
محنت سے چل رہے ہیں دنیا کے کارخانے
محنت سے مل رہے ہیں ہر قوم کو خزانے

میزان نغمگی کا اظہار نیر نے مزید ایک نظم میں کیا ہے ؎

باتیں نہ بنانا کبھی باتیں نہ بنانا
یہ بات رہے یاد اسے بھول نہ جانا
جو کام نہ کرنا ہو اسے لب پہ نہ لانا
جو بات کہو منہ سے اسے کر کے دکھانا

ان اشعار کے حوالوں سے نیر کی نظموں میں میزان نغمگی کے عنصر کا پتا چلتا ہے۔ اس طرح پانچ نغمگیوں کی نمائندگی اور بچوں کی فلاح کے لیے بہترین نظمیں لکھنے کی وجہ سے نیر کو اُردو کا نامور "شاعر اطفال" کہنے میں کوئی دریغ نہیں۔ اس کے علاوہ اپنی نظموں کے ذریعے اُردو میں "نغمانی شاعری" کو فروغ دینے [illegible]

مناظر عاشق ہرگانوی

آس پاس کا شاعر محمد شفیع الدین نیّر

اُردو میں بچّوں کے ادب کی باضابطہ ابتدا "خالق باری" اور مرزا غالب کے "قادر نامہ" سے مانی جاتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا محمد حسین آزاد کی ریڈریں "قصص ہند" اور "نصیحت کا کرن پھول" اپنے دل چسپ اندازِ بیان اور موضوع کے اعتبار سے زبردست اہمیت کی حامل ہیں۔

ابتدا میں بچّوں کے ادب کی طرف توجہ کم دی گئی، حالانکہ کسی بھی ادب میں بچّوں کے لیے مواد زیادہ وزن و وقار کا حامل ہوتا ہے۔ بچّوں کے ادب سے نئی نسل کی ذہنی تربیت میں بڑی مدد ملتی ہے۔ بچوں کا ادب ان کی عام تعلیم کا اہم جزو ہوتا ہے، اور بچوں کی کتابیں بنیادی طور پر تعلیمی ضروریات کے لیے کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ کتابیں کسی بھی شکل میں ہوں، پری کی کہانی ہو، جن بھوت کی کہانی ہو یا بہادری کے کارنامے ہوں، خواہ نثر میں ہوں یا نظم میں، ان کے ذریعے بچّوں کو عوامی معاملات، نئی ایجادات اور سماجی تاریخ سے باخبر رکھا جا سکتا ہے۔

اُردو میں بچوں کے ادب کی طرف سب سے پہلے دارالاشاعت پنجاب اور انجمن حمایت الاسلام نے توجہ کی۔ ان اداروں سے پہلی مرتبہ سلیس اور آسان زبان میں غیر نصابی کتابیں شائع ہوئیں۔ اس کے بعد قلم کاروں نے باضابطہ طور پر بچّوں کے لیے لکھنے کی طرف توجہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بچّوں کے ادب میں نظمیں، ڈرامے، کہانیاں، معلوماتی مضامین، طبع زاد کہانیاں، تاریخی کارنامے، حرف شناسی کے قاعدے، قوالیاں، پہیلیاں غرض سب کچھ مل جاتا ہے۔ لیکن یہ سرمایہ ناکافی ہے۔ اس کی اہم وجہ یہ نظر آتی ہے کہ اُردو میں صرف بچّوں کے لیے اپنے آپ کو کسی نے وقف نہیں کیا، بلکہ ایک رسم، فیشن کے طور پر بچّوں کے لیے لکھنے کی ادا نبھاتے رہے۔

لکھنے والوں کی بھیڑ میں صرف ایک نام جناب محمد شفیع الدین نیّر کا ملتا ہے جو پچھلے پچاس سال سے صرف بچوں کے لیے نظمیں اور کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں اور نظموں سے بچّوں کی ذہنی نشوونما میں اہم رول ادا کیا ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اپنی نظموں کے ذریعے بچّوں کو درس دے کر ان کی معلومات میں شفیع الدین نیّر نے کس حد تک اضافہ کیا ہے اور دلچسپی کا سامان مہیا کیا ہے، اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

یہ تو ہم سبھی جانتے ہیں کہ استاد کا پیشہ بہت ہی مقدس اور ذمے داری کا پیشہ ہوتا ہے۔ استاد کی خصوصیت نیّر صاحب سے سنیے ؂

انھیں دیکھیے، ہیں یہ استاد صاحب
یہ بچّوں کو ہیں ٹھیک رستہ دکھاتے
پڑھاتے ہیں ان کو لکھاتے ہیں ان کو
ترقی کے زینے پہ ان کو چڑھاتے
ریاضی ہو، تاریخ ہو یا ادب ہو
پڑھانے میں، ہیں نقش دل پر جماتے
یہ کرتے ہیں روشن اندھیرے دلوں کو
ہیں تعلیم کے نور سے جگمگاتے
بھلائی کا یہ بیج بوتے ہیں اُن میں
بُرائی سے دامن ہیں اُن کا بچاتے
سمجھتے ہیں شاگرد ان کو مُربّی
یہ کچھ ایسی شفقت سے ہیں پیش آتے
کوئی بات اک بار میں گر نہ سیکھے
تو سو بار اس بات کو ہیں بتاتے
ہے بچّوں کی صحت کا بھی دھیان ان کو
یہ ورزش کی رغبت ہیں ان کو دلاتے

طالب علمی کا زمانہ زندگی کا خوش ترین وقت ہوتا ہے۔ یہ زندگی کا وہ وقت ہے جس میں انسان سبھی طرح کے بوجھ اور فکر سے آزاد رہتا ہے یہ زمانہ گزار کر جب انسان اپنی دنیاوی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو اسے کئی طرح کی جواب دہی کرنی پڑتی ہے۔ ساری زندگی کی خوشی کا دار و مدار اسی پر ہے کہ اس نے طالب علمی کا زمانہ کس طرح گزارا ہے۔ بڑے پن کی بنیاد طالب علمی کے زمانے میں ہی ڈالی جاتی ہے۔ لیکن یہ بڑا پن اسی وقت کامیاب مانا جاتا ہے جب بچّوں کی تربیت اور تعلیم اچھے طریقے سے ہوئی ہو اور یہ اچھا پن لانا ایک استاد کا فرض ہے۔ طالب علم کے جسم اور دماغ کی ترقی استاد پر منحصر ہوتی ہے۔

لیکن ساتھ ہی شفیع الدین نیّر بچّوں کو اُن کا فرض یاد دلاتے ہوئے رغبت دلاتے ہیں کہ وہ "پڑھنا لکھنا سیکھو" ؂

پڑھنا لکھنا دنیا بھر کی دھن دولت سے بڑھ کر ہے
پڑھنا لکھنا ہیرے موتی، مال اور زر سے بہتر ہے
پڑھنا لکھنا سچ تو یہ ہے کہ انسانوں کا زیور ہے
نیّر دنیا بھر کی ترقی لکھنے پڑھنے ہی پر ہے
اپنا مان بڑھانا ہو تو آگے بڑھنا سیکھو
پڑھنا لکھنا سیکھو بھائی! لکھنا پڑھنا سیکھو

ہر بچّے پر یہ فرض ایک طرح سے قرض ہوتا ہے کہ وہ اپنی ماں کی عزت کرے، اُنھیں دکھ نہ دے بلکہ اُن کی خدمت کر کے دعائیں لے۔ شفیع الدین نیّر اپنی نظم "میری پیاری اماں جان" میں کہتے ہیں ؂

بچّہ تھا میں اک انجان
مجھ کو نہ تھی کچھ بھی پہچان
تم نے بڑھایا میرا مان
مجھ پہ رہیں صدقے قربان

میری اچھی اماں جان
میری پیاری اماں جان
وقت پہ کھانا تم نے دیا
وقت پہ کپڑا تم نے سیا
میرے لیے سب کام کیا
پھر بھی بدلہ کچھ نہ لیا
میری اچھی اماں جان
میری پیاری اماں جان
جب میں بڑا ہو جاؤں گا
کام تمھارے آؤں گا
خدمت کر کے دکھاؤں گا
خوب دعائیں پاؤں گا
میری اچھی اماں جان
میری پیاری اماں جان

ہر اچھے شہری کا فرض ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق کو تلف نہ کرے۔ اپنے فرائض سے واقف ہو اور ایمان داری سے ان فرائض کو انجام دے۔ لفظ شہری کے معنی ہیں ایک شہر میں رہنے والا۔ پرانے زمانے میں یونان میں صرف اُن لوگوں کو ہی حکومت میں اختیارات حاصل تھے۔ جو شہروں میں رہتے تھے۔ اس لیے لفظ شہری وہیں سے شروع ہوا۔ لیکن اب شہریت کا حق ملک کے تمام باشندوں کو دے دیا گیا ہے اس طرح اب ملک کے سبھی باشندے اس ملک کے شہری ہیں۔ ملک کے شہری کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے ملک سے محبت رکھے۔ اس لیے اسے ہر وہ ممکن کام کرنا چاہیے جس سے اس کا ملک ترقی حاصل کرے۔ وہ اچھے شہری کی خصوصیات بتاتے ہوئے نیرؔ کہتے ہیں ؎

جو لوگ بھی مل کر رہتے ہیں، وہ سب شہری کہلاتے ہیں
یہ شہری آپس میں مل جُل کر اپنے کام چلاتے ہیں
الفت ہے شیوہ ان سب کا پیار سے مل کر رہتے ہیں
دُکھ بھی اگر آجائے کوئی تو بھی خوش ہو کر سہتے ہیں
قانون کی پابندی کرنا، یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں
یہ امن و اماں کی دولت کو جنتا کا قرض سمجھتے ہیں
ہے اچھا شہری صرف وہی جو اچھا پیشہ کرتا ہے!
ہے خوفِ خدا دل میں جس کے اللہ سے اپنے ڈرتا ہے

شفیع الدین نیرؔ بچوں میں یہ احساس پیدا کرانا چاہتے ہیں کہ "اپنا گھر سب سے پیارا ہوتا ہے اور گھر والوں کی باہمی محبت فرض سے بھی بڑھ کر ہے۔ کہنے کا انداز دیکھیے ؎

گھر تو ہے اپنا ہی گھر، خوشحال یا بدحال ہو
ہاں مگر آپس کی اُلفت سے وہ مالا مال ہو
گھر وہی اچھا ہے سب کے سب جہاں شاداں رہیں
باپ ماں بھائی بہن بیوی میاں خوش دل رہیں
ایک کا دُکھ دوسرا دیکھے تو ہو بے چین وہ
دوسرے کو جس قدر بھی دے سکے دے چین وہ
ہر بشر گھر کا کرے یوں زندگی اپنی بسر
اپنے ہمسایہ کی آسائش رہے پیشِ نظر
ایک ہمسایہ ہی کیا، ہر ایک اس کا رام ہو
ساری بستی کے لیے اس کی محبت عام ہو

ہم جانتے ہیں کہ تندرستی ہزار نعمت ہے۔ ایک شخص کو تندرست اس وقت کہا جاتا ہے جب اُسے کوئی جسمانی تکلیف یا بیماری نہ ہو۔ جب اس میں تازگی ہو چستی ہو اور کافی طاقت و قوت ہو تو تندرست کہلاتا ہے۔ تندرستی جواہرات سے بھی زیادہ بیش قیمت ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ تندرستی کے بغیر زندگی بوجھ

ہوجاتی ہے۔ ایک شخص کے پاس کافی دولت ہوسکتی
ھ رہنے کے لیے ایک عالی شان عمارت ہوسکتی
ہے، اس کی خدمت کے لیے بہت سے ملازم ہوسکتے
ہیں اور پسندیدہ پوشاک اور خوراک ہوسکتی ہے۔
لیکن اگر وہ تندرست نہیں تو یہ چیزیں اسے خوشی
نہیں دے سکتیں۔ چونکہ تندرستی اتنی قیمتی چیز ہے
ص لیے انسان کا یہ فرض اولین ہے کہ وہ اپنی صحت
ی حفاظت کرے۔ اچھی صحت کے لیے بہت سی چیزیں
ضروری ہیں۔ مثلاً صاف ہوا، صاف پانی، اچھی خوراک
صفائی کی عادتیں، آس پاس کی صفائی اور باقاعدہ
جسمانی ورزش وغیرہ۔ شفیع الدین نیرّ ان ضروریات
دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص اندازِ بیان میں بچوں سے
خاطب ہوتے ہیں ؎

ماف ہوا میں رہنا سیکھو، صاف ہوا میں دل بہلاؤ
ماف ہوا رحمت ہے خدا کی، صاف ہوا کا لطف اٹھاؤ
ں میں ہوا آتی رہے اور جاتی رہے ایسا گھر بنواؤ
طلب یہ ہے تازہ ہوا تم جتنی بھی کھا سکتے ہو کھاؤ
پاک اور صاف کنوئیں سے جاکر پانی لانا اچھا ہے
سال میں ایک دو بار کنوئیں کو صاف کرانا اچھا ہے
تن ہوں جو صاف انھیں میں پینا کھانا اچھا ہے
اف جو ہوں تالاب انھیں میں جاکے نہانا اچھا ہے
سیدھا سادا کھانا کھاؤ، وہ بھی بھوک لگے تب کھاؤ
پیٹ بہت بھرنے سے پہلے کھانے سے جھٹ پٹ اٹھ جاؤ
سڑے بسے گندے سندے کھانے کے ہرگز پاس نہ جاؤ
پھینکو ایسے کھانے کو، تم بھول کے بھی مت ہاتھ لگاؤ
م کو اپنے صاف رکھو، میلے ہوتے ہی نہالو تم
ڑے ہوں کیسے ہی گھٹیا، صاف رہیں دھو ڈالو تم

دھوتی کرتا ٹوپی چادر، میلی ہو تو کھنگالو تم
میل نہ رہنے پائے کہیں اس بات کو دیکھ بھالو تم
اچھا کیا ہے کیا ہے برا، اس بات کی تم پہچان رکھو
تن کی درستی پیاری ہو تو من میں اپنے یہ دھیان رکھو

یوں تو کوئی بھی ایسا موضوع نہیں ہے جو شفیع الدین
نیرّ کی نگاہ سے چھوٹا ہو اور جس پر انھوں نے اپنے
شاعرانہ ذہن سے کام لے کر بچوں کی تربیت میں
حصہ لیا ہو۔ پھر بھی انھوں نے جس طرح ہر چھوٹے بڑے
موضوع کا خیال رکھا ہے، اس پر حیرت ہوتی ہے۔
مثلاً گائے کو لیجیے۔ گائے ہمارے لیے کتنی کارآمد ہے
یہ نیرّ کی زبانی سنیے ؎

تازہ دودھ پلاتی ہوں میں
میٹھی کھیر کھلاتی ہوں میں
لڈو، پیڑے، برفی، ربڑی
مکھن، لسی، مٹھا، چھاچھ، دہی، گھی
یہ اور ایسی چیزیں اچھی
دودھ سے ہیں میرے ہی بنتی
بچھڑے میرے بیل کہاتے
کھیتوں میں وہ ہل ہیں چلاتے
بکری، بھیڑ سہیلی میری
بھینس بڑی بہنیلی میری

تیوہار کوئی بھی ہو، خوشی کا پیغام لے کر آتا ہے
"عید مبارک" کی خوشی کا اظہار نیرّ یوں کرتے ہیں ؎

لو عیدگاہ جاؤ پڑھ کر نماز آؤ
جی بھر کے شیر کھاؤ کھیلو ہنسو ہنساؤ
سب بہن اور بھائی
عید سعید آئی

گرمی کا موسم آتا ہے تو لوگ بہت سی دقتیں

محسوس کرتے ہیں۔ جھلسانے والی ہوا سے بہت
پیاس لگتی ہے۔ ندیاں، جھیل اور تالاب سوکھ جاتے
ہیں۔ لو لگ جانے کے سبب بہت سے آدمی، چڑیاں
اور جانور مرجاتے ہیں۔ گرمی میں بیماریاں بھی پھیلتی
ہیں "گرمی کی گرما گرمی" کا ذکر نیرؔ یوں کرتے ہیں ؎

کچھ ایسا جلتا جیتے ہیں۔ پانی پر پانی پیتے ہیں
ہر کام سے جی ہولاتا ہے   ہر بات سے دل گھبراتا ہے
اب برف کا جادو چلتا ہے۔ فالودے کی بن آئی ہے
قلفی پر رال ٹپکتی ہے۔ اب ٹھنڈا شربت بھایا ہے
جب گھر سے باہر جاتے ہیں ہم دھول سے اَٹ جاتے ہیں
یہ موسم آندھی کے جھکڑ، لوؤں کے تھپڑے لایا ہے

ساری اچھائی برائی بتانے کے بعد آخر میں کہتے ہیں ؎

گرمی ہو، سردی ہو نیرؔ یا برکھا رُت پیاری پیاری
کوئی موسم کوئی رُت ہو، ہر رُت قدرت کی مایا ہے

اور جب بارش کا موسم آتا ہے تو قدرت ایک
نئی پوشاک پہنتی ہے۔ درخت جنھوں نے موسم گرما
میں اپنی پتیاں گرا دی تھیں۔ نئی پتیاں پاتے ہیں۔
سوکھے میدان میں نئی گھاس اُگتی ہے تو سبز
مخمل کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ کسانوں کے لیے یہ
موسم، رحمت کا موسم ہوتا ہے۔ بچے بھی بارش کے
موسم میں خوب اُچھل کود مچاتے ہیں۔ شفیع الدین
نیرؔ نے اپنی نظم "برکھا رُت" میں ان سب خصوصیات
کو نہایت دل کش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ چند
اشعار دیکھیے ؎

آئی ہیں پورب کی ہوائیں
چھائی ہیں گھنگھور گھٹائیں
بادل گرجے گڑ گڑ گڑ گڑ
بوندیں آئیں تڑ تڑ تڑ تڑ
بجلی چمکی چم چم چم چم
بارش برسی چھم چھم چھم چھم
پانی سے بھر بھر گئے جل تھل
ہو گئے کل سے بھتے جو بے کل
کھیتی میں ایک جان سی آئی
پیڑوں پر اک شان سی آئی

منظر نگاری، وہ بھی بچوں کی شاعری میں ذرا مشکل
کام ہے۔ لیکن شفیع الدین نیرؔ کو جہاں جہاں موقع ملا ہے
انھوں نے چابک دستی سے منظر نگاری کی ہے۔ ان کی
نظم "سرسوں رانی" منظر نگاری کا مکمل نمونہ ہے۔ دو
ایک اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

سرسوں کیا ہے پیارے پیارے پھولوں کی یہ رانی ہے
تاج ہے اس رانی کا سنہری جوڑا اس کا دھانی ہے
کھیتوں کھیتوں بادِ بہاری دن بھر گھوما کرتی ہے
دیکھ کے سرسوں اپنی ادائیں آپ ہی جھوما کرتی ہے

شفیع الدین نیرؔ اپنی نظموں کا مواد اپنے آس پاس
سے لیتے ہیں۔ سماج میں رہ کر ایک کہنہ مشق شاعر
جس طرح اپنے ماحول کا جائزہ لے سکتا ہے۔
شفیع الدین نیرؔ بھی گہری نظر سے جائزہ لیتے ہیں اور
بچوں بچیوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر ان کی
خصوصیات بیان کرتے ہیں۔ انھوں نے "درزی" اور
"سنار" پر بھی نظمیں لکھی ہیں "سنار" سے یہ اشعار دیکھیے ؎

سونے چاندی سے کام ہے مجھ کو
شغل اس کا مدام ہے مجھ کو
لونگ اور نتھ بلاق اور بندے
انگیاں، اور بالیاں، بالے

لونگ، دست بند اور چوڑی
اور گلوبند، بجلیاں، ہنسلی
پائے زیب اور انگوٹھیاں چھلّے
پائل اور ٹیکا اور کڑے بچھوے

یہ اور ایسے ہی بیسیوں زیور
دیتا رہتا ہوں روز گھڑ گھڑ کر
آرزو میرے بے مثال رکھتا ہوں
دل میں خوش ہوں کمال رکھتا ہوں

بچوں کو چاہیے کہ ہمیشہ سچ بولا کریں کیونکہ جھوٹ سے ہر کسی کو نفرت ہے۔ شفیع الدین نیّر نے "سچ" کی دیگر خصوصیات کے ساتھ یہ خصوصیت بھی بتائی ہے ؂

سچ سے ملتا ہے آدمی کو سرور
سچ سے ہوتا ہے رنج دل کا دور
سچ سے رہتی ہے آدمی کی شان
سچ ہے دنیا میں آبرو کا نشان
سچ بہادر ہمیں بناتا ہے
آڑے وقتوں میں کام آتا ہے

شفیع الدین نیّر کو بچوں کی نفسیات سے گہری واقفیت ہے۔ اسی لیے پہلو بدل بدل کر وہ بچوں کی نبض پرکھتے رہتے ہیں۔ اپنی نظم "چھٹی" میں بچوں کو چھٹی کا مزہ لوٹنے کی ترغیب دیتے ہیں لیکن وہ ایسا اس لیے کرتے ہیں تاکہ بچے چھٹیوں میں خوب تر و تازہ اور اگلی پڑھائی کے لیے چاق و چوبند ہو جائیں ؂

چھٹی ہے بھئی چھٹی، آؤ لکھنا پڑھنا چھوڑیں
کھیلیں، کودیں، موج اڑائیں سارے بندھن توڑیں
کیسی اردو کیسی ہندی کیسا علم ریاضی
کیسا حال اور کیسا مستقبل اور کیسی ماضی
سائنس اور ڈرائنگ سے بھی اب چھٹکارا پائیں
چھٹی ہے بھئی چھٹی، آؤ دن بھر لطف اٹھائیں
آؤ سارے مضمونوں کی دُم میں پھندا باندھیں
سیر کریں باغوں کی جا کر ان سب کو دفنا دیں

شفیع الدین نیّر کا تجربہ، علم اور شگفتہ اندازِ تحریر بچوں کے لیے امرت ہے۔ وہ بچوں کی نفسیات سے واقف ہیں۔ انھوں نے بچوں میں عمر گزاری ہے اور ان ہی کی زبان میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ قدرتی مناظر اور وطن کی محبت کے گیت لکھ کر بچوں میں جوش، ولولہ اور اُمنگ پیدا کی ہے۔ "بچوں کا ترانہ" "جی چاہتا ہے" "یادِ جواہر" "یادِ ذاکر" "باپو کا پیغام" وغیرہ ان کی ایسی ہی نظمیں ہیں۔ قومیت کی تعمیر میں ان نظموں کی اہمیت اور افادیت مسلّم ہے۔ ان کی ان نظموں میں بڑی شوخی، چلبلا پن، بچپن کی گرمی اور تازگی ہے جو شریر کھلنڈرے لڑکوں کو موضوع بنا کر لکھی گئی ہیں۔ غرض بچوں کی تعلیم اور ان کی ذہنی اور اخلاقی تربیت ہی شفیع الدین نیّر کا نصب العین ہے۔

میں ادارۂ پیامِ تعلیم کا شکرگزار ہوں کہ اُنہے
میری زندگی میں مجھے نوازا، اور بچوں کے ادب میں میری
ناچیز کوششوں کے پیشِ نظر ماہنامہ مذکور کا خصوصی
نمبر شائع کیا۔ آپ سب کی اس حوصلہ افزائی سے
میرے دل کو بڑی طمانیت اور تقویت حاصل ہوئی ہے۔
کیا عجب ہے کہ اس حوصلہ افزائی اور آپ کی دعاؤں
کی برکت سے میں کوئی واقعی قابلِ یادگار خدمت انجام
دے سکوں۔

مجھے یقین ہے کہ پیامِ تعلیم کی اس پیش روی سے
بچوں کے لیے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کا راستہ
کھل جائے گا، اور بچوں کے ادب کی خاطر خواہ ترقی
کی نئی نئی صورتیں پیدا ہوں گی۔ میں پیامِ تعلیم ہی کے
ذریعے اُن تمام اصحاب اور احباب کی خدمت میں
اپنا ہدیۂ احسان مندی پیش کرتا ہوں جن کی توجہ
فرمائی اور سعی و کوشش سے یہ شمارہ کامیابی کی اس
منزل پر پہنچ سکا۔

جناب ڈاکٹر سیفی پریمی صاحب کے انٹرویو
میں مندرجہ ذیل امور صحت طلب ہیں:۔
براہِ کرم اگلے شمارے میں نشان دہی کر دیجیے۔

پیامِ تعلیم نیر نمبر
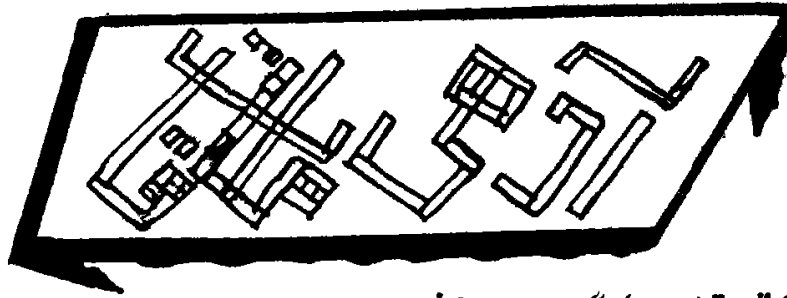
صفحہ ۱۲ حافظ احمد علی صاحب پیش امام جامع مسجد
سکندر راؤ کے ہاں میں کبھی نہیں رہا۔ ہاں انھوں نے
بسم اللہ پڑھائی تھی۔

صفحہ ۱۲ ۳۰ را پریل ۱۹۱۵ء کو والدہ محترمہ کی
اجازت سے میں تنہا دہلی آیا۔ میرے اپنے رہنے
کا ٹھکانہ کہاں تھا کہ وہ بھی آتیں۔

صفحہ ۱۳ محترم امام صاحب نے یتیم خانہ میں داخل
کر دینے کے لیے فرمایا تھا۔ میں اس پر رضامند نہیں
ہوا۔ چند روز مولوی اصغر علی صاحب کے ہاں رہا۔
پھر مولوی فضل الدین صاحب مرحوم ہیڈ ماسٹر
اینگلو عربک ہائی اسکول نے بورڈنگ ہاؤس میں
رہائش وغیرہ کا انتظام فرما دیا۔ مولوی فضل الدین
صاحب کے ہاں میں کبھی نہیں رہا۔ مرحوم امام صاحب
اس کے بعد بھی مجھ پر مہربان رہے۔

صفحہ ۱۴ موڈرن ہائی اسکول میں میرا تقرر
ساٹھ روپے ماہوار پر ہوا تھا۔ البتہ ۱۹۴۲ء میں
اسکول چھوڑتے وقت میری تنخواہ ایک سو پچیس روپیہ
ماہوار تھی۔

نیر صاحب کی کہانی خود اُن کی زبانی، صفحہ ۳۰ جو
مضمون میں ادارہ کی خواہش پر لکھا ہے، اُس سے
اس نوع کی غلط فہمیاں رفع ہو سکتی ہیں۔

والسلام خاکسار محمد شفیع الدین نیر

پیام تعلیم کا شفیع الدین نمبر دیکھا۔ بہت
پسند آیا۔ آپ نے واقعی بہت محنت اور خلوص
سے اسے مرتب کیا ہے اور دریا کو کوزہ میں بند
کر دیا ہے۔ اس میں غالباً نیر صاحب کی
نیک نیتی کو بھی دخل ہے جو ۵۰ سال سے زیادہ
عرصہ سے اردو زبان اور بچوں کے ادب
بے لوث خدمت کر رہے تھے۔ تمام مضامین
جگہ خوب ہیں۔ تصاویر بھی اچھی ہیں۔ میری جانب
آپ کو اور ریحان احمد عباسی صاحب کو بہت
بہت مبارک باد۔
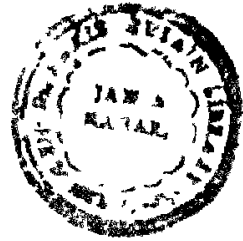
رشید الدین

نواب عزیز احمد خاں صاحب قدیرالدین اور حمیدالدین صاحب کے بہنوئی

نواب قدیرالدین احمد
یہ چیف جسٹس کے عہدے سے
ریٹائر ہوئے۔ ان کا مضمون بھی
شامل اشاعت ہے

نواب حمیدالدین احمد
ریلوے بورڈ کے
افسر اعلیٰ کے درجے سے
ریٹائر ہوئے

سیّد صاحب کی نگرانی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جوبلی میں دونوں نے تقریر کے اول اور دوم پرائز
حاصل کیے۔ ۱۹۲۶ء

Regd No, D(S)-097

1977.

Payam-I-Taleem

NEW DELHI-110025